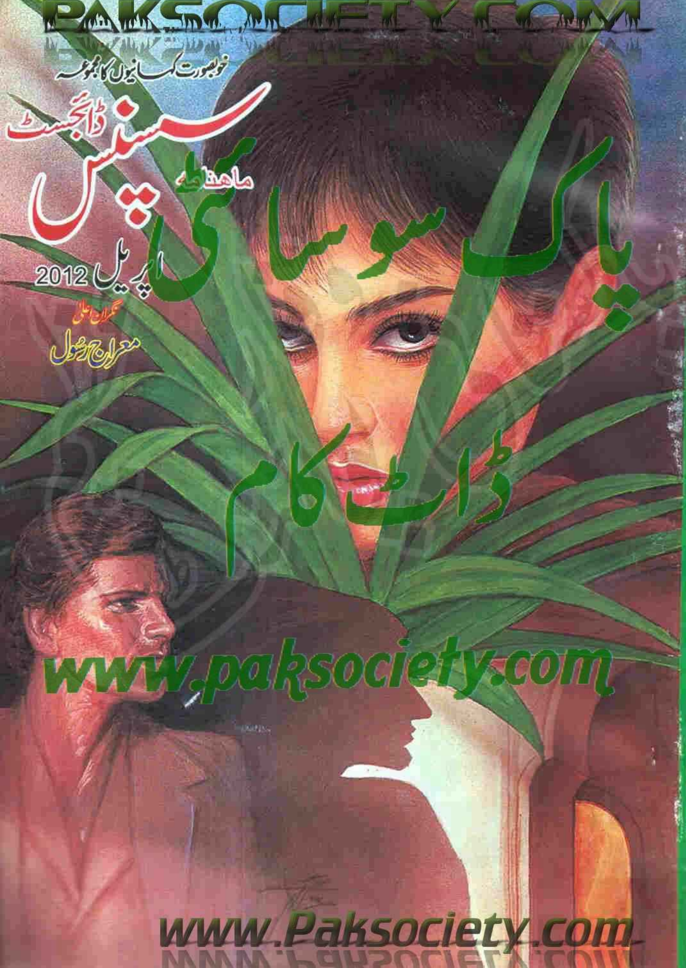

PAKSOCIETY.COM
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اپریل 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
www.Paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر و اعلیٰ: عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

جلد 41 • شمارہ 04 • اپریل 2012 • زرسالانہ 500 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 5895313 (021) فیکس 5802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

جرم

جون ایلیا

ہمارے یہاں جس چیز نے سب سے زیادہ فروغ پایا ہے، وہ جرم ہے۔ جرم کو اتنی سازگار فضا کبھی نہیں ملی تھی جتنی کہ گزر جانے والی دہائی میں ملی ہے اس لیے کہ نہ سزا کا خوف ہے اور نہ سزا وہ کیفیت جسے معاشرے کی گرفت کہتے ہیں، وہ اپنا اثر کھو بیٹھی ہے۔ سو نہ تو نیکی کی داد ہے اور نہ بدی کی فریاد۔ کوئی کچھ بھی کر گزرے، اسے کوئی روکنے والا نہیں، ٹوکنے والا نہیں۔ اب یہ کوئی خبر نہیں رہی کہ نامعلوم افراد نے سرِراہ گولیاں چلا کر دس آدمیوں کو ہلاک کر دیا بلکہ اب یہ بات خبر کہلائے گی کہ آج ہمارے اردگرد قتل، ڈکیتی یا اغوا کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

جرائم پیشہ لوگ کسی ایک طبقے یا کسی ایک گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ سماج کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے لوگ اپنی اپنی پسند کے جرائم کا ارتکاب کرنے میں سرگرم ہیں۔ ان کی راہ میں نہ کوئی مانع ہے اور نہ کوئی مخل۔

جس سماج میں جرائم کو معمولات کی حیثیت حاصل ہو جائے، اس سماج کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس صورت حال کا ذمے دار آخر کون ہے؟ کیا مجرم اس کے ذمے دار ہیں؟ ظاہر ہے کہ مجرم اس کے ذمے دار نہیں ہیں اس لیے کہ اگر مجرم جرم نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟

عوام جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا کریں اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اربابِ اختیار کیا کر رہے ہیں؟ اب تو یہ عالم ہے کہ جب ہم جرائم کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجرموں کو عبرت ناک سزا دی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم کوئی بہت ہی لچر اور پوچ بات کہہ رہے ہوں۔

کبھی کبھی تو اپنی مرضی سے جرم کرنے والوں یا جرم کرنے پر مجبور کر دیے جانے والوں سے میرا یہ بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اے عزیزو! ہمارے حکمرانوں کے ذہن میں ملک سے متعلق بہت سے منصوبے ہیں۔ تمہیں بھی ان ہی کی طرح کچھ کم اثر و نفوذ حاصل نہیں ہے لہٰذا تمہارے ذہن میں بھی اپنے ملک سے متعلق کچھ منصوبے ہوں گے۔ اس میں سے کسی ایک منصوبے کے یا دو ایک منصوبوں کے بارے میں معلوم تو ہو کہ آخر ان کی کیا نوعیت ہے اور یہ کہ تم نے اپنی قوم کے لیے آخر کیا سرنوشت تجویز کی ہے؟ اس کے علاوہ مجھے تم سے کچھ ذاتی قسم کی باتیں بھی پوچھنی ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے؟ کیا تم کسی کے باپ اور کسی کے بیٹے اور کسی کے بھائی اور کسی کے دوست نہیں ہو؟ اے عزیزو! کیا تم سارے رشتوں سے آزاد ہو؟ اگر ایسا ہے تو یہ کیفیت بہرحال زمینی کیفیت تو ہرگز نہیں ہے، آسمانی ہو تو ہو... شاید ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر تم جرائم کی انجام دہی میں اتنی دل جمعی اور مستعدی نہ دکھاتے۔ اس لیے کہ جو کسی کا باپ نہ ہو وہی مسلسل دل جمعی اور مستعدی کے ساتھ کسی کے بیٹے کو خون میں نہلا سکتا ہے، جو کسی کا بیٹا نہ ہو وہی کسی کے باپ کو بے تکان قتل کر سکتا ہے اور جو کسی کا بھائی یا دوست نہ ہو، وہی آزاد مرد پورے احساسِ آزادی اور بے ساختگی کے ساتھ کسی کے بھائی یا دوست کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر سکتا ہے، ہے کہ نہیں؟

کیوں نہ مل کر سوچیں کہ ہم آخر کس راستے پر چل رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں اور کہاں جا کر ٹھہریں گے۔ میرا گمان ہے کہ حالات نے تمہیں جس راستے پر ڈال دیا ہے، وہ راستہ ہرگز تمہارا پسندیدہ راستہ نہیں ہے۔ تم میں سے اکثر نے اپنے لڑکپن میں یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ جوان ہو کر جرم کو اپنا پیشہ بنائیں گے۔ آج بھی اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ کیا ملک کے لوگوں کی اکثریت کو جرائم پیشگی کا راستہ اختیار کر لینا چاہیے، تو شاید تمہارا جواب یہ ہوگا کہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر تم سے مجرم اور منصف میں سے کسی ایک حیثیت کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو شاید تم منصف کی حیثیت کا ہی انتخاب کرو گے۔ تو اے عزیزو! جب ایسا ہے تو پھر سر جوڑ کر کیوں نہ سوچا جائے۔ تمہارا ہم سے اور ہمارا تم سے یہ رشتہ ہے کہ ہم ایک ہی قوم کے فرزند ہیں۔ تم نے یہ راہ خود اپنائی ہے یا پھر ہم ہی شاید تمہیں یہاں تک لائے ہیں۔ تو آؤ کیوں نہ مل کر یہ سوچا جائے کہ ایک نئی راہ اختیار کی جائے خوشگوار خیالات اور خوش آئند خوابوں کی راہ۔

ایک خوش انجام سعی و عمل اور ایک درخشاں مستقبل کی راہ کہ اسی میں عزیزو، تمہاری اور ہماری سب کی نجات ہے!

عزیز قارئین!

اپریل 2012ء کا شمارہ پچھلے شماروں کے مانند اپنی بہار دکھا رہا ہے...... یہ بھی ٹھیک کہ بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے، جب خوشگوار جھونکے دلوں کو مسحور کن لطافت کا احساس دلاتے ہیں ایسے میں اچانک کسی کے تھپڑوں اور کسی کے رخسار کے درمیان ہونے والے دھماکوں سے فضا گونج اٹھتی ہے...... اور سارا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ملک کے ایک اہم مقام پر ہونے والے حالیہ ضمنی انتخابات میں وحیدہ شاہ کی پولنگ عملے کے ساتھ زیادتی...... سرگودھا کی کھلی کچہری میں ایک سابق ایم این اے کی شکایت کرنے پر 70 سالہ اسکول ٹیچر کو برہنہ کر کے بازار میں گھمانا اور اس کی دونوں ٹانگیں اور ایک ہاتھ توڑ دینا۔ گویا آنے والی نسلوں کے لیے اشرافیہ کی بالادستی کے نئے مظاہر...... ساتھ ہی حالیہ سینیٹ انتخابات میں ووٹوں کی خرید و فروخت کا بازار گرم رہا۔ قومی دولت کا یہ بدترین زیاں ہے۔ اصغر خان کیس میں کیے جانے والے ہولناک انکشافات نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ عوام کی خون پسینے کی آمدنی سے ادا کیے ہوئے ٹیکسوں کا یہ بے رحمانہ استعمال ناقابلِ معافی ہے...... تمام مسائل کے حل کے بجائے ان میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے جہاں وزراء عدالتوں کی توہین کو معمول بنا لیں اور قوم کے کروڑوں روپوں کی تقسیم نامعلوم اسباب کی بنا پر ہوتی ہو وہاں عوامی مسائل پر توجہ کیسے ممکن ہے۔ ان تمام مسائل کی جڑ بددیانتی اور نااہلی کے سوا کچھ بھی تو نہیں...... جس کی بدولت اداروں کے درمیان باہمی ہم آہنگی ختم ہوتی جا رہی ہے مگر مسائل کے حل کے لیے کوشش کیسے ممکن ہو جب کوئی بھی فریق اس بارِ گراں کو اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ بقول شاعر

مسئلہ یہ نہیں کہ مسئلہ حل کون کرے
مسئلہ یہ ہے کہ اس میں پہل کون کرے

بہرکیف ایک خوشی کی خبر ہمارے لیے یہ ہے کہ...... پاکستانی شرمین عبید چنائے نے آسکر ایوارڈ کی 84 ویں تقریب میں پہلی بار آسکر حاصل کر کے دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن کر دیا ہے۔ ان کی دستاویزی فلم Saving Face نے یہ ایوارڈ حاصل کیا، جس میں انہوں نے تیزاب سے متاثرہ خواتین کی بحالی کے موضوع کو فلمایا ہے جو یقیناً ہم وطنوں کے لیے ایک قابلِ فخر بات ہے...... اور جناب تھوڑی خوشی تھوڑے غم کے ساتھ چلتے ہیں اپنی نٹ کھٹ محفل کی جانب پرانے دوستوں کا پیار اور نئے دوستوں کا تعارف ہمارا منتظر ہے۔

✠ **ماہا ایمان**، حافظ آباد سے چلی آ رہی ہیں ”چند ماہ کی دوری کے بعد پھر سے حاضر خدمت ہوں (خوش آمدید) اہلِ محفل سمجھے ماہا ایمان بھاگ گئی کسی بھوت سے ڈر کے۔ تو دوستو بھاگنے والے تو ہم نہیں، ہاں کبھی حوادث زمانہ ہمیں سسپنس سے دور کر دیں تو اور بات ہے۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ دونوں وقت مل رہے تھے جب سسپنس نے ہمارے گلشن کو اپنی آمد کا اعزاز بخشا۔ سرورق بہت خوابناک اور رومانٹک سا ہے۔ لگتا ہے ذاکر انکل نے ٹائٹل کو میر تقی میر کے شعر سے اخذ کیا ہے۔ انشائیہ کے بارے میں یہ لکھنا کافی ہے کہ یہ وہ زندہ و جاوید تحریریں ہیں جو پڑھنے والوں کو عقل و شعور کی دولت سے سرفراز کرتی ہیں۔ تجزیاتی اداریہ بے حد فکر انگیز ہے۔ میدان کارزار میں بھوتوں کی کثرت سے بدامنی کا دور دورہ ہے۔ آغا فرید صاحب کرسی صدارت پر بیٹھے پھولے نہیں سما رہے۔ فکر مت کیجیے آپ کا بھانڈا پھوٹنے سے بچ گیا ہے کیونکہ طاہرہ اس ملنگ سے جادو نہیں کراتی جس کی خدمات آج کل آپ نے حاصل کر رکھی ہیں۔ تصویر العین تمہیں سسپنس میں پا کے خوشگوار حیرت ہوئی، اب آتی رہنا سوہنی۔ شارقہ سلجوق، سویٹ ہارٹ! مجھے بلاوا دے کے آپ خود کہاں غائب ہو گئیں۔ آ جائیے مل کے دو دو ہاتھ کریں گے صنف مخالف سے۔ قمرتی، محترم خوش فہمیاں اکثر ڈبو دیتی ہیں اس لیے حقیقت کا دامن پکڑیں کیونکہ پھول اس وقت تک خوشبو دیتا ہے جب تک پودے کے سائے میں رہتا ہے، پودے سے جدا ہوتے ہی ہوا کے جھونکے کے مانند بکھر کر اپنی خوشبو کھو دیتا ہے۔ طاہر الدین بیگ صاحب آپ کو پتا ہے مستقبل میں نعمان پیارے ایک چڑیل کا شکار بننے والے ہیں۔ بھئی سمجھا کریں وہ اپنی بیگم کو چڑیل کہتے ہیں ناں۔ طاہرہ یاسمین یار بڑی زیادتی کی تم نے اپنے منے بھائی سے اور زیادہ مطلبی نہ بنو، ہر بات کا مطلب پوچھنے بیٹھ جاتی ہو، خود سوچا سمجھا کرو ناں۔ حاجی عبدالحکیم جی ہمت مرداں، مدد خدا۔ کبھی نہ کبھی تو آپ کی نگارشات چھپیں گی۔ طاہر گلزار، ویلکم بیک ڈیئر اور ڈریں ہمارے دشمن۔ یہ افواہ کسی بدخواہ نے اڑائی ہوگی۔ عمران علی فرام جھنگ، آپ بہت اچھا سوچتے ہیں۔ تفسیر انکل کہاں غائب ہیں؟ آ جائیے، واپس میدان میں۔ آپ سے کی گئی نوک جھونک مزے کی ہوتی ہے۔ آتی ہوں خوبصورت کہانیوں کے پیر حاصل تبصرے کی طرف، تو آغاز مسافر سے کروں گی۔ تعارفی قسط خاصی جامع اور مفصل تھی۔ اٹھان اچھی ہے تحریر کی، امید ہے احمد اقبال کی کمی پوری کر پائیں گے ناصر ملک صاحب۔ ڈاکٹر شاہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ کشکول بہت ہی سپاٹ تحریر ہے، واقعات کو بار بار ریپیٹ کیا جا رہا ہے۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کا کردار بہت مصنوعی سا معلوم ہوتا ہے۔ شیخ حامد کی خباثت کو اس دفعہ خوب اجاگر کیا گیا۔ مجموعی طور پر یہ ایک الجھی ہوئی تحریر ہے۔ ماہر جاسوس، بلند اقبال، احمد اقبال صاحب کی تحریر سودے بازی بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ چوروں کو پڑ گئے مور کے مصداق اکبر حسین قوت خرید رکھتے ہوئے بھی بیوی کی وفا نہ خرید سکا۔ اصغر حسین اور اس کی بیوی نے اللہ سے دھوکا کیا اور وہ کیا برے انجام سے دوچار ہوئے۔ سچ ہے کہ کوئی اونچی اڑان بھر کر بھی عاجزی سے رہتا ہے اور کوئی پستی میں بھی تکبر سے فلک کو تکتا ہے۔ بیگ صاحب سے وکالت کے رموز سیکھنے پڑے تو ضرورت مند سے پالا پڑا۔ ماسی آمنہ نظریہ ضرورت کے تحت قتل کی مرتکب ہوئی اور بیگ صاحب اپنے موکل ساجد علی کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال لے جانے میں کامیاب ٹھہرے۔ مختصر تحریروں میں دائرہ در دائرہ میں پیلا ڈین اور اسپیڈ نے بوڑھے ڈیوڈ کو خوب ڈبل کراس کیا۔ آتش نادیدہ میں رادھا پر مجھے شروع سے ہی شک تھا جو کہ صحیح نکلا اور موہن بے چارہ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی رادھا کی چالاکیوں کا شکار ہو گیا۔ کاشف زبیر صاحب کی صلۂ احسان میں ڈین مارکنز نے اپنی حاضر دماغی سے اپنی فیملی کے ساتھ ساتھ ریڈ انڈینز کے قبیلے کو بھی

تحفظ فراہم کیا۔ یہ اس ماہ کی بیسٹ تحریر تھی۔ رضوانہ منظر کی نظر انداز میں سیلی نے اپنی بے وفائی کی سزا پائی البتہ ٹیڈ گرین بھی آسمان سے گر کے کھجور میں آخر اٹک ہی گیا۔ آخری گاہک میں جیری کو اینڈ تک شک نہ ہو سکا کہ میک ہی قاتل ہے، سنسنی خیز انجام رہا۔ محفلِ شعر و سخن میں ڈاکٹر ایچ اے لطیف اور محمد قیصر شہزاد کا شعر قابلِ تحسین تھا۔“

✠ **محمد نعمان پیارے**، ایس اے کنگ تلمبہ سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن مہاراج سسپنس کا دیدارِ عام 16 فروری کی سرد شام کو ہوا۔ ٹائٹل حسینہ نیچے گانا گانے میں مصروف شخص پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے اس کو فن پر داد دے رہی تھی۔ واہ جی! جون ایلیا! نسخہ نجات پر روشنی ڈال رہے تھے، دل لگا کے......! ہمارے پیارے اور محترم بڑے بھائی آغا فرید صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے بھلے لگ رہے تھے، آغا صاحب! مبارکاں، گلے لگا کے! تصویر صاحبہ! آپ کا مطلب ہے کہ ہمایوں صاحب ابھی سدھرے نہیں؟ جاوید بلوچ جی! براہ کرم میرا نام نعمان رہنے دیں لقمان نہ کریں۔ عمران علی! خوش آمدید۔ احمد خان جی! جگہ تو تب ملتی ہے جب آپ لکھیں، دیکھ لیں اس مرتبہ آپ نے تبصرہ لکھ کر بھیجا اور ہم نے آنٹی سے آپ کی سفارش کر دی۔ فٹ سے شائع ہو گیا نا؟“ ارے بھلا اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ ”قمرتی جی! ایسے ہی اچھے لگتے ہو بھیا، خوامخواہ سیاست میں آ کر کیوں......؟ شہزادہ ڈیڈو عرف چھوٹے! محفل میں دوبارہ آمد پر جی آیاں نوں...... گلے لگا کے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی شہید ہند ماضی کے بااختیار اور بے اختیار انسانوں کی عبرت انگیزیوں کا مکمل احاطہ کرتی نظر آئی۔ مختار آزاد کی کہانی دائرہ در دائرہ چند چھپے رستموں کی عیاریوں پر مشتمل دلچسپ کتھا تھی۔ ویسے پیلا ڈین کے لیے 3 فیصد حصہ کم نہ تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آتش نادیدہ اچھی کہانی تھی، نہ حالات ٹھیک ہوں گے اور نہ ہی موہن کو جانے کی اجازت ملے گی۔ واہ جی! کاشف زبیر صاحب کی صلۂ احسان متضاد احساسات کے درمیان کشمکش پر مشتمل زبردست کاوش تھی۔ مرزا امجد بیگ کی ضرورت مند قتل کی واردات پر مشتمل ایک کرب ناک داستان تھی۔ رضوانہ منظر کی نظر انداز بہت اچھی کاوش تھی۔ ایم اے راحت کی ادھوری تصویر ایک باکمال مصور...... ایک ادھوری زندگی کا مکمل شاہکار تھی۔ ناصر ملک کی نئی سلسلہ وار کہانی مسافر کی شروعات کافی بہتر انداز میں ہوئی ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر یہ کافی کامیابیاں سمیٹے گی۔ محمد عفان کی آخری گاہک ایک سنسنی خیز اسٹوری تھی، واقعی میک اپ تو اچھے اچھوں کو بے وقوف بنا دیتا ہے پھر بارٹینڈر کیا چیز تھی بہرحال اس بار جیری کے نشانے کا کوئی عینی گواہ نہیں۔“

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے تبصرہ کر رہی ہیں ”آپ لوگوں کے ساتھ اپنی خوشی شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ 29 مارچ کو میری بہن کی شادی ہے اور برات ملتان سے آئے گی (بہت بہت مبارک ہو اللہ جوڑی ہمیشہ بنائے رکھے اور خوشیاں نصیب کرے۔ آمین) ٹائٹل پر حسین آنکھوں والی ایک دوشیزہ اپنے ہاتھوں میں گلاب کی پتیوں کو پھونکوں سے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔ آپ کے خط تک پہنچے جہاں آپ نے ناقص ادویات کا ذکر کیا۔ میں خود آپ سے متفق ہوں میرے ابو ہارٹ پیشنٹ ہیں، ہمیں خود آج کل ان کی میڈیسن کی طرف سے فکر رہتی ہے۔ صدارت کی کرسی پر آغا فرید احمد خان براجمان تھے۔ آغا صاحب، نعمان سے جیلس ہونے کے بجائے آپ ان تینوں میں سے کوئی ایک کام کر کے دکھائیں تو مانیں۔ محمد نعمان پیارے، سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ ابرار وارث، آپ کی نانی کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ عمران علی ویلکم، خوش آمدید، جی آیاں نوں۔ پر آج کل کے مرد حضرات کو کیا ہو گیا، اپنی عمر بتانا ضروری ہے اور دیکھیں کم عمر بتاتے ہیں۔ پہلے یہ شعبہ خواتین کے پاس تھا۔ طاہرہ یاسمین، آپ کی والدہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ویسے آپ نے محمد جواد اشرف کو مشورہ بہت اچھا دیا ہے۔ احمد خان توحیدی ہم بھی سرگزشت، پاکیزہ اور جاسوسی بھی پڑھتے ہیں۔ پاکیزہ میں تو عمیرہ احمد کا ناول عکس بہت اچھا لگتا ہے (پھر ہم آپ تمام حاضرین محفل سے سوال کرتے ہیں کہ کیا نمرہ احمد، عمیرہ احمد سے بھی سسپنس کے لیے کچھ لکھوایا جائے؟) شہزادہ ڈیڈو، بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ ہماری پیاری دوست طاہرہ یاسمین کے بھائی ہیں۔ قمرتی، آپ نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے اب اللہ ہی حافظ ہے۔ آپ کا نام بڑبولا ہونا چاہیے تھا۔ شیر علی خان آپ کا نام بہت اچھا لگا۔ بس اپنے نام کی لاج رکھ لیجیے گا۔ بشریٰ ٹلو کرا اینڈ تانی ٹلو کرا اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔ حاجی عبدالحکیم اور طاہر الدین بیگ کے تبصرے بھی خوب تھے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ ناصر ملک کی مسافر بہت اچھی لگی ہے۔ پہلی قسط تو جان دار تھی آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ کشکول بھی اچھی جا رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ شبنم اپنے آپ کو بچاتے ہوئے شیخ حامد کے حکم کو مانتے ہوئے اس کے خلاف کیسے ثبوت اکٹھے کرتی ہے۔ کترنوں میں تفسیر عباس بابر، محمود افضل، عون عباس بابر، اختر شاہ عارف کی چوائس پسند آئی۔ ویسے سسپنس میں ایک وجہ خط لکھنے کی یہ بھی ہے کہ میں عون عباس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیا تفسیر عباس کے بھائی ہیں؟ محفلِ شعر و سخن میں سائرہ، صائمہ، شبیر علی خان، حجاب کنول خان اور راجا فیاض الحسن کے اشعار اچھے لگے۔“

✠ **عمران علی**، وریام والا، جھنگ سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”رسالہ 16 تاریخ کی شام کو ملا۔ بڑی بے تابی سے کھڑے کھڑے خطوط دیکھے جہاں اپنا خط پا کر بڑی خوشی ہوئی (تو پھر مٹھائی کہاں ہے؟) انشائیہ میں نسخہ نجات کا بڑا اچھا میسج دیا گیا۔ عارضی طور پر صدارت کی سیٹ پر آغا فرید احمد خان صاحب براجمان تھے، مبارکاں فرید صاحب۔ فرید بھائی، کبھی خوشبو لگا کے، کبھی دل لگا کے اور گلے لگا کے، نعمان بھائی کی یہ پولیٹکس نہیں ہے کوئی نئی سائنس ہے۔ فرید بھائی، کسی کے تبصرے کو زیادہ چھپنے پر ہٹ نہیں کرنی چاہیے (درست فرمایا کیونکہ کسی پر جملے بازی کرنا بہت آسان لیکن اسے برداشت کرنا بہت مشکل ہے) تصویر العین اچھا کیا جو آپ نے طبع آزمائی کی۔ محفل اب سجے گی۔ تصویر العین، میں بتاتا ہوں کہ گنے چنے لوگوں کا خط نمبر ون پر کیوں آتا ہے؟ رسالہ 15 تاریخ کو مارکیٹ میں آ جاتا ہے، اگر ہم 4 دنوں میں رسالہ پڑھ کر 19 تاریخ کو خط پوسٹ کر دیں تو جلد شائع ہوتا ہے، اگر تبصرہ اچھا ہو۔ ہمایوں سعید کے سدھر جانے والی بات اس سال کا جھوٹ نہیں بلکہ اس سال کا بہترین لطیفہ ہوا۔ جاوید بلوچ صاحب بڑے عاشق مزاج معلوم ہو رہے ہیں۔ شکر ہے آپ اغوا ہونے سے بچ گئے۔ احمد خان توحیدی کی طرح ہم بھی سرگزشت اور پاکیزہ کے بھی قاری ہیں۔ اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ عمیرہ احمد تو ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں (عمیرہ احمد کی طرف سے شکریہ، عمیرہ احمد کا ناول عکس مرد و خواتین میں یکساں مقبول ہے۔ ان کے علاوہ پاکیزہ میں ناہید سلطانہ اختر جو سسپنس کے لیے بھی لکھتی رہی ہیں، کا ناول بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی نمرہ احمد، میمونہ خورشید، نگہت سیما،

عنیزہ سید اور انجم انصار کو سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ سب معاشرتی مسائل پر بہت خوبی سے لکھتی ہیں) طاہرہ گلزار، جیسی آپ نئی شامل ہوئی ہیں اسی طرح ہم بھی شامل ہوئے ہیں۔ پرانوں کی جگہ نوواردوں نے لے لی ہے۔ انکل حاجی عبدالحکیم صاحب آپ شکوے نہ کریں۔ ہمیں اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ شہزادٹیڈو، آپ طاہرہ یاسمین کے بھائی ہیں، ویل کم بھائی۔ قمر ستی صاحب پہلے بھی آپ جیسے سیاست داں تھوڑے ہیں جو آپ بھی سیاست میں شامل ہو رہے ہیں کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی، لگتا ہے اگلی ایک دو قسطوں میں کہانی بڑی پلٹ کھائے گی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی شہید ہند پڑھ کر ہمیں سرنگا پٹم ناول یاد آ گیا۔ کاشف زبیر کی کہانی صلۂ احسان بڑی اچھی تھی۔ کم ہی لوگ ہیں جو دوستوں پر احسان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید، غیرت اور عزت کے بچانے پر ایسی کئی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مرزا امجد بیگ صاحب اس بار بھی چھائے رہے۔ رضوانہ منظر کی کہانی نظر انداز میں اندھی محبت کا منظر پیش کیا گیا۔ عورتوں کا رسیا کبھی کامیاب نہیں رہتا۔ تنویر ریاض کی کہانی گمنام مہربان اچھی کہانی تھی۔ خدا کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہے۔ ایم اے راحت، ادھوری تصویر میں معاشرے کا ایک پہلو اجاگر کیے ہوئے نظر آئے۔ ہاتھ میں کوئی بھی فن ہو پر دل میں دوسروں کا احساس ہونا چاہیے۔ محمد عفان کی کہانی آخری گاہک بڑی زبردست کہانی تھی۔ جیری بہت زیادہ معاوضہ کی غلطی میں مارکھا گیا۔ راز ہمیشہ راز رکھنا چاہیے۔ سوانح انبیا پڑھ کر دل کو بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے اور سکونِ قلب ملتا ہے۔ احمد اقبال کی کہانی سودے بازی، واقعی انسان جب انجام سے نا آشنا ہو جاتا ہے تو وہ کبھی سچا احساس نہیں پا سکتا۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✠ **قمر ستی**، کہوٹہ راولپنڈی سے محفل میں آئے ہیں ''اس بار شمارہ 19 فروری کو موصول ہوا۔ محفل میں پہنچے تو آغا فرید صاحب کرسی پر براجمان تھے۔ ان کا تبصرہ بہتر تھا۔ محمد نعمان پیارے بھی اس بار اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ تصویر العین! آپ کا نام بہت خوبصورت ہے مگر آپ کی تحریر میں بھی ماہا ایمان کی جھلک موجود ہے۔ محمد جاوید بلوچ! بھائی اتنا لمبا تبصرہ؟ کیا صرف ہر وقت ڈائجسٹ ہی پڑھتے رہتے ہو؟ طاہرہ یاسمین! آپ نے کیا کہا کہ لڑکیوں کے بارے میں اچھی باتیں لکھیں تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو؟ ہم جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس کا مطلب صرف محفل میں مزاح پیدا کرنا ہے کسی کی تضحیک نہیں۔ ادریس احمد، طاہرہ گلزار! اتنے بھائی اور بھائی بھی وہ جو...... ؟ جانے دیجیے ورنہ کئی چہروں سے نقاب اٹھے گا۔ انکل جی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ محفل میں بھی گروپ بنا دیے جائیں کیونکہ صنف نازک کچھ زیادہ ہی چیں چیں کر رہی ہے (یہ کام بھی آپ ہی کیجیے) ادریس احمد کا خط بلیک لسٹ میں دیکھ کر افسوس ہوا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، عام سلسلہ وار کہانیوں کے برعکس مصنف نے پہلی قسط مختلف انداز میں لکھی۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ کشکول میں تیسرے ہیرو اورنگزیب کی آمد بھی ہو گئی ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ شہید ہند اس بار بہت بہترین کہانی تھی۔ ٹیپو سلطان نے آخر تک ہمت نہیں ہاری اور مرہٹوں، انگریزوں اور اپنے ہی غداروں سے آخری لمحے تک جنگ کرتا رہا اور گیدڑ کے ہزار سالوں کے بجائے شیر کے ایک دن کو ترجیح دی۔ ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ احمد اقبال کی سودے بازی بھی نسبتاً بہتر تھی۔''

✠ **ریاض بٹ**، حسن ابدال سے لکھتے ہیں ''مارچ 2012ء کا شمارہ سترہ فروری 2012ء کی ایک سرد شام کو بے قرار، مضطرب اور منتظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ جون ایلیا کی زندہ و جاوید تحریر نسخہ نجات حسب حال ہے۔ نوکر شاہی نے جو گل کھلائے ہیں۔ وہ روز روشن کی طرح سب کے سامنے ہیں...... اس کے بعد دوڑتے بھاگتے پہنچے اپنی محفل میں۔ لیکن یہاں آکر دل کا چراغ بجھ گیا۔ جب اپنے خط کو بلیک لسٹ میں دبکے ہوئے دیکھا (یہ بلیک لسٹ نہیں بلکہ حاضری رجسٹر ہے جس میں محفل میں شرکت کرنے والوں کے نام شائع کیے جاتے ہیں) خیر میں نے زندگی میں کبھی ہمت نہیں ہاری (شاباش! ایسا ہی ہونا چاہیے) محفل میں خوب چہل پہل ہے۔ آغا فرید احمد خان کرسی صدارت مبارک ہو۔ آپ کے سوال کا جواب تو طاہرہ یاسمین بھی دے سکتی ہیں۔ محمد نعمان پیارے، آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ تصویر العین، بہن آپ کے نام کی طرح آپ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ حاجی عبدالحکیم صاحب، دل چھوٹا نہ کیا کریں۔ سسپنس میں خط لکھنے کے لیے گز بھر کا نہیں سیر بھر کا کلیجا ہونا چاہیے۔ طاہر الدین بیگ آپ نے نعرے تو لگا دیے لیکن ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے دل سے نہیں لگائے۔ البتہ حبیب جالب کا شعر خوب فٹ کیا۔ تاریخی کہانی شہید ہند پڑھ کر ٹیپو سلطان کی جوانمردی، بہادری اور ہمت سے روشناس ہوئے۔ وہ تمام عمر انگریزوں اور سازشیوں کے خلاف برسرپیکار رہا۔ اس کا تاریخی جملہ ''گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔'' اس کی طرح ہمیشہ کے لیے تاریخ کے اوراق میں امر ہو گیا اور غدار میر صادق کا عبرت ناک انجام سب کے سامنے ہے۔ مرزا امجد بیگ نے حسب معمول اپنی جارحانہ اور نپی تلی جرح سے اپنا مقدمہ جیت لیا۔ مختار آزاد کی دائرہ در دائرہ کچھ الجھی ہوئی تحریر لگی۔ بہرطور انجام توقع کے برعکس تھا۔ ایم اے راحت کی ادھوری تصویر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ محمد عفان کی آخری گاہک بھی زبردست تھی۔''

✠ **ملک بشریٰ تلوکر اینڈ تانی تلوکر**، میانوالی سے محفل میں تشریف لائی ہیں ''مارچ کا سسپنس خلافِ معمول جلدی مل گیا۔ ٹائٹل پر پھول بکھرے ہوئے تھے۔ محفل میں بھائی فرید خان پہلے نمبر پر تھے، ان کو مبارکباد۔ محفل میں اپنی بہنوں تصویر العین، طاہرہ یاسمین اور طاہرہ گلزار کو پاکر بہت شاد ہوئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے غیرت کے نام پر قتل پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کے بعد مسافر پڑھی، ناصر ملک تو لکھتے ہی ہمیشہ بہت اچھا ہیں۔ پھر سودے بازی پڑھی، بہت جاندار کہانی تھی۔ کشکول جیسی کہانی تو آج تک کسی رسالے میں نہیں پڑھی۔ ادارہ اتنی اچھی کہانی پیش کرنے پر مبارک باد کا حق دار ہے۔'' (شکریہ)

✠ **ڈاکٹر وسیم خالق کہیاں**، گجرات سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس بار میرا پیارا سسپنس ڈائجسٹ 16 فروری کو ملا جسے دیکھ کر ہمارا دل کچھ دیر کے لیے دھڑکنا بھول گیا جس کی اہم وجہ سرورق کی حسینہ تھی جو اپنے چاند سے چہرے پر زلفوں کو بکھرا کر انتہائی سنجیدگی سے ہمیں مسلسل دیکھے جا رہی تھی (اللہ رے یہ خوش فہمی) حسینہ سرورق سے نظریں چرا کے بعد ہم جون ایلیا کے انشائیہ نسخۂ نجات پر جا پہنچے جو ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی ہمارے

... کی بولیاں ہلانے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد محفل یاراں میں اپنے آپ کو نہ پاکر کسی قسم کا دکھ نہیں ہوا بلکہ اس بات پر خوشی ہوئی کہ ہماری جگہ پر ... ساتھیوں کی شمولیت کو یقینی بنا کر ان کی خوشیوں کو دوبالا کیا۔ نو وارد ساتھیوں کی خوشیوں میں ہی ہماری خوشی ہے (یہ ہوئی نا بات۔ ایسی باتیں کرنے کے لیے بہت دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ نے ہمارا دل خوش کر دیا) محفل یاراں میں اس بار کرسی صدارت پر آغا فرید صاحب رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے، مبارک ہو بھائی۔ محمد نعمان پیارے جنم دن مبارک ہو، گلے لگا کے۔ اوکاڑہ سے ہماری ... بہن تصویر العین اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ پہلی بار محفل کا حصہ بنی، خوش آمدید۔ محمد جاوید بلوچ کا تبصرہ جو کہ بہت طویل تھا، اپنی مثال آپ تھا۔ بشریٰ تلوکر اینڈ تانی تلوکر آپ آئیں بھی اور چلی بھی گئیں۔ باقی ساتھیوں میں سے احمد خان توحیدی، عمران علی، شیر علی خان کا شکریہ جنہوں نے ہمارا ... کا اپنے اپنے تبصروں میں ذکر کیا۔ سب سے پہلے آخری صفحات کی زینت بنی احمد اقبال کی کہانی سودے بازی پڑھی جس میں رائٹر نے اس بات پر زور دیا کہ روز اول سے انسان کی قسمت میں جو لکھ دیا گیا وہ اسے لاکھ کوشش کے باوجود نہیں مٹا سکتا۔ انوار صدیقی کی سلسلے وار کہانی کشکول اب پہلے سے بہتر جا رہی ہے۔ صلۂ احسان کاشف زبیر کی ایک بہترین کاوش تھی۔ مرزا امجد بیگ کی تحریر ضرورت مند بھی ہمیں متاثر نہ کر سکی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر غیرت کے نام پر جو ہمارے ہی شہر گجرات پر لکھی گئی جس پر میں ابھی تک حیرت کا بت بنا کھڑا ہوں (ڈاکٹر صاحب ایک معروف گائناکالوجسٹ ہیں اور ان کی اکثر تحریریں حقیقی واقعات پر مبنی ہوتی ہیں تاہم نام اور علاقوں کو تبدیل کر دیا جاتا ہے) مسافر کے بارے میں ایک دو اقساط کے بعد کچھ لکھ سکوں گا (ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا) گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے کے مقولے کے خالق ٹیپو سلطان کی کہانی شہید ہند پڑھی، جو زلف یار کی پیچ و خم کے طرح تھی جس کو جتنا سنوارتے گئے، اتنی ہی الجھتی گئی۔''

✠ **محمد قدرت اللہ خان نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے چلے آرہے ہیں ''مارچ 2012ء کا شمارہ ٹھٹھرتی صبح کو موصول ہوا۔ سرورق بہت دیدہ زیب تھا۔ حسینہ کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا نوکر شاہی کے اختیارات اور ان سے بچاؤ کے لیے نسخہ نجات بتا رہے تھے۔ اداریہ میں مدیرہ آنٹی حکومت کی بے پروائی کا رونا رونے میں مصروف نظر آئیں لیکن کیا کیا جائے حکومت تو کان منہ لپیٹ کر بس لوڈ کو بہانے میں لگی ہوئی ہے۔ محفل میں اپنا خط ڈھونڈا مگر کہیں نظر نہ آیا۔ محبت نامے کھنگالے تو اپنے خط کو محبت ناموں یعنی بلیک لسٹ میں موجود پایا۔ دل بہت اداس ہو گیا۔ آغا فرید احمد خان اپنے بزرگانہ انداز کے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھے، تبصرہ بہت جاندار تھا۔ نعمان پیارے! سعدیہ بخاری نے سچ نہیں بتانا اس لیے جواب کا انتظار فضول ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے دس سال کم بتائے تھے، جمع تفریق خود کر لیں۔ تصویر العین، شارقہ بلوچ کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر انٹری مار چکی ہیں اور صنف نازک کو مورل سپورٹ دینے میں لمبی لمبی چھوڑ رہی ہیں۔ تصویر العین صاحبہ! عورتیں ہوتی ہی سازش کا شاہکار ہیں تو ان ہی کو سازش کرتا دکھایا جائے گا (لیکن مرد بھی تو کسی طرح سازش کرنے اور انہیں عورتوں کے نام کرنے سے باز نہیں آتے۔ اگر عقل سے کام لیں تو سازش کا حصہ نہ بنیں) محمد جاوید بلوچ اپنے خوب صورت اور طویل ترین تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ اناڑی کے اختتام پر ہم بھی افسردہ ہیں۔ ابرار وارث! جناب ہماری طرف سے ویلکم اور مرحومین کے لیے دعا کہ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) اور ہمیں شارقہ کے خط میں مرد ذات سے نفرت والی تو کوئی بات نظر نہ آئی۔ وہ تو شاید محفل میں خواتین کی کم نمائندگی کی وجہ سے چیخ چلا رہی تھیں۔ احمد خان توحیدی! آپ کے خط کو تو مدیرہ آنٹی نے پاکیزہ کی ایڈورٹائزنگ کے لیے استعمال کر ڈالا (آپ کی اس بات کا جواب توحیدی صاحب خود دیں گے) طاہرہ گلزار، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ اور محفل کے تمام ساتھی باذوق ہی ہیں کیونکہ سسپنس ان سب کی مشترکہ پسند ہے۔ حاجی عبدالحکیم صاحب! ہم ادارے سے گزارش کریں گے کہ آپ کو محفل میں ضرور شامل کیا جائے اور دوبارہ آپ کو شکوے کا موقع نہ دیا جائے (کوشش ہماری بھی یہی ہوتی ہے تاہم جگہ کی کمی آڑے آجاتی ہے) شیر علی خان! بھئی ہم واقعی خوش ہیں محفل میں آپ کی آمد سے کہ ہمارے اکسانے پر آپ نے محفل کے لیے قلم اٹھایا۔ حسب معمول سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ شبنم شیخ حامد کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور نظر آئی۔ سراج، اورنگزیب کبھی ٹینشن شیخ حامد کے لیے ٹینشن پیدا کر سکتا ہے۔ لیاقت حسین کا ہم زاد مافوق الفطرت مفروضہ کردار محسوس ہوا۔ سب کچھ اس پر نہ چھوڑا جائے بلکہ کچھ لیاقت حسین کو بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع ملنا چاہیے۔ ناصر ملک کی نئی سلسلہ وار کہانی مسافر آپ بیتی ہونے کی وجہ سے اچھی لگی کیونکہ اس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ احمد اقبال کی سودے بازی حرام کمائی سے پیدا ہونے والے بگاڑ کی طویل عکاسی تھی اس میں عورت کو حد سے زیادہ مکار دکھایا گیا ہے۔ اکبر حسین جو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے مونا کو پھانس لیا ہے، الٹا اس کے تریا چلتر کا شکار ہو گیا۔ محمد عفان کی آخری گاہک میں جیری عینی شاہد ہونے کے باوجود میک کو نہ پہچان سکا۔ جھانسا میں کلنگر جینیفر کے نفسیاتی جال میں بری طرح پھنسا یہاں تک کہ خودکشی کر ڈالی۔ جینیفر نے اپنی جان دے کر باپ کے قاتل کو بھی خودکشی پر مجبور کر ڈالا۔ شہید ہند میں ٹیپو سلطان کے ولولہ افروز شب و روز پڑھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ٹیپو سلطان کے حالات زندگی کو بڑے خوب صورت انداز میں تحریر کیا۔ میر صادق کے انجام پر بہت خوشی ہوئی اور اس کو انجام تک پہنچانے والے گمنام میسوری ہیرو کو سلام پیش کرتے ہیں۔ آتش نادیدہ حسد کی ان دیکھی آگ پر ایک خوب صورت تحریر تھی۔ رادھا نے جس طرح موہن کو اپنے جال میں پھنسایا اس سے اس کی ذہانت کا بھی اندازہ ہوا۔ موہن کو سب کے لیے ہوا بنا کر خود اس کو قیدی بنایا ہوا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ غیرت کے نام پر قتل جیسی سلگتی ہوئی تحریر لے کر آئے جو معاشرے کا عکس ثابت ہوئی۔ ایم اے راحت کی ادھوری تصویر بھی بہت افسردہ کر گئی جس بدبخت کی تصویر 50 لاکھ میں خریدنے پر لوگ تیار ہیں اس کو علاج کے لیے چند ہزار بھی میسر نہیں۔ رضوانہ منظر کی نظر انداز بڈھے بے وقوف عاشق اور جوان لڑکی کی چالاکی کی روایتی کہانی تھی۔ نیڈ کو سوچنا چاہیے تھا کہ یلی جیسی حسین لڑکی جس کو ایک سے بڑھ کر ایک محبوب میسر آ سکتا ہے۔ اس جیسے بڈھے کھوسٹ کے ساتھ محبت کرنے پر کیسے خوش ہے؟ رضوانہ ساجد حضرت داؤدؑ کے واقعات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ ان کی تحریر سے معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ محفل شعر و سخن میں حجاب کنول فرام ملکوال کا قطعہ بہت نائس تھا۔ شوکت علی لاہور کا شعر بھی کافی اچھا تھا۔'' (اتنے خوبصورت تبصرے کا بے حد شکریہ)

✠ **ماہ تاب گل رانا**، راجن پور سے لکھتی ہیں ''سرورق پہلی نظر میں دل کو چھو گیا اور دوسری نظر میں غور سے دیکھنے پر کچھ خاص نہ لگا۔ انشائیہ

نے غور وفکر کے بہت سے در وا کیے۔ اپنی محفل کے وکٹری اسٹینڈ کو صنفِ مخالف نے پکڑ رکھا ہے۔ انکل جی! ہم معصوم، معصوم لڑکیوں کو بھی جگہ دے دیں (خوش آمدید) حسبِ عادت پہلے اناڑی کو کھولنا چاہا لیکن وہ ندارد، پھر یاد آیا کہ وہ تو ختم۔ خیر کشکول کو کھولنا پڑا۔ یہ قسط بھی خاصی ہنگامہ خیز رہی۔ شیخ حامد کی تلملاہٹ مزہ دے گئی۔ میڈم روبی خوب وار کر رہی ہے۔ لیاقت حسین کا کردار مزید دلچسپ بن گیا ہے۔ سراج، اورنگزیب اور ڈی آئی جی علیم کی تکون بھی زبردست رہے گی۔ مسافر پڑھ کر مزہ آیا۔ امید ہے اچھی چلے گی۔ ابتدائی صفحات پر ٹیپو سلطان کی داستانِ حیات دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی غیرت کے نام پر، نے دکھی کر دیا۔ مغرب سے ساری ترقیاں مستعار لینے والے آج بھی اسی نام نہاد غیرت کا پرچار کرتے ہیں۔ ادھوری تصویر بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعروسخن کے شعر بھی ملے جلے تھے۔ اس مرتبہ کترنیں کافی کم تھیں۔“

✠ **مرزا طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”مارچ 2012ء کے سسپنس میں دلچسپ تبصروں کے ساتھ محفل ”آپ کے خط“ پڑھ کر مزہ ہی آ گیا۔ اس مرتبہ خواتین بہت خوب رہیں۔ تصویر العین، طاہرہ یاسمین اور جاوید بلوچ صاحب کے تبصرے پڑھ کر یہ سوچنے پر ہم مجبور ہوئے کہ سب سے پہلے نمبر پر آنے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے؟ تاریخ کے جھروکوں سے شہید ہند ڈاکٹر صاحب نے خوب ہی تحریر کیا۔ مسلمان جرنیلوں کی شجاعت، ہمت اور جواں مردی کے ساتھ ساتھ ان کے کردار پر ڈاکٹر صاحب زبردست لکھ رہے ہیں۔ ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کا منظر پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ مسلمان جرنیلوں پر ضرور لکھیں۔ حیدر علی اور معظم علی پر آپ کی تحریر کا انتظار رہے گا۔ ناصر ملک کے مسافر سے شروع کرتے ہیں۔ پہلی ہی قسط نے اشارہ دے دیا کہ بڑا ہی ہنگامہ خیز سلسلہ رہے گا۔ اگلی قسط کا بڑی بے صبری سے انتظار رہے گا۔ کشکول زبردست طریقے سے رواں دواں ہے، ہر قسط لاجواب ہے۔ اورنگزیب، لیاقت حسین اور سراج بہترین کردار ہیں۔ خاص طور پر لیاقت حسین غیبی مدد سے جس طرح دشمنوں کو پچھاڑ رہے ہیں آگے چل کر بہت خوب ہوں گے۔ کاشف زبیر صاحب کی صلۂ احسان اور تنویر ریاض صاحب کی گمنام مہربان زبردست کہانیاں ہیں۔ جنہیں باہر سے لیا گیا ہے اور خوب لکھا گیا۔ غیرت کے نام پر سفاکی اور بے جا ہٹ دھرمی اور بہت کچھ، بہت خوب کہانی جس میں ہمارے معاشرے کے ایک سلگتے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ احمد اقبال صاحب کمال کر گئے۔ سودے بازی بہت زبردست معاشرتی کہانی ہے۔ شادو، اکبر، اصغر اور کلثوم یہ ہمارے ہی معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ احمد اقبال صاحب سے عرض ہے کہ کبھی کبھار کالے خان اور بھورے ماموں سے بھی کہیں نہ کہیں ملوا دیا کریں۔“

✠ **سعید عباسی**، بہاول پور سے تشریف لائے ہیں ”سسپنس ہمارے ہاتھوں میں ہے مارچ کا ٹائٹل خوب صورت تھا، لڑکی کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں سے گلاب کی پتیاں گرانے کا انداز اچھا لگا۔ آغا فرید احمد خان بھائی ہماری طرف سے کرسی صدارت مبارک ہو۔ محمد نعمان پیارے کا تبصرہ اچھا لگا۔ تصویر العین، آپ کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں، آتی رہا کریں۔ محمد جاوید بلوچ بھائی کم تبصرہ لکھا کریں، ہم جیسے پتا نہیں کتنے قاری آپ کے طویل تبصرہ کی وجہ سے رہ جاتے ہیں۔ طاہرہ یاسمین دکھ سکھ تو زندگی کا حصہ ہیں۔ بس ہر حال میں اپنے رب کا شکر ادا کرو۔ احمد خان توحیدی 40 سال والی بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی مجھے...... طاہرہ گلزار، آپ اچھا تبصرہ لکھتی ہیں بالکل سادہ اور کھرا، آتی رہا کریں۔ سب سے پہلے ناصر ملک کی مسافر پڑھی، بالکل دیہاتی لوگوں کے مسائل اور انسانی ہمدردی رکھنے والا ڈاکٹر منور علی شاہ اور سادہ دل شہریار۔ بالکل سچے اور کھرے کردار وہیں پر ظلمت علامت وریام خان جیسے وڈیرے بھی شامل ہیں۔ بالکل موقعے کی مناسبت سے کہانی شروع کی گئی۔ ویلڈن ناصر ملک صاحب، اس کے بعد صلۂ احساں کاشف زبیر کی پڑھی۔ ڈین اور اوچی ایک دوسرے کے کام آتے، ایڈی کو کہانی میں اس طرح سے نکالا گیا جیسے آٹے میں سے بال، کہانی اچھی تھی۔ احمد اقبال کی سودے بازی کہانی اچھی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اپنے سحر میں جکڑ لینے والی داستان بہت سارے کرداروں سے بھری۔ اصغر بھرائی سے لے کر اکبر تک ہر کردار کو بڑی خوبی سے نکالتے ہوئے احمد اقبال نے کہانی کے ساتھ انصاف کیا۔ ضرورت مند ایک اور گیس جس کو بڑی اچھی طرح حل کیا گیا۔ آمنہ حالات کے ہاتھوں مجبور اپنے پیاروں کو بچانے کے لیے خود دلدل میں جا پھنسی۔ مختار آزاد کی دائرہ در دائرہ کہانی بھی اچھی تھی۔ رابرٹ پیلاڈین اور اسپیڈ نے سوچ کر...... پلان بنایا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی غیرت کے نام پر جو تھی، اسٹوری نہیں تھی، ایک بہت اچھے طریقے سے ڈاکٹر شیر شاہ سید نے سمندر کو جیسے کوزے میں بند کر دیا ہو۔ گمنام مہربان تنویر ریاض کی بھی اچھی کاوش تھی۔ آخری گاہک محمد عثمان کی اچھی اسٹوری تھی۔ میک جیری کو بے وقوف بنا کر موت کے گھاٹ اتار کر چلا گیا۔“

✠ **عمران حیدر بلوچ**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ٹائٹل پر حسینہ ہوا میں پھول بکھیر رہی تھی اور اس کے کھلے بال اور مخمور آنکھیں انتہائی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ محفل میں پہنچے تو اپنا خط نہ پا کر بہت دکھ ہوا۔ ہم جتنی کوشش کے بعد شمارہ اور لفافہ منگواتے ہیں، ہم کو پتا ہے، اتنی مشکل کے بعد خط لکھتے ہیں اور وہ نہ شائع ہو تو بہت دکھ ہوتا ہے (اب تو آپ خوش ہیں) آغا فرید احمد خان کو کرسی صدارت پر مبارک باد۔ تصویر العین، عمران علی، شہزادہ ٹیڈو، شیر علی خان کو خوش آمدید اور شیر علی خان اکبر بھائیوں کے لیے دعا کرنے کا شکریہ اور باقی تمام دوستوں سے شکایت ہے کہ اسیر بھائیوں کو کسی نے یاد نہیں کیا کہ کیا وجہ ہے کہ وہ غیر حاضر ہیں۔ تفسیر عباس بھائی ہم آپ کو اور ماما کو یاد کرتے ہیں، پلیز واپس آ جائیں (لگتا ہے پُرخلوص پکار تھی آپ کی) کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ شیخ حامد کے گھر پر حملہ حیران کن تھا جس کا وہ سراغ نہ لگا سکا۔ سراج اور ایس پی اورنگزیب کی جوڑی خوب جمے گی۔ لیاقت کا اغوا اور واپسی حیران کن تھی۔ اس کے بعد مسافر پڑھی، کہانی اچھی تھی مزہ آئے گا۔ آتش نادیدہ میں رادھا نے بڑی عقلمندی سے موہن کو اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے پھنسایا، رادھا کی چالاکی پسند آئی۔ کاشف زبیر نے ہمیشہ کی طرح عمدہ کہانی صلۂ احسان کی صورت میں لکھی۔ محفل شعروسخن میں تفسیر عباس بابر، حجاب کنول اور طاہرہ یاسمین کے اشعار اچھے تھے۔“

✠ **سعدیہ بخاری**، ضلع اٹک سے چلی آ رہی ہیں ”اس بار تو سسپنس نے ہماری دوڑیں لگوا دیں۔ دوسرا بڑا صدمہ اپنا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر ہوا۔ جیسے معصوم صورت حسینہ ٹائٹل پر اپنی ہتھیلی پر سے پھول اڑا رہی ہے بالکل اسی طرح آنٹی جی نے ہمارے خط کو اڑا دیا (یہ آپ کی غلط فہمی نہیں ہے) حاجی عبدالحکیم انکل آپ کا اور ہمارا دکھ مشترک ہے، آؤ آپ چل کر احتجاج کرتے ہیں...... وہ ایسے کہ اس بار کہانیوں پر تبصرہ بالکل گول ماسوائے دو کہانیوں بیگ انکل کی ضرورت مند اور مسافر البتہ خطوں پر تبصرہ ضروری ہے کہ ہم کسی کا ادھار رکھنے کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ اس بار فہرست مضامین کو اپ ڈیٹ کیا گیا ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا بیوروکریسی کے کارنامے بیان کرتے نظر آئے۔ ابتدائیہ میں مدیرہ اعلیٰ نے 23 مارچ کے حوالے سے اور موجودہ دور کے حالات کا مختصراً مگر بڑا جامع تجزیہ کیا۔ دنیا تو ابھی نہیں لیکن پاکستان ضرور واپس زمانہ جاہلیت میں جا چکا ہے، اللہ رحم فرمائے۔ جاوید بلوچ اپنے ورلڈ ریکارڈ والے طویل ترین خط کے ساتھ موجود تھے۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ کا خط پڑھ کر...... اس لیے آپ کو ہاضمے والا چورن دینا ضروری ہو گیا تھا مگر آپ بھی ہمارے حکمرانوں کی طرح ہیں جن کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ طاہرہ گلزار تصویر بھائی نے، اوہو سوری تفسیر بھائی نے آپ کی کیا شکایت لگا دی اور آپ جاسوسی کی تبصرہ نگار ہیں نا، تو ادھر کیوں تاک جھانک کرنے آ گئیں اور اپنے تفسیر بھائی کو بھی ادھر ہی پکڑ کے رکھنا۔ توحید صاحب، آپ ضرور شرکت کریں اتنے سارے ڈھولوں میں کوئی بانسری کی سریلی آواز بھی ہونی چاہیے۔ قمرتی آپ

سسپنس محاوروں کے درمیان

✠ بہاولپور سے ایک ”شرارتی قاری“ نے لکھا ہے نامہ ہے یا ضرب الامثال ومحاورات کا گنجینہ (اس خواہش کے ساتھ کہ پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے...... قارئین کو بھی دعوت ہے کہ اپنے عقل کے گھوڑے دوڑائیں۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے) ”ہر مہینے سسپنس دیکھتے ہی سوکھے دھانوں پر پانی پڑ جاتا ہے۔ ویسے اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ باقی رسالے اس کے مقابلے میں نہ تین میں ہیں نہ تیرا میں۔ اگر کوئی آڑے ہاتھوں لیتا ہے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے اور اسے دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کی شہرت نے حاسدوں کو آنکھوں پانی پلا دیا ہے اور وہ جل بھن کر کباب ہو رہے ہیں۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہم نے ایک دوست کو سسپنس دکھایا۔ اسے دیکھتے ہی ان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا اور ناک بھوں چڑھانے لگے۔ اس کے علاوہ اپنے پسندیدہ رسالے کے بارے میں بڑی بڑی ہانکنے لگے۔ کہنے لگے کہ سسپنس کو ہرانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور یہ میرے رسالے کے ایک ہاتھ کا بھی نہیں۔ یہ سنتے ہی ہمارا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ قریب تھا کہ تین پانچ تک نوبت آ جاتی لیکن ہم نے غصہ تھوک دیا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے کیونکہ بندر کیا جانے ادرک کا سواد اور گدھا کیا جانے زعفران کی بہار۔ ہم نے اسے تسلی سے سمجھایا کہ سسپنس کا کوئی ہم پلہ نہیں مگر ہم سر پٹکتے رہ گئے اور اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی وہ کاٹھ کا الو بنا رہا۔ ہم نے سوچا بھینس کے آگے بین بجانے اور پتھر میں جونک لگانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات تھا۔ ہم نے ہمت مرداں مدد خدا کے اصول پر عمل کرنے کی ٹھانی اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے آخری بار اسے سمجھایا کہ خط شائع کرنے میں دوسرے رسالے ایک شیطان کی آنت کے مانند زدی کی ٹوکری رکھتے ہیں اور طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ مگر اس نے ہماری بات سن کر ہوا میں اڑا دی۔ ہم کافی دیر تک اسے سمجھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے لیکن اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ ہم نے سوچا اندھیرے میں تیر چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا کل اپنا رسالہ لے آنا ہم اپنے سسپنس کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں گے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ دوسرے دن ہمارے رسالے سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ہم نے اسے سر جھاڑ منہ پھاڑ آتے دیکھا۔ ہمارے دل میں خیال ابھرا کہ ہمارے دوست کو ہری ہری سوجھ رہی ہے۔ اس کے رسالے سے مقابلہ کرنا کوئی ٹیڑھی کھیر نہیں ہے مگر جب ہم نے اس کا رسالے کے سرورق پہ نظر ڈالی تو ہمارے سارے خیالوں پر پانی پھر گیا، خواب چکنا چور ہو گئے کیونکہ ہم اپنے رسالے کو ہی بہترین سمجھتے ہیں۔ جیسے ہی ہماری نظر سرورق پر پڑی ہوش اڑ گئے کیونکہ سرورق اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ مقابلے والی بات کر کے ہم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس کا رسالہ اوپر انسان اندر شیطان پر سولہ آنے فٹ بیٹھتا ہے ہم نے سوچا کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔ بہرکیف ہم نے رسالہ کھولا تو ایک ڈریکولا کی تصویر دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا کیونکہ تصویر ہماری طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ آخر جی کڑا کر کے ہم نے رسالے کی ورق گردانی شروع کی۔ ہم نے اس کا پورا رسالہ دیکھ ڈالا ہمیں تو اس کی کوئی کل سیدھی نظر نہ آئی جبکہ ہمارا دوست اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ دوسری طرف ہمارا دوست بھی سسپنس پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ رسالہ ختم کیا تو اس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ کشکول سمیت پورے رسالے نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ بت بنا ایسے بیٹھا تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ یہ دیکھ کر ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ ہمارے دوست کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا ہے اور وہ یہ بات ذہن نشین کر چکا ہے کہ سسپنس کا مقابلہ کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں اور اس کا اونچی دکان پھیکے پکوان کے اصول پر عمل کرنے والا رسالہ جس کی خوبیاں آٹے میں نمک اور اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہیں، سسپنس سے مات کھا گیا ہے۔ سسپنس نے ہمارے دوست کی خوب خبر لی تھی اور اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا کر دانت کھٹے کر دیے تھے۔ آخر ہمارے شرم سے پانی پانی دوست نے ہمیں رسالہ تھکے تھکے انداز میں اور دل پر پتھر رکھ کر واپس کیا۔ بعد ازاں دوست صاحب سر پر پیر رکھ کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ اتنا تیز دوڑے کہ ہم ان کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ ہم خراماں خراماں گھر کو آ گئے کیونکہ اس نے سسپنس کا لوہا مان لیا تھا۔ کسی بزرگ نے سچ کہا ہے کہ غرور کا سر نیچا۔ بس دوستو! مضمون اب ہمارے قابو سے نکل رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ پٹڑی سے اتر جائے ہمیں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ ہمارے طرزِ تحریر سے ہمارا نام پوچھیں، کچھ عرصہ پہلے ہم خودکشی کرنا چاہتے تھے۔“ (شکریہ...... آپ نے تو میدان مار لیا...... اب یہ ہمارے قارئین کی یادداشت کا امتحان ہے کہ ان کا نام خودکشی کے حوالے سے کسے یاد ہے)

پہلے اپنے آپے میں تو آجاؤ پھر سیاست میں بھی آجانا۔ اتنی لمبی لمبی چھوڑتے ہو، خیر فکر کی بات نہیں ہمیں لپیٹنا بھی خوب آتا ہے۔ تصویر العین عین وقت پر آگئیں، بہت شکریہ، اس کمک کا ہمیں تو کھڈے لائن لگا دیا۔ بیگ انکل آپ کی ذہانت کے تو کیا کہنے، ماسی آمنہ کی دریافت اور ٹائمنگ کے تھوڑے سے فرق نے آپ کو اصل قاتل تک پہنچا دیا۔ بعض دفعہ غیر اہم اور معمولی نکتہ کیس کا پانسا پلٹ دیتا ہے۔ مسافر بہت زبردست کہانی ہے۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار بس ٹھیک ٹھاک ہی تھے۔''

✠ طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل میں شریک ہوئی ہیں'' آخر آپ نے میرا خط شائع کر ہی دیا، شکریہ (خوش رہیے) یہ شمارہ تو بہت ہی اچھا لگا دو وجوہ سے، ایک کہانیاں بہت معیاری ہیں، خاص کر نئی کہانی مسافر اور دوسری وجہ میرے خط کا شائع ہونا۔ فرید بھائی کا خط پہلے نمبر پر اور محمد نعمان پیارے کا دوسرے نمبر پر ہے اور تصویر العین کا تیسرے نمبر پر اور میرا 9 نمبر پر۔ کٹ کٹا کے آخر شائع ہو ہی گیا۔ فرید بھائی کا تبصرہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ شیر علی خان، بنوں کی صرف مہندی نہیں مسالہ بھی بہت مشہور ہے۔ قدرت اللہ نیازی اس بار آپ کے تبصرے سے محروم رہے (نیازی صاحب کا تبصرہ تاخیر سے ملنے کے باعث شائع نہیں ہوسکا) شہید ہند تحریر نے میرا دل خوش کر دیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کو اتنا اچھا لکھنے پر مبارک باد۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں نے ہر دور میں ہمیشہ نقصان اپنوں کے ہاتھ اٹھایا ہے۔ نئی کہانی مسافر پڑھی۔ شہریار وہی ڈراسہا للکار کے ہیرو تابش کی طرح بعد میں ایک چٹان بن جائے گا۔ ظاہر ہے حالات انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پہلی قسط تو بہت زبردست ہے، معاشرے کا رنگ دکھایا ہے، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ کشکول بھی بہت اچھا جا رہا ہے اور وقت قریب آ رہا ہے کہ بگ باس کو بے نقاب کر کے اوپر پہنچایا جائے۔ کیا شاطر دماغ پایا ہے۔ شیطان کا چیلہ۔ باقی کہانیاں بھی بہت معیاری ہیں۔ شاعری بھی بہت معیاری ہے۔ عمران حیدر بلوچ، تفسیر عباس بابر، شبیر علی خان، حجاب کنول خان، طاہرہ یاسمین اور ظہیر عباس کے اشعار بہت اچھے ہیں۔ تفسیر عباس آپ کی شاعری کی دوسری کتاب کب آ رہی ہے؟ (مگر پہلی کتاب کہاں ہے؟) پرنس تنویر احمد کہاں غائب ہو؟''

✠ سید محی الدین اشفاق، لیہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔'' بدلتے موسم کی خوشگواریت مزید بڑھ گئی جب خوبصورت ٹائٹل حسینہ نے پھول کی پتیاں نچھاور کر کے ہمیں سسپنس میں ویلکم کہا۔ ونگ سیٹ پر آغا فرید احمد خان سے ملاقات ہوئی۔ مبارک ہو جناب آغا فرید صاحب، تبصرہ بے حد پسند آیا۔ تصویر العین جی! تبصرہ لاجواب تھا، خاکوں کا انتظار رہے گا۔ طاہرہ یاسمین! آپ کی والدہ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں، خدا انہیں آپ کے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے (آمین) محمد جاوید بلوچ صاحب کا کہانیوں کے علاوہ ٹائٹل حسینہ کی تیاری پر تبصرہ بے حد پسند آیا۔ محترم باذوق لگتے ہیں۔ نعمان پیارے بھائی، جگہ بنا رہے تھے، رشوت لگا کے۔ کشکول میں سیٹھ حامد کو ضرورت سے زیادہ خطرناک دکھایا جا رہا ہے اور لیاقت حسین کے ساتھ جو پراسراریت کا تعلق تھا اب بالکل واضح نہیں کیا جا رہا۔ نئی کہانی ناصر ملک مسافر کی پہلی قسط اچھی لگی۔ اختتام پر ڈاکٹر کے ساتھ شاید کچھ برا ہو چکا ہے۔ اشعار اچھے تھے۔''

✠ ہمایوں سعید راج، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں'' مارچ کا سرورق نہایت معیاری لڑکی سے سجا تھا (خوبصورت تو سنا تھا یہ معیاری لڑکی کیا ہوتی ہے) خوبصورت نینوں میں کسی کے انتظار کے دیے روشن تھے۔ جون ایلیا کا پہلے سے پڑھا ہوا نسخہ نجات پھر پوری توجہ سے پڑھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے اس باکمال شخصیت نے ہمارے موجودہ حکمرانوں کے لیے بطور خاص لکھا ہے (یہی تو کمال ہے جون صاحب کا! یا یوں کہیے کہ ہمارے حالات میں کوئی تبدیلی اب تک نہیں آئی) محفل میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ہماری غیر موجودگی میں سب بے حد افسردہ ہیں۔ آغا خان اگر میں دن کو دماغ کرائے پہ نہ دیتا تو آپ لوگوں کا کام کیسے چلتا۔ نعمان پیارے! اگر وہ حسینہ دوسری طرف تکنے میں محو تھی۔ تو تمہیں بھی عارضی بنیادوں پر تاکا جھانکی کی عادت ملتوی کر دینی چاہیے۔ تصویر العین صاحبہ! خیر سے کوئی مصورہ مل جائے تو منگنی سگنی بھی کر لیں گے۔ کیونکہ مصورہ زیادہ تر خاموش رہ کر اپنے اگلے شاہکار کے بارے میں سوچتی ہے۔ عمران بے حد نڈھال دکھائی دیے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ ماہا کی غیابی نے انہیں اس نہج پر پہنچایا ہے۔ انکل جی آپ احمد خان تو حیدی کی پاکیزہ کے ساتھ دوستی پر صرف حیران ہوئے ہیں (ایسی بات نہیں ہے جن لوگوں نے عمیرہ احمد کو پڑھا ہے وہ ان کی کسی بھی تحریر کو چھوڑ نہیں سکتے۔ آزمائش شرط ہے) حاجی عبدالحکیم انکل! اگر آپ اتنی معمولی سی بات پر دلبرداشتہ ہو جائیں گے تو نوجوان اہالیان محفل اچھا سبق نہیں لیں گی۔ سب سے پہلے خلاف معمول مسافر پڑھی۔ خوبصورت منظر نگاری اور لفظوں کا چناؤ اوپر سے شاہ جی کا دل کو چھونے والا کردار، کھالے کی دیوانگی غرض یہ کہ قسط شاندار رہی۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد ٹیپو سلطان لیے حاضر تھے۔ جسے پڑھ کر پتا چلا کہ پہلے سے حاصل معلومات کتنی محدود اور ناقص تھیں۔ آخری صفحات پر احمد اقبال ایک نہایت منفرد موضوع کی کہانی لیے حاضر تھے۔ شادو اور اصغر کا معصوم کردار اتنی تیزی سے منفی ہوا کہ میں دم بخود رہ گیا۔''

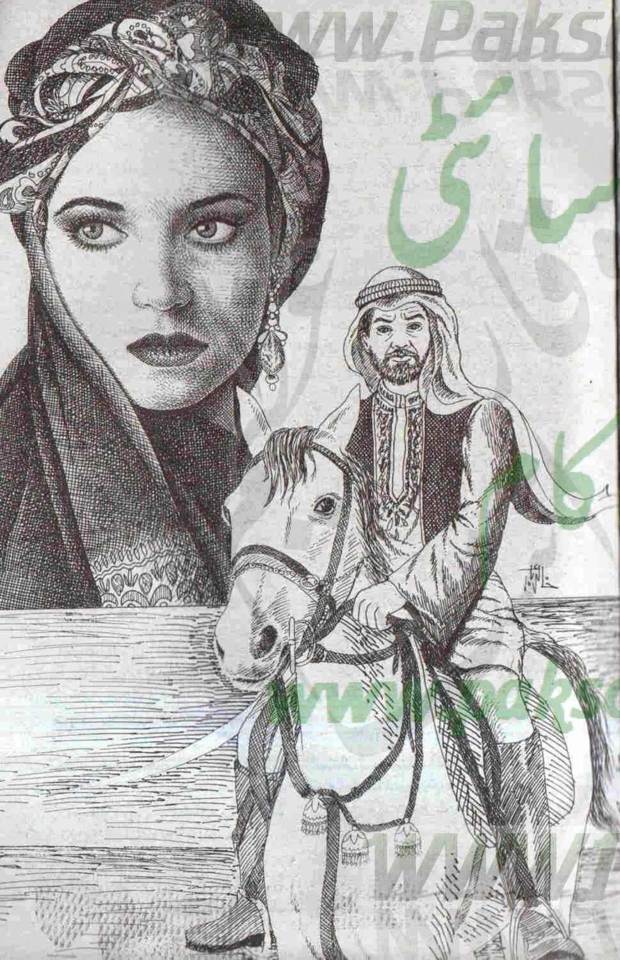
✠ راجا ثاقب نواز، رتی ٹبی، ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں'' مارچ کا سسپنس فروری کے آخری عشرے میں ملا۔ موسم کے تیور بتلاتے ہیں کہ بہار آنے کو ہے۔ مگر ملک خداداد نے جو سرخ ردا اوڑھی ہے وہ اترتی ہی نہیں۔ اقتدار کے بلند و بالا ایوان آئینی ترامیم کے لیے تو ایک ہیں مگر اصل مسائل کا ادراک ہی نہیں۔ ٹائٹل پر دیوانہ دیپک راگ چھیڑے بیٹھا ہے۔ نہیں جانتا کہ اس راگ کی تاثیر جلا ڈالتی ہے۔ جون ایلیا جی نے تو جیسے پوری تاریخ ہی ہمارے سامنے کھول دی۔ محفل نامہ اعمال میں آغا فرید احمد خان صدارت کے منصب پر فائز [illegible] تصویر العین نے کتنی خوبصورتی سے اپنی بیماری مجھے سونپنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ محمد جاوید بلوچ کے طویل مگر جاندار تبصرے نے متاثر کیا۔ ابرار [illegible] عمران علی آپ کو خوش آمدید۔ احمد خان توحیدی آپ کا شکوہ بجا، میں آئندہ خیال رکھوں گا۔ طاہرہ گلزار [illegible] سسپنس [illegible] زمانے میں ہمارے اپنے سسپنس میں سبق آموز کہانیاں کے ساتھ ساتھ لوریاں بھی چھپا کرتی تھیں [illegible] بہت

سے سوالات ہنوز جواب طلب ہیں۔ شہید ہند، یہ دھرتی آج بھی کسی ٹیپو سلطان کا ہی انتظار کر رہی ہے جبکہ ننگ وطن دھڑا دھڑا جنم لے رہے ہیں۔ دائرہ در دائرہ طوالت کا شکار ہو گئی۔ آتش نادیدہ میں رادھا کی جنونی محبت نے دل دہلا دیا۔ صلہ احسان میں ڈین مارکنز نے انتہائی ذہانت اور بروقت درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے کام لے کر اپنے خاندان کو ایک بڑے طوفان سے بچا لیا۔ غیرت کے نام پر ڈاکٹر شیر شاہ نے ایک نازک مسئلے پر نشتر زنی کی ہے۔ ضرورت مند میں بیگ صاحب اصلی مگر ضرورت مند قاتلہ کو قانون کے سامنے بے نقاب کرتے نظر آئے۔ نظر انداز میں ٹیڈ کی ایک غلطی نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ گمنام مہرباں کے انجام نے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ادھوری تصویر نے ہمارے معاشرے کی مجموعی بے حسی پر وہ چانٹا مارا ہے کہ جس کی بازگشت کئی دنوں تک سنائی دیتی رہے گی۔ مسافر کا آغاز ہو چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مسافر کو منزل کب ملتی ہے؟ آخری گاہک اچھی کاوش تھی۔ حضرت داؤد کے واقعات اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ جھانسا میں جنیفر نے کلنگر سے انوکھا انتقام لیا، گو اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ سودے بازی زیر مطالعہ ہے۔ کترنوں کے ساتھ ساتھ اب کی بار چیدہ چیدہ خاکے بھی نظر آئے۔''

✠ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ سے تشریف لائے ہیں'' دلکش رنگوں پر مشتمل سرورق نہایت جاذب نظر اور دیدہ زیب تھا۔ دوشیزہ کا سرورق کی نمناک نگاہوں میں...... ہجر کا موسم...... لمحۂ وصال کا منتظر ہے۔ مخروطی انگلیوں میں گل گلاب کی بکھرتی ہوئی پتیاں...... سپنوں، خوابوں اور امیدوں کے کچے دھاگوں کے ٹوٹ جانے کا...... سندیسہ سنا رہی ہیں خوبصورت فہرست کے بعد جون ایلیا کا نسخۂ نجات ملاحظہ کیا۔ وہی تلخی ایام کے مسموم لمحوں کا دلخراش نوحہ...... دعوت فکر دے گیا آپ کی محفل میں...... اداریے کا پراثر اداریہ ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتا ہے، وطن عزیز کا زوال وزیروں اور ارباب اختیار کے منافقانہ رویے...... جب مسیحا...... قاتل، حکمران...... خودغرض اور محافظ...... قزاق بن جائیں تو یہی ہوتا ہے۔ مسند خلافت پر سکھر سے ہمارے بہت پیارے بھائی آغا فرید احمد خان کا بہت پیارا مختصر مگر مفصل تبصرہ...... بہت پیار سے پڑھا، بہت زیادہ مبارکباد۔ تھمبہ سے نعمان پیارے، جاوید بلوچ کا ایلفی لگانے والا مشورہ...... مفت مشورہ سمجھ کر کہیں عمل ہی نہ کر بیٹھیے گا کیونکہ آپ تو ملیں گے ایلفی لگا کے...... پر لوگ کیسے چھڑائیں گے زور لگا کے؟ اور ایوان صدر کے کچن کا خرچہ...... ملکی معیشت کی پشت پر تازیہ ہے۔ اوکاڑہ سے تصویر العین کی آمد۔ ان کے جملے بہت اچھے لگے۔ لو جی نہ دل سے جی آیاں نوں۔ علی پور سے محمد جاوید بلوچ کا طویل ترین اور مفصل تبصرہ بھی خوب رہا۔ سندھیلیا والی سے ابرار وارث، آپ کے مرحومین کے لیے دعا ہے۔ سرگودھا سے طاہرہ یاسمین اللہ آپ کے مسائل و مصائب کا خاتمہ بالخیر کرے۔ لاہور سے محترم حاجی عبدالحکیم صاحب، آپ کی آمد ہمیشہ باعث طمانیت ہوتی ہے فرصت نکال کر آتے رہا کریں اور آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آنٹی جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ راولپنڈی سے قمر تقی، جناب کہاں غائب رہے اتنا عرصہ......؟ بونگیاں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھیں۔ اس ماہ محفل مختصر سی لگی۔ پاکستان میں نمک تک کا ریٹ بڑھ گیا لیکن آپ خطوط کا ایک صفحہ نہ بڑھا سکے۔ خیر چلتے ہیں کہانیوں کی جانب...... سب سے پہلے اسی شاہکار سے آغاز مطالعہ کیا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ ناصر ملک کی دلچسپ تحریر۔ مسافر متاثر کن اور دل گداز ثابت ہوئی۔ مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ایک اور دلچسپ مگر افسوسناک واقعہ...... ضرورت مند نہایت اثر انگیز رہا۔ انوار صدیقی کا تحیر آفریں سلسلہ کشکول کچھ ایسے واقعات جن پر یقین نہیں ہوتا۔ مگر کرنا پڑتا ہے۔ آخری صفحات پر بہترین مصنف کی شاندار تحریر۔ سودے بازی سپرہٹ ثابت ہوئی۔ اکبر نے غلط راہوں کا تعین کیا۔ غلط کام...... غلط انجام...... کلثوم نے عجب کام کیا جب اکبر کی موت ہی مقصود تھی تو کیا ضرورت تھی اسے پھانسی سے بچانے کی...... پر پھر وہی بات کہ عورت ایک معما ہے۔ ابتدائی صفحات کی خصوصی سوغات...... ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین ولازوال تحریر و تحقیق...... شہید ہند...... ٹیپو سلطان کی سرگزشت نے معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا۔ مختار آزاد کی دلچسپ تحریر دائرہ در دائرہ نے بھی بور نہیں کیا۔ چند چھپے رستموں کی عیاریاں اور مکاریاں۔ رابرٹ واقعی اعلیٰ نسل کا کمینہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آتش نادیدہ حضرت عشق کا ایک اور تماشا...... ورطۂ حیرت میں ڈال گیا۔ عشق یقیناً خلل ہے دماغ کا۔ کاشف زبیر کی پُراثر تحریر صلہ احسان نے ازحد متاثر کیا۔ ڈین نے جو کچھ کیا یہی مقصد تخلیق کون و مکاں ہے۔ اوجی بھی جاندار کردار ثابت ہوا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی درد انگیز حقیقت...... غیرت کے نام پر...... نے بہت افسردہ کیا۔ یہ غیرت نہیں، لاقانونیت اور جبر مسلسل ہے غیرت کے نام پر...... بے غیرتی ہے۔ رضوانہ منظر کی دلچسپ روداد محبت، نظر انداز بھی خوب رہی۔ محبت میں سب جائز ہوتا ہے اور محبت اندھی ہوتی ہے جس نے ٹیڈ کو بھی اندھا کر دیا۔ سیلی نے وہی کیا جو حسن کی سرشت میں ہے۔ تحریر ریاض کے گمنام مہربان نے بھی متاثر کیا اور بات الف سے یے تک سمجھ میں آگئی۔ گویا ساری کہانی کا روح رواں سونی ہی تھا۔ ایم اے راحت کی ادھوری تصویر نے پلکوں کے گوشے نم ناک کر دیے۔ فنکار تو بہت حساس اور درد مند ہوتے ہیں لیکن معیز نے بے حسی کی انتہا کر دی۔ عفان آزاد کے آخری گاہک کے کیا کہنے...... کتنی مہارت و چابک دستی سے میک نے جیری سے اعتراف حقیقت کروایا اور پھر اسے بھی راہی ملک عدم کر دیا۔ رضوانہ ساجد حالات اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات بیان کر رہی تھیں۔ یہ نہایت معتبر اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ سلیم انور کی سیر کو سوا سیر کا عملی مظاہرہ...... جھانسا بھی خوب رہی۔'' (آپ کی رائے بہت اہم ہے ہمارے لیے مگر کبھی کبھی جگہ کی قلت یا وقت پر نامہ نہ ملنے کی مجبوری آڑے آجاتی ہے)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہوسکے۔

رمضان پاشا، گلشن اقبال۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ ضلع میانوالی۔ محمد عثمان علی، نامعلوم مقام۔ حاجی عبدالحکیم، خانیوال۔ شیر علی خان، خانیوال۔ ہریرہ ابوبکر، فرادکہ، سرگودھا۔ حبیب الرحمن، سینٹرل جیل کوٹ لکھپت۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ جودھ پور، خانیوال۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ابرار احمد ساقی، الٰہ آباد، ضلع قصور۔ غلام رسول زاہد، راولپنڈی۔ نعیم الحق ڈار، گوجرانوالہ۔ ساگر نکوکر، چشمہ بیراج۔ طاہرہ یاسمین، سرگودھا۔

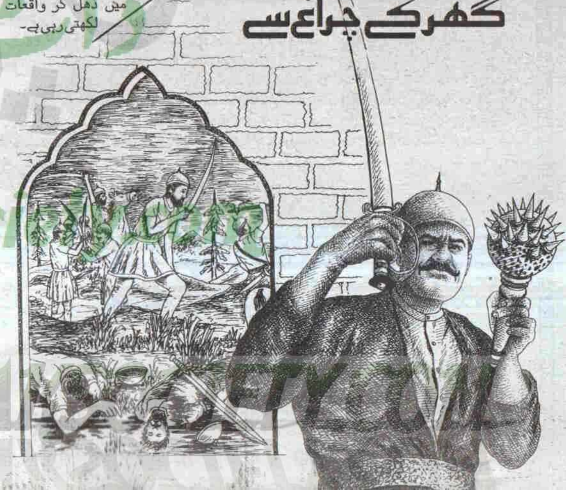


ماضی کا آئینہ۔ بااختیار
اور بے اختیار انسانوں
کے عبرت اثر واقعات

گھر کے چراغ سے

ڈاکٹر ساجد امجد

بادشاہت کے باب میں گزرا وقت روپ بدل کر کم وبیش ایک جیسے واقعات کو ہی دہراتے ہوئے تاریخ رقم کرتا رہا ہے۔ کبھی محلاتی سازشیں، کبھی رشتوں کی غداری... اورکہیں جانشینی کی جنگ... ایسے میں اگر کوئی غلطی دہرانا نہ چاہے تو بھی غلطیاں خودکو دہرا لیتی ہیں... زمانہ گواہ ہے کبھی سلطان معزالدین کیقباد خون میں نہایا تھا اور پھر گنگا کا پانی جلال الدین خلجی کے خون سے رنگین ہوا۔ اس درویش نے سچ ہی کہا تھا ”جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار سے ہی قتل ہوتا ہے“ سچ تو یہ بھی ہے کہ جب اقبال مندی محو سفر ہو تو دانش مندی دوسرے درجے پر آجاتی ہے اور بس یہیں سے زوال شروع ہو جاتا ہے۔ جس روز درویش کا وحشیانہ قتل ہوا، بڑی شدید سیاہ آندھی چلی جبکہ دوسری بار ایسی ہی سیاہ آندھی ہندوستان کی سرزمین پر اس وقت اتری جب روزے کی حالت میں جلال الدین خلجی کے سر پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا اور غروب آفتاب کے وقت بلبنی دور میں مغلوں کو شکست دینے والے اس بادشاہ کا سر کاٹ کر نشان عبرت بنا دیا گیا... اور علائو الدین نہایت تزک واحتشام سے دہلی میں داخل ہوا... مگر بادشاہت کب کسی کے پاس مستقل طور پر رہی ہے... یہ تو مسلسل گردش میں رہتی ہے اور انسان کے جاہ جلال... شعور وتفکر سے کھیلتی چلی آئی ہے۔ مختلف نام اور چہروں میں ڈھل کر واقعات لکھتی رہی ہے۔



"جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار ہی سے قتل ہوتا ہے۔"

یہ جملہ ملک فخر الدین، کوتوال شہر کے کانوں تک پہنچا اور پھر اس کی تختی سلطان دہلی جلال الدین خلجی کے سینے میں نیزے کی انی کی طرح اتر گئی۔

چند لفظوں پر مشتمل اس جملے کے پیچھے جلال الدین کا ماضی چھپا ہوا تھا۔ اس لیے وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ اس قول کا مخاطب وہی ہے۔ دوسرے دن جلال الدین کا شاہی ہاتھی سیدی مولہ کی خانقاہ کے سامنے کھڑا تھا امیر الامرا ملک فخر الدین کوتوالِ شہر اس کے ساتھ تھا

سیدی مولہ نے دروازے تک آنے میں دیر کی یا جان بوجھ کر آنا نہ چاہا تو سلطان خلجی خود اندر پہنچ گیا۔ سیدی مولہ ایک ان سلی چادر پورے بدن پر لپیٹے بیٹھے تھے۔ یہی ان کا لباس تھا۔ انہوں نے سلطان کی جانب سرد مہری سے دیکھا۔ سلطان کے یہاں آنے کا مفہوم بھی سمجھ میں آ گیا۔

سیدی مولہ کی زبان سے پھر وہی کلمات بلند ہوئے۔

"میں نے ملک فخر الدین سے کہہ تو دیا تھا کہ جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار ہی سے قتل ہوتا ہے۔"

"حضرت، میں دعا کا طالب ہوں۔ آپ میرے حق میں بددعا کر رہے ہیں۔" سلطان نے کہا۔

"تیرے لیے دعا بددعا سے مجھے سروکار نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ یہاں جو بوتے ہو وہی کاٹتے ہو۔"

"میرے دل میں آپ کا جو احترام ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ نصیحت موزوں تو نہیں۔"

"موزوں تو یہ بھی نہیں کہ دین کہیں اور ہو دنیا کہیں اور ہو۔"

سلطان جلال الدین ابھی ایک جملے کی پیچیدگی سے باہر نہیں نکل سکا تھا کہ دوسرا جملہ سامنے آ گیا۔ اس کی چوٹ بھی براہِ راست اس پر پڑتی تھی۔

اللہ والوں سے بگاڑ پیدا کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے اس نے بھی اس پر اکتفا کیا کہ ایک ذومعنی جملہ وہ بھی کہہ دے تاکہ ساتھ آئے ہوئے امرا یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ لاجواب ہو گیا ہے۔

"آپ کا احترام مجھ پر لازم ہے لیکن آپ بھی یہ خیال رکھیں کہ دین پر دنیا اور دنیا پر دین غالب نہ آنے پائے۔ ہر چیز اپنے مقام پر رہے تو اچھا ہے۔"

سلطان جلال الدین نے اس کے بعد وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور باہر نکل آیا۔ اسے سیدی مولہ کی باتیں بہت گراں گزری تھیں لیکن یہ موقع زہر اگلنے کا نہیں تھا۔ وہ یوں خاموشی سے شاہی محل تک آ گیا جیسے کسی کو دفنا کر آ رہا ہو۔

محل میں پہنچتے ہی اس نے امرا کو رخصتی کی اجازت دی اور اپنے چھوٹے بیٹے ارکلی خاں کو طلب کیا۔

"میں سیدی مولہ سے ملاقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ درویش لوگوں کے بہکاوے میں آ گیا ہے۔ اس کے عزائم اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ دین و دنیا کی باگ ڈور ایک ہاتھ میں رکھنے کی بات کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود بادشاہ بننا چاہتا ہو۔"

"آپ ان اندیشوں میں ہیں اور بھائی جان کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے اس ننگ دھڑنگ درویش کو منہ بولا باپ بنایا ہوا ہے۔ اس سے ملنے اس کی خانقاہ پر جاتے ہیں۔"

سلطان پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ "کیا کہا تم نے؟ اختیار الدین خانِ خاناں سیدی مولہ سے روابط رکھے ہوئے ہیں۔" وہ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر سر اٹھایا۔

"اب ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ سیدی مولہ کے لہجے کی تلخی خان خاناں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے امرا بھی وہاں ضرور آتے جاتے ہوں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں سیدی مولہ کی خانقاہ میں مخبروں کا جال بچھا دوں گا۔ سب معلوم ہو جائے گا، کون کیا کر رہا ہے۔ بس آپ بھائی جان کو سیدی مولہ سے دور کر دیں۔"

"یہ تو کرنا پڑے گا۔" سلطان نے کہا۔ "کسی شہزادے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ محل چھوڑ کر خانقاہ میں بیٹھا رہے۔ میں جس تخت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا آج اس تخت پر جلوہ افروز ہوں اور میرا بیٹا اس فقیر کے قدموں میں بیٹھتا ہے۔"

ارکلی خاں نے اپنے مخبر خانقاہ میں پہنچا دیے۔

شہزادہ اختیار الدین کو بادشاہ کے حکم سے کوشک کی ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔

سیدی مولہ جرجان سے فقیروں کے لباس میں ملک مغرب میں آئے اور وہاں کے درویشوں اور صوفیوں سے ایک طویل عرصے تک فیضانِ قلبی حاصل کرتے رہے۔

بغداد اور شام کے سفر کے دوران انہوں نے شیخ فرید الدین گنج شکر کا ذکر تواتر سے سنا تو شوقِ ملاقات پیدا ہوا۔ سفر طویل تھا، زادِ راہ ساتھ نہ تھا لیکن عقیدت تھی جو لیے چلی جاتی تھی۔ آپ کسی نہ کسی طرح اجودھن پہنچ گئے جہاں حضرت گنج شکر قیام فرما تھے۔ آپ والہانہ حاضر ہو گئے۔ حضرت گنج شکر پر بھی روشن ہو گیا کہ مرید کس پائے کا ہے۔ پاس بٹھایا ضرور لیکن یہ عجیب و غریب جملہ بھی کہہ دیا۔

"رہ جاؤ مگر زیادہ رہ نہیں سکو گے۔"

"حضرت، آپ کے سوا میرا ہے کون۔ میں تو گھر بار چھوڑ کر آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔"

سیدی مولہ، فرید الدین گنج شکرؒ کی سرپرستی میں سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ اس قدر شدید ریاضت کی کہ خود مرشد کو رشک آنے لگا۔

ایک عرصے بعد مرشد نے حکم دیا کہ دہلی جا کر اپنے آستانے کو لوگوں کا ملجا بناؤ۔ فقیروں اور درویشوں کی حاجت روائی کرو۔ البتہ ایک نصیحت ہے، امیروں اور حاکموں سے زیادہ میل جول پیدا نہ کرنا۔ امیروں کی دوستی ہماری موت کا سبب بن جاتی ہے۔

سیدی مولہ دہلی آئے اور یہاں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی اور ضرورت مندوں کی روٹی کپڑے سے مدد کرنے لگے۔ کسی کو نقدی کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی اسی خانقاہ سے ملتی۔

ان کی ایک عادت البتہ لوگوں کی نظروں میں کھٹکتی تھی۔ وہ نماز کے لیے جماعت کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز تک کے لیے مسجد میں نہ جاتے تھے بلکہ تنہا نماز ادا کرتے تھے لیکن ریاضت اور مجاہدے میں آپ کا جواب نہیں تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ نماز سے غافل ہوں بس جماعت کی پابندی سے نالاں تھے۔ ایک چادر کے سوا ان کے بدن پر کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا۔ غذا بھی بہت سادہ تھی۔ خانقاہ میں ہر طرح کے کھانے پکتے تھے لیکن خود ان کا یہ عالم تھا کہ چاول کی روٹی کو پانی میں تر کر کے کھاتے تھے۔ کوئی لونڈی تھی نہ منکوحہ عورت۔ نہ ہدیہ قبول کرتے تھے نہ نذرانہ۔ خانقاہ کے اخراجات اتنے تھے کہ کوئی امیر کبیر بھی چند روز سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اہلِ دہلی میں یہ چرچا عام ہو گیا تھا کہ وہ کیمیا بنانا جانتے ہیں۔

وہ جب دہلی آئے تھے تو غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ معز الدین کیقباد کی حکمرانی کا دور آیا تو سیدی مولہ نے حضرت فرید گنج شکر کی نصیحت کو فراموش کر دیا۔ امرا اور دیگر بڑے لوگوں سے گہرے مراسم پیدا ہو گئے۔ اب خانقاہ میں ان بڑے لوگوں کے لیے بھی دسترخوان سجنے لگے اور ایسے کہ بادشاہی دسترخوان بھی ماند نظر آتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ایک دن میں ایک ہزار من میدہ، چالیس من شکر، پانچ سو من گوشت اور کئی من گھی ان کے باورچی خانے میں صرف ہوتا۔

اکثر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی ضرورت مند آیا۔ انہوں نے اس سے کہا فلاں پتھر کو اٹھاؤ، اس کے نیچے اتنی اشرفیاں ہیں تم لے لو۔ وہ شخص اس پتھر کو اٹھاتا تو اتنی ہی اشرفیاں مل جاتیں جتنی سیدی مولہ کی زبان سے نکلی تھیں۔

جب جلال الدین خلجی، کیقباد کو قتل کرا کے تخت شاہی پر بیٹھا تو سیدی مولہ کی خانقاہ کی رونق مزید بڑھ گئی۔

جلال الدین خلجی نے کیقباد کو قتل کیا تھا۔ اسی لیے سیدی مولہ نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ "جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار ہی سے قتل ہوتا ہے۔"

سیدی مولہ کی پراسرار شخصیت لوگوں کے لیے معما بنی ہوئی تھی۔ کوئی کہتا وہ کیمیا بناتے ہیں۔ کسی کا خیال تھا کہ انہیں دست غیب حاصل ہے۔ کوئی کہتا انہوں نے خانقاہ میں ٹکسال لگائی ہوئی ہے جس میں سکے ڈھالے جاتے ہیں۔ ثابت کچھ نہیں ہوتا تھا۔

سلطان جلال الدین خلجی نے حکومت تو حاصل کر لی تھی لیکن اس کی نرم دلی ثابت کر رہی تھی کہ وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں۔ ملک کے ہر حصے میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں۔ اول تو کوئی مجرم پکڑا ہی نہیں جاتا تھا اور اگر پکڑا جاتا اور اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اسے توبہ کروا کے چھوڑ دیتا۔ اس کے بڑے بڑے امیر اس پر برگشتہ ہو گئے اور کھلے بندوں بادشاہ کو ملامت کرنے لگے۔ ان کا یہ ڈر بھی نکل گیا تھا کہ اگر یہ باتیں بادشاہ تک پہنچیں تو بادشاہ مشتعل ہو کر کوئی بھی سزا سنا سکتا ہے۔ اکثر یہ کہتے نظر آتے تھے کہ جب وہ چوروں اور لٹیروں کو سزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا تو ہم تو اراکینِ سلطنت ہیں۔ امرائے وقت کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ وہ جلال الدین کی معزولی کے مشورے کرنے لگے۔

"جلال الدین کی جرأت و بہادری میں کوئی کلام نہیں لیکن یہ اس کے عہدِ جوانی کے قصے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب غیاث الدین بلبن کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ ہمارے حصے میں تو ضعیف العمر جلال الدین آیا ہے جس کو شاعری اور شطرنج کے سوا کچھ نہ آتا۔"

"اس کے بیٹے بھی بس اسی کی طرح ہیں۔ بڑا بیٹا سیدی مولہ کے قدموں میں پڑا رہتا ہے۔ چھوٹا ہے، اس نے کیقباد کی بیٹی سے عقد کر لیا ہے۔ وہ باپ سے زیادہ بلبنی امرا

کا وفادار ہے۔ کسی دن دیکھنا وہ انہی امرا کے ہاتھوں باپ کا تخت پلٹ دے گا۔"

"سنا ہے بلبنی امرا، سیدی مولہ سے ساز باز کر رہے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جلال الدین کا بڑا بیٹا ان کا ساتھ دے رہا ہو۔"

"منجھلا بیٹا ارکلی خان ایسا ظالم ہے کہ اگر وہ تخت نشیں ہوا تو ہم سب کی گردنیں ایک ساتھ اڑا دے گا۔"

یہ مشورے ہوتے ہی رہتے تھے کہ ایک روز انہی چند ہم خیال دوستوں نے ایک امیر ملک تاج الدین کوچی کی قیام گاہ پر بادہ نوشی کی ایک محفل منعقد کی۔ بادشاہ کے خلاف باتیں ذہن میں گردش کر ہی رہی تھیں۔ شراب نے اثر دکھایا تو اندر کی باتیں باہر آنے لگیں۔ جو باتیں سرگوشیوں میں ہوتی تھیں، محفل میں آگئیں۔ آوازوں نے قد نکالا۔ یہ خیال بھی نہ ہوا کہ یہاں دو چار وہ بھی ہیں جو ان مشوروں میں شریک نہیں رہے ہیں۔

ایک بادہ خوار نے ملک تاج الدین کوچی کو مخاطب کیا کہ وہ میزبان تھا۔ اسے خوش رکھنا لازمی تھا۔

"ملک تاج الدین! تم اعلان کرو۔ ہم تمہیں بادشاہ تسلیم کریں گے۔"

"جلال الدین جیسے بزدل کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ عنان حکومت اس کے ہاتھ میں رہے۔"

"تم لوگ بھی کمال کرتے ہو۔" ایک تیسرا امیر بولا۔ "جب تک جلال الدین کو قتل نہیں کیا جائے گا، تخت خالی کیسے ہوگا؟ پہلے یہ تو طے کرلو کہ جلال الدین کو قتل کیسے کیا جائے۔ تخت پر بیٹھنے کا کیا ہے؟ تم لوگ کہو گے تو میں بیٹھ جاؤں گا۔"

"تم کیسے بیٹھ جاؤ گے۔ یہ حق صرف تاج الدین کوچی کا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو انہوں نے کیسی اچھی شراب ہمیں پلوائی ہے۔"

"چلو انہیں بادشاہ بنوا دینا۔ پہلے یہ طے کرلو کہ بادشاہ کو قتل کیسے کرو گے؟"

"اس میں کیا مشکل ہے، میں اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کردوں گا۔"

ایک امیر نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ اس کی مجلس شراب میں شریک ہونے والوں میں سے ہوں۔ کسی دن موقع دیکھ کر اس کے جام میں زہر ملا سکتا ہوں۔"

غرض قتل کی مختلف تجاویز دیر تک محفل میں گونجتی رہیں۔

ایک امیر جو اس محفل ناؤنوش میں شریک تھا بلکہ خود بھی اول فول بکتا رہا تھا۔ گھر پہنچا اور نشہ اترا۔ گزری رات کی باتیں یاد آئیں تو ندامت نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ وہ بادشاہ جو ہم پر اتنا مہربان ہے، اس کے بارے میں اس کے امرا کے یہ خیالات ہیں؟ اگر وہ ان پر عمل کر بیٹھے تو ملک میں کیسے خون خرابے کا بازار گرم ہوگا۔ اس کے بعد بھی گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے یا نہیں۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ بادشاہ سے ملاقات کے لیے لباس تبدیل کیا۔

بادشاہ ان دنوں غیاث الدین بلبن کے بنوائے ہوئے خاص محل "کوشک لعل" میں مقیم تھا۔ اس کا زنان خانہ یہیں تھا۔ وہ یہاں کسی سے ملاقات نہیں کرتا تھا اور ان دنوں تو اس نے ایک ہندو لڑکی پدما دیوی سے نئی نئی شادی کی تھی اور زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی کے پاس تھا کہ اسے ملک قرابیگ کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ یہ اطلاع ایک خاص کنیز لے کر آئی تھی جو دروازے پر پہرا دے رہی تھی۔

"تم نے انہیں بتایا نہیں کہ ہم اس وقت آرام کر رہے ہیں؟" جلال الدین نے پدما دیوی کے پہلو سے اٹھتے ہوئے کہا، جو اب پدما بیگم کہلانے لگی تھی۔

"میں نے بتادیا تھا لیکن محل کے بڑے دروازے کا پہرے دار طغرل بیگ کہہ رہا تھا کہ قرابیگ کوئی معمولی امیر نہیں۔"

"جاؤ، ایک مرتبہ پھر کہلوا دو کہ ہم اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔"

جلال الدین نے ملنے سے انکار کردیا تھا لیکن جانے کے لیے تیار بھی ہونے لگا تھا جیسے اسے یقین ہوگیا ہو کہ قرابیگ اس سے ملے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

"آپ نے ان امیروں کو بہت منہ چڑھا لیا ہے۔" پدما بیگم نے اس کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی میری پیاس بجھی بھی نہیں اور آپ جانے کے لیے تیار بھی ہوگئے۔"

"کوئی خاص بات ہے ورنہ قرابیگ یہاں کبھی نہ آتا۔ اگر اس نے ملاقات پر اصرار کیا تو اس سے مل کر فوراً لوٹ آؤں گا۔"

"آپ تو بس۔ میں تو کہتی ہوں آپ راج پاٹ کسی کے حوالے کردیں اور ہر وقت میرے پاس بیٹھے رہا کریں۔"

"میں تو خود یہی سوچنے لگا ہوں کہ اب یہی کرنا پڑے گا یا پھر طغرل بیگ کو یہاں سے ہٹانا پڑے گا۔ ہر ایک کا

پیغام اندر بھیج دیتا ہے۔"

"وہ بے چارہ تو بڑا وفادار ہے۔ اسے جگہ سے بے جگہ کیوں کرتے ہیں۔"

اتنی دیر میں وہی کنیز پھر اندر آئی۔ "ملک قرابیگ فرماتے ہیں کہ سلطنت سے متعلق کوئی اہم بات انہیں آپ تک پہنچانی ہے اس لیے ملاقات ضروری ہے۔"

"انہیں دیوان خانے میں بٹھاؤ، ہم آتے ہیں۔"

کنیز چلی گئی اور جلال الدین نے پدما بیگم کو آغوش میں بھر لیا۔ "بس ہم یوں گئے اور یوں آئے۔"

ملک قرابیگ دیوان خانے کے فرش پر پڑے دبیز قالین پر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ جلال الدین جیسے ہی اندر داخل ہوا وہ آداب بجا لایا اور اس انتظار میں کھڑا رہا کہ بادشاہ بیٹھے تو وہ بھی بیٹھنے کی جسارت کرے۔

"قرابیگ، کہو کیسے آنا ہوا جبکہ تمہیں معلوم بھی تھا کہ ہم "کوشک لعل" میں کسی سے ملاقات نہیں کرتے۔"

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن بات کچھ ایسی تھی کہ میں رات بھر سو نہیں سکا۔"

"صبح آنکھ لگ گئی ہوگی جو دن چڑھے کھلی ہے۔"

"نہیں حضور ایسی بات نہیں۔ جاگ تو میں صبح ہی گیا تھا۔ میں نے تو حضور کے آرام کی خاطر دن چڑھنے دیا۔"

"اب خوشامد چھوڑو، یہ بتاؤ بات کیا ہے؟"

"حضور تشریف فرما ہوں تو عرض کروں۔"

"ارے، یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے کہ قرابیگ ابھی تک کھڑے ہیں۔" جلال الدین نے مزاحاً کہا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ سامنے کا تخت ملک قرابیگ نے سنبھال لیا۔

"شاید حضور کے علم میں ہو کل شب ملک تاج الدین کوچی کی قیام گاہ پر بادہ نوشی کی ایک محفل برپا ہوئی تھی۔"

"یہ کون سی نئی بات ہے۔ ہمارے امرا کو اب شراب نوشی کے سوا کام ہی کیا رہ گیا ہے۔"

"حضور، ایسی محفلیں نئی بات نہیں لیکن وہاں جو باتیں میں سن کر آرہا ہوں وہ نئی بھی ہیں اور باعث تشویش بھی اور اس لائق بھی کہ آپ تک پہنچیں اور آپ کوئی تدارک فرماسکیں۔"

"کہیے کیا بات ہے؟"

"آپ کو معزول کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں بلکہ میرے منہ میں خاک، آپ کو قتل کرنے کی ترکیبیں بیان ہو رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا تلوار ٹھیک رہے گی، کسی کا خیال تھا بادہ نوشی کے وقت شراب میں زہر دے دیا جائے۔ میں نے تمام باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں۔"

"ملک قرابیگ، مجھے تیری باتیں سن کر پریشانی تو قطعی نہیں ہوئی لیکن دکھ ضرور ہوا کہ میرے وہ امرا جنہیں میں نے جاگیریں بخشیں وہی میری جان کے درپے ہیں۔ کیا تو مجھے بتا سکتا ہے کہ وہاں کون کون تھا؟"

ملک قرابیگ نے ایک ایک کرکے سب کے نام گنوا دیے۔

بادشاہ اس محل سے اٹھ کر دوسرے محل میں گیا جہاں وہ دربار کیا کرتا تھا۔ قرابیگ کو رخصت کردیا اور اس سے کہا، وہ بھی اس وقت آئے جب میں دوسروں کو بلاؤں تاکہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ وہاں کی باتیں تو نے مجھے بتائی ہیں۔"

اس نے تمام امیروں کو ایک ساتھ طلب کرلیا۔

جب سب آچکے تو اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر سامنے رکھ دی۔

"اس وقت میری تلوار مجھ سے جدا ہے۔ میں نہتا ہوں۔ یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ تلوار کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا بھی نہیں۔ اب میں تم سے کہتا ہوں۔ تم میں سے جس کو بھی اپنی بہادری پر ناز ہے اٹھے اور میری ہی تلوار سے میری گردن اڑا دے۔ خاص طور پر وہ جس نے کل رات یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنی تلوار سے میرے دو ٹکڑے کردے گا۔"

سب امیروں کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ بادشاہ کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ رات جو باتیں ہوئی تھیں وہ کسی نے بادشاہ تک پہنچا دی ہیں۔ ان سب کو اپنا انجام بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔

بادشاہ نے ایک مرتبہ پھر انہیں للکارا۔

"میرے قتل کے بغیر مجھے معزول کیسے کرو گے۔ تلوار اٹھاؤ اور مجھے قتل کرو۔ شاید نیا آنے والا بادشاہ اس سے زیادہ جاگیریں تمہیں بخش دے جو میں نے تمہیں دی ہیں۔ تم کہو تو یہ تلوار میں خود اپنے گلے پر پھیر لوں کیونکہ بہادری کا کوئی کارنامہ تم سے سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔"

جب کوئی کچھ نہ بولا اور بادشاہ اپنے دل کی بھڑاس خوب اچھی طرح نکال چکا تو وزیر الممالک ملک نصرت اپنی جگہ پر کھڑا ہوا۔ رات کی محفل میں وہ بھی شریک تھا اور سب سے زیادہ بکواس اسی نے کی تھی۔

"حضور کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ شرابی، شراب کے نشے میں ہرزہ سرائی کیا ہی کرتے ہیں۔ ہم نے بھی کچھ زیادہ پی لی ہوگی مگر اس وقت تو ہوش میں ہیں۔ اس وقت تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم آپ جیسے آقا کو جس نے ہمیں اپنے بیٹوں کی طرح پالا ہے، کوئی گزند پہنچائیں گے تو پھر ایسا شفیق

مالک ہمیں کہاں سے ملے گا۔ یہی حال ہمارا ہے۔ اگر حضور ہم جیسے نمک خوار بیٹوں کو سزا دیں گے تو پھر ہم جیسے جاں نثار بھی آپ کو نہیں ملیں گے۔''

بادشاہ ان باتوں سے مطمئن تو خیر کیا ہوتا لیکن درگزر کرنا اس کا شیوہ تھا اور اسی لیے اس کا خوف جاتا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ان گستاخیوں سے صرفِ نظر کیا۔

''میری جگہ اگر کوئی اور بادشاہ ہوتا تو تمہیں قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا لیکن میں اس بڑھاپے میں غصے اور ظلم سے کنارہ کشی اختیار کر چکا ہوں اور پھر تم سے مجھے کوئی خطرہ بھی نہیں۔ میں تم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں کہ تمہیں شراب نوشی اور عیش کوشی سے بالکل فرصت نہیں کہ دوسرا کوئی کام کر سکو۔ شمشیر زنی تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تم لوگوں کو معاف کرتا ہوں۔''

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر ''کوشک لعل'' میں پدما بیگم کو فکر ہونے لگی تھی کہ ایسی کیا بات ہو گئی جو بادشاہ دیوان خانے میں گیا اور پھر اس سے ملے بغیر ہی دربار میں چلا گیا۔ اس نے حقیقت جاننے کے لیے طغرل بیگ کو بلا بھیجا۔ کنیز سے کہا کہ وہ بادشاہ تک کوئی اہم پیغام پہنچانا چاہتی ہے لہٰذا طغرل بیگ کو یہاں بھیج دے اور نظر رکھے۔ اگر بادشاہ آتا ہے تو اسے اطلاع دے۔

طغرل بیگ ایک ترک نوجوان تھا۔ نہایت خوبصورت تھا۔ کوشک لعل کی حفاظت کے لیے جو دستہ متعین کیا گیا تھا یہ شخص اس کا نگراں تھا۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے پدما بیگم کی نظروں میں آ گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔ بادشاہ کی بیوی ہوتے ہوئے اسے یہ حرکت زیب نہیں دیتی تھی لیکن وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس سے یہ امید کی بھی جا سکتی تھی۔ وہ کسی اعلیٰ راجپوت خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی کہ اپنی عزت کے لیے جان پر کھیل جاتی۔ وہ تو ایک ناچنے والی کی بیٹی تھی۔ معزالدین کیقباد کی عیش و نشاط کی محفلوں میں اپنی ماں کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ کیقباد کے قتل کے بعد بہت سی عورتوں کو جلال الدین اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ انہی میں پدما بیگم بھی تھی جس نے اسے کنیز نہیں رہنے دیا بلکہ بیوی بنا لیا تھا۔ اس نے اپنی اصلیت اس طرح ظاہر کی تھی کہ طغرل بیگ سے راہ و رسم بڑھا لی تھی۔ ابھی اس تعلق کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اس لیے چرچے بھی زیادہ نہیں تھے۔ چند لونڈیوں کو شک تھا مگر وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔

طغرل بیگ خواب گاہ میں آیا تو پدما بیگم سولہ سنگار کیے اس کی منتظر تھی لیکن طغرل بیگ اس وقت عام دنوں سے زیادہ محتاط تھا۔ پدما بیگم جب بھی اس کے سامنے آتی، اس کے ہاتھ گستاخیاں کرنے لگتے تھے لیکن اس وقت وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے طغرل۔ تم مجھ سے بے زار ہو گئے ہو یا تمہیں کوئی خطرہ ہے؟''

''تم سے بے زاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن خطرے تو ہر طرف ہیں۔''

''اس سے پہلے تو تم نے کسی خطرے کا اظہار نہیں کیا۔''

''بعض امرا میرے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو تشویش سے دیکھ رہے ہیں۔ ملک نصرت میرا سخت دشمن بنا ہوا ہے۔ بادشاہ کے بھتیجے علاؤالدین کو تو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔''

''وہ اپنی جاگیر پر ہے۔ یہاں کہاں سے آ گیا۔''

''میں نے سنا ہے وہ ابھی ابھی دہلی پہنچا ہے۔ اسی لیے میں اتنا خوف زدہ ہوں۔ کیا خبر بادشاہ سے کیا کچھ کہہ دے۔''

''اچھا یہ بتا، بادشاہ کو ایسی کیا جلدی تھی کہ مجھے بتائے بغیر چلے گئے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''سنا ہے بادشاہ کی معزولی کی کوئی سازش پکڑی گئی ہے۔ بادشاہ سلامت اسی کی تحقیق کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ کوئی اور بادشاہ بن کر بیٹھ جائے گا اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔''

''تم فکر کیوں کرتی ہو میری رانی۔ موقع دیکھ کر یہ بھی کر گزروں گا۔''

''بادشاہ کی بڑی بیوی ملکہ جہاں سے میں نے ربط ضبط پیدا کر لیا ہے۔ علاؤالدین کا تو میں ایسا پتا صاف کراؤں گی کہ یاد رکھے گا۔''

''اچھا اب میں چلتا ہوں، حالات کوئی رخ اختیار کرنے والے ہیں۔ میں پوری نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

●●●

ارکلی خاں کے مخبر سیدی مولہ کی خانقاہ میں پھیل چکے تھے لیکن انہیں کوئی ایسی بات نہیں مل رہی تھی جس سے سیدی مولہ پر جرم ثابت ہو سکے جبکہ ارکلی خاں سیدی مولہ کو سزا دینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسے یہ یقین بھی تھا کہ سیدی مولہ ضرور بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے اور ایسے لوگ تیار کر رہا ہے جو اس کی مدد کر سکیں۔ آدمی ہوشیار ہے اس لیے سارے کام اتنی رازداری سے کر رہا ہے کہ مخبروں کو بھی ہوا نہیں لگنے دے رہا ہے۔

ارکلی خاں کئی دن برابر غور کرتا رہا اور پھر یہ طے کیا کہ سیدی مولہ کو شیشے میں اتارنا اور کسی جرم پر آمادہ کرنا معمولی مخبروں کا کام نہیں۔ اس کے لیے قابلِ ذکر ہستیوں کو خانقاہ میں بھیجنا ہوگا۔

دربار میں ابھی تک ایسے امرا موجود تھے جو بلبنی عہد کی یادگار تھے، عہدِ بلبن کے بادشاہ معزالدین کیقباد کے منظورِ نظر تھے اور اب خلجی دربار میں بھی موجود تھے۔ ارکلی خاں نے ایک خاص منصوبے کے تحت ان سب کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کر دیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ ان پر ایسی معاشی پابندیاں عائد کیں کہ یہ معززین کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ ان سب نے سیدی مولہ کی خانقاہ کا رخ کیا۔ ان کو یہاں کھانے کو بھی ملنے لگا اور خرچ کے لیے اشرفیاں بھی اور ایک ایسی بزرگ ہستی کا سہارا بھی جس سے وہ بادشاہ کی شکایتیں کر سکتے تھے۔

یہ عام دستور بن گیا کہ جس کسی کو بادشاہ سے شکایت ہوتی وہ سیدی مولہ کے پاس پہنچ جاتا۔

جب ان معززین کی ایک بڑی تعداد خانقاہ میں جمع ہو گئی تو شہر کی سب سے معزز ہستی قاضی جلال الدین کاشانی کو ارکلی خاں نے اپنے پاس بلایا۔ ارکلی خاں کے لیے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جسے تنہائی میں اپنے پاس بلاتا ہے اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب بھی ڈرتے ڈرتے اس کی خدمت میں پیش ہوئے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ ارکلی خاں ان کی راہ میں آنکھیں بچھا رہا ہے۔

''قاضی صاحب، میں نے آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ خلجیوں کی سلطنت اب آپ ہی بچا سکتے ہیں۔''

''یہ خاکسار تو آپ کا نمک خوار ہے۔ فرمائیے یہ غلام کیا کر سکتا ہے اور ایسا کیا خطرہ درپیش ہے؟''

''میرے مخبروں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ سیدی مولہ نے ایک بڑا گروہ تیار کر لیا ہے اور وہ بادشاہت پر قبضہ کرنے کے خواہاں ہیں لیکن وہ اتنے بااثر ہیں کہ میں ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان سے دوستی پیدا کریں اور انہیں بادشاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ آپ پر اعتماد کر کے وہ دل کا راز اگل دیں گے۔ آپ کی گواہی ہوگی تو مجھے ان کے خلاف کارروائی میں آسانی ہوگی۔''

''ان کا اعتماد خریدنے کے لیے مجھے بادشاہ کی برائی کرنی ہوگی۔'' قاضی نے کہا۔

''آپ پر کوئی آنچ آئی تو میں سینہ سپر ہو جاؤں گا۔''

قاضی کاشانی نے ہامی بھر لی۔ وہ اتنی معزز اور بااثر شخصیت تھے کہ دھڑلے سے سیدی مولہ کی خانقاہ پہنچ گئے۔ اس خانقاہ کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے تھے۔

ایک مرید نے سیدی مولہ کو اطلاع دی کہ قاضی جلال الدین کاشانی تشریف لائے ہیں۔

''یہ کون ہے اور کیسا شخص ہے؟''

''یہ شہر دہلی کی اہم ترین شخصیت ہیں۔ نہایت دلیر اور بے باک ہیں۔ یقیناً بادشاہ سے کوئی شکایت ہوئی ہوگی ورنہ وہ یہاں نہ آتے۔''

''اب تو یہ زیادتیاں اتنی عام ہو گئی ہیں کہ میری خانقاہ بھی شاید چھوٹی پڑ جائے۔ بہرحال انہیں آنے دو۔''

قاضی صاحب اندر آئے تو معززین کی بڑی تعداد انہیں گھیرے بیٹھی تھی۔ ان میں دو کوتوال برنجن اور تہائی پہلوان بھی تھے۔ انہوں نے قاضی کو دیکھا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ ''قاضی صاحب آپ بھی!''

''ہاں بھائی، میری صاف گوئی بادشاہ کی خوشامدی طبیعت کو کیسے پسند آ سکتی ہے۔''

''اب تو بس حد ہو گئی۔'' تہائی پہلوان نے کہا۔ ''اب وقت آ گیا ہے کہ دین و دنیا کی باگ ڈور سیدی مولہ کے ہاتھ میں دے دی جائے۔''

''میں آپ لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ میرے مرشد بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے مجھے امرا سے تعلق رکھنے کو منع فرمایا تھا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ دنیا مجھے اپنے شکنجے میں لیتی جا رہی ہے۔ دیکھو کیا انجام ہوتا ہے۔''

''کیا خلقِ خدا کو قتل و خوں سے نجات دلانا خدمتِ دینی نہیں۔ اگر ہے تو اس بادشاہ سے نجات دلائیے، ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے۔''

سیدی مولہ نے سکوت اختیار کیا۔

یہ تو پہلی ملاقات تھی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ سیدی مولہ نہ کرتے ہوں لیکن اس خانقاہ میں ایسی باتیں ہو ضرور رہی ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے سیدی مولہ بہت گہرے ہوں۔ خود بے دلی کا مظاہرہ کر کے دوسروں سے کام لینے کے خواہاں ہوں۔ ان کے دل کی بات زبان پر لانے کے لیے کچھ وقت تو درکار ہوگا۔

انہوں نے سیدی مولہ سے اس حد تک مراسم پیدا کیے کہ وہ ان کی خانقاہ میں تین تین چار چار روز تک مہمان رہنے لگے اور تنہائی میں سیدی مولہ کو ترغیب دیتے رہے۔

ایک روز قاضی نے کہا۔ ''خداوند تعالیٰ نے آپ کو دستِ غیب عطا کیا ہے۔ آپ کا دل ایسا بنایا ہے کہ خدا کے

بندوں سے رحم اور مہربانی سے پیش آئیں۔ اس مہربانی کا تقاضا ہے کہ حکومت کو جو خدا کی نیابت ہے، ظالموں کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے قبضے میں کریں اور اہلِ دنیا کو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ اگر آپ اس عظیم الشان عہدے کو حاصل کرنے سے کنارہ کشی کریں گے تو پھر کل قیامت کے روز آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔"

قاضی جلال الدین اسی قسم کی باتیں کیا کرتا تھا اور جب موقع ملتا ارکلی خاں تک اپنی کارگزاری بھی پہنچا دیا کرتا تھا۔ باتوں باتوں میں یہ شرط بھی منوالی تھی کہ اسے بدایوں کا قاضی بنا کر بھیج دیا جائے گا۔

جب قاضی کی جانب سے ترغیب کے جال پھیلتے چلے گئے تو سیدی مولہ کے دل میں بھی بشری تقاضوں نے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ ان کے انکار میں اب وہ طاقت نہیں رہی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ اب قاضی اور ان کے مریدین بغاوت کے منصوبے بناتے رہتے اور سیدی مولہ سنتے رہتے۔ کبھی کبھی دبے لفظوں میں کہہ بھی دیتے۔

"دین اور دنیا کی باگ ڈور ایک ہی ہاتھ میں ہو۔ یہ اچھا تو ہے لیکن اس زمانے میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں بادشاہ سے بغاوت کے حق میں نہیں۔ نہ جانے اس کا انجام کیا ہو۔"

مریدین زیادہ زور دیتے تو وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے۔ "تم لوگ جو چاہو، میں تو اب بھی تیار نہیں۔"

مریدین کہتے۔ "جو کچھ کرنا ہے ہمیں کرنا ہے۔ آپ کو تو بس تختِ شاہی سنبھالنا ہوگا۔ ہندوستان کی سرزمین پر کیسا روح پرور انقلاب ہوگا جب ایک درویش، اس ملک کا بادشاہ ہوگا۔ ہر شخص خوش حال اور دیندار ہوگا۔"

سیدی مولہ پوری طرح اپنے مریدوں کی مٹھی میں آ چکے تھے۔ اب ان کا کمزور سا انکار بھی کسی کو سننے کو نہیں ملتا تھا۔

جب سازش پوری طرح تیار ہوگئی تو ضروری سمجھا گیا کہ اس منصوبے کو خانقاہ میں موجود تمام لوگوں تک پہنچا دیا جائے۔ اس روز خلافِ معمول خانقاہ کے دروازے بند کر دیے گئے۔ جو لوگ اندر تھے بس وہی تھے۔ سیدی مولہ کو حجرے میں رہنے دیا گیا تھا کیونکہ قاضی کو شک تھا کہ کہیں حاضرین کے سامنے سیدی مولہ اس منصوبے سے انکار نہ کر دیں۔

اس وسیع و عریض عمارت میں اس وقت ہزاروں لوگ موجود تھے۔

جب سب لوگ آ گئے تو نتھائی پہلوان نے تقریر کرنی شروع کی۔

"ہم جو کچھ کہیں گے اس میں ہمیں سیدی مولہ کی پوری طرح تائید حاصل ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ملک میں فسق و فجور بڑھ چکا ہے۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں۔ جلال الدین بادشاہ ان جرائم کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ وہ خود دین سے دور ہے اور اس کے امرا اس کے پیروکار ہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ دہلی کی سلطنت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جو متقی اور پرہیزگار ہو۔ یہ شخصیت ہمارے آقا سیدی مولہ کی ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ کل جب جمعہ کی نماز کے لیے بادشاہ کی سواری گزرے تو اسے راستے میں روک لیا جائے۔ آپ اسے گھیر لیں گے اور میں آگے بڑھ کر اسے قتل کر دوں گا۔ تمام مرید اسی وقت آقائی سیدی مولہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ شاہی فوج خانقاہ کے دروازے پر آ گئی۔ غالباً قاضی جلال الدین تک یہ خبر پہنچا دی گئی تھی۔ اسی نے آگے بڑھ کر خانقاہ کا دروازہ کھولا۔

نتھائی پہلوان کے منہ سے ایک مرتبہ پھر نکلا۔ "قاضی صاحب آپ بھی۔"

یہی جملہ اس کی زبان سے اس وقت بھی ادا ہوا تھا جب قاضی جلال الدین اس خانقاہ میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت اس جملے کا مفہوم یہ تھا کہ قاضی صاحب، آپ بھی بادشاہ کے ستائے ہوئے ہیں۔ اس وقت اس کا مفہوم یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ قاضی صاحب، آپ بھی مخبروں میں شامل ہیں۔

شاہی فوج نے اندر آتے ہی برنجن، نتھائی پہلوان اور سیدی مولہ کو گرفتار کر لیا۔ حاضرین میں سے بھی بہت سے پکڑے گئے اور باقی پچھلے دروازے سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

بادشاہ کو ان سب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

بادشاہ کے حضور صرف تین افراد کو پیش کیا گیا۔ وہ بھی ایک ایک کر کے۔ سب سے پہلے سیدی مولہ کو جلال الدین کے روبرو پیش کیا گیا۔

جلال الدین اس وقت بہادر پور کے نزدیک ایک میدان میں خیمہ ڈالے ہوئے تھا۔

"کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار سے قتل ہوتا ہے۔" جلال الدین نے سیدی مولہ سے کہا۔

"آپ کو بالکل ٹھیک یاد ہے۔ یہ میں نے ہی کہا تھا۔"

"اور اب آپ مجھے اپنے مریدوں کے ہاتھوں قتل کرا کے اپنے اس قول کو درست کرانا چاہتے تھے۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ جو کچھ آپ نے معز الدین کیقباد کے ساتھ کیا وہی آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں اب بھی اپنے قول پر قائم ہوں۔"

"تو کیا آپ نے میرے خلاف سازش تیار نہیں کی؟"

"میں نے سلطان کے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔ نہ میں اس میں شریک ہوا۔"

"آپ کی خانقاہ میں میرے خلاف باتیں ہوئیں اور آپ خاموش رہے۔"

"میری خانقاہ میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔"

"کیا آپ نے یہ بھی نہیں کہا کہ دین و دنیا کی باگ ڈور ایک ہاتھ میں ہونی چاہیے۔"

"مملکتِ اسلامیہ کے لیے یہ ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مملکت کی باگ ڈور میں اپنے ہاتھ میں لے لوں۔"

"آپ کے ساتھیوں نے جرم قبول کر لیا ہے اور وہ اس میں آپ کو شریک کہتے ہیں۔"

"اگر آپ سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہیں تو میرا خونِ ناحق اپنی گردن پر لے لیں۔"

بادشاہ نے سیدی مولہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کہا تھا کہ "آپ کے ساتھیوں نے جرم قبول کر لیا ہے۔" ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ابھی کسی سے باز پرس ہوئی ہی نہیں تھی۔

سیدی مولہ نے جرم کی صحت سے انکار کیا۔

اس کے بعد برنجن کوتوال اور نتھائی پہلوان کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

"تم دونوں تو انکار نہیں کرو گے کیونکہ تم نے ہی میرے قتل کا ذمہ لیا تھا۔"

ان دونوں نے بھی اسے سراسر بہتان اور الزام قرار دیا۔

بادشاہ ان کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوا۔ ارکلی خاں بادشاہ کے پہلو میں کھڑا تھا اور بار بار جھک کر سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس نے کچھ کہا اور بادشاہ نے حکم صادر کر دیا۔

"بہادر پور کے جنگل میں ایک بڑی آگ روشن کی جائے۔ سیدی مولہ اور اس کے دونوں مریدین خاص برنجن اور نتھائی پہلوان اس آگ پر سے ننگے پاؤں گزریں تاکہ معلوم ہو سکے وہ سچے ہیں یا جھوٹے۔"

وہ علما جو بادشاہ اپنے ساتھ دہلی سے لایا تھا اس وقت موجود تھے۔ ان میں سے ایک جو قاضی کاشانی کے راز سے واقف نہیں تھا اور کچھ اختلاف بھی رکھتا تھا، دیکھ رہا تھا کہ قاضی کو اس معاملے سے دور رکھا جا رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بادشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

"قاضی صاحب بھی اس معاملے میں شریک ہیں۔ انہیں اس عدالت میں کیوں پیش نہیں کیا گیا تاکہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچتے۔"

ہر طرف سکوت چھا گیا۔ بادشاہ کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس صورتِ حال کو ارکلی خاں نے سنبھالا۔ وہ سامنے آیا اور علما سے مخاطب ہوا۔

"قاضی صاحب کا معاملہ دوسرا ہے۔ چھان بین کر لی گئی ہے۔ وہ عقیدت کے طور پر سیدی مولہ کے پاس جاتے تھے، کسی سازش میں شریک نہیں رہے۔ اس کے باوجود محض تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں خارج البلد کر دیا گیا ہے۔ انہیں بدایوں کا قاضی مقرر کر کے دہلی سے نکالا جا رہا ہے۔ وہ اب تک بدایوں روانہ ہو چکے ہوں گے۔"

شاہی حکم کی تعمیل کی گئی۔ آگ روشن کر دی گئی۔

جلال الدین اپنے مصاحبوں اور لشکر کے سرداروں کے ساتھ آگ کے قریب ایک خیمے میں ٹھہر گیا۔

سیدی مولہ قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے الاؤ کے طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے دونوں ساتھی ان کے پیچھے تھے۔ خوف نام کی کوئی چیز ان کے چہروں پر بھی نہیں تھی۔

بادشاہ ان کی دلیری کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ لوگ سچائی پر ہوں۔ اس نے چند علما کو اپنے پاس بلایا۔

"آپ لوگ کیا کہتے ہیں۔ میرا یہ فیصلہ درست ہے کہ انہیں آگ پر سے گزارا جائے۔"

علما نے بالاتفاق عرض کیا۔ "جلانا آگ کی فطرت میں ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ جھوٹا ہو یا سچا آگ اسے جلا دے گی۔ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ آگ کے ذریعے کرنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔ اگر یہ تینوں آگ میں جل مرے تو یہ کبھی ظاہر نہیں ہو سکے گا کہ یہ سچے تھے یا جھوٹے لہٰذا بادشاہ انہیں معاف کر دے یا ان کے خلاف ثبوت فراہم کرے۔"

بادشاہ یہ سن کر سخت خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے فوراً آگ بجھانے کا حکم دے دیا۔

تینوں ملزمان کو دہلی لایا گیا۔

قاضی جلال کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کر کے دہلی سے روانہ کر دیا گیا اور دیگر بلبنی امرا کو خارج البلد کر دیا۔

ارکلی خاں ننگی تلوار ہاتھ میں لیے برنجن کوتوالی اور تہائی پہلوان کے سروں پر پہنچ گیا۔

"تم لوگ اپنا جرم قبول کر لو۔ اچھا ہے سچ بول کر موت کو قبول کرو ورنہ گردن تو یوں بھی اترنی ہے۔ اب تمہارے سیدی مولہ تمہیں بچا نہیں سکیں گے۔"

ان دونوں نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ مرنے سے پہلے سچ بول دیں۔ انہیں یقین تھا کہ ارکلی خاں کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ یوں بھی انہیں قتل کر ہی دے گا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے، ہمیں موقع نہیں ملا ورنہ ہم بادشاہ کا سر اس کے جسم پر نہیں رہنے دیتے۔ اسلام کی سربلندی کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنے سے دریغ نہ ہوتا۔"

"کیا تم یہ بات علمائے وقت کے سامنے کہنے کی جرأت رکھتے ہو؟"

"جب ہم نے اپنے خدا کے سامنے رکھ دیا تو علمائے وقت کیا چیز ہیں۔ جو کام ان کے کرنے کا تھا ہم تو وہ کرنے چلے تھے۔"

ان دونوں کو علما کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے یہی بات علما کے سامنے بھی کہی۔ ارکلی خاں نے ان دونوں کو جلادوں کے حوالے کر دیا۔

جلال الدین، سیدی مولہ کو اپنے ہمراہ لے کر کوشک محل کی طرف لوٹا۔ وہ خود تو کوشک میں قیام پذیر ہوا اور سیدی مولہ کو اس کے پاس ہاتھ باندھے کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔

جلال الدین نے ایک مرتبہ پھر سیدی مولہ سے کچھ سوالات کیے۔ سیدی مولہ نے ان سوالات کے جوابات بھی جرأت مندی اور دلیری سے دیے۔

کوئی بات ثابت نہ ہو سکی لیکن بادشاہ کے نزدیک سید صاحب کا وجود خطرے کا باعث تھا۔ حالات سے ثابت ہو رہا تھا کہ کوئی سازش ہوئی ضرور تھی۔ ارکلی خاں بھی بادشاہ کو برابر اکسا رہا تھا۔ اس نے شیخ ابوبکر طوسی حیدری کو اور دیگر درویشوں کو، کوشک کے قریب بلایا اور ان سے مخاطب ہوا۔

"اس درویش سیدی مولہ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میرے دشمنوں کو پناہ دی۔ میرے ملک میں فساد اور بدامنی پھیلانے کی کوشش کی۔ میں انصاف تم لوگوں کے ہاتھ میں دیتا ہوں، تم جو مناسب سمجھو فیصلہ کرو۔"

بس یہ سننا تھا کہ بحری نام کے ایک درویش نے جس پر بادشاہ کے احسانات تھے، حق نمک ادا کیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور سیدی مولہ پر جھپٹا۔ ایک استرا اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس استرے سے سیدی مولہ کے جسم پر کئی گھاؤ لگائے۔

سیدی مولہ نے گرتے گرتے کہا۔ "یہ استرا میری گردن پر نہیں لگا، جلال الدین خلجی کے حلق میں پیوست ہوا ہے۔ میرا لہو ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ اس کا وبال بادشاہ اور اس کی اولاد پر ضرور پڑے گا۔"

جلال الدین یہ فقرہ سن کر کانپ اٹھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا کہ درویش کو مزید وار کرنے سے روکے۔ ارکلی خاں نے سلطان کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے کوشک کے اوپر ہی سے فیل بان کو اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی فیل بان نے اپنے مست ہاتھی کو چھوڑ دیا۔

دیو پیکر ہاتھی نے دیکھتے ہی دیکھتے سیدی مولہ کو کچل کر رکھ دیا۔

اس وقت سیدی مولہ کو حضرت فریدالدین گنج شکر کی نصیحت ضرور یاد آئی ہوگی۔ انہوں نے فرمایا تھا۔ "امیروں اور حاکموں سے تعلق مت رکھنا اور یہ جو دست غیب تجھے حاصل ہے اس کا برملا اظہار مت کرنا۔ تجھے نہیں معلوم اس دست غیب سے کتنی آزمائشیں وابستہ ہیں۔ ان کا نزول کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے۔"

یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ خود بادشاہ حیرت زدہ رہ گیا۔ "ارکلی خاں، تو نے یہ کیا کیا؟"

"اس قصے کو ختم ہونا تھا۔ میں نے ختم کر دیا۔ اب شہر دہلی میں کوئی سیدی مولہ نہیں رہا جو آپ کے دشمنوں کو آپ کے خلاف بھڑکا سکے۔"

پدما بیگم اس وقت سلطان کی بڑی بیگم ملکہ جہاں کے پاس بیٹھی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ بادشاہ کا بھتیجا علاؤالدین کچھ دن پہلے دہلی آیا تھا اور بادشاہ کو سیدی مولہ کے خلاف بھڑکا کر گیا تھا۔ یہ سب اسی کی کارستانی ہے جو اس درویش کا خون بہایا گیا ہے۔

اس اطلاع میں کوئی صداقت نہیں تھی لیکن پدما بیگم تہیہ کر چکی تھی کہ ملکہ بیگم کو علاؤالدین کے خلاف کرتی رہے گی۔

ابھی یہ دونوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ محل میں اندھیرا چھا گیا حالانکہ ابھی دن تھا۔

"یہ کیسا اندھیر ہے۔ کیا قیامت آ گئی؟" ملکہ جہاں زور زور سے چلا رہی تھی۔

"یہ موئے فقیر سیدی مولہ کی بددعا تو نہیں۔" پدما بیگم نے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

کنیزیں، لونڈیاں آپس میں ٹکراتی پھر رہی تھیں۔

بڑی مشکل سے چراغ جلے۔ کمرے سے باہر نکلیں تو سخت آندھی چل رہی تھی اور آسمان ایسا سیاہ ہو گیا تھا جیسے رات ہو گئی ہو۔ چاند ستاروں کے بغیر رات۔

یہ سیاہ آندھی صرف محل تک محدود نہیں تھی بلکہ پورا شہر تاریک ہو گیا تھا۔ ایسی مہیب تاریکی تھی کہ لوگ ایک دوسرے کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی اندھیرے میں، سیدی مولہ کے بعض مرید، ان کی لاش اٹھا کر لے گئے اور خانقاہ کے اس حجرے میں دفن کر دی جہاں آپ قیام کیا کرتے تھے۔ دن بھر کی تاریکی کے بعد آندھی نے ہاتھ کھینچا تو سیدی مولہ کی لاش غائب تھی۔ پہلے تو اسے سیدی مولہ کی کرامت سمجھا گیا لیکن جب معلوم ہوا کہ مریدوں نے انہیں ان کے حجرے میں دفن کر دیا ہے تو مردے کو قبر سے نکال کر کہیں اور دفن کرنا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ ارکلی خاں اس پر بھی بضد تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس آندھی کے بعد دہلی میں ایک زبردست قحط پڑا تھا۔ اس قحط کی مشکلات کی تاب نہ لا کر ہندوؤں کا ایک بڑا گروہ دریائے جمنا میں غرق ہو گیا۔

سیدی مولہ کے قتل کے بعد ہی جلال الدین کے زوال کے آثار شروع ہو گئے۔ ہر روز طرح طرح کے واقعات پیش آنے لگے یا پھر یہ تھا کہ دل میں ایسا ڈر بیٹھ گیا تھا کہ جو واقعہ بھی پیش آتا اسے سیدی مولہ کے قتل سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔

سب سے بڑا حادثہ جو وقوع پذیر ہوا وہ خود جلال الدین کے بڑے بیٹے کی وفات تھی۔ اختیارالدین خانِ خاناں نہایت سعادت مند شہزادہ تھا۔ حکمرانی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔ سیدی مولہ کا نہایت عقیدت مند تھا۔ ان کے قتل کی خبر سنتے ہی بیمار پڑ گیا۔ اسے کوٹھری سے نکالا گیا تو وہ بے ہوش تھا۔ تجربہ کار طبیبوں نے پوری توجہ سے علاج کیا۔ ولی عہد سلطنت تھا۔ کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ شہزادے نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ ایسا صدمہ تھا جس نے جلال الدین کو تمام زندگی خون کے آنسو رلایا۔ جلال الدین کے دل پر جو بھی گزری ہو لیکن ارکلی خاں کے دل کی مراد بر آئی۔

سیدی مولہ کا قتلِ ناحق سلطان جلال الدین کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے سوچا اس موقعے پر کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا جائے جو اسے مجاہد سے مجاہد اسلام بنا دے۔ سیدی مولہ کے قتل کا داغ دھل جائے۔ کم از کم مسلمانوں کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ اسلام اور درویشوں کے خلاف نہیں۔ وہ محض بادشاہ نہیں مسلمانوں کا بادشاہ ہے۔ جس اسلامی انقلاب کے داعی سیدی مولہ تھے وہ اسے اپنے ہاتھوں سرانجام دینے کا خواہش مند ہوا۔ اس نے سوچا ہندو راجپوتوں کی بہادری ضرب المثل ہے۔ اگر ان سے ٹکرایا جائے اور ان کے مضبوط ٹھکانے قلعۂ رن تھنبور پر قبضہ کر لیا جائے تو بے پناہ خزانہ بھی ہاتھ آئے گا اور یہ اسلام کی خدمت بھی ہوگی۔

اس نے راجپوتوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ سرداروں کو حکم دیا کہ وہ نئی بھرتیاں کریں اور لشکر تیار کریں۔

* * *

پدما بیگم کی خواب گاہ طرح طرح کی خوشبویات سے مہک رہی تھی۔ ایک اونچی تپائی پر شراب کے ظروف قرینے اور سلیقے سے آراستہ تھے۔ سیج پر بچھے ہوئے موتیا اور بیلے کے پھول کسی آنے والے کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ پدما بیگم کبھی خود ہی خود اکیلے میں ناچنے لگتی، کبھی زیرلب وہ ٹھمری گنگنانے لگتی جو اس کی ماں بڑے شوق سے گایا کرتی تھی۔ سلطان جلال الدین نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رن تھنبور روانگی سے قبل وہ ایک رات اس کے ساتھ بسر کرے گا اور وہ رات آ گئی تھی۔ اسے سلطان کا انتظار تھا۔

کوشک لعل کے دروازے پر رکھے شادیانوں پر چوٹ پڑی۔ اس کا مطلب تھا سلطان تشریف لا رہے ہیں۔ پدما بیگم نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور پلنگ سے نیچے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور پھر کچھ سوچ کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ پھر ایک جانی پہچانی خوشبو نے اسے ہوشیار کر دیا۔ دروازے پر طغرل بیگ کھڑا تھا۔

"مورکھ تم اس وقت کیوں آ گئے؟"

"محض یہ دیکھنے کے لیے کہ جب تم کسی کا انتظار کر رہی ہوتی ہو تو کیسی لگتی ہو؟"

"کیا یہ بھی مذاق کا کوئی وقت ہے۔ دیکھتے نہیں سلطان دروازے تک آ گئے ہیں۔ ڈھول کی آواز نہیں سنی؟"

"شادیانوں کو ڈھول کہتی ہو۔"

"شادیانے تو اس وقت بجیں گے جب تم بادشاہ کے روپ میں میرے پاس آؤ گے۔"

"وہ بھی وقت آئے گا۔ ابھی تو میں یہ کہنے آیا ہوں کہ سلطان تمہارے پاس آتے آتے ملکہ جہاں کے محل کی طرف مڑ گئے ہیں۔ اب خدا جانے کب ادھر آئیں۔"

یہ سنتے ہی پدما بیگم نے بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ طغرل بیگ مجسم خوشبو میں بھیگ گیا۔ کچھ دیر کے لیے وہاں سانسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے پدما بیگم نے اسے خود سے الگ کیا۔

”بھگوان کی سوگند! اگر مجھے بادشاہ کا ڈر نہ ہوتا تو تجھے رات بھر کے لیے یہیں روک لیتی۔ تو بس اب چلا جا ورنہ میں ایسا کر گزروں گی۔ پھر نہ جانے کیا ہو۔ جا جلدی چلا جا۔“

طغرل بیگ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ پدما بیگم نے دروازہ بند کرلیا۔ ہاتھوں کے گجرے نوچ کر دور پھینک دیے اور پلنگ پر گر کے سسکیاں بھرنے لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ بادشاہ کے عشق میں گلے گلے ڈوبی ہوئی تھی بلکہ اس لیے کہ ملکہ جہاں نے اسے شکست دے دی تھی۔

شہزادہ اختیار الدین کے انتقال کے بعد جانشینی کا مسئلہ سلطان جلال الدین کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ رن تھنبور روانگی سے قبل وہ اس مسئلے کو سلجھا دینا چاہتا تھا۔ یہ مسئلہ اتنا پریشان کن نہ ہوتا اگر وہ ارکلی خاں کے مزاج سے واقف نہ ہوتا، وہ اس کے مزاج کی سختی سے ڈرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ عوام پر ظلم کے پہاڑ توڑ دے گا۔ وہ اس کی دلیری اور بہادری کا قائل تھا لیکن نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بہادری کا نشانہ عوام بنیں۔ وہ اس کے بجائے اپنے بھتیجے علاؤ الدین خلجی کو حکمران دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا یہ فیصلہ ارکلی خاں اور اس کی ماں ملکہ جہاں کو ہرگز قابل قبول نہیں ہوگا۔ ملکہ جہاں پہلے ہی علاؤ الدین سے خوش نہیں تھی جبکہ جلال الدین نے اس کی پرورش بالکل بیٹوں کی طرح کی تھی اور جانشینی کا اسے حق دار سمجھتا تھا۔ اسی تھی کو سلجھانے کے لیے وہ اس وقت پدما بیگم کی طرف آتے آتے ملکہ جہاں کی جانب مڑ گیا تھا۔

پدما بیگم کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔ اب وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر کوئی ہلکے ہلکے دستک دے رہا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا جبکہ شاہی آداب میں یہ بات شامل تھی کہ کوئی بیگم جب وہ اکیلی ہوگی، اندر سے دروازہ بند نہیں کرے گی۔ پہرا دینے والی کنیز باہر کھڑی ہو کر نگرانی کرتی رہے گی تاکہ کوئی باہر سے اندر نہ جانے پائے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی اور پھر اسے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر بادشاہ کھڑا تھا۔ دو کنیزیں اس کے ہمراہ کھڑی تھیں جو دروازہ کھلتے ہی الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئیں۔

بادشاہ اندر آگیا۔ اب دروازہ اندر سے بند کیا جاسکتا تھا۔

”جوانی کی نیند کو آگ لگے۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہا اور ہم سو گئے۔“ پدما بیگم نے اپنی دانست میں ملکہ جہاں پر طنز کیا کیونکہ بادشاہ ایک بوڑھی عورت کے پاس سے ہو کر آرہا تھا۔

پھر اسے یاد آیا کہ ایک اور غلطی بھی اس سے سرزد ہوئی ہے۔ ”میں نے اندر سے دروازہ بند کرلیا تھا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“

”کیا کر رہی ہو پدما بیگم۔ ساری معافیاں کیا آج ہی مانگ لوگی۔ ہم نے تو تم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔“

”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ آپ نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرے دروازے پر جو کنیز ہوا کرتی تھی وہ کیوں نظر نہیں آئی۔“

”ارے ہاں، جب ہم دروازے پر آئے تو وہ وہاں تھی ہی نہیں۔“

”میں نے اسے الگ کردیا ہے۔ میں نے سوچا تھا جب آپ سے ملاقات ہوگی، آپ سے اجازت لے لوں گی۔“

”کسی اور کو رکھ لینا۔ میں طغرل بیگ سے کہہ دوں گا۔ وہ کسی اور کنیز کی تعیناتی کردے گا۔“

”اس سے یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ پہلے مجھ سے مل کر مشورہ کرلے۔“

”یہ بھی کہہ دوں گا۔ یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کیوں شرطیں منوانے پر تلی ہوئی ہو۔ یہ نہیں پوچھو گی کہ ہم کس مشکل میں ہیں؟“

”مشکل کیسی۔ آپ کو تو ملکہ جہاں سے فرصت نہیں۔ میرے پاس آتے آتے آپ ادھر مڑ گئے تھے۔“

”ملکہ کو راج پاٹ کی سمجھ ہے۔ ایسی ہی کچھ باتیں تھیں جو ان سے کرنے چلا گیا تھا۔“

پدما اپنی جگہ سے اٹھی۔ تپائی پہ رکھی صراحی سے شراب انڈیلی، جام بنایا اور جلال الدین کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پہلا جام تھا بادشاہ نے ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔

پدما چاہتی تھی بادشاہ کو کچھ نشہ ہوجائے، اس کے بعد پوچھے گی کہ ملکہ جہاں سے کیا باتیں ہوئیں۔ پہلے جام کے بعد دوسرا پھر تیسرا اور پھر چوتھا جام بادشاہ کے حلق سے اتر گیا۔ وہ پدما کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ پدما اس کے بالوں میں ہلکے ہلکے انگلیاں پھیرنے لگی۔

”کیا باتیں ہوئیں ملکہ جی سے۔ آپ کچھ راج پاٹ کی بات کہہ رہے تھے۔“

”ہاں یاد آیا۔“ جلال الدین نے نشے میں ڈوبی بھاری آواز میں کہا۔ ”کسی جوان عورت کے بستر پر لیٹ کر یہ کہنا کہ میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں غیر مہذب بات ہے لیکن

اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میں نے غیاث الدین بلبن کی ملازمت کے دوران مغلوں کے بے شمار حملے پسپا کیے۔ لاتعداد جنگیں لڑیں مگر اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میرے سامنے جانشینی کا مسئلہ ہے۔ میرا بڑا بیٹا زندہ ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے انتقال نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں ارکلی خاں (منجھلا بیٹا) کو بہترین سپاہی سمجھتا ہوں، اچھا بادشاہ نہیں۔ اسی لیے میں اپنے بھتیجے علاؤ الدین کو اپنا جانشین بنانا چاہتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ارکلی خاں اتنی آسانی سے اپنا حق چھوڑنے والا نہیں۔ وہ علاؤ الدین سے لڑ پڑے گا۔ بس یہی بات کرنے ملکہ جہاں کے پاس گیا تھا۔"

"کیا کہا انہوں نے؟"

"ارکلی خاں ان کا بیٹا ہے۔ انہیں تو اسی کی حمایت کرنا تھی۔ وہ علاؤ الدین سے اتنی نفرت کرتی ہیں، یہ تو مجھے آج معلوم ہوا۔"

"انہیں تو وہ کرنا چاہیے جس میں دیس کی بھلائی ہو۔ آپ کے بھتیجے کی مخالفت تو نہیں کرنی چاہیے۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو۔ اس لیے کہ ارکلی خاں تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ ہر ماں چاہے گی کہ اس کا بیٹا بادشاہ بنے۔"

"یہ بھی کیا بات ہوئی۔"

"چلو چھوڑو اس قصے کو۔ ہم دو ایک روز بعد رن تھنبور کا قلعہ فتح کرنے جارہے ہیں۔"

"آپ میرے دھرم جاتیوں سے اتنا بیر کیوں رکھتے ہیں؟"

"اچھا ہے نا، تمہاری طرح انہیں بھی فتح کرلیں۔"

"آپ نہ جانے کب واپس ہوں۔ ہم اتنے دن کیا کریں گے؟"

"ہم نے ملکہ جہاں سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارا دھیان رکھیں گی۔"

پدما نے بادشاہ کا سر اپنی آغوش سے اٹھا کر تکیے پر رکھ دیا اور پھر خود بھی اس کے برابر دراز ہوگئی۔ پھر کسی خیال سے اٹھی اور شمعیں گل کردیں۔

دوسرے دن وہ بادشاہ کے رخصت ہونے کے بعد ملکہ جہاں کے محل میں گئی اور انہیں بتایا کہ بادشاہ اپنے بھتیجے کو اپنا جانشین مقرر کرنے پر بضد ہے لہٰذا اس کے رن تھنبور جانے سے پہلے ارکلی خاں کو ولی عہدی کا مرتبہ دے کر جانشین مقرر کرادو ورنہ کچھ بعید نہیں کہ بادشاہ کی غیر موجودگی میں علاؤ الدین بہ زور طاقت اپنے حق میں فیصلہ کرالے۔ خون خرابے سے بچنا ہی مصلحت ہے۔ علاؤ الدین کے خلاف اور بھی بہت سی باتیں کیں جن کا مقصد ملکہ جہاں کو اس کے خلاف بھڑکانا تھا۔

وہ ملکہ جہاں سے ملاقات کے بعد واپس اپنے محل میں آئی تو طغرل بیگ آگیا۔ وہ کسی کنیز کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ بہت بھروسے کی عورت ہے۔ کوئی بات اِدھر سے اُدھر نہیں پہنچائے گی۔ پھر پدما بیگم کے کان میں کہا۔ "یہ ہمارے رازوں سے واقف ہے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ ہماری ملاقاتوں کا بندوبست بھی کرے گی۔ بہت ہوشیار عورت ہے۔ اب تمہارے دروازے پر یہ پہرا دیا کرے گی۔"

جنگ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ جہاد کے اعلان نے سب کے حوصلے بلند کردیے تھے۔ لشکر جمع ہورہے تھے جن کا معائنہ جلال الدین خلجی بہ ذات خود کیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت ویسا ہی جوان نظر آرہا تھا جیسا کبھی غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ معرکہ آرائیوں میں دشمن کا منہ پھیر دینے والا جفاکش سپاہی۔

اس نے ملکہ جہاں کی ضد سے مجبور ہوکر اپنے دوسرے بیٹے ارکلی خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور شاہی لوازمات سے سرفراز کرکے دہلی میں چھوڑا اور خود رن تھنبور کی طرف بڑھا۔

رن اور تھنبور نام کے دو پہاڑ آمنے سامنے سینہ تانے کھڑے تھے۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان یہ قلعہ تھا۔ اسی کی مناسبت سے یہ قلعہ رن تھنبور کہلاتا تھا۔ محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ "رن" پہاڑ اس قلعے کے لیے مورچے کا کام دے رہا تھا۔ قلعے کی جانب سے تیر آسکتے تھے لیکن نیچے کی جانب سے کسی کو نشانہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ قلعے کی تسخیر اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ پہاڑوں پر چڑھا نہ جائے۔ اس میں مہینوں نہیں بلکہ سالوں لگ سکتے تھے۔ بھاری جانی نقصان بھی اٹھانا پڑتا۔ اس کے بعد بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ قلعہ فتح ہو۔ جوانی کا جوش ہوتا تو وہ یہ کارِ مشکل بھی اختیار کرلیتا لیکن اب تو وہ ایسی عمر میں تھا جب آدمی احتیاط سیکھ لیتا ہے۔ اس نے رن تھنبور کی فتح کا خیال دل سے نکال دیا اور "جھاین" کی طرف بڑھ گیا۔

جھاین کو فتح کرلیا۔ بت خانے منہدم کرادیے۔ بے شمار ہتھیار اور مال غنیمت لیتا ہوا مالوہ پہنچ گیا۔ یہاں کے مندروں میں ہندوؤں کی بے پناہ دولت چھپی ہوئی تھی۔ یہاں کا راجا خلجیوں کو دیکھ کر قلعہ بند ہوگیا لیکن جلال الدین نے کچھ دن قلعے کا محاصرہ کرکے قلعے پر دھاوا بول دیا۔ راجا فرار ہوگیا۔ خلجی لشکر نے یہاں کے مندروں کو خوب جی بھر

کر لوٹا۔ قلعے سے بھی زر کثیر ہاتھ آیا۔

یہاں سے وہ دہلی کی طرف واپس ہوا۔

واپسی میں ایک مرتبہ پھر اس کا گزر رن تھنبور سے ہوا۔ جلال الدین اس مرتبہ فتح کے نشے سے سرشار تھے۔ اس نے پھر ارادہ کیا کہ وہ اس قلعے کو فتح کرے گا۔ اس نے راجا کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرلے۔ راجا نے پھر انکار کیا۔ راجا کی سرکشی نے جلال الدین کو برافروختہ کردیا۔ اس نے فوراً خیمے نصب کرنے اور ڈیرے ڈالنے کا حکم دے دیا۔

ابھی اس محاصرے کو چند ہی روز گزرے تھے کہ محاصرے کا حکم منسوخ کردیا۔ لشکر میں یہ حکم گردش کررہا تھا کہ صبح ہوتے ہی محاصرہ اٹھالیا جائے گا۔

سرداران لشکر کو اس حکم کی منسوخی پر سخت تعجب تھا۔ وہ بادشاہ کے پاس آئے اور عاجزانہ اس تبدیلی کا سبب دریافت کرنے لگے۔

بادشاہ نے جواز پیش کیا۔ "میں نے پہلے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ اس قلعے کو تسخیر کروں لیکن جب میں نے اپنے اس ارادے پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ بے شمار مسلمانوں کی جانوں کی قربانیاں دیے بغیر قلعے کو سر کرنا مشکل ہے۔ میں اس قلعے کی خاطر مسلمانوں کے خون کو اتنا ارزاں نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے اپنے ارادے سے ہاتھ اٹھانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔"

بادشاہ کی یہ تقریر سن کر شاہی مصاحب ملک حبیب احمد خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔ "مہمات سلطنت کو انجام دیتے ہوئے سپاہیوں کی جان کا خیال رکھنا، آئین جہاں گیری کے خلاف ہے۔ اگر راجا رن تھنبور کو سرزنش نہ کی تو وہ اسے ہماری کمزوری سمجھے گا۔ ہماری کمزوری ظاہر ہوتے ہی وہ فتنہ و فساد کا بازار گرم کرے گا۔"

ملک حبیب احمد کی یہ نصیحت بادشاہ کو پسند نہ آئی۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں آئین جہانگیری سے ناواقف ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اکثر بادشاہوں کو ملک گیری کی ہوس میں مسلمانوں کی قیمتی جانوں کا کوئی خیال نہیں رہتا لیکن ہر بادشاہ اسی طرح کا نہیں ہوتا۔ جو بادشاہ سچے مسلمان ہوتے ہیں اور جنہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک دن انہیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کو منہ دکھانا ہے تو وہ مسلمانوں کی جانوں کی قدر کرتے ہیں۔ جنگ میں جان کا چلا جانا فطری ہے لیکن جان بوجھ کر انہیں موت کے منہ میں دھکیلنا دانش مندی نہیں۔

میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں اب بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میں اپنی زندگی کے آخری دور میں فرعون اور نمرود کی روش پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے ایسا کوئی کام پسند نہیں ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں مسلمان عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوکر رہ جائیں۔"

اس کے بعد کسی کو اسے سمجھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

♥♥♥

محل میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کہیں کہیں کوئی قندیل تھی جو روشنی کا ادھورا انتظام کررہی تھی۔ طغرل بیگ اپنے کمرے میں لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ کمرے سے نکل کر اپنے خدمت گار کو دیکھ چکا تھا جو باہر بستر بچھائے گہری نیند سو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹے ارتعاش پیدا کررہے تھے اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

طغرل بیگ کو پچھلی کھڑکی پر کسی دستک کا انتظار تھا۔ وہ اپنی زرخرید کنیز سے شام ہی کو کہہ چکا تھا کہ پدما بیگم جیسے ہی اس سے ملاقات کے لیے تیار ہو وہ اس کی کھڑکی پر آکر دستک دے دے۔ وہ اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جائے گا۔ اگر فرار کا موقع مل گیا تو ٹھیک ورنہ آئندہ کے لیے کوئی موقع تلاش کرلیا جائے گا۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ کہیں پدما بیگم نے اپنا ارادہ بدل تو نہیں دیا؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کھڑکی پر دستک ہوئی۔ وہی ہوگی لیکن پھر بھی پوچھنا ضروری ہے۔ اس نے کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھولا۔

"دستک دینے والا کون ہے۔"

"پدما بیگم کی کنیز۔"

"وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"آپ باہر نکل کر میرے پیچھے پیچھے آیئے۔ میں آپ کو ان تک پہنچا دوں گی۔"

"تو ٹھہر، میں آتا ہوں۔"

طغرل بیگ کمرے سے نکلا۔ اس کا خدمت گار سو رہا تھا۔ وہ مختلف کمروں کو پار کرتا ہوا اپنے کمرے کے عقب میں پہنچ گیا۔ کنیز اس کا انتظار کررہی تھی۔

"پدما بیگم کہاں ہیں؟"

"میں انہیں سامنے کے باغ میں بٹھا کر آئی ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔"

محل کی عمارت سے کچھ فاصلے پر باغ تھا۔ کہیں کہیں قندیلیں بھی روشن تھیں۔ اسی باغ میں ایک درخت کے نیچے پدما بیگم اس کا انتظار کررہی تھی۔ کنیز اسے وہاں چھوڑ

کرواپس آگئی۔

”طغرل بیگ، میں کل سے اب تک ایک ہی بات سوچتی رہی ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”تو ارکلی خاں کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کیوں نہیں کرلیتا۔اس وقت سلطان بھی یہاں نہیں ہے۔“

”آپ نے تو ایسے کہہ دیا جیسے مرغی ذبح کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ارکلی خاں کی طاقت جانتی ہیں آپ؟“

”مرد ہو تو مردوں والے کام بھی کرو۔“

”میرے ساتھ چند سپاہی ہیں ان سے کیا ہوسکتا ہے۔“

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ سلطان کا بھتیجا..... علاؤالدین اپنی جاگیر سے یہاں پہنچا ہے۔ خدا جانے کس ارادے سے آیا ہے۔ارکلی خاں کی جانشینی اسے ناگوار گزری تھی۔اس لیے مجھے کھٹکا لگا ہوا ہے۔اس سے پہلے ہی اگر تم اپنا کام کرگزرو۔“

”یہ امر محال ہے۔“

”پھر مجھے یہاں سے نکال لے جاؤ۔“

”میں بہت سوچتا رہا ہوں مگر یہاں ہمیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بس کچھ دن ٹھہر جاؤ، میں تمہیں گجرات کے راجا کرن دیو کے پاس لے چلوں گا۔ سلطان کے بہت سے ناراض امرا اس کے پاس پناہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی سلطان کے حوالے نہیں کرے گا۔“

ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ ایک درخت کی اوٹ سے کنیز نمودار ہوئی۔

”ملکۂ عالیہ، میں نے کچھ سپاہیوں کو باغ کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید کسی کو خبر ہوگئی ہے کہ آپ یہاں ہیں۔“

”کیا بکتی ہے۔“ طغرل بیگ نے اسے ڈانٹا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

وہ دونوں گھبرا کر اٹھے۔ پدما بیگم نے کنیز کا ہاتھ تھاما اور طغرل بیگ مخالف سمت میں چلتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف بڑھ گیا۔

پدما بیگم اپنے کمرے میں پہنچ کر بے ترتیب سانسیں درست کرنے لگی۔ سوچ رہی تھی یہ سپاہی کون ہو سکتے ہیں۔ اس کا دھیان علاؤالدین کی طرف گیا لیکن پھر خود ہی خود کو جھٹلا دیا۔ ممکن ہے کنیز کا وہم ہو۔

یہ وہم اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب صبح ہوتے ہی یہ خبر پھیلی کہ باغ سے محل کی طرف آتے ہوئے کسی نے طغرل بیگ کو قتل کر دیا۔ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ رات کے وقت وہ باغ میں کس سے ملنے گیا تھا اور قتل کس نے کر دیا۔ پدما بیگم کا دھیان ایک مرتبہ پھر علاؤالدین خلجی کی طرف گیا کہ وہ اس رات محل ہی میں تھا۔

وہ جلدی جلدی تیار ہوئی اور ملکہ جہاں کی خدمت میں پہنچ گئی تاکہ وہاں سے کچھ سن گن لے سکے۔ یہاں پہنچ کر اس کے شک کو تقویت مل گئی، ملکہ جہاں کھل کر اس قتل کا ذمے دار علاؤالدین خلجی کو قرار دے رہی تھیں۔ اس کا سبب وہ یہ بتا رہی تھیں کہ طغرل بیگ سلطان کے بہت قریب ہو گیا تھا..... علاؤالدین ہر اس آدمی کو راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے جو سلطان سے قریب ہو۔

”سوال یہ آتا ہے کہ طغرل بیگ اس وقت باغ میں کیا کر رہا تھا۔ اسے تو اپنے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔“ پدما بیگم نے کریدنے کے لیے پوچھا تاکہ یہ معلوم ہو کہ کہیں اس کا راز تو نہیں کھل گیا۔

”یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ میں نے ارکلی خاں کو بلوایا ہے۔ اس سے کہوں گی کہ علاؤالدین کو فوری گرفتار کرے اور اس معاملے کی تحقیق کرے۔“

علاؤالدین خلجی کے کانوں تک بھی یہ باتیں پہنچ رہی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ملکہ جہاں اس کے بہت خلاف ہے۔ یہ موقع اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کرے گی۔ سلطان جلال الدین بھی اس وقت مہم پر گیا ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے بھی اپنی صفائی پیش نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ دہلی سے فرار ہو کر اپنی جاگیر کڑہ (الٰہ آباد) پہنچ جائے۔ وہاں پہنچ کر سلطان سے مراسلت کے ذریعے اپنی صفائی پیش کرے۔

♥ ♥ ♥

سلطان جلال الدین خلجی وہاں پہنچ چکا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے طغرل بیگ کے قتل کی خبر ملی تھی۔ ملکہ جہاں نے..... علاؤالدین کی طرف سے اس کے خوب کان بھرے لیکن وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پدما بیگم نے بھی اسے بھڑکانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے بھتیجے کے خلاف کوئی سازش تیار کی جا رہی ہے لٰہذا اس نے علاؤالدین کی طرف ایک خفیہ خط روانہ کیا کہ وہ کڑہ میں رکا رہے۔ دہلی آنے کی کوشش نہ کرے۔ ملکہ جہاں کو اس نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ علاؤالدین جس وقت بھی دہلی آیا وہ اسے گرفتار کرلے گا۔ اس نے یہ بھی کیا کہ ارکلی خان کو ملتان کا حاکم بنا کر بھیج دیا تاکہ ماں بیٹوں میں دوری ہو جائے اور کوئی نئی سازش تیار نہ ہوسکے۔

اس کے بعد وہ ایک جنگ میں الجھ گیا۔

ہلاکو خاں کے ایک رشتہ دار نے ایک لشکر جرار کے ہمراہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہ لشکر ایک لاکھ سے زیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔

جلال الدین ماضی میں مغلوں کے ایسے کئی حملوں سے نمٹ چکا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ایک زبردست فوج ساتھ لی اور مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ ایک بہت بڑے میدان کو جنگ کے لیے منتخب کیا۔

وحشی مغل موت سے بے پروا ہو کر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں فوجوں کے قلب لشکر آپس میں گتھم گتھا ہوئے تو تلواروں کی جھنکاروں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

کئی گھنٹوں کی معرکہ آرائی کے بعد خلجیوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بے شمار مغل موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ کئی نامی گرامی سرداروں کو زندہ گرفتار کرلیا گیا۔

ان کی رہائی کے لیے بات چیت کا آغاز ہوا جو صلح پر جا کر ختم ہوئی۔ جلال الدین نے مغل سردار کو بیٹا کہہ کر یاد کیا اور اس نے جلال الدین کو ”باپ“ کہا۔ دونوں طرف سے تحائف کا تبادلہ ہوا۔

مغل لشکر اپنے ملک واپس چلا گیا۔

اس واقعے کے بعد چنگیز خان کا نواسہ الغو خاں اپنے لشکر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا اور جلال الدین نے اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی۔ الغو خاں اور اس کے ساتھیوں نے ”نومسلموں“ کے خطاب سے شہرت پائی اور موضع غیاث پورہ (جہاں اب حضرت شیخ نظام الدین اولیا کا مزار ہے) میں آباد ہوئے اور اس مقام کو مغل پورہ سے موسوم کیا۔

♥ ♥ ♥

علاؤالدین خلجی، دہلی کے حالات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ملکہ جہاں کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ کسی بھی وقت بادشاہ کو اس کے خلاف کر سکتی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ پدما بیگم بھی اس کے خلاف ہے اور طغرل بیگ کے قتل کا ذمے دار اسی کو سمجھتی ہے۔ جب موقع ملتا ہے بادشاہ کو اکساتی رہتی ہے۔

اب علاؤالدین یہ سوچنے لگا تھا کہ اسے دہلی سے دور دور رہنا چاہیے تاکہ ملکہ جہاں اور بادشاہ دونوں کی دسترس سے باہر رہے بلکہ مستقل طور پر دہلی سے دور چلا جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ بادشاہ کو خوش کرتا رہے۔ بادشاہ اپنے نائبین میں فتوحات کی کثرت تلاش کرتے ہیں۔ انہیں مال و متاع سے محبت ہوتی ہے۔ علاؤالدین بھی بادشاہوں کی اس کمزوری سے ناواقف نہیں تھا۔

ایک اندھیری رات میں اس نے اپنے دو قاصد دہلی کی طرف روانہ کیے۔ ان قاصدوں کو علاؤالدین کے لیے بادشاہ سے یہ اجازت طلب کرنی تھی کہ وہ ”تہاسہ“ پر حملہ آور ہو جائے اور بادشاہ کے لیے مال غنیمت جمع کرے۔ اس نے خود یہ اجازت حاصل کرنے کے لیے دہلی آنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بادشاہ اس کی مصلحت کو سمجھتا تھا۔ ملکہ جہاں کے اصرار کے باوجود وہ علاؤالدین کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریزاں رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ دہلی آئے۔

اس نے قاصدوں کو بہ خوشی اجازت دے دی۔

علاؤالدین یہ حملہ خود بھی کرسکتا تھا لیکن وہ خود کو بادشاہ کا زیادہ سے زیادہ فرماں بردار ثابت کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اجازت ملتے ہی تہاسہ پر چڑھائی کر دی۔ خوب تباہی مچائی۔ اس لوٹ مار میں بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اب اسے دہلی آنے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا استقبال کیا جائے گا، اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ یہاں سے اسے کانسی کے دو بت بھی ملے تھے۔ ان بتوں کو اس نے بدایوں دروازے کے سامنے لا کر ڈال دیا تاکہ آتے جاتے لوگوں کے پاؤں کے نیچے آ کر پامال ہوں۔

جلال الدین کو اس کی یہ خدمات بہت پسند آئیں اور اس نے شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کر کے اسے اودھ کے صوبے کا حاکم مقرر کر دیا۔

جب وہ اودھ کی طرف جانے لگا تو اس نے جلال الدین کی مہربانیوں کو ایک مرتبہ پھر آواز دی۔

”آپ کی مہربانیاں اگر شامل حال ہوں تو کچھ اور عرض کروں؟“

”میں نے ہمیشہ تجھے اپنا بیٹا کہا ہے اور تو نے اسے ثابت بھی کیا ہے، اب تجھے کیا کہنا ہے۔ میں تیری کوئی بات نہیں ٹالوں گا۔“

”چندیری کے آس پاس کے علاقوں میں بہت سے دولت مند ہندو راجا آباد ہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اپنی جاگیر کی آمدنی سے نیا لشکر تیار کروں اور پھر نئے اور پرانے لشکروں کی مدد سے ان راجاؤں کو شکست دے کر ان کی دولت شاہی خزانے میں جمع کروں۔ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکا، مجھے یہ خدمت کرنے کا موقع فراہم کریں۔“

سلطان جلال الدین بات کی گہرائی تک پہنچ ہی نہیں

سکتا تھا کیونکہ کہنے والا کوئی اور نہیں علاؤ الدین تھا جبکہ .... علاؤ الدین، ملکہ جہاں کے اثر سے نکلنے کے لیے کسی مضبوط مقام کو اپنے قبضے میں کرنے کا خواہش مند تھا۔

اجازت ملتے ہی وہ کڑہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے لشکر فراہم کرنا شروع کر دیا۔

سلطان جلال الدین نے تخت نشین ہونے کے بعد غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کو کڑہ کا حاکم بنا دیا تھا لیکن اس نے وہاں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرلیا اور اودھ کا خود مختار فرماں روا بن بیٹھا۔ جلال الدین نے اس پر حملہ کیا اور اس کے لشکر کو شکست دے کر اسے معزول کر دیا۔ علاؤ الدین خلجی کو حاکم کڑہ متعین کیا۔

اس وقت سے لے کر اب تک علاؤ الدین خلجی یہاں کا حاکم چلا آرہا تھا۔

ملک چھجو کے ملازمین اور دیگر بلبنی امرا تلاش معاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ علاؤ الدین خلجی نے جب نیا لشکر ترتیب دینا چاہا تو اس نے ان سب کو ملازمت میں داخل کرلیا۔

اب اسے ان راجاؤں کی تلاش تھی جن کے خزانے دولت سے معمور تھے۔ اسے معلوم ہوا کہ دکن کے راجا رام دیو کے پاس ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ یہ خزانہ اس قدر بیش قیمت ہے کہ سلاطینِ دہلی میں سے بھی کسی کے پاس بھی ایسا خزانہ نہیں رہا۔

علاؤ الدین نے علاء الملک کو جو اس کے مخلص لوگوں میں سے تھا اپنا نائب مقرر کیا اور دیوگیر کی طرف روانہ ہوگیا اور ظاہر یہ کیا کہ مضافاتِ چندیری کی لوٹ مار کے لیے جا رہا ہے۔

علاؤ الدین کے ساتھ صرف سات آٹھ ہزار کا لشکر تھا۔ اس نے اس ہلکے پھلکے لشکر کو لے کر جنگل کی راہ سے سفر طے کیا تاکہ جلد از جلد منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ یہ فیصلہ ہرگز دانش مندی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن اقبال مندی اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ قسمت نے اسے دیوگڑھ پہنچا دیا۔

اس وقت راجا رام دیو اپنی گڑھی میں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں دور گیا ہوا تھا۔ اس نے جو سنا کہ علاؤ الدین دیوگڑھی پہنچا ہے تو وہ الٹے قدموں لوٹا اور اپنے امرا اور لشکر کو لے کر مقابلے پر آگیا۔ علاؤ الدین کے لشکری دیوگڑھی کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ راجا رام دیو دلیری اور پامردی سے مقابلے پر آیا لیکن اسے ضروری تیاریوں کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ ابتدا ہی میں ہمت ہار بیٹھا اور دیوگڑھ کے قلعے میں پناہ لے لی۔

یہ قلعہ خندق اور دیگر دفاعی سامان سے مضبوط نہ تھا۔

جس وقت راجا رام دیو اور علاؤ الدین کے لشکر نبرد آزما تھے، دیوگڑھ کے کچھ سوداگر دو یا تین ہزار بورے کوکن سے لے کر آئے تھے اور جنگ کی وجہ سے ان بوروں کو قلعے کے پاس کہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ راجا جب قلعہ بند ہوا تو اس کے آدمیوں نے ان بوروں کو غلے کے بورے سمجھا اور اٹھا کر اپنے ساتھ قلعے کے اندر لے گئے۔

علاؤ الدین نے جی کھول کر شہر کو لوٹا۔ دیوگڑھ کی سرزمین نے ہزار ہا سال سے کسی حملہ آور کے گھوڑوں کی ٹاپیں نہیں سنی تھیں۔ یہ لوگ نہ سختیوں سے واقف تھے نہ لڑنے کا ہنر جانتے تھے۔ علاؤ الدین نے یہ افواہ بھی پھیلا دی تھی کہ مسلمانوں کا ایک دوسرا لشکر بھی بہت جلد پہنچنے والا ہے۔ راجا گھبرا گیا۔ اس نے طے کیا مسلمانوں کے دوسرے لشکر کے پہنچنے سے قبل علاؤ الدین سے صلح کرلی جائے اور کسی طرح اس بلا کو یہاں سے نکالا جائے۔

راجا نے چند برہمنوں کو علاؤ الدین کے پاس بھیجا جنہوں نے راجا کا پیغام پڑھ کر سنایا۔

”اس شہر میں تمہارا آنا حکمت اور دور اندیشی اور احتیاط سے بہت دور ہے۔ اس وقت ہمارا شہر چونکہ لشکر سے خالی ہے اس لیے تم نے غلبہ پا کر جو چاہا کرلیا۔ تمہیں اپنی اس فتح پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ آس پاس کے علاقوں سے عنقریب ہمارا عظیم الشان لشکر جو تعداد کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے دیوگڑھ پہنچ کر تمہیں درست کر دے گا اور تم میں سے ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا اور اگر اتفاق سے تم اس لشکر کی گرفت میں نہ آسکے تو مالوہ کا راجا جس کے پاس چالیس ہزار سواروں اور پیادوں کا لشکرِ عظیم ہے اور خاندیس اور گونڈواڑہ کے راجگان تمہارے ارادوں سے باخبر ہو کر راستے ہی میں تمہیں دبوچ لیں گے۔

تمہارے لیے اب بھی بہتر ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ، تم نے ہمارے جن مہاجنوں اور رعایا کو گرفتار کیا ہے ان سے ”لعل بہا“ (آزاد کرنے کا معاوضہ) لے کر انہیں چھوڑ دو۔“

علاؤ الدین کے پاس زیادہ بڑا لشکر نہیں تھا۔ راجا نے جن خطرات کا ذکر کیا تھا اگر وہ پیش آجاتے تو وہ مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ اس نے عاقبت اندیشی سے کام لیا اور راجا کی شرائط مان کر قیدیوں سے پچاس من سونا، کئی من موتی اور بیش قیمت کپڑے لے کر طے کیا کہ صبح کے وقت قیدیوں کو رہا کر کے دیوگڑھ سے رخصت ہو جائے گا۔

رام دیو کے بیٹے کو ان حالات کا علم ہوگیا تھا۔ وہ اس

صلح کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے لشکر کو دیوگڑھ سے تین کوس کے فاصلے پر کھڑا کر دیا کہ علاؤالدین جیسے ہی دیوگڑھ سے نکلے، وہ اس پر حملے کر دے۔

راجا رام دیو کو اس کا علم ہوا تو اس نے ایک معتمد شخص کو بیٹے کے پاس دوڑایا اور اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا تھا وہی ہوا۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ رعایا پر واقعی ظلم ہوا، تم مسلمانوں سے جنگ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ عجیب جنگجو قوم ہے۔ اس سے مقابلہ نہ ہو تو بہتر ہے۔"

رام دیو مقابلے کے لیے تیار بیٹھا تھا کہ ایسے میں باپ کا یہ پیغام مل گیا۔ اس نے یہ تحریر اٹھا کر پھینک دی اور اپنے آدمیوں کو علاؤالدین کے پاس بھیجا۔

"اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً وہ مال و متاع جو تم نے ہماری غیر موجودگی میں ہماری رعایا سے حاصل کیا ہے واپس کر دو اور اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ اور اسی کو غنیمت سمجھو۔"

علاؤالدین کو ایسا طیش آیا کہ اخلاقی تقاضے بھی بالائے طاق رکھ دیے۔ قاصدوں کا منہ کالا کر کے سارے شہر میں گھمایا۔

اس نے اپنے ایک امیر ملک نصرت کو ایک ہزار سواروں کے ساتھ قلعے کے محاصرے میں چھوڑا اور خود بقیہ فوج لے کر ہندوؤں کے لشکر سے معرکہ آرائی کرنے کے لیے نکل پڑا۔ دونوں لشکروں میں آمنا سامنا ہوا اور لڑائی کا بازار گرم ہو گیا۔

ہندوؤں کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی اور سب کے سب مرنے کے لیے تیار تھے۔ ایسی جانبازی سے لڑ رہے تھے کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ عین ممکن تھا کہ وہ میدان چھوڑ دیتے لیکن اچانک ملک نصرت غیبی امداد کی طرح، اطلاع دیے بغیر میدان جنگ میں آ گیا۔ ہندوؤں نے جب ملک نصرت کی فوج کو دیکھا تو وہ سمجھے یہ مسلمانوں کا وہی لشکر ہے جس کے آنے کی خبر گرم تھی (دیوگڑھ پہنچتے ہی علاؤالدین نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ مسلمانوں کا ایک عظیم لشکر آنے والا ہے)

اس لشکر کو دیکھتے ہی ہندوؤں میں سراسیگی پھیل گئی۔ انہوں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ یہ محض ایک ہزار سوار ہیں۔ وہ میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔

علاؤالدین کو فتح حاصل ہو گئی۔

اس کامیابی کے بعد علاؤالدین نے ازسرنو قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

راجا رام دیو کو عاجز کرنے کے لیے علاؤالدین نے برہمن قیدیوں کو قتل کر دیا اور جو قیدی رام دیو کے رشتہ دار تھے ان کے پیروں میں زنجیریں اور گردنوں میں طوق ڈال کر قلعے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

رام دیو قلعے کے اوپر سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ قلعے میں غلہ بالکل نہیں ہے اور وہ بورے جو قلعے میں لائے گئے تھے، ان میں غلہ نہیں بلکہ نمک ہے۔ رام دیو حواس باختہ ہو گیا۔ اب اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ باہر سے امداد آنے کا انتظار کرتا۔ مجبور ہو کر اس نے علاؤالدین کے نام خط بھیجا۔

"آپ جانتے ہیں کہ جو جنگ میرے بیٹے نے آپ سے کی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، نہ میں نے اس کا ساتھ دیا نہ حوصلہ افزائی کی بلکہ اسے روکنے کے لیے خط بھی لکھا مگر وہ نہ مانا۔ آپ میرے بیٹے کی غلطیوں کی سزا مجھے نہ دیں اور محاصرہ اٹھا کر چلے جائیں جیسا کہ ہمارے تمہارے درمیان طے ہوا تھا۔"

اس خط میں اس نے غلے کی کمی کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن اپنے قاصدوں سے کہہ دیا تھا کہ صلح جلد سے جلد ہونی چاہیے۔ قلعے میں غلہ اتنا کم رہ گیا ہے کہ مسلمانوں نے محاصرہ تین چار روز بھی جاری رکھا تو ہم سب بھوک سے مر جائیں گے۔

قاصدوں نے یہ خط علاؤالدین کے حوالے کیا۔ علاؤالدین کو اپنے ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ قلعہ میں غلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ ان قاصدوں کی حالت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور صلح کرنے میں اتنی دیر لگا دینا چاہتا تھا کہ اپنی مرضی کی شرائط منوا سکے۔ اس نے قاصدوں سے کہا کہ وہ کچھ دن اس کے مہمان بن کر رہیں۔ وہ سوچ کر جواب دے گا۔

قاصدوں کے منہ اتر گئے۔ انکار کی جرأت نہیں تھی۔ صلح کے بغیر واپس بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ان کے لیے خیمہ لگا دیا گیا لیکن وہ رات غالباً انہوں نے کانٹوں پر گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہ علاؤالدین کی خدمت میں پہنچ گئے اور خوشامد کرنے لگے۔ علاؤالدین انہیں ٹالتا رہا۔

"ابھی ایک دن ہوا ہے اتنی جلدی کیا ہے۔ محاصرہ کیا ہے کوئی حملہ نہیں کیا جو اتنے بوکھلائے ہوئے ہو۔"

"مہاراج! جو کام کل کرنا ہے وہ آج کر لیں۔"

"ہم مسلمانوں میں مثل مشہور ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ میں اچھی طرح غور کروں گا پھر کوئی جواب دوں گا۔"

"ہمارے راجا جی بہت بے چین ہیں۔ انہوں نے ہم سے یہی کہا تھا کہ ترت جواب لے کر آئیں۔"

"جواب بھی مل جائے گا۔ ابھی آرام کرو۔"

ایک دن اور گزر گیا۔ آخر تیسرے دن وہ یہ قبول کرنے پر تیار ہو گئے کہ وہ جلدی کس لیے کر رہے ہیں۔

"میں چاہوں تو تم سب کے مرنے کا تماشا دیکھوں اور دیوگڑھ کا مالک بن جاؤں لیکن میں اتنا ظالم نہیں ہوں البتہ صلح میری شرائط پر ہوگی۔"

"ہم سے یہ پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ آپ کی ہر شرط منظور ہوگی۔ راجا کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی شرائط بتائیے۔"

علاؤالدین نے شرائط ان کے حوالے کر دیں۔

"ان شرطوں پر صلح ہوگی۔"

رام دیو اس وقت چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من لعل، یاقوت، الماس اور زمرد۔ ایک ہزار من چاندی، چار ہزار ریشمی کپڑے علاؤالدین کے حوالے کرے گا۔ نیز ایلچ پور کا صوبہ بھی علاؤالدین کے قبضے میں دے دے گا اور اگر وہ ایسا نہ کرنا چاہے تو اس صوبے کا سالانہ محصول اسے روانہ کیا جاتا رہے گا۔

علاؤالدین اس صلح کے بعد جب وہاں سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ اتنے جواہرات، مال و اسباب اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ تھے کہ اتنی دولت کبھی کسی بادشاہ دہلی کے پاس جمع نہیں ہوئی تھی۔

●●●

بادشاہ دہلی جلال الدین خلجی کو ان کامیابیوں کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ چھ مہینے سے زائد کا عرصہ گزر گیا تھا لیکن علاؤالدین نے اسے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ کبھی کبھی علاؤالدین کا نائب علاء الملک اس مضمون کے عرائض روانہ کر دیتا تھا کہ علاؤالدین آج کل چندیری کی غارت گری میں مصروف ہے۔

یہ خط جلال الدین کی تشفی کے لیے ناکافی تھے۔ اس دن بھی ایک ایسا ہی خط آیا تھا اور اس نے جھنجلا کر اسے دور پھینک دیا تھا۔ ملک حبیب احمد قریب کھڑے تھے۔ انہیں حکم دیا کہ علاؤالدین کے نائب کو فوراً دہلی طلب کرو۔

"اس کا کیا فائدہ ہوگا؟" ملک حبیب احمد نے کہا۔ "یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین کے مفصل حالات خود اس کے علم میں بھی نہیں ورنہ وہ ضرور لکھتا۔ یہاں آ کر بھی وہ یہی کہے گا جو وہ اپنے عریضوں میں لکھتا رہا ہے۔"

"پھر ہم کیا سمجھیں۔ علاؤالدین کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ اپنی خیریت کے دو بول بھی ہمیں نہیں پہنچا سکا۔"

ملک حبیب احمد سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے پاس یا تو کوئی جواب نہیں تھا یا پھر وہ جواب دینا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ بادشاہ تک یہ خبر پہنچانے کا اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ لب کشا ہوئے۔

"دہلی میں یہ خبریں عام ہو رہی ہیں کہ علاؤالدین نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔"

"آپ کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ دہلی کے بازاری اس نیک طینت فرزند پر الزام دھر رہے ہیں اور آپ ان افواہوں کو مجھ تک پہنچا رہے ہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تصدیق بھی ہو چکی ہے۔"

"آپ کا انداز بتا رہا ہے کہ آپ کو یقین بھی ہے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں کہ حضور کو تکلیف پہنچی۔"

"ملک حبیب احمد، علاؤالدین ہمارا بھتیجا نہیں فرزند ہے۔ وہ بھی ہمیں باپ کا درجہ دیتا ہے۔ وہ کبھی ہمارا باغی نہیں ہو سکتا۔ اس کی الجھنیں اسے فرصت نہیں دے رہی ہوں گی ورنہ وہ خط ضرور لکھتا۔ اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ رکھیے گا۔"

اب ملک حبیب احمد کیا کہتا کہ تاج و تخت کے حصول کے لیے کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔

ملک حبیب احمد رخصت ہو چکے تھے لیکن بادشاہ کے دل میں شک کا بیج بو گئے تھے۔ وہ بار بار سوالات اٹھاتا رہا اور پھر خود ہی اس کی تردید کرتا رہا۔ وہ ملکہ جہاں اور علاؤالدین کے بگڑتے ہوئے تعلقات سے باخبر تھا اور بغاوت کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ علاؤالدین اس کے خلاف ہو گیا ہے۔

ملکہ جہاں اب کھل کر علاؤالدین کی مخالفت کرنے لگی تھی اور بادشاہ کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ علاؤالدین کو اپنا باغی قرار دینے کا اعلان کرے اور اس کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔

ان سوالوں سے بچنے کے لیے وہ شکار کے بہانے گوالیار کی طرف چلا گیا۔ یہاں اس نے چند ماہ قیام کیا۔

علاؤالدین کے نائب کی جانب سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا لیکن اس کے لشکر میں یہ خبریں عام ہونے لگیں کہ علاؤالدین نے دیوگڑھ فتح کر لیا ہے اور اس کے ہاتھ اتنی دولت آئی ہے کہ اس سے پہلے کسی بادشاہ کو میسر نہیں ہوئی ہوگی۔

بادشاہ ان خبروں پر یقین نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک روز اسے یقین کرنا پڑا۔ ایک اجنبی گھڑسوار اس کے لشکر میں آیا اور

سلطان جلال الدین سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اسے پہلے امرا کے پاس لے جایا گیا اور پھر سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اس نے شرط عائد کی کہ وہ امرا کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ جب سلطان نے تمام امرا کو باہر نکال دیا تو اس نے اپنی شناخت ظاہر کر دی۔ وہ ایک بلبنی امیر تھا اور علاؤ الدین کے لشکر سے بھاگ کر آیا تھا۔ اس نے دیوگڑھ کی فتح کا تمام حال سلطان کے سامنے بیان کر دیا۔

''میں نے چالیس سے زیادہ ہاتھیوں پر سامان لدا ہوا دیکھا ہے۔ علاؤ الدین کے ہاتھ اتنی دولت آئی ہے کہ تمام ہندوستان کی دولت ملا کر بھی کسی کے پاس اتنی دولت نہیں ہوگی۔ وہ دیوگڑھ سے کڑہ کی طرف بڑھ گیا ہے جبکہ اسے دہلی آنا چاہیے تھا۔''

''تم اس کے پاس سے کیوں بھاگے؟''

''آپ کے احسان کی قیمت اتارنے۔''

''کیسا احسان؟''

''جب آپ نے ملک چھجو کو شکست دی تھی تو بہت سے امرا گرفتار ہوئے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ ہم قیدیوں کو جب آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ سخت رنجیدہ ہوئے تھے۔ ہمیں آزاد کرایا اور اپنی خاص مجلس میں شریک کیا اور ہمارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو بادشاہ اپنے قیدیوں سے کرتے ہیں، کسی اور کو یہ احسان یاد ہو نہ ہو، مجھے یاد ہے۔ اب جو میں نے یہ دیکھا کہ علاؤ الدین کی نیت مال و دولت دیکھ کر خراب ہو رہی ہے اور اب وہ آپ کا فرماں بردار نہیں رہا تو میں آپ کو خبر دینے چلا آیا۔''

جلال الدین کو بے وقوف کہا جائے یا علاؤ الدین سے اس کی بے پناہ محبت کہ اس نے بلبنی امیر کی اطلاع کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ البتہ اسے یہ یقین آ گیا کہ علاؤ الدین نے دیوگڑھ فتح کر لیا ہے اور اب وہ وہاں سے مال و اسباب لے کر روانہ ہو چکا ہے۔ اس نے اسے بھی علاؤ الدین کی اقبال مندی اور اپنی رفعت و شان سے تعبیر کیا۔ اس کے برخلاف بادشاہ کے مقربین جو عاقبت اندیش تھے ان کی نگاہیں کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔ ملکہ جہاں اور علاؤ الدین کی رنجش اور علاؤ الدین کا کثیر دولت حاصل کرنا کسی بغاوت کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔

بادشاہ نے خاص مصاحبوں اور مشیروں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

''علاؤ الدین دیوگڑھ سے اس قدر مال و دولت لے کر آ رہا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اپنی جگہ خاموش رہوں یا آگے بڑھ کر استقبال کروں یا پھر دہلی واپس چلا جاؤں؟''

کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اصل حقیقت بادشاہ تک پہنچاتا۔ آخر ملک حبیب احمد بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا۔

''آپ ذرا اس پر غور فرمائیں کہ علاؤ الدین کے اردگرد کون لوگ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ملک چھجو کو بہلا پھسلا کر بادشاہ کی اطاعت سے منحرف کر دیا تھا۔''

''کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ علاؤ الدین مجھ سے منحرف ہونے کی تیاری کر رہا ہے؟''

''اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اب ملک.... علاؤالدین کا ارادہ کیا ہے۔''

''یہی جاننے کے لیے تو میں نے آپ لوگوں کو جمع کیا ہے۔''

''اس کی نیت جاننے کے لیے آپ کو چندیری تک کا سفر کرنا چاہیے کیونکہ یہ مقام علاؤ الدین کے راستے میں ہے۔ جب علاؤ الدین کو شاہی لشکر کی آمد کی خبر ملے گی تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ وہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو اور جو مال و دولت وہ دیوگڑھ سے لایا ہے آپ کی خدمت میں پیش کر دے۔ آپ کو چاہیے کہ نقد دولت اور ہاتھیوں کو خود قبول فرمائیں کیونکہ یہ چیزیں شاہی لوازم میں سے ہیں بقیہ تمام مال و اسباب علاؤ الدین کو بخش دیں۔''

ایک اور امیر نے مشورہ دیا۔ ''اس کے بعد حضور کے لیے مناسب ہوگا کہ ملک چھجو اور ملک فخر الدین کے مصاحبوں کو جو سیدی مولہ کے قتل کے واقعے کے بعد سے علاؤ الدین کے اردگرد جمع ہو گئے ہیں انہیں دور دراز ممالک بھیج دیں۔ اس کے بعد آپ چاہیں تو علاؤ الدین کو کڑہ جانے کی اجازت دیں اور چاہیں تو اپنے ساتھ دہلی میں رکھیں۔''

''اگر میں اسے کڑہ جانے دوں؟''

''اگر وہ خزانے ہاتھیوں اور دیگر اسباب کے ساتھ کڑہ چلا گیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا کیونکہ گستاخی معاف ملکہ جہاں اور علاؤ الدین کی رنجش اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ اسی رنجش کے بنا پر علاؤ الدین یہ چاہتا ہے کہ کسی دور دراز کے مقام پر خود مختار بن کر رہے۔ اگر اس کے پر کاٹے بغیر اسے اڑنے دیا گیا تو یہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

ایک اور امیر ملک فخر الدین کوچی نے ایک نئی بحث چھیڑ دی کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ بادشاہ ملک حبیب احمد کی تقریر سے متاثر نہیں ہوا ہے۔

''ابھی یہ بات پوری طرح پایہ تحقیق کو نہیں پہنچی کہ.....

علاؤالدین اس طرف آ رہا ہے اور اس نے بہت سا مال و دولت فراہم کر لیا۔ ابھی تک یہ محض مفروضے ہیں۔ ہاں اگر تحقیق ہو جاتی ہے تو ہم اپنے لشکر کے ذریعے اسے راستے ہی میں روک دیں گے۔ اسے فی الحال جانے دیا جائے۔ اگر وہ کڑہ پہنچ بھی گیا تو ہم ایک ہی حملے سے اس کا کام تمام کر دیں گے۔''

یہ رائے ملک حبیب احمد کی رائے سے بالکل مختلف تھی لہٰذا اس کا بھڑک جانا مناسب تھا۔ اس نے ملک کوچی کو نہایت تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''خدا کے لیے ضرورت سے زیادہ تن آسانی سے کام نہ لو ورنہ وقت ہم لوگوں کو دھوکا دے جائے گا۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ جب علاؤ الدین بادشاہوں کی سی شان و شوکت کے ساتھ کڑہ پہنچ کر لکھنوتی پر حملہ کرے گا اس وقت تم اس کے مقابلے پر کامیاب ہو گے یا نہیں؟''

بادشاہ ان دونوں کی جھڑپ بہ غور دیکھ رہا تھا۔ علاؤ الدین کی محبت یہاں بھی آڑے آ رہی تھی۔ اسے ملک حبیب احمد کی باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔ اس نے ملک حبیب کو خود غرض کے لقب سے یاد کیا۔

''تم تو ہمیشہ علاؤ الدین سے بدگمان رہتے ہو۔ کان کھول کر سن لو۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میرے حقیقی بیٹے میرے مقابلے پر اتر آئیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ملک علاؤ الدین مجھ سے بغاوت کرے۔''

ملک حبیب احمد اتنا رنجیدہ ہوا کہ کسی معذرت یا بحث کے بغیر شاہی مجلس سے اٹھ گیا۔ باہر آ کر اس نے یہ سوچے بغیر کہ یہ باتیں بادشاہ تک بھی پہنچ سکتی ہیں اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''یہ احمق بادشاہ خود اپنے ہاتھوں اپنے لیے گڑھا کھود رہا ہے۔ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو۔''

جلال الدین خلجی نے ملک کوچی کے مشورے پر عمل کیا اور دہلی چلا آیا۔

ابھی وہ دہلی پہنچا ہی تھا کہ علاؤ الدین کا خط اسے مل گیا۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ کڑہ پہنچ گیا ہے۔ اس خط میں اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ عتابِ شاہی کے خوف سے دہلی نہیں آیا۔

''میں ایک مدت سے حضور سے جدا ہوں۔ دوری اور راستوں کے بند ہو جانے کی وجہ سے مراسلت بھی قطع رہی ہے۔ میں اور میرے ساتھی شاہی عتاب کے خوف سے پریشان ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت اپنے قلم خاص سے ایک فرمان میرے اور میرے ہم سفروں کے نام لکھوا کر بھجوا دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ اس کے بعد میں بڑے شوق سے بارگاہ سلطانی میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

یہ خط کیا ملا جلال الدین کی آنکھوں کو روشنی مل گئی۔ علاؤ الدین کی محبت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی، اس نے ملک کوچی کی ایک مرتبہ پھر تعریف کی کہ اس کے مشورے نے اسے علاؤ الدین کی مخالفت سے روک لیا تھا۔

اب دہلی کے دربار میں واضح طور پر دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک کی سربراہی ملک حبیب احمد کر رہا تھا۔ اس میں ملکہ جہاں اور چند امیر شامل تھے۔ یہ گروہ اب بھی یہ کہنے میں بضد تھا کہ یہ علاؤ الدین کا خلوص نہیں بلکہ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ اسے علاؤ الدین کے خلاف لشکر کشی کرنی چاہیے۔ دوسرا گروہ ملک کوچی کا تھا جو بادشاہ کو خط کا مضمون لکھنے پر اکسا رہا تھا۔

ان دونوں گروہوں سے الگ ایک اور کردار بھی تھا جس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ یہ تھا علاؤ الدین کا بھائی الماس بیگ جو بادشاہ کا داماد بھی تھا۔

وہ ایک دن بادشاہ کے پاس آیا اور سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہ ظاہر کرنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہو۔ بادشاہ نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

''کیا بات ہے الماس، تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔''

''سلطان مکرم بات ہی کچھ ایسی ہے۔ میرے بھائی علاؤ الدین کی جان سخت خطرے میں ہے۔''

''ہماری طرف سے تو اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔''

''آپ کے دشمنوں نے اس کی آپ سے مخالفت کی خبریں ایسی پھیلا دی ہیں کہ مجھے خوف ہے کہیں وہ ندامت کی وجہ سے خودکشی نہ کر لے۔''

''یہ سب تمہاری وہ محبت ہے جو تم اپنے بھائی سے کرتے ہو ورنہ وہ بھی سمجھتا ہے کہ ہم اسے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔''

''جی ہاں اسی لیے تو اس نے میرے نام یہ خط لکھا ہے۔'' اس نے جیب سے خط نکالا۔ ''چاہیں تو آپ بھی اسے ملاحظہ فرما لیں۔''

اس خط میں لکھا تھا۔ ''بادشاہ میرا چچا نہیں بلکہ باپ بھی ہے اور میری جان کا مالک بھی۔ بادشاہ کی ناراضی میرے لیے عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ اگر تمہیں یہ کسی طرح معلوم ہو جائے کہ بادشاہ میری جان کا دشمن ہے اور مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو فوراً مجھے لکھو تاکہ میں زہر کھا کر خود کو ہلاک کر لوں۔''

بادشاہ نے وہ خط پرزے پرزے کر کے اڑا دیا۔

''اس نے یہ گمان بھی کیسے کرلیا کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ ہم ابھی اس کے نام شاہی فرمان جاری کرتے ہیں اور ممکن ہوا تو اس سے ملنے خود بھی کڑہ جائیں گے۔''

جلال الدین نے ایک محبت بھرا فرمان لکھ کر اپنے دو خاص ملازمین کے ہاتھ علاؤ الدین کے پاس کڑہ روانہ کیا۔ ان کے کڑہ پہنچتے ہی علاؤ الدین نے ان قاصدوں کو گرفتار کرلیا تا کہ جلال الدین تک کسی قسم کی کوئی اطلاع نہ پہنچ سکے اور الماس بیگ کے نام ایک خفیہ خط لکھا۔

''اگر دولت حاصل کرنے کے لالچ میں بادشاہ اس طرف تنہا چلا آئے تو ہمارا کام بن جائے۔ تم کوئی ایسی چال چلو کہ وہ یہاں تک اکیلا چلا آئے۔''

الماس بیگ نے اس ہدایت کے مطابق بادشاہ کو شیشے میں اتارنا چاہا۔

''بہتر یہی ہے کہ حضور اکیلے ہی کڑہ کا سفر اختیار کریں اور اس سے پہلے کہ میرا بھائی خودکشی اختیار کرے یا کسی دوسرے ممالک چلا جائے اس کا ہاتھ پکڑیں اور یہاں لے کر چلے آئیں۔''

جلال الدین یہ سن کر پریشان ہوگیا اور الماس بیگ کو فوراً کڑہ کی طرف روانہ کیا کہ جا کر علاؤ الدین کو تسلی دے۔ پیچھے پیچھے میں بھی آتا ہوں۔

بادشاہ کی ہدایت کے مطابق الماس بیگ کشتی میں سوار ہوا اور کڑہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

سات روز کے سفر کے بعد وہ کڑہ پہنچ گیا۔

''مبارک ہو بھائی۔ تیر نشانے پر لگا۔ بادشاہ اکیلے آنے پر تیار ہوگیا ہے بلکہ اب آتا ہی ہوگا۔''

اس سے پہلے یہ طے ہوا تھا کہ علاؤ الدین لکھنوتی چلا جائے وہاں جا کر بادشاہ کی مخالفت کا اعلان کردے اور بنگالہ پر قبضہ کرلے لیکن اب گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا تھا لہٰذا اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب ضروری تھا کہ پہلے بادشاہ کا کام تمام کیا جائے۔ اگر اس کے بعد ارکلی خاں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو پھر دیکھا جائے گا۔

جلال الدین دولت کے لالچ میں بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا یا سیدی مولہ کا ناحق قتل اس کا پیچھا کررہا تھا۔ اس موقع پر اس نے کسی امیر سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر امیروں نے مخالفت کی تو وہ جا نہیں سکے گا اور ایسے میں اگر علاؤ الدین لکھنوتی چلا گیا تو اس کے پاس جو مال و دولت ہے وہ پھر کسی طرح نہ مل سکیں گے۔

وہ پالکی میں سوار ہو کر پدما بیگم کی طرف جارہا تھا۔ وہ اسے بتانا کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا قاعدہ تھا کہ جب بھی کہیں باہر جاتا تھا ایک رات اس کے ساتھ گزارتا تھا یا کم از کم اس سے ملاقات ضرور کرتا تھا۔ اب اس کے پاس رات کی فرصت نہیں تھی لیکن ملنا ضرور چاہتا تھا۔ راستے میں ایک فقیر اس کی پالکی کے سامنے آگیا۔ وہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا تھا۔ نرم دل بادشاہ نے کہا پالکی روکی جائے۔ وہ اس فقیر کی فریاد سنے گا۔ پالکی رک گئی۔

پالکی رکی اور بادشاہ اس فقیر کی آوز سننے کے لائق ہوا تو اس نے آواز سنی۔

وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ ''سیدی مولہ کی تلوار چلنے کو ہے۔ مجھے بچالو۔ سب کو بچالو۔ سیاہ آندھی آنے کو ہے۔''

بادشاہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

''کون ہے یہ؟''

''حضور یہ وہی سنجر نامی فقیر ہے جس نے سیدی مولہ پر استرے سے حملہ کیا تھا۔ جب سے یہی کہتا پھرتا ہے۔''

''اس کا جرم بھی تو بڑا تھا۔ سیدی مولہ کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ جو کچھ کیا تھا دوسروں نے کیا تھا۔ اسے کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔''

پالکی آگے بڑھ گئی لیکن اس کے بعد بادشاہ کے ہونٹوں پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ وہ پدما بیگم سے بھی اسی طرح ملا جیسے آخری مرتبہ مل رہا ہو۔

''میں پوچھ سکتی ہوں بادشاہ اب کس معرکے پر تشریف لے جارہے ہیں؟''

''میں کسی جنگ پر نہیں جارہا ہوں۔''

''ملکہ جہاں فرما رہی تھیں کہ آپ کڑہ تشریف لے جارہے ہیں۔''

''وہاں میں اپنے بیٹے علاؤ الدین سے ملنے جارہا ہوں جو میرا منتظر ہے۔''

وہ محل میں بیٹھا تھا کہ سیاہ آندھی اسی طرح پھر آئی جیسے سیدی مولہ کے قتل کے دن شہر دہلی تاریک ہوگیا تھا لیکن یہ وقفہ بہت کم تھا۔ کچھ دیر بعد اندھیرا اچھٹ گیا۔

وہ وہاں سے نکلا تو یہ خبر عام تھی کہ جس فقیر نے بادشاہ کا راستہ روکا تھا وہ کہیں سے استرا چھپا کر لے آیا تھا جو اس نے اپنے گلے پر پھیر لیا۔

جلال الدین نے اس نشانی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس نے اپنے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس نے صرف پانچ سو سوار اپنے ساتھ لیے اور کشتی میں سوار ہوگیا۔

ملک حبیب احمد کو حکم دیا کہ وہ لشکر لے کر خشکی کے راستے کڑہ کی طرف روانہ ہو۔

جلال الدین کے سر پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ رمضان کے دن تھے اور وہ روزے سے تھا۔

علاؤ الدین کو بادشاہ کی آمد کی خبر ملی تو اس نے گنگا پار کرکے مانک پور کے مقام پر ڈیرے ڈال لیے۔ علاؤ الدین کی نظریں پانی پر جمی ہوئی تھیں کہ کب شاہی چتر نظر آئے اور کب وہ اپنی فوجوں کو کوئی حکم دے۔

خدا خدا کر کے شاہی چتر نظر آیا۔ علاؤ الدین کے لشکر نے اپنے آپ کو مسلح اور ہاتھیوں اور گھوڑوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ الماس بیگ حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

''تم بادشاہ کے استقبال کے لیے آگے جاؤ اور جس طرح بھی ممکن ہو بادشاہ کو اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے تنہا کنارے پر لے آؤ۔''

الماس بیگ ایک کشتی لے کر روانہ ہوگیا اور شاہی چترے پر پہنچ گیا۔

''اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے اور اس سے بھی اچھا یہ ہوا کہ مجھے آپ نے بروقت روانہ کردیا۔ اگر میں کڑہ ایک دن کی بھی تاخیر سے پہنچتا تو علاؤ الدین خودکشی کرچکا ہوتا۔''

''ہمیں گلہ یہ ہے کہ ہمارے استقبال کو وہ خود کیوں نہیں آیا۔''

''اس میں کسی گستاخی کا دخل نہیں۔ وہ آپ سے شرمندہ ہے بلکہ وہ یہ دیکھ لینا چاہتا ہے کہ آپ اس سے ناراض تو نہیں۔''

''کوئی اپنے فرزندوں سے بھی ناراض ہوتا ہے۔''

بادشاہی کشتی کنارے کی طرف بڑھی تو الماس بیگ نے دوسری چال چلی۔

''میرا بھائی اب بہت قریب آگیا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے ان چند مسلح مصاحبوں کو بھی علیحدہ کردیں ورنہ علاؤ الدین آپ کے ساتھ مسلح لوگوں کو دیکھ کر بدگمان ہوسکتا ہے۔'' بادشاہ نے اپنے تمام ساتھیوں سے کہا کہ وہ ہتھیار اتار دیں۔ خود بادشاہ نے بھی اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں رکھا۔

کشتی کنارے کے قریب پہنچی تو بادشاہ کے ملازموں نے دیکھا کہ علاؤ الدین ہتھیار بند ہو کر استقبال کے لیے آرہا ہے۔ یہ انہونی بات تھی۔ اسے بادشاہ سے کیا خطرہ ہوسکتا تھا۔ وہ کیوں ہتھیار بند ہے۔ یہ بات بادشاہ نے محسوس نہ کی ہو لیکن مصاحبوں نے الماس بیگ کی توجہ اس طرف دلائی۔

''الماس بیگ! کیا یہ کوئی فریب تو نہیں؟''

''کیسا فریب؟''

''آپ نے ہم سب لوگوں کے ہتھیار رکھوا دیے جبکہ علاؤ الدین کا لشکر ہتھیار بند کھڑا ہے۔ وہ خود بھی ہتھیار لگائے ہوئے ہے۔''

''آپ لوگوں کو یہ بات سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔ یہ باپ بیٹوں کی ملاقات ہے، دشمنوں کی نہیں۔ میرے بھائی کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے لشکر کو آراستہ اور مسلح کر کے بادشاہ کے معائنے کے لیے پیش کرے۔ اسی لیے لشکر کو آراستہ کیا گیا ہے۔''

جلال الدین نے ایک مرتبہ پھر یہ گلہ کیا۔ ''میں اس قدر دور دراز کا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ روزے سے بھی ہوں لیکن اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دور تک میرے استقبال کے لیے آتا۔''

''علاؤ الدین سے میں نے کہا تھا لیکن اس کا کہنا یہ تھا کہ خالی ہاتھ حضور کی خدمت میں حاضر ہونا ندامت کی بات ہے۔ آپ خشکی پر اتر جائیں تو وہ بیش قیمت جواہرات اور قیمتی گھوڑے اور ہاتھی لے کر آپ کی پابوسی کا شرف حاصل کرے گا۔''

جلال الدین مطمئن ہوگیا اور تلاوت میں مشغول ہوگیا۔ عصر کے وقت کشتی کنارے سے لگی۔ بادشاہ نے کشتی سے کنارے کی طرف دیکھا۔ علاؤ الدین استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔

بادشاہ نے جیسے ہی خشکی پر قدم رکھا علاؤ الدین آگے بڑھا اور بادشاہ کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ جلال الدین نے بڑی شفقت سے اس کے گال پر چپت ماری۔

''میں نے تجھے بڑے پیار اور لاڈ سے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ تیرے بچپن کی بو اب تک میرے کپڑوں سے نہیں گئی۔ تو نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں تیرے خلاف ہوگیا ہوں۔ یہ دیکھ میں تجھے لینے کے لیے آگیا ہوں۔''

بدبخت علاؤ الدین پر ایسی شفقت آمیز باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ان لوگوں کو اشارہ کیا جو اس کام کے لیے متعین کیے گئے تھے۔

ایک سپاہی جس کا نام محمود بن سالم تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور بادشاہ پر اپنی تلوار ماری۔ بادشاہ زخمی ہو کر کشتی کی طرف دوڑا۔

''علاؤ الدین میرے بیٹے یہ تو نے کیا، کیا۔''

ابھی وہ کشتی تک نہیں پہنچا تھا کہ اختیار الدین جو جلال

الدین کا پروردہ نعمت تھا، اس نے نمک حرامی کی۔ اس نے بادشاہ کو پچھاڑا اور اس کا سر کاٹ لیا۔

قدر صہبا مری محبت کی
وہ محبت حرام کیا جانے

علاؤالدین کا باقی لشکر کشتی میں داخل ہوا اور بادشاہ کے وہ ہمراہی جو ابھی تک کشتی میں تھے اور ہتھیار اتارے ہوئے تھے، ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اختیار الدین، سلطان جلال الدین کا کٹا ہوا سر لے کر علاؤالدین کی خدمت میں پہنچا تو غروب آفتاب کا وقت تھا۔ افطار کا وقت ہونے ہی والا تھا۔

سلطان کے سر کو نیزے پر بلند کر کے کڑہ اور مانک پور کی گلیوں میں اس کی تشہیر کرائی گئی اور پھر وہاں سے اودھ لے گئے، اس کا سر زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ ”میرا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنا خون جگر پلا کر اپنے جگر گوشوں کو پالا۔ اپنے بھائی کی امانت کو بیٹوں سے زیادہ اہمیت دی۔ اس بے وفا دنیا سے جو امید رکھتا ہے، اس کو یہی دن دیکھنے کو ملتا ہے۔“

سیدی مولہ نے ٹھیک کہا تھا۔ ”جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار ہی سے قتل ہوتا ہے۔“

سیدی مولہ نے یہ بھی کہا تھا۔ ”یہ استرا میرے حلق پر نہیں لگا جلال الدین خلجی کے حلق میں اترا ہے۔“

کبھی سلطان معزالدین کیقباد خون کے دریا میں نہایا تھا اور اب گنگا کا پانی جلال الدین خلجی کے خون سے رنگین تھا۔

ابھی دہلی تک اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ امیر ملک حبیب احمد بادشاہ کی ہدایت کے مطابق خشکی کے راستے کڑہ روانہ ہوا تھا۔ اسے راستے ہی میں خبر ہوگئی۔ اب اس کا آگے جانا بے سود تھا۔ بادشاہ کی قسمت پر افسوس کرتا ہوا راستے ہی سے لوٹ آیا۔

♥♥♥

بغیر خاوند کی بیوی، بیوہ کہلاتی ہے جب تک کہ اسے نیا سہاگ نہ مل جائے۔ یہی حال اس وقت دہلی کا تھا۔ علاؤالدین کے سامنے بھی کچھ کم مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ جلال الدین کو تو وہ قتل کر ہی چکا تھا لیکن اس سے زیادہ مشکل کام یہ تھا کہ بیوہ کا سہاگ کیسے واپس کیا جائے۔ حکومت کے نسق و نظم کو درست کیسے کیا جائے۔ وہ دہلی سے بہت دور بیٹھا تھا اور وہاں اس کی حریف ملکہ جہاں موجود تھی جو سیاسی مہرے چلنے میں ماہر تھی۔ دہلی میں موجود دوسرے امرا سے بھی اسے زیادہ امید نہیں تھی۔

اس کے سامنے اب دو راستے تھے جن پر وہ پہلے بھی غور کر چکا تھا۔ پہلا راستہ تو یہ تھا کہ وہ لکھنوتی پر حملہ کر کے بنگالہ تک کا علاقہ اپنے قبضے میں کر لے۔ دہلی کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ کڑہ، مانک پور ہی میں قیام کرے اور یہیں رہ کر سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں۔

جلال الدین کے خون کے سرہانے بیٹھ کر وہ ان تجویزوں پر غور کرتا رہا۔ لاؤلشکر کی کثرت کے باوجود وہ دہلی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

اس نے امیروں سے مشورہ کیا۔ تمام امیروں نے ارکلی خاں اور اس کی ماں ملکہ جہاں کی طرف سے اندیشوں کا اظہار کیا۔

”ارکلی خاں اور ملکہ جہاں جلال الدین خلجی کا بدلہ لینے کے لیے ضرور معرکہ آرائی کریں گے۔ اس لیے حضور کے لیے بہتر ہے کہ کڑہ ہی میں قیام فرمائیں البتہ ایک لشکر لکھنوتی روانہ کر دیا جائے تاکہ بنگالہ کے علاقے میں حضور کی حکومت مضبوط ہو۔ اگر ارکلی خاں دہلی سے نکل کر ہمارے لشکر کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے تو پھر ہم لکھنوتی پہنچ کر اس کا مقابلہ کر لیں گے۔“

♥♥♥

جلال الدین کے قتل کے ساتھ ہی دہلی کی حکومت عورتوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ ملکہ جہاں پہلے بھی ہر کام میں دخیل ہوا کرتی تھی۔ اب تو تمام انتظام ہی اس کے ہاتھ میں تھا۔ پدما بیگم کا عمل دخل بھی اچانک بڑھ گیا۔ امرا کچھ دم بخود تھے، کچھ بے دلی کا شکار۔ ملکہ جہاں نے امرا کے مشورے کے بغیر ہی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ قدر خاں کو سلطان رکن الدین ابراہیم شاہ کا خطاب دے کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

اس سلسلے میں امرا کی رائے نہیں لی گئی تھی اس لیے وہ سب ملکہ کے خلاف ہو گئے اور سازشوں کا جال پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔

یہ خبریں برابر علاؤالدین تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا خوف زائل ہو گیا۔ اس نے لکھنوتی اور بنگالہ تک محدود رہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سارے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے نہایت چابکدستی سے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ امرا اور درباریوں کو اعزاز و خطابات سے نوازا۔ ان کی جاگیروں اور مراتب میں معقول و مناسب

اضافے کیے۔ دوسرے لفظوں میں ان سب کے منہ بند کر دیے اور اس کے بعد اپنے لیے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

برسات شروع ہو چکی تھی۔ اس موسم میں تو معرکہ آرائی اور بھاری لشکر کو لے کر آگے بڑھنے سے گریز کیا جاتا ہے لیکن علاؤالدین نے اس موسم کی بھی پروا نہیں کی۔ دیوگڑھ سے لائی ہوئی تمام دولت ہمراہ لی اور دہلی کی راہ پکڑی۔ اس کا لشکر کیا تھا موتی برساتا ہوا بادل تھا۔ اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں یوں لٹاتا چلا جا رہا تھا جیسے ان میں اشرفیاں نہ ہوں ریت بھری ہو۔ گراں قدر سامان سے لدی ہوئی قطاروں کی قطاریں لوگوں کو تحفے میں دے دیتا تھا۔

اس سخاوت کا شہرہ پھیلا تو قریب کی بستیوں کے لوگ لشکر در لشکر اس کی بارگاہ میں جمع ہونے لگے۔ جتنا لشکر لے کر چلا تھا اس سے زیادہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ ان میں پیشہ ور سپاہی بھی تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو محض انعام کے لالچ میں اس کے ساتھ ہو لیے۔

یہ بے ترتیب سا لشکر ایسا تھا کہ کوئی بھی منظم فوج ڈھنگ سے اس پر حملہ آور ہوتی تو ضرور اسے ہزیمت اٹھانی پڑتی لیکن اس کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ سلطان رکن الدین ابراہیم کا لشکر اس کے سامنے آیا لیکن سلطان کی ناتجربہ کاری نے کام بگاڑ دیا۔ وہ خود اس لشکر کے ہمراہ نہیں آیا بلکہ اپنے امیروں اور اراکین سلطنت کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ امرا و اراکین کے درمیان پہلے ہی پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی سلطان کے ساتھ نہیں تھا۔ بدایوں پہنچتے ہی یہ امرا لشکر سمیت علاؤالدین سے آملے۔ علاؤالدین نے ان پر دولت کی بوچھاڑ کر دی۔

اس کے لشکر میں مزید ساٹھ ہزار افراد کا اضافہ ہو گیا۔

ملکہ جہاں اپنا دربار سجائے بیٹھی تھی اور مطمئن تھی کہ علاؤالدین کا عمل دخل دہلی سے دور ہے، وہ خود اس کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ اس کے مشیروں نے اسے یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ علاؤالدین دہلی کی طرف بڑھنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری کہ دہلی سے بھیجا ہوا لشکر جنگ کیے بغیر ہی علاؤالدین کے ساتھ مل گیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ جو کام اسے پہلے کرنا تھا وہ اب کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے ایک شخص کو ملتان کی طرف دوڑایا تاکہ وہ ارکلی خاں کو اپنے ہمراہ دہلی لائے۔ اگر وہ یہ قدم پہلے اٹھا لیتی تو حالات کچھ اور ہوتے۔ سلطان جلال الدین کا اقتدار ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ ارکلی خاں حالات سنبھال لیتا لیکن اب اس نے کہلوا دیا۔

''اب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ فوج دشمن سے مل گئی۔ شاہی خزانے میں اتنی دولت نہیں رہی کہ سپاہیوں کو چھ ماہ کی تنخواہ بھی پیشگی دی جا سکے۔ دوسری جانب علاؤالدین ہے، جو اشرفیاں بارش کی طرح برسا رہا ہے۔ ایسے میں میرے آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو آپ نے کیا ہے اب خود ہی اس سے نمٹنے کی کوشش کریں۔''

علاؤالدین کو اس صورت حال کا علم ہوا تو دہلی پہنچنے میں سرعت سے کام لیا۔ دریائے جمنا کو پار کیا اور خیمہ زن ہو گیا۔ یہ ایک میدان تھا جس کے ایک طرف دریا دوسری جانب باغ تھا۔ شہر دہلی میں اس اطلاع سے بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر شہری کی آنکھ شاہی فوج کی طرف لگی ہوئی تھی کہ کب وہ اس کے مقابلے کے لیے نکلتی ہے۔ اگر دیر ہوئی اور علاؤالدین کی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں تو بڑی لوٹ مار مچے گی۔ دہلی کے تمام دروازے بند کر لیے گئے تھے۔ گلیاں سنسان، گھر خاموش تھے۔

محل میں مشوروں پر مشورے ہو رہے تھے۔ ملکہ جہاں کیسی ہی زیرک سہی، جنگی معاملات کو وہ کیا جان سکتی تھی۔ بالآخر امیروں کے مشورے سے سلطان رکن الدین لشکر لے کر نکلنے کو تیار ہوا لیکن اس کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ اب بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہے۔

اہل دہلی ابھی جلال الدین کے قتل کا صدمہ فراموش نہیں کر سکے تھے۔ وہ علاؤالدین کو قاتل سمجھ کر اس کی طرف سے نفرت محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے جنگ کی تیاریاں دیکھیں تو خوش ہوئے کہ سلطان کا بدلہ لینے والا کوئی تو ہے لیکن ان کی خوشیاں دیرپا ثابت نہیں ہوئیں۔

سلطان، علاؤالدین کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلا ضرور لیکن علاؤالدین کا لشکر کثیر دیکھ کر بزدلی کا مظاہرہ کر بیٹھا اور اپنے امیروں سے واپس چلنے کا تقاضا کرنے لگا۔ اس کے امیروں نے اس کی مخالفت کی۔ وہ سب کٹ مرنے کو تیار تھے لیکن سلطان کی بزدلی غالب آئی۔ اس کے امیر بھی مجبور ہو گئے۔ وہ واپس لوٹا اور دہلی میں شہر بند ہو گیا۔

اس کے امیر دہلی واپس آنے کے بعد بھی اسے مقابلے کے لیے تیار کرتے رہے لیکن وہ ملکہ جہاں کے پاس جا کر چھپ گیا۔ وہ اپنے بھائی ارکلی خاں کی طرح کسی جنگ میں شریک ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ جنگ کیا ہوتی ہے جبکہ امیروں کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ ملکہ جہاں کے ہاتھ سے بھی اب بساط نکل چکی تھی۔ ارکلی خاں

آنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان رکن الدین بادشاہ ہوتے ہوئے، لشکر اور امیروں کا ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے دفاع میں کچھ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

پدما بیگم کو اس رات طغرل بیگ کی بہت یاد آئی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو بادشاہت چھیننے کا کیسا سنہری موقع تھا۔ نئے سلطان کو قتل کرنا کتنا آسان ہے۔ اس وقت تو ملکہ جہاں کو بھی کسی کے سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ خود دیکھ چکی تھی کہ نیا سلطان بچوں کی طرح ماں کے پاس دبکا بیٹھا ہے اور وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہے۔

جس رات وہ یہ سوچ رہی تھی اس کے بہت سے امرا بھی کچھ سوچ رہے تھے۔ ڈوبتے ہوئے جہاز میں کوئی بھی بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ اس کے امیروں نے یہی سوچا۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے شہر کے دروازے کھلوائے اور علاؤالدین کے کیمپ میں پہنچ گئے۔

صبح ہوئی اور سلطان پر یہ راز کھلا تو اس کے لیے سوائے فرار کے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ اس نے اپنی ماں، بہنوں اور خزانے کا تھوڑا بہت حصہ جو ہاتھ لگا، لیا اور ملتان کی طرف بھاگ گیا۔ چند امیر بھی اس کے ساتھ تھے جن میں ملک حبیب احمد سب سے نمایاں تھا۔

علاؤالدین اس وقت سیری کے جنگل میں قیام کیے ہوئے تھا۔ اس کا لشکر بھی اسی جنگل میں تھا۔

دن کی دھوپ چمکی اور شہریوں کو معلوم ہوا کہ ان کا بادشاہ انہیں چھوڑ کر جا چکا ہے تو انہیں اپنی جانوں کی فکر ہوئی۔ انہوں نے سوچا، علاؤالدین کو روکنے والی اب کوئی طاقت نہیں رہ گئی۔ اس کا لشکر اب شہر میں گھس کر قتل و غارت گری کرے گا۔ خیریت اسی میں ہے کہ اپنی وفاداریاں ظاہر کی جائیں تاکہ اس کا غصہ کچھ کم ہو۔ شہر کے تمام شرفا اور رؤسا اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علاؤالدین سے تخت سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ عہد بھی لیا کہ شہریوں کو کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔

اس کے بعد لوگوں نے عجیب منظر دیکھا۔ علاؤالدین کے ساتھ آئے ہوئے ہاتھی جب شہر میں داخل ہوئے تو ان پر بیٹھے ہوئے لوگ سونا اور اشرفیاں اس طرح لٹا رہے تھے جیسے کوئی کاغذ کے پرزے اڑاتا ہے۔ جو جتنا لوٹ سکتا ہے لوٹ لے۔ لٹانے والے اتنا لٹا رہے تھے کہ کوئی ہاتھ خالی نہیں رہا۔ لوگوں کے دلوں سے جلال الدین خلجی کی موت کا غبار بہتا رہا۔

علاؤالدین نہایت تزک و احتشام سے دہلی میں داخل ہوا۔ اہل دہلی اس طرح استقبال کر رہے تھے جیسے وہ ان کے لیے کوئی جنگ جیت کر آیا ہو۔

تخت نشینی کے بعد وہ ''کوشک لعل'' گیا۔ یہاں ایک کمرے سے ایک عورت کی لاش ملی جس کے سینے میں خنجر اترا ہوا تھا۔ اسے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ یہ پدما بیگم تھی جس نے اپنا انجام دیکھ کر شاید خودکشی کر لی تھی۔

''کاش! میں اس کی بے وفائی کی سزا اپنے ہاتھ سے اسے دیتا جس طرح طغرل بیگ کو اس کی نمک حرامی کی سزا میں نے سنائی تھی۔ اگر اس طرح کے بے وفا جلال الدین کے اردگرد نہ ہوتے تو وہ کبھی میری تلوار کی زد میں نہ آتا۔'' علاؤالدین نے اپنے قریب کھڑے لوگوں سے کہا اور حکم دیا کہ اسے کہیں دفنا دو۔

یہ راز پھر بھی نہ کھل سکا کہ ملکہ جہاں اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئی، اس نے خودکشی کی یا کسی نے اسے قتل کیا؟

اسی کوشک لعل میں بیٹھ کر اس نے جشن مسرت منعقد کیا جو تین روز تک جاری رہا۔ رعایا نے بھی اس خوشی میں حصہ لیا اور شہر کو سجا کر اور عیش و عشرت کی محفلیں برپا کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ دہلی کے گلی کوچے عشرت کدے بنے رہے۔

علاؤالدین خلجی نے نظم مملکت کے لیے امرا کو مختلف کام تجویز کیے اور انہیں خطابات سے نوازا۔ ان میں وہ امرا بھی تھے جو جلال الدین کے عہد سے چلے آ رہے تھے اور اچھی شہرت کے مالک تھے۔

اسے اس وقت تک اطمینان میسر نہیں ہو سکتا تھا جب تک ارکلی خاں کی تلوار لٹک رہی تھی جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بادشاہ کا خاندان ارکلی خاں کے پاس ملتان پہنچ چکا ہے۔

اس نے الماس بیگ کو چالیس ہزار سواروں کے لشکر کے ساتھ ملتان کی طرف روانہ کیا۔ اس لشکر نے ملتان پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔

ارکلی خاں بہادر ہونے کے باوجود یہ ہمت نہ کر سکا کہ باہر نکل کر مقابلہ کرتا۔

یہ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا۔

یہاں بھی وہی صورت حال پیش آئی جو دہلی میں پیش آ چکی تھی۔ اہل ملتان اور ملتانی لشکر نے ارکلی خاں اور سلطان رکن الدین کا ساتھ چھوڑ دیا اور علاؤالدین کے امیروں کے ساتھ مل گئے۔

اب صلح کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ ارکلی خاں اور سلطان رکن الدین، دونوں بھائی ملتان کے شیخ طریقت شیخ رکن الدین کی خدمت میں پہنچے۔ ان کی

سفارش ہوئی تو الماس بیگ ان دونوں بھائیوں سے ملاقات کے لیے تیار ہوگیا۔ الماس خاں نے ان دونوں بھائیوں کی نہایت تکریم کی۔

ارکلی خاں، رکن الدین ابراہیم اور جلال الدین خلجی کے وہ امرا جو بھاگ کر ملتان آگئے تھے، الماس بیگ کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے۔ الماس بیگ نے دہلی روانہ ہونے سے پہلے تیز رو قاصدوں کے ذریعے فتح نامہ علاؤ الدین کے پاس روانہ کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں علاؤ الدین نے ملک نصرت الدین کوتوال کو خاص ہدایات دے کر ملتان کی طرف روانہ کیا۔ الماس بیگ راستے میں تھا کہ ملک نصرت، علاؤ الدین کی ہدایات لے کر پہنچ گیا۔ ان ہدایات کے مطابق جلال الدین خلجی کے دونوں بیٹوں اور داماد الغو خاں کی آنکھوں میں لوہے کی سلائیاں پھیر دی گئیں اور ہانسی کے قلعے میں قید کر دیا۔ تمام امرا کو بھی اسی قلعے میں رکھا گیا۔ ان امیروں میں ملک حبیب احمد بھی تھا۔ شاہی حرم کو مع ملکہ جہاں دہلی لا کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

جلال الدین خلجی کے خانوادے کی تباہی نے علاؤ الدین خلجی کے رعب اور دبدبے میں ایسا اضافہ کیا کہ آس پاس کے امیر اور حکمران اس کے نام سے تھرانے لگے۔ اس کی فوج جس طرف کا رخ کرتی کامرانی اس کے قدم چومتی۔

ان کامیابیوں نے اس میں ایسا اعتماد پیدا کر دیا کہ اب اسے ان امیروں کی بھی ضرورت نہیں رہی جو سلطان ابراہیم سے بے وفائی کر کے علاؤ الدین کے ساتھ آملے تھے یا ملتان میں ارکلی خاں کو چھوڑ کر علاؤ الدین سے مل گئے تھے۔ اس وقت علاؤ الدین نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی تھی لیکن اب اسے ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے ان سب امیروں کو گرفتار کیا۔ بیشتر کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیری گئیں اور بہت سوں کو مختلف قلعوں میں قید کر دیا گیا۔ ان کے مال و دولت پر بھی قبضہ کر لیا گیا جو بیشتر علاؤ الدین ہی کا دیا ہوا تھا۔

علاؤ الدین خلجی سمجھ گیا تھا کہ فتنوں کو دبانے کے لیے تندخوئی اور جبر و زیادتی سے کام لیا جاتا ہے۔ شاہی رعب اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب سزائیں بھرپور ہوں۔ شاید اس نے یہ خیال اس لیے قائم کر لیا تھا کہ اس کا مربی اور چچا جلال الدین خلجی نہایت نرم دل اور صلح جو تھا۔ بڑے سے بڑے مجرم کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا کرتا تھا۔ بعد میں یہی مجرم کسی بہت بڑے فتنے کا سبب بنتے تھے۔ خود علاؤ الدین اس کی مثال تھا۔ جلال الدین نے اس کے بارے میں بے جا غفلت کا مظاہرہ کیا تھا اور بالآخر اپنی جان سے چلا گیا۔

علاؤ الدین نے اس غلطی کو کبھی نہیں دہرایا لیکن غلطیاں خود بھی تو اپنے آپ کو دہراتی ہیں۔

سیدی مولہ کو جس وقت قتل کیا گیا تھا تو ان کی زبان سے نکلا تھا۔

”تم یہ یاد رکھو کہ میرا لہو ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا اور اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور پڑے گا۔“

یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ جلال الدین خلجی کا خاندان تنکوں کی طرح بکھر گیا۔ ایک بیٹا قضائے الٰہی سے فوت ہوا۔ باقی دونوں بیٹے اندھے کر دیے گئے اور قیدی بنا لیے گئے۔ داماد کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئیں۔ ملکہ جہاں جس کے سامنے جلال الدین بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا، قید خانے کی اندھیر کوٹھری میں مر گئی۔ جاں نثار امرا یا تو جان سے گئے یا کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر بھیک مانگتے پھرے۔

غلطیاں خود بھی اپنے آپ کو دہراتی ہیں۔ جو غلطیاں جلال الدین سے سرزد ہوئی تھیں، علاؤ الدین بھی ایک عرصہ حکومت کرنے کے بعد وہی غلطیاں کرنے لگا۔ بہت سے ایسے کام سرزد ہونے لگے جو اس کی سلطنت اور خاندان کے زوال کا باعث بنے۔ اس کا خاندان بھی اسی طرح تتر بتر ہوا جس طرح جلال الدین خلجی کا خاندان اجڑا تھا۔

جس زمانے میں علاؤ الدین خلجی کی اولاد پر اپنوں اور بیگانوں کے ہاتھوں مظالم ہو رہے تھے ان دنوں کسی شخص نے شیخ بشیر مجذوب سے سوال کیا، علاؤ الدین خلجی کے خاندان کی تباہی و بربادی کا سبب کیا ہے؟

بشیر مجذوب نے جواب دیا۔ ”یہ سب اسی نمک حرامی کا وبال ہے جو علاؤ الدین خلجی نے اپنے چچا اور مہربان آقا جلال الدین خلجی سے کی تھی۔“

♥♥♥

ماخذات

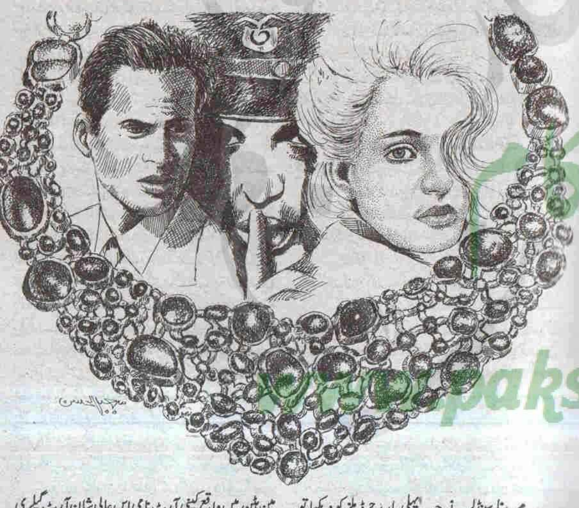
تاریخ فرشتہ، ترجمہ مشفق خواجہ۔ طبقات اکبری، ترجمہ محمد ایوب قادری۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی

جرمِ محبت

کاشف زبیر

قدرتی طور پر محبت میں وہ کشش اور قوت ہے جو قطروں کی صورت میں بھی پتھر میں گھر کر سکتی ہے... محبت ایک ایسا آسیب ہے جس سے ہزار کوششوں کے باوجود فرار ممکن نہیں... عشق اک ایسا حصار جس میں انسان قید ہو کر بھی خوش رہتا ہے... وہ جو وحشت جنوں میں عجیب فیصلے کیے بیٹھی تھی، ایک روز ریت کی دیوار کے مانند ڈھے گئی... وہ جو مجرم کی تلاش میں سرگرداں تھی خود ہی جرم محبت کر بیٹھی... اور اس جرم کی اسے سزا تو ملنی ہی تھی۔

دلوں میں ہلچل مچاتی اور مہکتے جذبوں سے معمور محبت کی کارفرمائیاں



مرینا سینڈلر نے جب پہلی بار رچرڈ ملز کو دیکھا تو اسے لگا یہی وہ آدمی تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ رچرڈ تقریباً چالیس برس کا خوبرو اور اسمارٹ نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے اعلیٰ درجے کا سی گرین سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ اس وقت مین ہٹن میں واقع کینی آرٹ نامی اس عالی شان آرٹ گیلری کے ایک ہال میں موجود تھا۔ مرینا کے ساتھ موجود جاسوس پولیس افسر جرمی کون نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”رچرڈ کا شمار آرٹ کی دنیا سے تعلق رکھنے والے چند امیر ترین افراد میں

ہوتا ہے۔ ڈائنا آرٹ اسی کی ملکیت ہے۔"

مرینا جانتی تھی ڈائنا آرٹ کا شمار صرف امریکا نہیں بلکہ دنیا کی چند بڑی آرٹ کمپنیوں میں ہوتا تھا۔ ڈائنا آرٹ نہ صرف فن پاروں کی تجارت کرتی تھی بلکہ یہ آرٹ کی نمائشوں اور سیمینارز کا انعقاد بھی کرتی تھی۔ ڈائنا آرٹ رچرڈ ملز کی ماں ڈائنا ملز نے قائم کی تھی۔ وہ خود بھی ایک اچھی مصورہ تھی لیکن اس سے بڑھ کر وہ اچھی بزنس وومین تھی۔ اس نے صرف ایک ملین ڈالرز کے سرمائے سے یہ کمپنی قائم کی تھی اور آج ڈائنا آرٹ کے اپنے اثاثوں کی مالیت دو ارب ڈالرز سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس کی سالانہ آمدنی دو سو ملین ڈالرز سے زیادہ تھی۔ رچرڈ ملز اس کا واحد مالک تھا۔ مرینا غور سے رچرڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ خوب صورت مرد جو پہلی ہی نظر میں اس کے دل کو بھا گیا تھا، ایک مبینہ مجرم تھا۔

دو دن پہلے کینی آرٹ میں ایک نمائش کے دوران ایک صدی پہلے بنائی گئی ایک مشہور تصویر چوری ہو گئی۔ چوری بھی عجیب سے انداز میں ہوئی، پیشہ ور قسم کے آرٹ چوروں کا ایک گروہ عین نمائش کے وقت گیلری میں داخل ہوا اور اس نے کیمرے ناکارہ بناتے ہوئے تصویروں والے ہال کے اوپر بلٹ پروف شیشے کو اڑانے کے انتظامات کر لیے تھے کہ عین موقعے پر سیکیورٹی والوں نے انہیں پکڑ لیا اور ہنگامی حالات کا سائرن بجا دیا جس کا مطلب تھا کہ گیلری فوراً خالی کر دی جائے۔ الارم بجتے ہی حفاظت کا خودکار نظام حرکت میں آ گیا اور ہال میں آمد و رفت کے تمام راستوں پر بہت مضبوط فولادی گرلز آ گری تھیں۔ مگر جب پولیس چوروں کو قابو کر کے لے جا رہی تھی تو ایک فولادی گرل کو کھلا پایا گیا۔ یہ فرش سے صرف ایک فٹ اوپر رک گئی تھی اور اسے روکنے کے لیے ایک فولادی اینٹ استعمال کی گئی تھی جو ایک عام سے لیدر بریف کیس میں بند تھی۔ بریف کیس عین اس جگہ رکھا تھا جہاں جالی آ کر گرتی اور فولادی اینٹ نے جالی کو پوری طرح گرنے نہیں دیا اور اس کے نیچے اتنا خلا رہا جس سے ایک شخص آرام سے نکل سکتا تھا۔ جب گرل اوپر کی گئی تو مرکزی ہال سے سب سے مہنگی تصویر اپنے فریم سے غائب تھی۔

دو دن پہلے مرینا لندن میں تھی۔ وہ ایک آرٹ انشورنس کمپنی میں جاسوس کے طور پر کام کرتی تھی۔ یہ کمپنی دنیا بھر میں مہنگے ترین نوادر کی انشورنس کرتی تھی۔ کینی آرٹ سے غائب ہونے والی تصویر بھی اسی نے انشورنس کر رکھی تھی اور اس کی قیمت ایک سو اسی ملین ڈالرز بنتی تھی۔ اگر تصویر بازیاب نہ ہوتی تو انشورنس کمپنی آرٹ گیلری کو ایک سو اسی ملین ڈالرز ادا کرنے کی پابند تھی۔ مرینا کو حکم ملا کہ وہ پہلی پرواز سے نیویارک روانہ ہو جائے اور نیویارک پولیس کے ساتھ مل کر تصویر کی بازیابی کی کوشش کرے۔ مرینا رات گیارہ بجے نیویارک پہنچی تھی۔ ایرپورٹ پر جرمی کون اور اس کا ساتھی جوزف گارنر استقبال کے لیے موجود تھے۔ تعارف کے بعد وہ باہر آئے اور انہوں نے اسے ہوٹل چھوڑا جہاں مرینا کے لیے کمرا مخصوص تھا۔

اگلے دن وہ دفتری اوقات کے مطابق پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی تو جرمی اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ کسی قدر موٹے اور معصوم نقوش والا جوان پولیس افسر تھا۔ مرینا اس کی حیرت دیکھ کر مسکرائی۔ "مجھے اپنا ساتھی سمجھو اور ہو سکے تو یہاں میرے لیے ایک ڈیسک کا بندوبست کر دو۔"

"میرا ڈیسک خاصا بڑا ہے تم چاہو تو اسے شیئر کر سکتی ہو۔" اس نے خلوص سے کہا۔

"تھینک یو۔" مرینا نے اپنا کوٹ اتار کر ہینگر پر لٹکایا۔ "سب سے پہلے میں چوری کی رپورٹ دیکھنا پسند کروں گی۔"

جرمی نے ایک فائل اس کے سامنے رکھ دی۔ مرینا نے فائل کھولتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی مشکوک شخص سامنے آیا ہے؟"

"ہم نے جن چار افراد کو چوری کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کیا ہے انہوں نے کسی پانچویں شخص کی موجودگی کا اعتراف نہیں کیا ہے۔"

"چوری کی کوشش۔" مرینا نے حیرت سے کہا۔ "چوری ہو چکی ہے اور میں اسی لیے یہاں موجود ہوں۔"

"ہاں لیکن تصویر ان کے پاس سے نہیں نکلی ہے۔ کیمرے ناکارہ ہونے تک تصویر اپنی جگہ موجود تھی۔ اس کے مشکل سے دو منٹ بعد ان چاروں کو پکڑ لیا گیا تھا۔ اس وقت تک ہنگامی حالات کا الارم بھی نہیں بجا تھا اور تصویر والے ہال میں تقریباً پچاس تماشائی موجود تھے۔ تصویر ان چاروں کی گرفتاری کے بعد غائب ہوئی ہے اور ہمارے پاس ایک مشکوک آدمی ہے۔"

مرینا چونک گئی۔ "مشکوک آدمی؟"

"رچرڈ ملز... وہ نمائش کے دونوں دن گیلری میں موجود تھا۔"

"شک کے لیے صرف یہ وجہ کافی نہیں ہے۔"

جرمی نے گہرا سانس لیا۔ "پولیس کو رچرڈ پر خاصے عرصے سے شک ہے کہ وہ نایاب پینٹنگز کی چوریوں میں ملوث ہے۔ لیکن ہم آج تک اس کے خلاف کارروائی کے لیے کوئی جواز تلاش نہیں کر سکے۔ جن چوریوں کا اس پر شک کیا جا رہا ہے وہ بہت مہارت سے چوری کی گئی ہیں۔"

"یعنی صرف سابق شک کی بنیاد پر اس چوری کا شک بھی رچرڈ ملز پر کیا جا رہا ہے؟"

"یہی بات ہے۔" جرمی نے اعتراف کیا۔ "اس چوری سے رچرڈ کا تعلق ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی معمولی سی شہادت بھی نہیں ہے۔"

"میں گیلری دیکھنا چاہوں گی۔" مرینا نے کہا۔ "اور کیا پولیس کے آدمی رچرڈ کی نگرانی کر رہے ہیں؟"

"چوری کا انکشاف ہونے کے ایک گھنٹے بعد ہی سادہ لباس اہلکاروں نے اس کی مستقل نگرانی شروع کر دی تھی۔" جرمی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تم رپورٹ دیکھو، ہم لنچ کے بعد گیلری چلیں گے۔"

لنچ انہوں نے ایک چھوٹے ریستوران میں کیا جو کینی آرٹ کے قریب ہی تھا۔ جرمی کو دوران لنچ کال موصول ہوئی۔ "اچھا وہاں موجود ہے؟ ٹھیک ہے اس پر نظر رکھو۔"

"کیا ہوا؟" مرینا نے پوچھا۔

"رچرڈ ملز کینی آرٹ میں موجود ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" مرینا نے پروم منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ لنچ کرتے ہی کینی آرٹ گیلری کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ مرینا کے پاس یہاں کوئی گاڑی نہیں تھی اس لیے وہ جرمی کے ساتھ ہی جا رہی تھی۔ چوری کے بعد انتظامیہ نے چند گھنٹوں کے لیے مرکزی ہال بند رکھا لیکن وہ اس سے زیادہ دیر اسے بند نہیں رکھ سکتے تھے۔ پولیس نے اس جگہ کو پیلی پٹیاں لگا کر سیل کر دیا تھا جہاں چوری ہونے والی تصویر لگی تھی۔ لوگوں کو پٹیوں کے پاس آنے سے روکنے کے لیے وہاں ایک پولیس مین موجود تھا۔ جس وقت جرمی اور مرینا وہاں پہنچے تو کچھ زیادہ ہی ہجوم تھا۔ چوری کے واقعے کے بعد لوگ کہیں زیادہ تعداد میں گیلری کا رخ کر رہے تھے۔ ہال کی طرف جاتے ہوئے جرمی ایک کمرے کے سامنے رکا اور اس نے رچرڈ ملز کی جانب اشارہ کیا۔ مرینا اسے دیکھ کر ساکت رہ گئی۔ رچرڈ کمرے میں گیلری کے منیجر روپرٹ شا سے بات کر رہا تھا۔ مرینا نے جرمی کی طرف دیکھا۔ "یہ ارب پتی ہے۔"

جرمی اس جملے میں چھپا سوال سمجھ گیا۔ "پولیس کا خیال ہے یہ اپنی تسکین کے لیے تصویریں چراتا ہے۔ جو تصویر اسے پسند آتی ہے یہ پہلے اسے خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور جب ناکام ہو تو اسے چرا لیتا ہے۔ اتفاق سے اس قسم کی جتنی چوریاں ہوئیں ان میں پہلے رچرڈ نے منہ مانگے داموں ان تصاویر کو خریدنے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے پولیس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔"

"یہ پیشہ ور چور نہیں ہے۔"

اس بار بھی جرمی چھپا سوال سمجھ گیا کہ رچرڈ پیشہ ور چور نہیں تھا تو وہ تصویر چرانے کے لیے اتنے زبردست منصوبے کیسے بنا لیتا ہے؟ "وہ اسی بزنس سے تعلق رکھتا ہے اور تمام حفاظتی انتظامات اس کی نظروں میں ہوتے ہیں۔ ذہانت کی اس کے پاس کمی نہیں ہے۔ اس کا تعلق زیر زمین دنیا سے ہے اس لیے ماہرین کی بھی کمی نہیں ہے۔"

مرینا نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ "جرم کی منصوبہ بندی آدمی خود کرتا ہے کسی سے کرواتا نہیں ہے۔"

"ان چار افراد کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جرمی نے کہا۔ "وہ اپنا منہ بند رکھے ہوئے ہیں اور ابھی تک انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا ہے۔"

"انہیں کتنی سزا ہونے کا امکان ہے؟"

جرمی نے شانے اچکائے۔ "اگر ڈسٹرکٹ اٹارنی نے بہت زور لگایا تو دو سال یا زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال سزا ہو گی۔"

"اگر ان چاروں کو پانچ ملین ڈالرز فی کس دے دیے جائیں تو یہ دو سال ہنسی خوشی جیل میں گزار لیں گے۔" مرینا نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ جرمی نے اس کے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی، اس نے دیکھ لیا تھا کہ مرینا کا رخ رچرڈ کی طرف تھا۔ اب وہ اسی کمرے میں ایک تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس میں ایک آدمی کے چہرے کی جگہ بڑا سا سرخ گلاب بنا ہوا تھا۔ مرینا، رچرڈ کے برابر میں جا کھڑی ہوئی۔ رچرڈ اور مرینا کے علاوہ بچوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی تھی جو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق تصویروں پر تبصرے کر رہی تھی۔

"مصور نے غلط عکاسی کی ہے۔" مرینا نے اچانک کہا۔ "گلاب آدمی کے دل میں ہوتا ہے جیسے کانٹا آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اسے سر کی جگہ دکھانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم نے مجھ سے کہا؟" رچرڈ نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے تبصرہ کیا ہے، ویسے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کیا ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں؟"

مرینا نے رچرڈ کی طرف دیکھا۔ "مجھے مرینا سینڈلر کہتے ہیں۔"

رچرڈ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔ ”رچرڈ ملز...“

مرینا دوبارہ تصویر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اچھی نقل ہے۔“

رچرڈ نے اس بار چونک کر دیکھا تھا۔ ”تمہارے خیال میں یہ نقل ہے؟“

مرینا مڑ کر واپسی کے لیے چل پڑی تھی۔ رچرڈ اس کے پیچھے آیا۔ ”سنو، تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو، کیا تم آرٹ کے بارے میں جانتی ہو؟“

”ہاں اس آرٹ کے بارے میں جو چوری ہو جاتا ہے۔“ مرینا بولی۔ وہ گیلری سے باہر نکل آئے تھے۔

”میں تم سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟“ رچرڈ نے کہا۔

مرینا کے اشارے پر ایک ٹیکسی سامنے آ کر رکی اور رچرڈ نے اس کے لیے دروازہ کھولا، وہ اندر بیٹھ گئی۔ ”کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں... ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے، آج رات...“ اس نے جگہ بتائی۔

مرینا مسکرائی۔ ”میں آجاؤں گی۔“

”میں انتظار کروں گا۔ سات بجے شام کو۔“ رچرڈ نے کہا اور ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد مرینا پولیس ہیڈ کوارٹر میں جرمی اور جوزف کے ساتھ تھی۔ جرمی اس کی بات سن رہا تھا۔

”وہ تم سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

جوزف ہنسا۔ ”دوست ......نرے پولیس والے ہو۔ اگر رچرڈ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی مرینا سے ملنا اور اسے ڈنر پر بلانا چاہتا۔“

جرمی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رچرڈ کے ساتھ مختلف اوقات میں مختلف عورتیں نظر آتی ہیں لیکن وہ عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا شخص نہیں ہے۔ مرینا تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔“

”میں محتاط رہوں گی۔“ مرینا بولی۔ ”مجھے تمہاری بات درست لگ رہی ہے، رچرڈ نے مجھے صرف اس لیے نہیں بلایا ہے کہ میں ایک خوبصورت عورت ہوں۔“

”تم نے پولیس رپورٹ دیکھی؟“

”ہاں اس میں واحد کام کا نکتہ جو مجھے دکھائی دیا۔ وہ یہ کہ ایک سال پہلے رچرڈ نے اس تصویر کو ایک سو پچاس ملین ڈالرز کے عوض خریدنے کی پیش کش کی تھی۔“

☆☆☆

مرینا اسپینشیا کے ڈائننگ ہال میں نمودار ہوئی تو ایک لمحے کو ہر نظر اس پر جم گئی۔ اس نے سرخ رنگ کا خوب صورت ریشمی لباس پہن رکھا تھا جو اس کے دلکش وجود پر سرسراتا ہوا اسے پوری طرح نمایاں کر رہا تھا۔ اس نے بال جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ گلے میں تین لڑی والا سچے موتیوں کا ہار تھا اور کلائی میں کسی چمکدار دھات کا بنا ہوا سادہ کنگن تھا۔ اس سادگی میں بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی نظریں رچرڈ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک کسی نے عقب سے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ”خوش آمدید۔“

وہ چونکی، رچرڈ اس کے پاس کھڑا تھا جو اس کا منتظر تھا۔ ایک ویٹر نے ریزرو میز تک ان کی رہنمائی کی۔ رچرڈ نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“

”شکریہ۔“ وہ ہنسی۔

رچرڈ ذرا آگے جھکا۔ ”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم برٹش ہو؟“

ویٹر نے ان کے سامنے ڈنر سے پہلے کے جام رکھے۔ مرینا نے اپنا گلاس اٹھا لیا۔ ”ہاں میں دو دن پہلے ہی نیو یارک آئی ہوں۔“

”سیر و تفریح کے لیے؟“

”نہیں، کام سے۔“ مرینا نے جواب دیا۔ ”تین دن پہلے گینی آرٹ سے جو تصویر غائب ہوئی ہے مجھے اس کی بازیابی کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

رچرڈ کے تاثرات معمول کے مطابق تھے۔ ”تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہو؟“

”نہیں، میں انشورنس کمپنی کی جاسوس ہوں۔“

رچرڈ نے اس بار بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ڈشز سرو ہونا شروع ہو گئیں اور وہ کھانے لگے۔ مرینا نے درمیان میں سونف کی وائن لی۔ رچرڈ نے پوچھا۔ ”تو یہ وجہ ہے کہ تم آرٹ کے بارے میں جانتی ہو؟“

”ایک وجہ یہ بھی ہے۔“ مرینا نے کہا۔ ”ڈنر بہت اچھا ہے۔ میری زندگی کے چند بہترین ڈنرز میں سے ایک ہے۔“

رچرڈ اس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا جو کسی قسم کی انگوٹھی سے خالی تھا۔ ”ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“

”تم شادی شدہ رہی ہو؟“

”ایک بار۔“ مرینا نے گلاس گھماتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے لیکن شادی کے ایک مہینے بعد ہی یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک ذاتی سوال میں بھی کر سکتی ہوں؟“

”ضرور۔“

”تم بھی شادی شدہ رہے ہو؟“

”ہاں، میں بھی ایک بار شادی شدہ رہا ہوں لیکن ہمارے درمیان علیحدگی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ٹرمنل کینسر ہو گیا تھا اور پتا بہت دیر سے چلا۔ اس کے بعد میں نے شادی نہیں کی۔“

”اوہ...... افسوسناک۔“ مرینا نے رسمی انداز میں کہا۔

ڈنر کے بعد رچرڈ اسے ہوٹل چھوڑنے گیا۔ راستے میں اس نے اس عمارت کے سامنے گاڑی روکی جس میں اس کا دو منزلہ اپارٹمنٹ تھا۔ یہ سینٹرل پارک کے سامنے تھا۔ ”یہ میرا گھر ہے۔ اندر سے دیکھو گی؟“ رچرڈ کے انداز میں التجا تھی۔

مرینا نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”ابھی نہیں پھر سہی۔“

رچرڈ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے پاس بی ایم ڈبلیو کا نیا ماڈل تھا۔ وہ جتنا دولت مند تھا، اتنا لگتا نہیں تھا۔ ہوٹل کے سامنے رچرڈ نے گاڑی روکی۔ ”پھر ملاقات کب ہو گی؟“

”ابھی تو میں مصروف ہوں۔“ مرینا نے کہا۔

”ممکن ہے میں بھی تمہاری مصروفیت میں شامل ہو جاؤں۔“

”کیا مطلب؟“ مرینا اترتے اترتے رک گئی۔

”کل پولیس ہیڈ کوارٹر میں مجھے طلب کیا گیا ہے۔“

☆☆☆

مرینا شیشے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی جرمی اور جوزف، رچرڈ سے بات کر رہے تھے۔ رچرڈ نہایت سکون سے ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ پر ہجوم ہال کے ایک گوشے میں بیٹھے بہ ظاہر گپ شپ کر رہے تھے۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان میں سے ایک مبینہ ملزم ہے۔ نصف گھنٹے بعد رچرڈ کو جانے کی اجازت مل گئی اور وہ اٹھ کر ہیڈ کوارٹر سے نکل گیا۔ مرینا اسے کھڑکی سے جاتا دیکھ رہی تھی۔ رچرڈ نے سڑک پار کی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ جرمی دفتر میں آیا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”کیا رہا؟“ مرینا نے پوچھا۔

”کتیا کا بچہ۔“ جرمی غرایا۔ ”اس نے کوئی موقع نہیں دیا۔“

”وہ بہت ذہین آدمی ہے۔“ کہتے ہوئے مرینا کے لہجے میں ایک انجان سا فخر آ گیا۔ ”جبھی پولیس سالوں سے کوشش کے باوجود اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ جرمی شکست خوردہ انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

”تم اپنی ہار مان رہے ہو؟“ مرینا کا لہجہ چیلنج کرنے والا تھا۔

”اگر میں ہار مان لوں تو تم کیا کرو گی؟“

”میں اپنی کوشش کا آغاز کروں گی۔“

”لیکن میں نے ابھی ہار نہیں مانی ہے۔ میرے آدمی اس کے پیچھے ہیں اور یہ کبھی نہ کبھی ضرور پھنسے گا۔“

”ٹھیک ہے تم کوشش جاری رکھو۔“ مرینا نے اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے نہیں امید کہ تم کامیاب ہو سکو گے۔“

”اس پر چار مختلف تصویروں کی چوری کا شبہ ہے لیکن ایک بار بھی پولیس اس کے خلاف کوئی معمولی سا ثبوت بھی حاصل نہیں کر سکی ہے۔“

”یہی اس کے ذہین ہونے کا ثبوت ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا؟“

”پکڑا جائے گا لیکن اپنی غلطی کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی کمزوری کی وجہ سے...“

”کیسی کمزوری؟“

”ہر انسان میں مختلف کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اگر ہمیں رچرڈ کو پکڑنا ہے تو ہمیں اس کی کوئی کمزوری تلاش کرنی ہو گی۔“

جرمی نے غور سے اسے دیکھا۔ ”مرینا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟“

”میں اسے بتا چکی ہوں کہ میں ایک انشورنس کمپنی کی جاسوس ہوں اور تصویر کی بازیابی کے لیے یہاں آئی ہوں۔“

جرمی کے تاثرات مایوس کن تھے۔ ”اب وہ تمہاری طرف سے محتاط ہو جائے گا۔“

مرینا مسکرائی۔ ”کھیل کا مزہ تو اسی وقت آتا ہے جب اگلا فریق باخبر ہو جائے۔“

☆☆☆

رچرڈ ملز اس وقت مین ہٹن کی ایک معروف تفریح گاہ کے بال روم میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ ڈانس کے دوران وہ سرگوشیوں میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا اور لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اچانک رچرڈ کی نظر چند قدم کے فاصلے پر موجود مرینا پر گئی۔ وہ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ رچرڈ کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے ہاتھ آگے کیا جیسے اس کا ساتھ طلب کر رہی ہو۔ رچرڈ کے ساتھ موجود لڑکی نے مڑ کر مرینا کی طرف دیکھا۔ رچرڈ نے اس کے کان میں

کچھ کہا اور پھر اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ لڑکی نے گھور کر مرینا کو دیکھا اور مڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ اسی وقت دھن بدلی اور مرینا ایک اشارے پر رچرڈ کے بازوؤں میں آگئی۔

"تم اتفاق سے یہاں آئی ہو یا۔۔۔؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

رچرڈ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔ "اگر تم اتفاق سے نہیں بھی آئی ہو تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ ایک میز پر تھے۔ رچرڈ نے ڈرنک منگوائی۔ "تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے پیچھے لگی ہوں؟" مرینا نے پوچھا۔

"کیا یہ بات غلط ہے؟"

"اگر پولیس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میں تمہارے پیچھے ہوں۔"

"اور تمہارا نقطۂ نظر کیا ہے؟"

لیکن مرینا نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے موضوع بدل دیا۔ "تم نے اپنا گھر دکھانے کو کہا تھا۔"

"وہ تم جب چاہے دیکھ سکتی ہو۔"

"تو آج ہی کیوں نہ دیکھ لوں۔"

"لیکن پہلے ڈنر نہ کرلیں؟"

مرینا نے اثبات میں سر ہلایا تو رچرڈ نے اشارے سے ویٹر کو طلب کرلیا اور اسے آرڈر نوٹ کرانے لگا۔ دو گھنٹے بعد وہ رچرڈ کے گھر پہنچے تو اچھے خاصے نشے میں تھے۔ صبح رچرڈ بہت خوش تھا۔ انہوں نے ناشتا فلیٹ کے شاندار ٹیرس میں کیا جہاں سے سامنے دور تک پھیلے سینٹرل پارک کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ سرما میں ٹیرس کو شیشوں سے ڈھک دیا جاتا تھا اس لیے باہر کے موسم کا پتا نہیں چلتا تھا۔ رچرڈ کے کورین نژاد بٹلر جان کومی نے انہیں یہیں ان کی پسند کا ناشتا سرو کیا تھا۔ مرینا ایک گھنٹے تک سونا باتھ میں رہی اور اس وقت خود کو بہت تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ رچرڈ اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے ناشتے کا آغاز کیا اور مرینا کی طرف دیکھا۔ "میرے ساتھ سینٹ لیوسیا چلو گی؟"

"ڈومینیکن ری پبلک۔" مرینا نے آہستہ سے کہا۔

"سیاحت کے لیے؟"

"نہیں، وہاں میرا ذاتی مکان ہے اور میں اپنا سرمایہ بھی وہاں منتقل کر رہا ہوں۔"

"ڈائنا آرٹ بھی؟"

"نہیں، اس کا بزنس یہیں رہے گا۔ میں سینٹ لیوسیا سے ہینڈل کروں گا۔ کچھ عرصے یہاں بھی رہوں گا۔"

"ابھی کس لیے جا رہے ہو؟"

رچرڈ نے صرف شانے اچکائے اور کوئی جواب دینے سے گریز کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "تم ڈیوٹی سمجھ کر چلو۔"

"تم پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی؟"

رچرڈ اورنج جوس پی رہا تھا۔ اس نے گلاس خالی کردیا۔ "کمپنی تمہیں کیا دیتی ہے؟"

"سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈز تنخواہ اور بازیاب ہونے والی تصویر کی مالیت کا پانچ فیصد۔"

"یعنی اگر تم چوری ہونے والی تصویر واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہارے اکاؤنٹ میں تقریباً چار لاکھ اسی ہزار ڈالرز کا اضافہ ہو جائے گا؟"

مرینا نے سر ہلایا۔ "یہ میرے کیریئر کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔"

"تم نے جواب نہیں دیا، میرے ساتھ چلو گی؟"

"یہ تمہاری خواہش ہے؟" مرینا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں۔"

"تب میں سوچوں گی۔"

مرینا شام کو دفتر پہنچی تو جرمی اور جوزف اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے میں مصروف تھے۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"ہم اس کے گھر چھاپا مارنے جا رہے ہیں۔" جرمی نے تند لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ مرینا نے عقب سے کہا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

جرمی پلٹ کر واپس آیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "کیا اس لیے کہ تم رات اسی گھر میں رہی تھیں۔"

"میں کیس کے حوالے سے کہہ رہی ہوں۔" مرینا بولی۔ "تم ناکام رہو گے۔"

جرمی غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ "اگر میں ناکام رہا تب بھی اس حرامزادے کو نہیں چھوڑوں گا۔"

مرینا سمجھنے سے قاصر تھی کہ جرمی کے غصے کی کیا وجہ تھی۔ ایئرپورٹ پر سامنا ہونے کے بعد سے جب بھی جرمی اس کے سامنے آیا تو بظاہر کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی مرینا نے محسوس کیا کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے اور اس دلچسپی کو ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا۔ کیا وہ اس بات پر جل اٹھا تھا کہ مرینا نے گزشتہ رات رچرڈ کے گھر میں گزاری تھی۔ تین گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تو ناکامی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ اس نے فائل مرینا کے سامنے پٹخی اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

''وارنٹ بیکار گیا۔'' اس نے مرینا کی طرف دیکھا۔ ''اب دوبارہ وارنٹ بھی مشکل سے ملے گا۔''

''مجھے معلوم تھا، وہ بہت چالاک آدمی ہے۔''

جرمی نے سر ہلایا۔ ''جب میں وہاں پہنچا تو اس کا اٹارنی بھی موجود تھا اور اس نے دھمکی دی ہے کہ جلد وہ پولیس کو عدالت میں کھینچ لے گا۔''

''میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گا۔ چاہتے تو تم بھی یہی ہو۔''

''ہاں ایک بار معاملہ عدالت میں چلا گیا تو رچرڈ ملزم کے لیے بہت ساری مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ اٹارنی اس لیے موجود تھا کہ مجھے وارنٹ سے تجاوز نہ کرنے دے۔''

مرینا کچھ سوچ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ''پولیس اس طرح تلاشی نہیں لے سکتی جس طرح لینی چاہیے۔''

جرمی نے سرد آہ بھری۔ ''ہم مجبور ہوتے ہیں، ایک حد سے آگے نہیں جاسکتے۔''

''کچھ لوگ مجبور نہیں ہوتے۔'' مرینا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

☆☆☆

رچرڈ کے گھر کے سامنے ایک کلینرز وین کھڑی تھی اس پر ایک معروف کلینرز کمپنی کا نام اور لوگو موجود تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا اور اندر سے جان کومی برآمد ہوا اور ایک طرف چل پڑا۔ اس کے ذرا آگے جاتے ہی وین سے مرینا اتری اور اس کے ساتھ تین افراد مزید اتر آئے، انہوں نے ہاتھوں میں صفائی کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ وہ سڑک پار کر کے فلیٹ کے دروازے تک پہنچے۔ مرینا نے ایک چابی سے داخلی دروازہ کھولا اور وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے اس لیے نشانات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنا سامان وہ دروازے کے ساتھ ہی چھوڑ کر مکان میں پھیل گئے اور منظم انداز میں تلاشی شروع کر دی۔ وہ بہت مہارت اور تیزی سے لیکن احتیاط کے ساتھ تلاشی لے رہے تھے۔ جو چیز جیسے اٹھاتے ویسے ہی رکھتے تھے۔ مرینا لاؤنج میں آئی جہاں ہر طرف تصویریں لگی تھیں۔ ان میں گلاب اور انسان کی ایک عدد نقل بھی تھی۔ اس کی اصل کیپٹی آرٹ میں لگی ہوئی تھی۔

مرینا کے ساتھ آنے والے تینوں افراد پروفیشنل تھے اور جانتے تھے کہ اپنا کام کیسے کرنا ہے۔ مرینا نے انہیں صرف یہ بتایا تھا کہ کیا تلاش کرنا ہے۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ مذکورہ چیز اس مکان میں ہوئی تو وہ لازمی اسے تلاش کر لیں گے۔ مرینا لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے دیوار پر لگی تصویروں کا معائنہ کر رہی تھی، یہ سب ایک ہی ڈیزائن والے فریموں میں لگی تھیں اور اکثر اصل تھیں۔ ان کی مالیت بلاشبہ ملین ڈالرز میں تھی۔ درمیان میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کے عقب میں گلاب اور انسان کی نقل لگی تھی۔ یہ بڑے سائز کی پینٹنگ تھی۔ مرینا نے اسے پاس سے دیکھا۔ تصویر دیوار سے لگی تھی لیکن جب مرینا نے اسے ہلانا چاہا تو وہ نصب نکلی۔ اس کے برخلاف دوسری تصاویر ٹنگی ہوئی تھیں اور انہیں آرام سے الگ کیا جا سکتا تھا۔ مرینا نے ایک چھوٹا چاقو نکالا اور اس سے دیوار کو کریدا۔ پھر وہ پلٹ کر میز کی طرف آئی، اس نے سامنے والے حصے میں نیچے ہاتھ ڈالا اور جلد اسے میز کی لکڑی میں ایک ابھار مل گیا۔ اس نے بٹن دبایا تو سامنے سے دیوار تصویر سمیت اوپر اٹھ گئی اور اس کے نیچے مسروقہ تصویر موجود تھی۔

ایک گھنٹے بعد مرینا خاکی کاغذ سے ڈھکی تصویر اٹھائے پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوئی تو وہاں جرمی اور دوسرے پولیس افسران اس کے منتظر تھے۔ مرینا نے اندر داخل ہوتے ہی فاتحانہ انداز میں ہاتھ اوپر کر کے دکھائے ''تصویر مل گئی ہے۔''

سوائے جرمی کے سب تالیاں بجانے لگے۔ جرمی بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ مرینا اس کے ساتھ کمرے میں آئی جہاں کیپٹی آرٹ کا ماہر ڈاکٹر گلبرٹ اپنے آلات سمیت اس کا منتظر تھا۔ مرینا نے تصویر اس کے حوالے کی اور جرمی اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ ''یہ تم نے کیسے حاصل کی ٹریس پاس کر کے؟''

''میں نے کوئی ٹریس پاس نہیں کیا۔''

''پھر تصویر تمہیں کیسے مل گئی؟''

''تصویر نہیں ملی ہے۔'' ڈاکٹر گلبرٹ نے پکار کر کہا۔ ''ذرا ادھر آکر دیکھنا۔''

ڈاکٹر گلبرٹ کے لیپ ٹاپ پر تصویر کی اصلیت سامنے تھی یہ کوئی اور تصویر تھی جس پر مسروقہ تصویر کی نقل تیار کی گئی تھی۔ اوپر والی نقل اتنی اچھی تھی کہ خود مرینا کو بھی شبہ نہیں ہوا تھا مرینا کچھ دیر ساکت کھڑی تصویر کو گھورتی رہی پھر یک دم مڑی اور دفتر سے نکل گئی۔ ڈاکٹر گلبرٹ نے جرمی سے پوچھا۔ ''اس تصویر کا کیا کرنا ہے؟''

''تم اسے مزید معائنے کے لیے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔''

باہر مرینا نے ایک ٹیکسی رکوائی اور اس میں بیٹھ کر موبائل پر رچرڈ کا نمبر ملایا۔ ''میں تمہارے ساتھ سینٹ لیوسیا

چل رہی ہوں۔''

''تب تم اپنے سامان سمیت تیار رہنا، دو دن وہاں رکنا ہوگا۔''

رچرڈ سے بات کر کے مرینا نے جرمی کو کال کی۔ ''میں دو دن دفتر نہیں آؤں گی۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں کیوں...؟''

''میں آ کر بتاؤں گی۔'' مرینا نے کہا اور کال کاٹ دی۔

☆☆☆

ایگزیکٹو ایئرلائنز کا لیئر جیٹ سینٹ لیوسیا کے ایئرپورٹ پر اترا۔ مرینا کھڑکی سے اس سرسبز جزیرے اور اس کے آس پاس پھیلے بے حد نیلگوں سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ جیٹ کی آرام دہ نشست پر اس طویل سفر کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس پورے طیارے کے وہی دو مسافر تھے۔ رچرڈ نے نیویارک سے سینٹ لیوسیا تک طیارہ بک کرایا تھا کیونکہ یہاں تک کوئی براہِ راست پرواز نہیں آتی تھی اور عام ایئرلائن سے سفر کرنے کی صورت میں انہیں تین طیارے بدلنے پڑتے اور پورا دن اس سفر میں گزر جاتا۔ اب وہ صرف چار گھنٹے میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ دو عدد ایئر ہوسٹس ان کی خدمت کے لیے موجود تھیں۔ سینٹ لیوسیا میں طیارہ ریزرو پارکنگ میں رکا اور وہ کسٹم کے مراحل طے کر کے ایئرپورٹ سے باہر آگئے۔

جب طیارے سے سامان اتارا جا رہا تھا تو مرینا کی توجہ لکڑی کے ایک چوکور اور چپٹے بکس کی طرف گئی۔ اسے رچرڈ نے خود اتار کر ایک پورٹر کو احتیاط سے ٹرالی پر رکھنے کو کہا تھا۔ مرینا دیکھ نہیں سکی تھی کہ کسٹم پر اس بکس کا معائنہ ہوا تھا یا نہیں لیکن وہ سامان والی جیپ میں موجود تھا۔ دوسری جیپ رچرڈ اور اس کے لیے آئی تھی یہ کھلی ہوئی اور طاقتور لیکن چھوٹے سائز کی جیپ تھی۔ اس میں وہ رچرڈ کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ سینٹ لیوسیا کا شہر چھوٹا لیکن صاف ستھرا اور خوب صورت شہر تھا۔ جزیرہ اونچی نیچی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ کیوبا سے آگے اور جزائر غرب الہند میں واقع جنوبی امریکا کے ملک وینزویلا سے کچھ ہی دور بحر اوقیانوس میں موجود یہ جزیرہ کسی زمانے میں آتش فشاں کے لاوے سے بنا تھا۔ اس کے چاروں جانب نیلا سمندر ہے۔ اپنے سرسبز ساحلوں اور نیلے سمندر کی وجہ سے یہ سیاحوں کا پسندیدہ تفریحی مقام ہے۔

آس پاس کے دولت مند ممالک کے امرا یہاں چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ شہر سے باہر زیادہ تر جنگل تھا اور کہیں کہیں کافی یا دوسری چیزوں کے کھیت تھے۔ مرینا نے رچرڈ سے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

رچرڈ نے گلوز کمپارٹ سے ایک چھوٹی دوربین نکالی اور بہت دور ساحل کے ساتھ بنی ہوئی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم وہاں جا رہے ہیں۔''

مرینا نے دوربین سے دیکھا۔ پہاڑی کے سب سے اوپری حصے میں گھنے درختوں کے درمیان سے ایک سنہری چھت والی دو منزلہ عمارت جھلک رہی تھی۔ ''یہ تو بہت خوب صورت ہے۔''

''مستقبل میں میرا گھر ہوگا۔''

''گھر؟'' مرینا نے زیر لب دہرایا۔ کیونکہ رچرڈ نے مکان نہیں کہا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ سطح سمندر سے تقریباً دو ہزار فٹ بلندی پر بنے اس گھر کے سامنے موجود تھے۔ مکان کے عقبی حصے میں وہ بہت ترچھی ڈھلان تھی جو نیچے ساحل تک جاتی تھی اور اس طرف مکان میں تین وسیع و عریض ٹیرس تھے۔ جو کسی پلیٹ فارم کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ درمیان والے پلیٹ فارم پر ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول بھی تھا۔ مرینا سحر زدہ رہ گئی تھی۔ سامنے سے مکان تقریباً پورا ہی شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس کا بنیادی ڈھانچا کنکریٹ کا تھا جس پر باقی تعمیر دیوار اور ٹیک کی لکڑی سے کی گئی تھی۔ اندر سے

مکان بہترین فرنیچر اور سامان سے آراستہ تھا لیکن یہاں کوئی نوکر نہیں تھا۔ نیچے گرمی تھی لیکن یہاں بلندی پر سمندر سے آنے والی تیز اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ جیپ کے ساتھ آنے والے لوگوں نے سامان اندر پہنچایا اور اپنا معاوضہ لے کر رخصت ہو گئے۔

''یہاں کوئی ملازم نہیں ہے؟''

''ابھی نہیں ہے لیکن جب میں مستقل یہاں آؤں گا تو ملازم رکھوں گا۔'' رچرڈ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''تم فریش ہو جاؤ جب تک میں کھانا تیار کرتا ہوں۔''

رچرڈ کھانا بہت اچھا بناتا تھا۔ اتوار کے دن وہ گھر میں خود پکاتا تھا۔ ان دو دنوں میں رچرڈ نے خود پکایا کیونکہ مرینا کو کھانا بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے دن رات کے وقت وہ پہلے ٹیرس میں بیٹھے تھے۔ سامنے الاؤ جل رہا تھا کیونکہ سمندر سے آنے والی ہوا نہایت خنک ہو گئی تھی۔ انہوں نے ڈنر کر لیا اور پھر الاؤ کے پاس آ بیٹھے۔ اندر لاؤنج میں وہ سامان رکھا تھا جو رچرڈ اپنے ساتھ لایا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ رچرڈ نے اچانک پوچھا۔ ''تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کس سلسلے میں؟''

''یہی تصویر کی چوری کے سلسلے میں۔'' رچرڈ بولا۔ ''تم نے دیکھا ہے سامان میں ایک بکس ہے جس میں چوری ہونے والی تصویر آسکتی ہے۔''

''میں اس بارے سوچنا نہیں چاہتی۔''

''لیکن تم سوچتی رہی ہو۔'' رچرڈ کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''مرینا مجھے بتاؤ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟''

''پلیز۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ پھر وہ اٹھی اس نے اندر جا کر لکڑی کا بکس اٹھایا اور اسے لا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ رچرڈ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ مرینا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اپنا گلاس اٹھا لیا۔ لکڑی کے بکس نے آگ پکڑ لی تھی اور دونوں کے درمیان ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ان دو دنوں میں اس خوب صورت اور یادگار جگہ بس یہی ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ دوسرے دن شام کو مرینا پہاڑی سے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی اور یہ منظر ناقابلِ یقین حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ رچرڈ اندر سے آیا اور اس کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔ ''خوب صورت۔''

''ہاں واقعی، میں نے اتنا خوب صورت غروب ہوتا سورج کہیں نہیں دیکھا۔''

''میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔'' رچرڈ بولا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مرینا میری خواہش ہے تم یہاں رہو۔''

''تمہارے ساتھ؟''

''ہاں میرے ساتھ۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میں واپس جا کر اپنے کچھ کام نمٹاؤں گا اور اس کے بعد یہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں سوچ کر جواب دوں گی۔'' مرینا نے کہا اور سمندر پر پھیلتی تاریکی کی چادر کو دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک ایسے شخص کے پروپوزل کا کیا جواب دے جس کے جرم کی وہ تفتیش کر رہی تھی۔

☆☆☆

مرینا دفتر میں آئی تو جوزف اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے جرمی سے کہا۔ ''اچھا ویک اینڈ گزرا۔ خوب صورت جگہ ہے سینٹ لیوسیا۔''

مرینا اندر آتے آتے رک گئی۔ اس نے جوزف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے اسے لفافے میں موجود تصویریں پکڑا دیں۔ یہ وہ تصویریں تھیں جو کسی سرکاری جاسوس نے سینٹ لیوسیا میں رچرڈ کے گھر میں لی تھیں۔ اس میں وہ اور رچرڈ نمایاں تھے۔ ایک تصویر میں وہ ٹیرس پر دھوپ لے رہی تھی۔ مرینا نے گہری سانس لی اور تصویریں لفافے میں ڈال کر جرمی کے سامنے ڈال دیں اور سرد لہجے میں بولی۔ ''تمہارے آدمی اسمارٹ ہیں۔''

''رچرڈ سے زیادہ نہیں، اسے یقیناً علم ہوگا کہ سرکاری آدمی اس کے پیچھے ہیں۔''

''تم مجھے الزام دے رہے ہو۔'' مرینا کا لہجہ برہم ہو گیا۔

''غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم پولیس کے ساتھ کام کر رہی ہو لیکن تم نے قانون کی بالادستی قائم کرنے کا حلف نہیں لیا ہے اس لیے تم جو چاہے کر سکتی ہو۔''

مرینا سمجھ رہی تھی، وہ اس کی غیر قانونی حرکت کا حوالہ دے رہا تھا جو اس نے رچرڈ کے گھر میں گھس کر کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ رچرڈ واقف ہے کہ وہ اس کے گھر سے تصویر نکال کر لے گئی تھی مگر اس کے ردِعمل سے اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ وہ اس سے معمول کے مطابق پوری محبت سے پیش آیا تھا۔

مرینا، جرمی کے سامنے بیٹھ گئی۔ ''سچی بات ہے مجھے اب تک رچرڈ کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔''

''یا تم نے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔''

''نہیں، میں تمہیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' جرمی نے نرمی سے کہا۔ ''رچرڈ ایک مجرم ہے اور جلد یا بدیر وہ قانون کی گرفت میں آجائے گا اس لیے اس سے کوئی بھی تعلق قائم کرتے وقت خوب سوچ سمجھ لینا۔''

''میں اپنے اچھے برے کی خود ذمے دار ہوں۔'' مرینا نے کہا اور اپنی چیزیں سمیٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''یہ اچھی بات ہے تم ذمے دار ہو۔'' جرمی نے عقب سے کہا۔ ''لیکن کیا تم نے اپنی ذمے داری پوری کی ہے تم جس تصویر کی تلاش میں یہاں آئی تھیں وہ ابھی تک نہیں ملی ہے۔''

مرینا رک گئی پھر اس نے کہا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں کل دفتر آؤں گی اور دیکھوں گی کہ پولیس نے تصویر کی تلاش میں اب تک کیا کیا ہے۔''

مرینا کی طبیعت ٹھیک تھی لیکن وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ یہ تھکاوٹ جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی۔ وہ کشمکش میں تھی۔ اس کشمکش میں اسے رچرڈ نے نہیں خود اس کے دل نے ڈالا تھا۔ وہ ہوٹل جا کر آرام کرنا اور ذہنی طور پر غافل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے کمرے میں پہنچتے ہی پورٹ کی بوتل منگوائی اور اس وقت تک پیتی رہی جب تک اس کے حواس جواب نہیں دے گئے۔ پھر دروازے پر مسلسل دستک سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اس نے بہ مشکل اٹھ کر دروازہ کھولا۔ جرمی اندر آیا۔ ''تم ٹھیک تو ہو، پہلے ہوٹل والے آتے رہے اور تم نے دروازہ نہیں کھولا۔''

''میں سو رہی تھی۔'' مرینا نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''کل سے؟''

مرینا رک گئی اور اس کی نظر کلاک کی طرف گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا، وہ کل دوپہر سے سو رہی تھی اور اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ یہ یقیناً ہینگ اوور تھا۔ اس نے جرمی سے معذرت کی اور پہلے گرم پانی سے غسل کیا۔ اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی، جب وہ بال خشک کرتی باہر آئی تو جرمی نے اسے گرم سیاہ کافی تھما دی۔ خود وہ آرٹ کے بارے میں ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ''میں تمہارے لیے فکر مند تھا جب تمہارے سیل فون سے بھی جواب نہیں ملا تو میں خود آگیا۔''

''شکریہ... یہ بتاؤ کہ کوئی پروگریس ہوئی؟''

''ہمارے آدمی اس کے پیچھے ہیں۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' مرینا نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''یہ بتاؤ کہ اگر آرٹ کا کوئی شاہکار ملک سے باہر لے جایا جائے تو سرحدوں پر اسے چیک کرنے کے کیا انتظامات ہیں؟''

''انتظامات ہیں لیکن کسی بھی تصویر کو ماہر کی نظر سے چیک کرنا ناممکن ہے، اگر اسی طرح کسی اعلیٰ درجے کی آئل پینٹنگ کے اوپر کوئی دوسری تصویر بنا کر لے جایا جائے تو اسے نہیں پکڑا جا سکتا۔''

''تب میرا خیال ہے چوری ہونے والی تصویر ملک سے باہر جا چکی ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں نے کہا نا میرا خیال ہے۔ کوئی اسے امریکا میں اپنے قبضے میں رکھنے کی حماقت نہیں کرے گا کیونکہ یہاں یہ کبھی نہ کبھی پکڑی جائے گی۔''

''کسی دوسرے ملک میں اسے نہیں پکڑا جا سکے گا۔ مثلاً ڈومینیکن ری پبلک میں...؟'' جرمی نے سادگی سے پوچھا۔

''شاید۔'' مرینا نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے، ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''تم تیار ہو کر آجاؤ۔ میں نیچے لابی میں انتظار کر رہا ہوں۔'' ''مجھ سے رابطہ کرنے کی کوئی خاص وجہ؟''

جرمی نے سر ہلایا۔ ”ہاں ... لیکن تمہیں ڈنر کے بعد بتاؤں گا۔“

مرینا تیار ہو کر آئی۔ جرمی نے ایک سی فوڈ ریستوران منتخب کیا، شام کے وقت یہاں میز بہت مشکل سے ملتی تھی اور بعض اوقات لوگوں کو کھڑے ہو کر کھانا پڑتا تھا لیکن خوش قسمتی سے انہیں ایک میز مل گئی۔ مرینا نے جھینگا پلاؤ اور فرائی فش طلب کی تھی۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی کیونکہ اس کا بھوک سے برا حال تھا۔ جرمی نے اس کا تھوڑا بہت ساتھ دیا پھر اپنے لیے کافی طلب کرلی۔ کھانے کے بعد مرینا نے بھی کافی لی اور پھر وہ باہر آگئے۔ جرمی نے گاڑی کا رخ سمندر کی طرف موڑ دیا۔ اس نے ساحلی پشتے پر کار لا کر روک دی، سامنے سمندر میں عمارتوں کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔

”تم کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟“

”میرے آدمیوں نے کل شام کلب میں رچرڈ کی کچھ تصویریں لی ہیں۔“ جرمی نے کوٹ سے ایک لفافہ نکال کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ مرینا نے لفافے سے تصویریں نکالیں۔ ان میں رچرڈ اسی لڑکی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا اور تقریباً ہر تصویر میں اس کی آنکھوں میں لڑکی کے لیے محبت نہایت نمایاں تھی۔ مرینا کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گئی پھر اس نے جرمی سے پوچھا۔

”تم مجھے کیوں دکھا رہے ہو یہ تصویریں؟“

”صرف اس لیے کہ اگر تم کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو تو اب بھی وقت ہے، رک جاؤ۔“

”تمہیں ... تمہیں اس سے کیا سروکار کہ میں کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں یا نہیں ...؟“ مرینا کا لہجہ تند ہو گیا۔

”مجھے اس سے سروکار ہے کیونکہ میں خود اسی سراب کے پیچھے بھاگ چکا ہوں اور دکھ اٹھا چکا ہوں۔“

مرینا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مجھے ... مجھے افسوس ہے لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ وہ کہتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ وہ پشتے کی دیوار کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ سمندر کی طرف سے ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی نمی بھی آگئی ہے۔ جرمی بھی اس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

”مجھے افسوس ہے ...“

”نہیں، اس میں افسوس کی بات نہیں ہے۔“ مرینا نے اس کی بات کاٹی۔ ”میرا خیال ہے میں ناکام ہو چکی ہوں۔“

”تم واپس چلی جاؤ گی؟“

”شاید۔“ مرینا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”تم مجھے کسی ایسی جگہ اتار دو جہاں سے مجھے ٹیکسی مل جائے۔“

کچھ دیر بعد مرینا ٹیکسی میں رچرڈ ملز کے گھر جا رہی تھی۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ دروازے پر آئی اور اس وقت تک کال بیل پر انگلی رکھے رہی جب تک جان نے آکر دروازہ نہیں کھول دیا۔ وہ اسے دھکیل کر اندر گھس گئی۔

”رچرڈ کہاں ہے؟“

”وہ اندر ہیں لیکن ...“

وہ جان کی پوری بات سنے بغیر اندر کی طرف بڑھی۔ رچرڈ اپنے بیڈ روم میں تھا اور لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر مرینا کو دیکھا اور اس نے تصویریں رچرڈ کے سامنے بکھیر دیں۔ اس نے ایک نظر بستر پر بکھری تصویروں کو دیکھا اور سکون سے بولا۔ ”مرینا، ان میں کیا خاص بات ہے؟“

”تمہارے خیال میں اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے؟“ مرینا کا لہجہ سرد تھا۔

”ہاں، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ رچرڈ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے بازو تھامے۔ مرینا نے جھٹکے سے بازو چھڑا لیے۔

”تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ آخر اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”مرینا تم غلط سمجھ رہی ہو۔“

”تو تم صحیح سمجھا دو۔“

”دیکھو میں یہاں سے وائنڈ اپ کر رہا ہوں اور دو تین دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”اس لڑکی کے ساتھ۔“ مرینا کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”وہ بہت خوب صورت ہے۔ لیکن نہیں...... خوب صورت تو میں بھی ہوں وہ بہت جوان ہے شاید بیس سال کی بھی نہیں ہوگی۔ مجھ سے پندرہ سال چھوٹی ہے۔“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“ رچرڈ نے نرمی سے کہا۔ ”اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو۔“

”میں اور تمہارے ساتھ......“ مرینا ہنسی۔

”ہاں میرے ساتھ کیوں نہیں جا سکتیں؟“

”رچرڈ تم بھول رہے ہو تم ایک مبینہ مجرم ہو اور میں اس چوری کی تحقیق کر رہی ہوں جس کا شبہ تم پر کیا جا رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”تم پھر بھی مجھے لے جانا پسند کرو گے؟“

”ہاں، کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور مجھے اس

سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کیا ہو۔“

رچرڈ نے پہلی بار یوں محبت کا اظہار کیا تھا۔ مرینا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ ”لکڑی کے اس بکس میں کیا تھا؟“

”کچھ غیر اہم تصاویر تھیں جو میں مکان کے لیے لے گیا تھا۔“

مرینا ششدر رہ گئی تھی۔ ”تبھی تم نے اتنی آسانی سے مجھے اس بکس کو جلانے کی اجازت دے دی تھی۔“

”اگر اس میں وہ تصویر بھی ہوتی تب بھی میں تمہیں نہیں روکتا۔“

”تم کب جا رہے ہو؟“

”شاید پرسوں ... تم میرے ساتھ چلو گی؟“

مرینا خاموش رہی تو رچرڈ اس کے پاس آگیا، نرمی سے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے مرینا کے کان میں سرگوشی کی۔ ”اگر تم میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو تو میں پرسوں تین بجے تک وہ تصویر واپس گیلری میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

مرینا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”واقعی ...؟“

”ہاں اگر تم میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو۔“

”اگر میں راضی نہ ہوئی تب ...“

”تب بھی تصویر تمہیں مل جائے گی۔ میں سینڈ اسٹون پر تمہارا انتظار کروں گا۔“

”پھر تم کبھی یہاں واپس نہیں آؤ گے؟“

”کم سے کم رہنے کے ارادے سے نہیں آؤں گا۔“ رچرڈ نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم چلو گی تو تم بھی واپس نہیں آؤ گی۔“

☆☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹر میں جرمی اور جوزف اس کی بات سن رہے تھے۔ مرینا اب تک کی صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس نے سب بتا دیا سوائے رچرڈ کی آخری پیشکش کے۔ جرمی نے گہری سانس لی۔ ”یعنی وہ ہمارے ہاتھ سے نکل کر جا رہا ہے۔“

”ہاں، تم سینٹ لیوسیا میں اس کے خلاف تفتیش کرا سکتے ہو لیکن اس طرح نہیں جیسے یہاں ہو سکتی ہے۔ دوسرے وہاں کی پولیس اتنی تربیت یافتہ اور وسائل والی نہیں ہے جو ایسے ذہین مجرم کو پکڑ سکے۔“

جوزف خلاف معمول سنجیدہ تھا۔ ”اس کا مطلب ہے ہمیں جلد یہ کیس ختم کرنا ہوگا۔“

”ختم نہیں کرنا ہے۔“ جرمی نے مرینا کی طرف دیکھا۔ ”اگر پولیس ناکام رہی تو یہ کیس ایف بی آئی کے پاس چلا جائے گا۔“

مرینا نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ جوزف نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

مرینا نے شانے اچکائے۔ ”وہی جو تمہارا خیال ہے۔ تصویر ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ جس شخص پر شک تھا ہم اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے ہیں۔“

”فی الوقت۔“ جرمی نے پھر کہا۔ ”لیکن یہ ہمیشہ نہیں بچے گا۔ جب بھی اس کے خلاف ثبوت ملا۔ وہ دنیا میں کہیں بھی ہوا اسے گرفتار کر کے یہاں لایا جائے گا اور عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔“

مرینا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن ہم تو ناکام رہے ہیں۔“

”یہ اہم بات نہیں ہے۔“ جرمی اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”مجرم پکڑا جاتا ہے، پکڑنے والا کوئی بھی ہو۔“

جوزف نے کہا۔ ”وہ یہاں سے جا رہا ہے۔ اس بار اس کے سامان کی بھرپور تلاشی لی جائے گی۔“

”تمہارے خیال میں وہ اتنا احمق ہے کہ اپنے ساتھ اس قسم کی کوئی چیز لے کر جائے گا جبکہ اسی ملک میں درجنوں باہر جانے کے راستے ہیں اور وہ کسی بھی راستے سے کوئی بھی چیز لے جا سکتا ہے، ہمارے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں ہوگا۔“

”مرینا ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ جرمی نے اس کی تائید کی جس پر مرینا کو ذرا حیرت ہوئی تھی۔ ”وہ کسی بھی راستے سے تصویر ملک سے باہر لے جا سکتا ہے۔ اسے چیک نہیں کیا جا سکتا۔ تصویر صرف اس کے گھر سے برآمد ہو سکتی ہے۔“

”سینٹ لیوسیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔“ جوزف نے کہا۔

”سینٹ لیوسیا میں ہی یہ ممکن ہے۔“ جرمی مسکرایا۔ ”جب امریکی حکومت ڈومینیکن ری پبلک سے درخواست کرے گی کہ اس کے ایک شہری کے گھر کی بھرپور تلاشی لے کر تصویر برآمد کی جائے تو وہاں کی پولیس یہ کام کر لے گی چاہے اسے رچرڈ کے گھر کی ایک ایک کیل اور اینٹ نکال کر کیوں نہ دیکھنی پڑے۔ وہاں کی پولیس کے پاس اختیارات نیویارک پولیس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ ایک بار تصویر اس کے پاس سے نکل آئے پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے جیل جانے سے نہیں بچا سکتی۔ ہم اسے یہاں بلوا لیں گے۔“

مرینا کے اندر کوئی چیز جیسے ٹوٹ گئی تھی۔ کیا رچرڈ پکڑا جائے گا؟ جرمی کا کہنا درست تھا، سینٹ لیوسیا کی پولیس کے پاس کہیں زیادہ اختیارات تھے۔ اگر ان پر امریکی حکومت کا دباؤ آتا تو وہ رچرڈ کے مکان کی تلاشی لے کر وہاں سے تصویر برآمد کر سکتے تھے۔ وہ دفتر سے نکلی تو اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اگلے دن رچرڈ کی روانگی تھی۔ اگر وہ اسے صبح اپنی رضامندی سے آگاہ نہیں کرتی تو وہ بغیر تصویر واپس کیے چلا جاتا۔ مگر اس صورت میں بھی وہ پکڑا جاتا، سینٹ لیوسیا کی پولیس اس سے تصویر برآمد کر لیتی۔ نہیں...... اس کا تصویر یہیں دے کر جانا ضروری تھا۔ مرینا رات بھر سوچتی رہی۔ صبح سویرے وہ ناشتا کیے بغیر ہوٹل سے نکلی اور ٹیکسی میں رچرڈ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اتفاق سے جیسے ہی وہ دروازے کے پاس پہنچی وہاں سے جان کوی نکلا، وہ شاید کسی کام سے باہر جا رہا تھا۔

''مجھے رچرڈ سے ملنا ہے۔'' مرینا اندر جاتے ہوئے بولی۔

''ایک منٹ میڈم...'' جان نے اسے روکنا چاہا لیکن اتنی دیر میں وہ اندر آچکی تھی۔ تب اس نے سیڑھیوں کے ساتھ دو بڑے سائز کے لیدر سوٹ کیس ساتھ ساتھ رکھے دیکھے۔ وہ سیڑھیوں سے ہوتی اوپر رچرڈ کے بیڈ روم کی طرف لپکی۔ جان اسے روکنے کے لیے پیچھے پیچھے آرہا تھا مگر اتنی دیر میں مرینا بیڈ روم کا دروازہ کھول چکی تھی تب اس نے دیکھا وہی لڑکی جسے وہ رچرڈ کے ساتھ دیکھ چکی تھی بیڈ پر بیٹھی ایک پاؤں پر موزہ چڑھا رہی تھی۔ آس پاس سوٹ بکھرے ہوئے تھے جنہیں ابھی پیک کرنا تھا۔ لڑکی اسے دیکھ کر ساکت رہ گئی۔ رچرڈ واش روم میں تھا اور کچھ کہہ رہا تھا، جب اسے لڑکی کی طرف سے جواب نہیں ملا تو وہ ٹائی باندھتا ہوا باہر آیا اور مرینا کو دیکھ کر چونک گیا۔ پھر اس نے لڑکی کو دیکھا۔ وہ موزے اور جوتے پہن کر اٹھی اور مرینا کے برابر سے ہوتی ہوئی چلی گئی۔ مرینا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''تو... تمہارے ساتھ... یہ جا رہی ہے۔''

''غلط...... میرے ساتھ تم جا رہی ہو۔''

''بکواس مت کرو جھوٹے آدمی۔'' مرینا چلائی۔ ''تم مسلسل مجھے دھوکا دیتے آئے ہو۔'' وہ پلٹی اور سیڑھیوں کی طرف جانے لگی، رچرڈ تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔

''مرینا میری بات سنو۔'' اس نے سیڑھیوں کے پاس اسے پکڑ لیا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں، میرے ساتھ تم جا رہی ہو۔ مجھے یقین تھا تم مان جاؤ گی اس لیے میں نے تمہارا سامان بھی تیار کروالیا۔''

وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولی۔ ''سامان تم نے میرا تیار کروایا اور تمہارے بیڈ روم میں یہ تھی۔''

''مرینا اس سے میرا وہ تعلق نہیں ہے جو تم سے ہے، میری بات کا یقین کرو۔'' رچرڈ کے لہجے میں التجا آگئی تھی۔ ''میں شام کو گیلری میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

مرینا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ رچرڈ کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ آخری سیڑھی پر پہنچ کر بیٹھ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ جان ایک طرف ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

موسم نہایت سرد اور بارش والا ہو رہا تھا۔ ہلکی پھوار کا سلسلہ صبح سے جاری تھا۔ لوگ اوور کوٹ، برساتیاں اور چھتریاں لگائے جا رہے تھے۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ بارش ... میں بھیگ رہی ہے۔ اچانک اس نے خود کو پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے پایا۔ تب اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کئی میل تک پیدل چل چکی ہے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ رچرڈ کے فلیٹ سے چلتی یہاں پولیس ہیڈ کوارٹر تک آگئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ جرمی اپنے دفتر میں تھا۔ وہ مرینا کو اس حال میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے اسے اپنا کوٹ پہنایا۔

''میرے خدا...... تم بالکل بھیگ گئی ہو۔''

''میں بارش میں پیدل چل کر آئی ہوں۔'' مرینا نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پھر بولی۔ ''جرمی تم رچرڈ کو گرفتار کرنا چاہتے ہو؟''

جرمی نے غور سے اسے دیکھا اور پھر گرم کافی نکال لایا۔ ''یہ پیو اور آرام سے بتاؤ کیا بات ہے؟''

مرینا نے کافی کا کپ میز پر رکھ دیا۔ ''رچرڈ آج شام کینی آرٹ گیلری میں آئے گا، وہ چوری ہونے والی تصویر میرے حوالے کرے گا۔''

''یہ اس نے تم سے کہا ہے؟''

مرینا نے سر ہلایا تو جرمی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے کمرے سے جھانک کر ایک مبینہ مجرم سے سر کھپاتے جوزف کو آواز دی۔ وہ اسے چھوڑ کر اندر آیا تو جرمی نے اسے رچرڈ کے بارے میں بتایا۔ اس نے بے یقینی سے مرینا کی طرف دیکھا۔ ''وہ سچ مچ آئے گا؟''

''اس نے مجھ سے یہی کہا ہے۔''

جوزف کے لہجے میں بے یقینی بڑھ گئی تھی۔ ''اور تم ہمیں بتا کر اسے گرفتار کرا رہی ہو؟''

مرینا جواب دینے کے بجائے اپنے سردی سے نیلے پڑ جانے والے ہونٹ کاٹتی رہی۔ ابھی صبح کے دس بج رہے تھے اور ان کے پاس انتظامات کے لیے خاصا وقت تھا، اس کے باوجود وہ اس طرح حرکت میں آئے جیسے کہیں بہت ایمرجنسی میں کارروائی کرنا ہو۔ ذرا سی دیر میں دفتر میں ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ معاملہ بڑے مجرم کا نہیں ایک سو اسی ملین ڈالرز کی تصویر کا تھا۔ مرینا ساکت بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ اتنا ستا ہوا تھا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی نظر آرہی تھی۔ وہ اچانک اٹھی اور ان سے معذرت کرتی واش رومز کی طرف چلی گئی۔

جوزف نے افسوس سے سر ہلایا۔

''یہ بے وقوف عورت اب جا کر روئے گی۔''

''کیا یہ سچ مچ اس سے محبت کرنے لگی ہے؟''

''میرا خیال ہے...... اور شاید رچرڈ بھی اس سے محبت کرنے لگا ہے ورنہ ایک سو ملین ڈالرز کی تصویر کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

جوزف کے جواب پر جرمی کا چہرہ ستا گیا تھا لیکن اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔ آدھے گھنٹے بعد مرینا واش روم سے آئی تو بالکل نارمل اور تر و تازہ لگ رہی تھی۔ اس نے جرمی سے پوچھا۔ ''انتظامات کر لیے؟''

''ہاں، تمام انتظامات ہو گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے ساتھ تیس آدمی ہوں گے۔''

☆☆☆

تین بجے تک وہ کینی آرٹ گیلری میں اپنی اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ جرمی، جوزف اور مرینا گیلری کے کیمرا کنٹرول روم میں تھے، یہاں مانیٹرز پر گیلری کا ایک ایک منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تین بجے تک جرمی درجن بار سے زیادہ دوسروں سے یہ سوال کر چکا تھا کہ رچرڈ آئے گا۔ سب کے اعصاب کشیدہ تھے۔ جوزف کا خیال تھا کہ رچرڈ کوئی چال چل رہا تھا اور اسے علم تھا کہ مرینا پولیس کو خبردار کر چکی ہے۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ کھیل رہا تھا لیکن جرمی کا خیال مختلف تھا اگر رچرڈ کو علم ہو گیا تھا تو وہ نہیں آتا کیونکہ پولیس کے ساتھ کھیلنا اسے مہنگا بھی پڑ سکتا تھا۔ ٹھیک تین بجے رچرڈ گیلری کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا تو سب سنبھل گئے۔ مرینا، جو اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی اچانک ہی بیمار سی نظر آنے لگی۔ جرمی نے ایک نظر اسے دیکھا اور واکی ٹاکی پر اپنے آدمیوں کو ہوشیار رہنے کو کہا۔

رچرڈ سیاہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس نے سر پر گول ہیٹ پہن رکھا تھا، اس کے ہاتھ میں ہلکے بھورے رنگ کا ایک چرمی بیگ تھا۔ وہ داخلی ہال میں عین اس جگہ آکر کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ تمام کیمروں سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہیٹ اتار کر اوپر منہ کرتے ہوئے اپنا چہرہ واضح کیا اور پھر چاروں طرف گھوم کر دکھایا۔ جرمی چونکا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ خود کو واضح کر کے دکھا رہا ہے۔'' جوزف بولا۔

''یہ کوئی چال چل رہا ہے۔''

رچرڈ کے چہرے پر اعتماد اور سکون تھا۔ اس نے ہیٹ اس طرح پہنا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا اور پھر وہ سر جھکائے تیز قدموں سے گیلری کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ جرمی نے جلدی سے واکی ٹاکی پر کہا۔ ''وہ اندر آرہا ہے، اسے گھیر کر پکڑ لو۔''

پولیس کے آدمی گیلری میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی معاونت کے لیے جوزف بھی باہر نکل گیا۔ جرمی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس نے مرینا کی طرف دیکھا اور غرا کر بولا۔ ''اسے معلوم ہے، اسے تم نے بتایا ہے۔''

''یہ غلط ہے۔'' وہ احتجاجی انداز میں بولی۔

اسی لمحے جرمی کی نظر ایک اسکرین پر گئی۔ کمرے کے دروازے کے پاس ویسا ہی ایک بریف کیس رکھا تھا جیسا کہ رچرڈ کے ہاتھ میں تھا پھر ایک اوور کوٹ اور ہیٹ والا شخص تیزی سے آیا اور بریف کیس اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے مرینا نے ایک اسکرین پر ویسے ہی کوٹ، ہیٹ اور بریف

ہیگل کا سمندر

اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ملاحظہ ہو

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اس شعر کی خوبی علامہ اقبالؒ کے اس خط سے ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے حضرت اکبر کو اس سلسلے میں تحریر فرمایا تھا:

''سبحان اللہ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ ہیگل جسے جرمن افلاطون سے بھی بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں اور تخیل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا۔ اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرے میں بند کر دیا ہے یا یوں کہیے کہ ہیگل کا سمندر اسی قطرے کی تفسیر ہے۔''

تحریر: سید محمد مسلم رضوی ☆ مرسلہ: فیض الرحمٰن ساجد، کراچی

کیس کے ساتھ ایک اور شخص کو دیکھا۔ رچرڈ کے اتنی جلدی دوسری اسکرین والے حصے میں پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جرمی نے دیکھ لیا تھا اور ایک لمحے کو بوکھلا گیا لیکن پھر اس نے جلدی سے واکی ٹاکی سنبھالا۔

''ہوشیار وہ دھوکا دے رہا ہے۔ سیاہ کوٹ اور ہیٹ والے ویسا ہی سوٹ کیس اٹھائے کئی افراد گیلری میں موجود ہیں تم لوگ اس حلیے والے ہر شخص کو روک کر چیک کرو۔''

مرینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ ذرا پیچھے ہو کر تمام اسکرینوں کو نظر میں رکھے ہوئے تھی۔ تقریباً ہر اسکرین پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک جیسے حلیے اور جسامت کے لوگ ایک جیسے بریف کیس اٹھائے گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ بریف کیس کہیں چھوڑ جاتے اور پھر آنے والا دوسرا فرد اسے اٹھا کر آگے بڑھ جاتا۔ جوزف اپنے آدمیوں کے ساتھ بھاگتا پھر رہا تھا لیکن ابھی تک ان کے ہاتھ ایک بھی آدمی نہیں آیا تھا۔ جرمی اسکرینوں پر دیکھ کر انہیں گائڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جوزف کامیاب رہا۔ اس کے آدمیوں نے ایک سیاہ اوور کوٹ والے کو روک لیا جس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا چرمی بریف کیس تھا۔ پولیس والوں نے اسے چاروں طرف سے جکڑ لیا اور جوزف نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس جھپٹ کر کھول دیا۔ اس میں چوری ہونے والی تصویر نہیں تھی لیکن اس کے ڈھیروں فوٹو گرافس تھے جو فرش پر بکھر گئے۔

عین اس وقت نمائش والے ہال میں چند دھویں والے بم پھٹے اور پورے ہال میں دھواں پھیلنے لگا۔ فوراً ہی اسموک الارم بجنے لگا اور قیمتی تصاویر کے سامنے چھت سے فرش تک فولادی چادر آنے لگی۔ الارم زور و شور سے بج رہا تھا اور لوگ چیختے چلاتے ہوئے باہر جانے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسے ہی تصویروں پر فولاد کی چادریں آئیں چھت سے پانی کے اسپرنکلو کھل گئے۔ یہ خود کار نظام تھا جو دھویں کی موجودگی محسوس کرتے ہی حرکت میں آ جاتا تھا۔ فولادی چادروں کے پیچھے تصویریں پانی سے محفوظ ہو جاتی تھیں لیکن ایک تصویر پر چادر نہیں آئی تھی کیونکہ وہ جس ریل پر سرک رہی تھی اس کے درمیان میں ایک لمبی سی دھاتی سلاخ آ گئی تھی اور وہ چادریں اس سے ٹکرا کر رک گئی تھیں جب پانی برسا تو اس طرف لگی تصویر کے رنگ پانی کے ساتھ بہنے لگے۔

مرینا چپکے سے پیچھے ہٹی اور کنٹرول روم سے نکل گئی۔ باہر لوگوں کے ہجوم میں اس کی نظریں رچرڈ کو تلاش کر رہی تھیں۔ لوگ اب بھی باہر نکل رہے تھے اور ان کے ریلے اتنے بڑے تھے کہ پولیس کے لیے باہر نکلنے والوں کو چیک کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اچانک کسی نے عقب سے مرینا کا بازو تھام لیا۔ یہ جرمی تھا۔ ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''وہ... میں باہر نکل رہی تھی۔'' وہ بوکھلا کر بولی۔

جرمی کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''اس نے تمہیں کوئی آفر کی تھی؟''

مرینا نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ ''ہاں اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔''

''تو جاؤ اس کے ساتھ چلی جاؤ۔'' جرمی نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ ''کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔'' مرینا کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں اس نے آگے بڑھ کر جرمی کے رخسار پر پیار کیا۔ مرینا کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ وقت کم ہے اور کہیں رچرڈ اسے چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ وہ پلٹی اور تیزی سے باہر آئی۔ چار بجنے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور اس میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''سینڈ اسٹون چلو... جلدی۔''

ذرا دیر بعد ٹیکسی برج کی طرف جانے والے ٹریفک میں بری طرح پھنس گئی تھی اور اس کے آگے جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ وقت کم رہ گیا تھا، مرینا نے ایک نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیا اور نیچے اتر آئی۔ سینڈ اسٹون یہاں سے کچھ ہی دور تھا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے پشتے تک پہنچی لیکن وہاں رچرڈ نظر نہیں آیا۔ پھر دور ایک شخص سیاہ اوور کوٹ اور ہیٹ میں کھڑا دکھائی دیا۔ مرینا اس کی طرف بھاگی، اس شخص نے ایک بڑا سا لیدر کیس اٹھا رکھا تھا۔ مرینا اس کے پاس پہنچ کر چلائی۔

''رچرڈ...''

لیکن جب وہ شخص مڑا تو وہ رچرڈ نہیں تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مرینا کی طرف دیکھا اور مہذب لہجے میں بولا۔ ''تم یقیناً مس سینڈلر ہو؟''

''ہاں، میں مرینا سینڈلر ہوں۔''

''تب یہ کیس تمہارے لیے ہے۔'' اس نے بڑے سائز کا لیدر کیس اسے تھما دیا اور خود نپے تلے قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ مرینا کو لگا جیسے وہ خالی ہاتھ رہ گئی ہو۔ رچرڈ کے یہاں نہ آنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ چلا گیا تھا، اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے۔ اس کی بے وفائی کی یہی سزا تھی جو وہ اسے دے سکتا تھا۔ مرینا گھٹنوں کے بل گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت دیر تک رونے کے بعد اس کا دل

ہلکا ہوا تھا۔ اس ویرانے میں کوئی نہیں تھا جو اسے یوں پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھتا۔ اس کے سیل فون نے بیل دی تو مرینا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جرمی تھا اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''مرینا وہ ہاتھ دکھا گیا ہے چوری ہونے والی تصویر مل گئی ہے۔''

''کیسے...؟ کہاں سے...؟''

''وہ اسی دہری سطح والی تصویر کے نیچے تھی جو تم رچرڈ کے گھر میں گھس کر نکال لائی تھیں۔ اصل میں تصویر پر دو مرتبہ تصویر بنائی گئی تھی۔ کسی نے سلائڈ کے سامنے سلاخ رکھ دی جس سے اس تصویر کی جگہ کھلی رہ گئی اور اوپر سے گرنے والے پانی سے اس کی دونوں تہیں اتر گئیں اور اصل تصویر سامنے آ گئی۔ اسے نقصان نہیں ہوا تھا۔''

''وہ کیا ہاتھ دکھا گیا؟''

''گلاب اور انسان نامی تصویر غائب ہے، اسے اسی دوران میں چوری کیا گیا ہے۔''

''گلاب اور انسان۔'' مرینا نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ میں موجود بڑا لیدر کیس دیکھا۔ ''رچرڈ کے بارے میں پتا چلا؟''

''نہیں لوگوں کے ہجوم میں وہ صفائی سے نکل گیا۔ ہم نے چند سیاہ اوور کوٹ والے پکڑے ہیں۔ مگر ان کے خلاف کوئی چارج نہیں لگایا جا سکتا تھا اس لیے انہیں چھوڑ دیا ہے۔''

''تم نے ٹھیک کیا۔'' مرینا بولی۔ ''تمہیں دوسری تصویر کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ابھی چوری نہیں ہوئی ہے۔ وہ جلد واپس مل جائے گی۔''

''کیسے...؟'' جرمی نے پوچھنا چاہا لیکن اس نے فون بند کر دیا اور پھر اسے آف کر دیا۔ اس وقت وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ کینی آرٹ میں لگی گلاب اور انسان اصلی نہیں تھی۔ اس کی اصل رچرڈ کے گھر میں لگی تھی اور اب وہی اصل اس لیدر کیس میں تھی۔ نقل جو گیلری میں لگی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور لیدر کیس اٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

مرینا ایئرپورٹ پر تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جنہیں چھپانے کے لیے اس نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ جب لگیج کا وقت آیا تو اس نے لیدر کیس اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھا اور اپنی ریزرویشن پیش کی۔ ''میری سیٹ او کے کر دو پلیز۔''

کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے مسکرا کر اپنے کمپیوٹر پر ریزرویشن دیکھی تھا اور سیٹ او کے کر دی۔ پھر اس نے چرمی کیس دیکھا۔ ''یہ لگیج میں جائے گا؟''

''نہیں، اسے نیویارک پولیس ہیڈ کوارٹر بھیجنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' لڑکی نے اس سے لیدر کیس لے لیا۔ مرینا نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کے اندر کینی آرٹ سے غائب ہونے والی تصویر گلاب اور انسان ہو گی۔ جب وہ کسٹم اور امیگریشن سے فارغ ہو کر لاؤنج میں آئی تو فلائٹ میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ کچھ دیر بعد مسافر پین ایم کے جمبو جیٹ پر سوار ہونے لگے۔ اتفاق سے مرینا کو جو سیٹ ملی اس کے برابر میں کوئی نہیں تھا اور وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ لندن آنے سے پہلے وہ اپنے دل کا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔ برابر والی سیٹ پر کوئی اور ہوتا تو اتنی آسانی سے رو دھو نہیں سکتی تھی۔ جیسے ہی طیارہ فضا میں بلند ہوا اس کا دل پھر سے بھر آیا۔ اس نے کشن منہ پر رکھ لیا اور اپنی سسکیاں اس کے اندر ہی دبانے لگی۔

اچانک ایک بازو اس کے شانے پر آ گیا اور کوئی اسے بہت پیار سے سہلانے لگا۔ ایک جانی پہچانی خوشبو نے اسے بتا دیا کہ اس کے پاس کون ہے۔ وہ شاک میں ساکت رہ گئی پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رچرڈ اس کے برابر میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ ''تت... تم؟''

''ہاں، میں...''

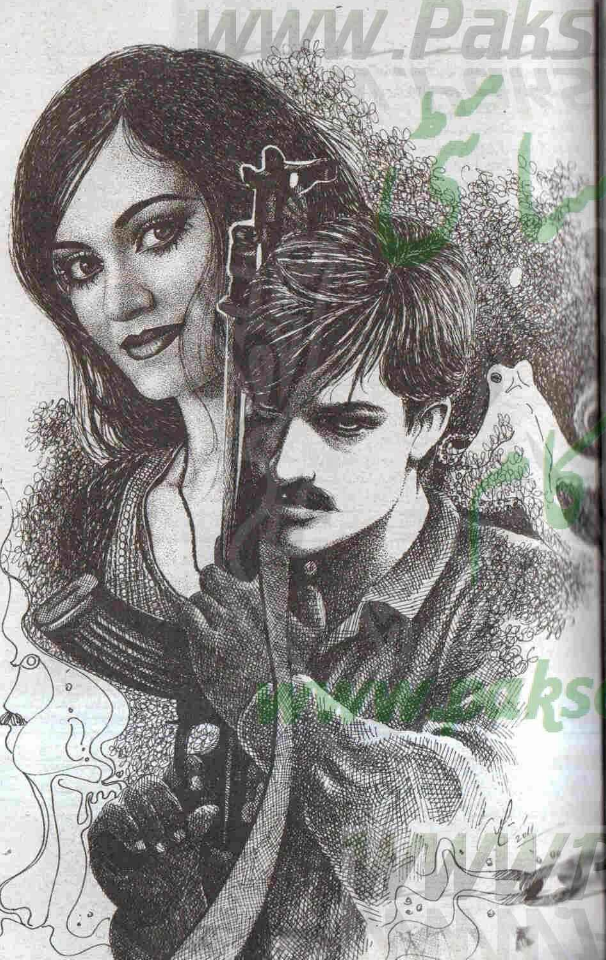
اچانک مرینا پر دورہ پڑ گیا اور وہ چیختے چلاتے ہوئے رچرڈ کو کشن سے مارنے لگی۔ ایک مسافر کو کچھ سمجھاتی ایئر ہوسٹس شور سن کر اس کی طرف لپکی لیکن جب وہ پاس آئی تو اس نے مرینا کو رچرڈ کے گلے لگے روتے دیکھا اور وہ اسے تھپک رہا تھا...... رچرڈ نے او کے کا اشارہ کیا تو ایئر ہوسٹس مسکراتے ہوئے پلٹ کر واپس چلی گئی، رچرڈ نے آہستہ سے کہا۔

''بس ڈیئر، میں نے کہا تھا نا ہم ساتھ جائیں گے۔''

''تو وہ کون تھی؟''

''وہ ہمارے ساتھ ہے، وہ دیکھو۔'' رچرڈ نے اشارہ کیا تو مرینا نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی دوسری قطار میں بیٹھی ایک رسالہ دیکھ رہی تھی مرینا کو متوجہ پا کر وہ دھیرے سے مسکرائی اور دوبارہ رسالہ دیکھنے لگی۔ مرینا نے دوبارہ رچرڈ کی طرف دیکھا تو وہ اس کے کان میں آہستہ سے بولا۔ ''میری بیٹی این ملر...''

مرینا نے مطمئن ہو کر سر رچرڈ کے شانے سے ٹکا دیا۔



اسرار اور تحیر کے پردے
میں لپٹا ایک منفرد
طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

قسط نمبر 9

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

محبت کی یہ داستان نوشہرہ کے لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا انا پرست باپ سردار سرفراز خان طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنے بیٹے کی محبت کا مخالف ہے۔ لیاقت اپنی چاہت، فرحین سے شادی کر کے کراچی آجاتا ہے۔ باپ مخالف مگر ماں اس کی ہمدرد تھی۔ یہ جوڑا کراچی کی ایک کچی آبادی میں گل خان اور اس کی بیوی زرینہ کے ساتھ مشترکہ طور پر کرائے کے مکان میں قیام کرتا ہے، مکان سے متصل قبرستان میں فرحین ایک ہندو عامل پرتاب گھوش کو برہنہ حالت میں پراسرار عمل ورقص کرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اسی دوران لیاقت حسین کو ایک قبر سے عمل کیا ہوا نیبو ملتا ہے وہ اللہ کا نام لے کر اس عمل کو ختم کر دیتا ہے۔ لیاقت ملازمت کے لیے پریشان تھا کہ راہ میں ایک جلتے مکان سے جان پر کھیل کر ایک عورت کو نکال لانے پر اس کے بیٹے کے ذریعے اسے سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی مسز راحیلہ بیگم بہت سلجھے ہوئے ہمدرد انسان اور کامیاب بزنس مین ہیں جبکہ شیخ حامد بہ ظاہر ان کا رفیق مگر درحقیقت حریف ہے اور



اپنے دست راست افضل خان کے ذریعے اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین جسے ایک نابینا بزرگ کی جانب سے ایک ماورائی قوت یعنی ہمزاد میسر آ گیا ہے جو مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے لیکن لیاقت حسین کو اس کے متعلق کوئی ادراک نہیں ہے اسی پر اسرار قوت کے باعث وہ ہر بار شیخ حامد کے منصوبوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ میڈم روبی ایک دولت مند بیوہ ہے جو اپنے شوہر کی حادثاتی موت کے بعد بزنس اور سماجی مصروفیات میں شامل ہوتی ہے اور شوہر کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شیخ حامد کے دست راست افضل خان سے راہ و رسم بڑھاتی ہے اس کے علاوہ شیخ حامد جو کہ مافیا کا سرغنہ ہے اور کوڈ ورڈ بلیک ٹائیگر کے تحت کئی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے، اس کے آفس کی ایک ورکر شبنم بھی بگ باس کے خلاف میڈم جیسے ہی مخالف جذبات رکھتی ہے اور اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لیاقت حسین کے علاوہ سیٹھ عثمان کا ایک پولیس آفیسر دوست ڈی ایس پی سراج بھی اس کا مددگار ہے جو کہ ایک ایماندار افسر ہے اور افسر اعلیٰ علیم احمد کا قابل اعتماد ہے۔ شیخ حامد میڈم کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے افضل خان کو استعمال کرتا ہے اور شراب کے نشے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں میڈم کی قابل اعتراض تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عین وقت پر ایک پر اسرار کال کے سبب وہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ متعدد مواقع پر لیاقت حسین شیخ حامد کے آڑے آتا رہا۔ لہٰذا وہ لیاقت حسین کا دشمن بن گیا اور اسے مجبور کرنے کے لیے فرحین کو اغوا کرا لیتا ہے لیکن یہاں بھی لیاقت حسین اپنے ہمزاد کے ذریعے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ناکامی کے بعد بگ باس شیخ حامد افضل خان کو سخت عتاب کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب شبنم میڈم روبی سے ملتی ہے اور مشترکہ مقصد کے لیے تعاون کی درخواست کرتی ہے۔ اسی دوران اعلیٰ افسر علیم احمد ریٹائر ہو جاتا ہے اور آغا منظور اس کی جگہ لیتا ہے جو کہ ایک کرپٹ افسر ہے لیکن میڈم روبی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں رد و بدل کے نتیجے میں نیا ڈی ایس پی لودھی تعینات ہوتا ہے جبکہ ایس پی کے عہدے پر اورنگزیب جوائن کرتا ہے جو کہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ سراج حکمت عملی کے تحت در پردہ شیخ حامد سے تعلقات استوار رکھتا ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا کی کال سراج کو موصول ہوتی ہے جس میں وہ اپنی خودکشی کی اطلاع دیتی ہے اور اپنی ایک خفیہ تحریر کے متعلق بتاتی ہے جو اس نے سراج کے نام لکھی ہے جس میں کچھ انکشافات کیے گئے ہیں۔ سراج پریشان ہو جاتا ہے کہ موبائل پر اس کے نمبرز دیکھ کر شیخ حامد اس سے برگشتہ ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، حامد نے سراج کو مزہ چکھانے کے لیے اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیا لیکن اس بار پھر لیاقت حسین کے ہمزاد نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ صبا بیگم کی موت کی تحقیقات کے لیے اورنگ زیب تندہی سے تفتیش کرتا ہے شیخ حامد انسپکٹر لودھی کے ذریعے جو اس کا گماشتہ ہے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سیٹھ عثمان لیاقت حسین کو اپنے یہاں ہی انیکسی میں رہائش دے دیتا ہے جبکہ فرحین بھی اپنے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتی ہے اور وہاں کا احوال لیاقت حسین کو بتاتی ہے۔ دوران تفتیش انسپکٹر دانش سراج کو ایک اہم فائل کے متعلق بتاتا ہے، دوسری جانب شیخ حامد سخت مشتعل ہو کر انسپکٹر لودھی کی ملی بھگت سے بلیک ٹائیگر کے ذریعے تھانے پر حملہ کر کے انسپکٹر دانش کو قتل کرا دیتا ہے اور تھانے کا تمام ریکارڈ جلا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ افضل خان اسپتال سے فارغ ہو کر بے یار و مددگار مایوسی کے عالم میں خودکشی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اسے شبنم اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے جاتی ہے۔ شبنم بگ باس کے زیر اثر اسی کی ہدایت پر افضل خان کو اپنے فلیٹ میں لائی تھی اور اس کا مقصد آخری چانس کے طور پر شیخ حامد کے مخالفین کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو اغوا کرایا جاتا ہے جہاں ہمزاد پہنچ کر اسے آزاد کرا لیتا ہے۔ اورنگ زیب سراج سے مل کر باہمی اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ حامد کے گھر پر حملہ ہوتا ہے اور وہ چراغ پا ہو کر انسپکٹر لودھی سے باز پرس کرتا ہے اور ایک نئے حریف رستم علی آغا خانی کا کردار سامنے آتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”سر......!“ کنول آبدیدہ ہو گئی۔ ”آپ میرے محسن ہیں۔ ہر ماہ جو تنخواہ دیتے ہیں اس کا تصور تو میرے خواب میں بھی نہیں تھا۔ آپ کے ہاں ملازمت کرنے سے پہلے ہمارا گزارا کس طرح ہوتا تھا شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ”میرے معصوم باپ کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا گیا تھا کہ اس نے کسی واقف کار کی ناجائز خواہش پر سر تسلیم خم کرنے کے بجائے اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ دوسرے ہی دن میرے باپ کو دفتر کے بعد ایک ٹیوشن پڑھانے کے بعد گھر آتے وقت سر عام قتل کر دیا گیا۔“ کنول کی آواز بھرانے لگی۔ ”تین کرائے کے بدمعاش جو ڈھاٹا باندھے ہوئے تھے ایک پک اپ سے کود کر اچانک سامنے آ گئے۔ انہوں نے بھری پری شاہراہ پر میرے والد کو چاقوؤں اور خنجر کے وار کر کے موت کی نیند سلا دیا۔ وہاں سیکڑوں افراد موجود تھے۔ کسی نے ان لفنگوں کے ہاتھ سے ایک ایسی قیمتی جان بچانے کا رسک نہیں لیا جو اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے سر...... انہیں بھی عزیز ہو گی جو وہاں اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ میرے باپ کے جسم پر اکیس گہرے زخم آئے تھے...... شاید اس کے مرنے کے بعد بھی ایک کمزور عورت کو اپنی عزت بچانے کے جرم میں سزا دی گئی تھی۔“ کنول کی ہچکیوں نے ایک لمحے کے لیے اسے خاموش کیا تو شیخ حامد نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہیں اس شخص کا پتا معلوم ہے جس نے تمہاری ماں کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی؟“

”پرانے زخموں کو دوبارہ کریدنے سے کیا فائدہ سر؟“ اس نے سسکتے ہوئے، رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس حادثے کو بھی دس سال بیت گئے...... میری ماں نے محلے والوں کے مشورے پر اسی دن خاموشی سے اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا جس دن میرے والد کی تدفین ہوئی تھی۔ میری عمر اس وقت شاید سات یا آٹھ سال کی رہی ہو گی۔ کئی بار میں نے ماں کو کریدنے کی کوشش کی لیکن کوئی خوف تھا جس نے اس کی زبان میں تالے ڈال

...ہیں اور اب تو میں نے اصرار کرنا بھی چھوڑ دیا۔“

”آئی۔ سی......“ اس نے کنول کو ہمدردانہ نظروں ...دیکھا۔ ”اس وقت تم جس مکان میں ہو وہ......“

”وہ میرے والد کے دور پرے کے عزیز داروں کا ...ہے۔“

”گزر اوقات کس طرح ہوتی تھی؟“

”ماں نے میری پرورش کے لیے سلائی کڑھائی کا کام ...کر لیا تھا۔ اسی سے گزارا ہو رہا تھا۔ دو آدمیوں کا خرچ ہی کتنا ...ہوتا ہے۔“

”تمہاری تعلیم کا کیا ہوا......؟“

”میں نے کسی نہ کسی طرح میٹرک کر لیا تھا سر، پھر...... ...میں بھی ماں کے کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔“ کنول نے ...دبی زبان میں کچھ توقف سے کہا۔ ”آپ نے مجھے ملازمت ...دے کر بہت بڑا احسان کیا ہے سر...... میری ماں کا بوجھ بھی ...کچھ ہلکا ہو گیا ہے لیکن......“ وہ کچھ کہتے کہتے یک لخت ...خاموش ہو گئی پھر سسکتے ہوئے بولی۔ ”آج پہلی بار آپ نے ...میرے قریب آنے کی کوشش کی تو مجھے مرحوم باپ کی ...دردناک موت یاد آ گئی...... شاید...... شاید آپ کو میرا ...مزاحمت کرنا برا لگا ہو؟“

”ڈونٹ بی سلی......“ اس نے کنول کو تسلی دی، اوپری ...دل سے اپنی غلطی کا ڈھکے چھپے لفظوں میں اقرار کرتا رہا پھر ...اچانک اس سے ایک ایسا سوال کر دیا کہ کنول کو اپنی سماعت ...پر دھوکا ہونے لگا۔ اس نے حیرت سے شیخ حامد کو دیکھا۔

”مجھے احساس ہے کہ میری تمہاری عمروں میں بڑا ...فرق ہے لیکن تمہیں وہ تحفظ ضرور مل جائے گا جو ابھی تک نہیں ...مل سکا۔“ اس نے ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر اپنا منہ دوسری ...طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”انکار کی صورت میں بھی میں برا ...نہیں مانوں گا۔ تم اپنی ماں سے بھی مشورہ کر لینا۔“

”آپ محسن ہیں سر...... جو پیشکش کر کے آپ نے مجھے ...دینے کی بات کی ہے وہ کسی شریف ماں بیٹی کے لیے ...بڑی اہم بات ہے لیکن...... آپ کے اور میرے اسٹیٹس ...میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔“ اس نے کھلے لفظوں میں ...کہا۔ ”اقرار کرنے کی صورت میں تمہیں اور تمہاری ماں کو ...شاندار کوٹھی میں منتقل کر دوں گا۔ وہاں تم دونوں کو ہر قسم ...کی آسائش حاصل ہو گی۔ ایک بات کا خیال بھی رکھنا ہو گا؟“

”وہ کیا...... سر؟“

”یہ شادی خفیہ ہو گی اور...... خفیہ رہے گی، میں اپنے دشمنوں کو ہنسنے کا موقع دینا پسند نہیں کروں گا۔ تمہیں دھوکا بھی نہیں دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ شیخ حامد کا وعدہ۔“

”میں آپ کا پیغام ماں تک ضرور پہنچا دوں گی۔ فیصلہ کرنا اسی کا حق ہے ویسے...... ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ یقیناً میرے حق میں فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ مم...... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔“

کنول خاموشی سے کافی پیے بغیر کھڑی ہو کر اپنے آفس میں چلی گئی۔ شیخ حامد کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب اسے اپنے دوسرے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔

☠☠☠

چھریرے بدن، درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک سیاہ فام ہاشم اس وقت ایک فور اسٹار ہوٹل کے ساتویں فلور کی بالکونی میں کھڑا، دوربین آنکھوں سے لگائے ساحل سمندر پر ہونے والی چہل پہل دیکھنے میں مشغول تھا، اس کے جسم پر اس کا روایتی لباس، پیلے رنگ کی گھٹنوں تک کی ہاف پینٹ اور پیکاک بلیو کلر کی بنگی شرٹ نظر آ رہی تھی۔ جنوبی افریقا میں بھی وہ اکثر و بیشتر اسی لباس کو پسند کرتا تھا۔ اس کی دوربین کا فوکس ایک چھ ساڑھے چھ برس کا بچہ تھا جو گلے میں موٹر ٹیوب ڈالے آنے والی لہروں پر بار بار جمپ لگا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

خوبصورت اور معصوم بچے ہاشم کی کمزوری تھے۔ اس لیے کہ شادی کے بعد اس کا ایک ہی بچہ تھا جو پانچ ساڑھے پانچ سال کا ہونے کے بعد ایک قدرتی حادثے کا شکار ہو گیا تھا، اولاد کے غم میں اس کی بیوی بھی اسے داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ ساحلی علاقے کے سبب ہی اس نے اس فور اسٹار ہوٹل کو ترجیح دی تھی، ورنہ اس سے بہتر کسی فائیو اسٹار میں بھی ٹھہرنے کا مجاز تھا۔ وہ اس بچے کو بڑی محویت سے دیکھنے میں مصروف تھا جب موبائل کی گھنٹی کی میوزک ٹون دوسری بار سنائی دی۔ اس نے دوسری بار بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا چائنیز شریک کار اسے فون کر رہا ہو گا جو کسی بھی ٹاسک کے مکمل ہو جانے کے بعد بھی کئی دن تک وسوسوں کا شکار رہتا اور بال کی کھال نکالتا رہتا تھا۔ ہاشم کو اس کی زیادہ دور اندیشی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی لوچن اسے ابھی تک پارٹی سربراہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھا، یہ غلط فہمی اسے جہاز میں اس وقت لاحق ہوئی تھی جب لوچن ایئر ہوسٹس سے دل بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ ہاشم کباب میں ہڈی بن کر اس کے راستے میں آ گیا تھا پھر اس

نے تیسرے مسافر ڈوما کے بارے میں جب لوچن کو بتایا تھا کہ وہ معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے تو لوچن کو اس پر تعجب ہی ہوا تھا۔ اس کے بعد سے لوچن اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ ہاشم ہی دراصل کوڈ ''سیون اسٹار'' کا استعمال کسی عورت کے ذریعے اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے کر رہا ہے لیکن...... جب تیسری بار موبائل کی میوزک ٹون گونجی تو ہاشم نے کمرے میں آکر موبائل آن کر دیا۔

''ہاشم اسپیکنگ!'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''سیون اسٹار......'' دوسری جانب سے کوڈ ورڈ کے ساتھ ہی نسوانی آواز ابھری۔ ''تم شاید کسی ضروری کام میں مصروف تھے؟''

''میرا خیال تھا کہ غالباً حسب معمول لوچن کے پیٹ میں درد ہو رہا ہوگا۔'' اس نے سنجیدگی اختیار کی۔ ''کسی کام کے مکمل ہو جانے کے بعد وہ مختلف شبہات میں مبتلا ہو جانے کا عادی ہے۔''

''اس بار وہ کس بات پر غور کر رہا ہے......؟'' بہ دستور سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

''لوچن کا خیال ہے کہ میں نے چار مقامی لوگوں کو اپنی خصوصی پلاننگ کے تحت ہائر (HIRE) کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں نے محل وقوع کا جائزہ لینے کے بعد ہی تین اطراف سے بیک وقت فائرنگ کرنے کی پلاننگ کی تھی۔'' ہاشم نے وضاحت کی۔ ''اگر ہم تینوں نے تنہا تنہا رہ کر اس پر عمل کیا ہوتا اور کوئی ایک بھی دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتا تو باقی دو بھی زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔''

''میں تم سے متفق ہوں لیکن مقامی بدمعاش زیادہ قابل بھروسا نہیں ہوتے، دولت کا لالچ دے کر انہیں منہ مانگے داموں خریدا بھی جاسکتا ہے...... جگا اس معاملے میں پہلے ہی بدنام ہے۔''

''اس کا اصل نام جہانگیر بٹ ہے۔''

''جانتی ہوں...... پہلے وہ سیدھے راستوں کا مسافر تھا۔ ایک کیس میں مجرم نہ ہونے کے باوجود پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ دو ہفتے جیل میں عادی مجرموں کے درمیان رہ کر باہر نکلا تو اسے احساس ہوا کہ طاقت اور دولت کے بغیر اوسط درجے کے لوگوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اس لیے وہ عادی مجرم بن گیا اور اب ایک گینگ کا مالک ہے۔ پولیس کو ہر ماہ پابندی سے طے شدہ رقم ملتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ جگا کے سلسلے میں چشم پوشی کرتی ہے۔ بہرحال۔'' دوسری جانب سے بات کو مختصر کر کے کہا گیا۔ ''بگ باسٹرڈ کے زرخرید کتے بو سونگھتے ہوئے جگا تک پہنچ گئے ہیں۔ جگا نے فی الحال انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ مرنے والے دونوں افراد دو روز کی چھٹی پر تھے، وہ اس کے گینگ میں بھی نئے نئے شامل ہوئے تھے۔''

''پھر...... پریشانی کس بات کی ہے؟'' ہاشم نے روانی میں دریافت کیا۔ ''مرنے والے دوبارہ جگا کے خلاف گواہی دینے نہیں آئیں گے۔''

''ہاشم......'' دوسری جانب سے تنبیہ کی گئی۔ ''تم شاید بھول رہے ہو کہ کس سے بات کر رہے ہو؟''

''آئی ایم سوری لیکن......''

''دو آدمی جو مفرور ہو گئے ہیں، اگر وہ پکڑے گئے تو......؟'' چبھتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا گیا۔

''ہاشم ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھ کر کام کرنے کا عادی ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''وہ اگر سامنے آبھی گئے تو گواہی دینے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔''

''میں تمہاری صلاحیتوں سے واقف نہ ہوتی تو تمہارا انتخاب بحیثیت رنگ لیڈر کے کبھی نہ کرتی...... ممکن ہو تو جگا سے فون پر رابطہ قائم کر کے پہلی فرصت میں معلوم کرو کہ وہ دونوں کہاں ہیں...... ان کو قبل از وقت وارننگ دے دی جائے تو مناسب ہوگا۔''

''آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن اگر انہوں نے اسے ہماری کمزوری سمجھ کر منہ کھولنے کی کوشش کی اور مزید کچھ رقم کا مطالبہ کیا تو......؟''

''ہمارے ملک میں کمیٹی والے بھی بھونکنے والے آوارہ کتوں کو زہریلی گولیاں دے کر ختم کر دیتے ہیں۔ تمہیں بھی پوری اجازت ہے لیکن میں غیر ضروری خون خرابا پسند نہیں کرتی۔''

''ایک مشورہ اور چاہتا ہوں۔'' ہاشم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کوئی مرض دائمی صورت اختیار کر جائے تو مریض کو صرف ایک خوراک دینے سے کام نہیں بنتا۔''

''آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن...... کیا تم تنہا اس کام کو کرنے کی جرأت کر سکو گے؟''

''میرے آگے پیچھے رونے والا کوئی نہیں ہے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''میرے ذمے اس کا ایک پچھلا قرض بھی ہے جسے میں چکتا کرنا چاہوں گا۔''

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''نہیں......'' ہاشم معنی خیز انداز میں مسکرایا، وہ سمجھ گیا

تھا کہ ''آخری فیصلے'' کے حوالے سے اس کا امتحان لیا گیا ہے۔ اس نے جواب دینے میں پوری احتیاط سے کام لیا۔ ''مجھے سیون اسٹار سے کوڈ سے متعلق تمام شرائط یاد ہیں۔ جب تک اسی حوالے سے لائن کلیئر کا سگنل نہ ملے میں خود سے کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ سوائے ایک صورت میں۔''

''اس صورت کی وضاحت ضروری ہے؟''

''کوئی ایسا موقع بھی آتا ہے جب انسان پوری طرح بے بس ہو کر خود کو بچانے کی خاطر سچویشن کے اعتبار سے اپنی مرضی کا مالک ہو جاتا ہے۔''

''تم دور اندیش ہونے کے علاوہ تجربہ بھی رکھتے ہو......'' اس کی وضاحت کو سراہا گیا۔ ''سیون اسٹار گروپ نے یقیناً تمہارے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی...... میری طرف سے تمہیں اپنا قرض چکانے کی اجازت ہے لیکن...... بات یا تختہ کے علاوہ کوئی اور غلطی نہ کرنا، اس بات کی بھنک لوچن یا ڈوما کو نہیں ہونی چاہیے۔''

دوسری طرف سے جملہ مکمل ہونے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ ہاشم کے چہرے پر ابھرنے والے خوشی کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ وہ شیخ حامد سے اپنا حساب بے باق کرنے میں وقت نہیں لے گا۔ اسے یاد تھا کہ کچھ لوگ اسے اس وقت ہوٹل سے اغوا کر کے اس جگہ تک لے گئے تھے جہاں لوچن اس گڈس ٹرانسپورٹ کے ڈرائیور کو بازیاب کر کے لیاقت حسین کی گاڑی کو ٹکر مارنے کے سلسلے میں اس کی زبان کھلوانے کی خاطر ٹارچر کر رہا تھا۔ ہاشم کو اپنے اغوا کرنے کا وہم وگمان بھی نہیں تھا اس لیے وہ بری طرح پھنس گیا تھا، ایسے وقت میں بھی اس کے ذہن کی مشین برابر کام کر رہی تھی۔ اغوا کرنے والے اسے اور لوچن کو ایک ساتھ ختم کرنے کے موڈ میں تھے، یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے اور لوچن کے درمیان نورا کشتی والی تکرار بھی ہوئی تھی، خود لوچن کو خطرے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیور کی بندشوں کو کھولنے کی کوشش کی تھی پھر...... اپنے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بازی پلٹ دی تھی، اغوا کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ اور ہاشم دوبارہ آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اسی روز ہاشم نے اس شخص کا نام جاننے کی درخواست کی تھی جس کے کارندوں نے اغوا کیا تھا۔ ''سیون اسٹار'' کی طرف سے اسے اجازت مل گئی تو وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ وہ اس قرض کو واپس کرنے کی خاطر فوری طور پر پلاننگ کرنے میں محو تھا جب دروازے پر دستک کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ پلک جھپکتے میں اس نے اپنا بے آواز آٹومیٹک تکیے کے نیچے سے نکال کر بگی شرٹ کے اندر کر کے ہاف پینٹ میں اڑسا پھر دروازے کے قریب جا کر میجک آئی میں دیکھا۔ آنے والی ہوٹل کی خوبصورت ہوسٹس تھی جو دو بار پہلے بھی اسے ''مخصوص ٹائپ'' کے لوگوں میں شمار کر کے اپنی اداؤں سے نواز چکی تھی۔ ہاشم نے کچھ سوچ کر دروازہ کھول دیا۔

''اگر آپ مصروف نہ ہوں تو میں کمرے کی ضروری صفائی کر دوں؟'' حسب معمول اس نے ہاشم کی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکا۔ ''بیڈ کی چادریں اور پلو کورز بھی تبدیل کرنے ہیں۔''

''کل ہی تو آپ نے تبدیل کیے تھے؟''

''ہم خاص طور پر غیر ملکی ٹورسٹ کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔'' ہوسٹس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میں اس وقت شاور لینے جا رہا تھا۔'' ہاشم نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''اگر آپ شام کی چائے میرے ساتھ پینا پسند کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس وقت مجھے تنہائی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔''

''او۔ کے، ایز یو وش۔'' اس نے معنی خیز اور دلربا انداز میں جواب دیا پھر مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

ہاشم نے دروازہ بند کرنے کے سکون کا گہرا سانس لیا۔

❀❀❀

شبنم نہا دھو کر اپنے کمرے سے پوری طرح چینج کر کے ناشتے کی میز پر آئی تو افضل خان نے اسے سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھا، اس وقت وہ خاصے ماڈرن ڈریس میں تھی جبکہ پہلے خود بہت لیے دیے رکھنے کی عادی تھی۔ افضل خان اس تبدیلی کو معنی خیز انداز میں سوچ رہا تھا۔ اسے شبنم کے فلیٹ میں آئے پورے سات روز گزر چکے تھے۔ بگ باس کی دی ہوئی رعایت ختم ہونے میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ ''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' وہ پہلے والی پوزیشن میں ہوتا تو شاید سات دنوں میں شبنم کو شیشے میں اتارنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلتا تو وہ انگلی ٹیڑھی کرنے کے فن سے بھی واقف تھا لیکن موجودہ حالات میں ہر گزرنے والا دن ایک سخت امتحان تھا۔ ان حالات میں جبکہ اس کا مستقبل تلوار کی نوک پر تھا، وہ شبنم کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں

سکتا تھا۔

”خلاف توقع تم پہلے کے مقابلے میں اب بہت سنجیدہ ہوتے جا رہے ہو؟“ شبنم نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”تم بھی پہلے اتنی ماڈرن اور بے باک نہیں تھیں۔“ وہ دبی زبان میں بولا۔

”کبھی حالات اور کبھی کچھ مجبوریاں انسان کے اندر بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔“

”تم کس وجہ سے مجبور ہوئیں......؟“

”کوئی اور بات کرو......“ اس نے بیزاری کا اظہار کیا پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”باس نے تمہیں جو رعایت دی تھی اس کے ختم ہونے میں......“

”جانتا ہوں......“ افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ”صرف تین دن اور رہ گئے ہیں لیکن تم پریشان نہ ہو...... ہوسکتا ہے میں اس سے پہلے ہی......“

”نہیں......“ شبنم نے اسے نشیلی نظروں سے دیکھا۔ ”میری اجازت کے بغیر تم کوئی ایسی غلطی نہیں کرو گے۔“

”سوری...... میں تمہیں اپنی وجہ سے پریشانی میں نہیں ڈالوں گا۔“

”بات پریشانی کی نہیں تمہارے آخری فیصلے کی ہے۔“ اس نے افضل خان کو تیکھی نظروں سے دیکھا پھر چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔

”میرا آخری فیصلہ...... تعجب ہے تم ایسی بات کہہ رہی ہو جس پر میرا ابھی پاگلوں کی طرح قہقہہ لگانے کو جی چاہ رہا ہے۔“ افضل خان کے جواب میں اس کا اعصابی تناؤ اور ٹوٹ پھوٹ کا احساس چھلک رہا تھا۔ ”میرا فیصلہ وہی ہے جو یہاں آنے سے پہلے تھا، میں نے جس شہر میں کسی بھی وجہ سے راج کیا ہو، وہاں بھکاری کی طرح زندہ رہنے پر موت ہی کو ترجیح دوں گا۔ تم نے جتنے دنوں اپنی چھت کے نیچے سہارا دیا، اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”ایک سوال کروں؟“ اس نے افضل خان کی آنکھوں میں خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ ”بے تکلفی سے جواب دو گے؟“

”پوچھو......“

”حالات کی تبدیلی سے پہلے تم مجھے شکار کرنے کی خاطر نہیں سوچتے تھے؟“ اس کے لہجے میں بے باکی بھی شامل ہوگئی۔

”ہاں......“ وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ”مگر میں نے بارہا اس خواہش کو بگ باس کے خوف کی وجہ سے پورا کرنے کی جسارت نہیں کی۔“

”سات روز تک میرے ساتھ تنہا رہنے کے بعد بھی تمہیں کبھی اس کا خیال نہیں آیا......؟“ شبنم نے اسے مزید ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”نہیں...... شاید اس لیے کہ جب موت کا تصور ذہن کو مایوسی کی انتہا پر پہنچا دے تو اس وقت انسان کو پیٹ بھرے کی باتیں نہیں سوجھتیں۔“ افضل خان نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”تم نے ابھی میرے کسی آخری فیصلے کی بات کی تھی؟“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا؟“ وہ یک لخت سنجیدہ ہوگئی۔ ”آخری فیصلہ تم ہی کو کرنا ہے لیکن...... تمہیں یاد ہوگا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں لاتے وقت میں نے تم سے کہا تھا کہ بگ باس کسی شخص سے خوش نہیں ہے۔ شاید وہ تمہیں کوئی آخری چانس دے اور کامیابی کی صورت میں اس کی خفگی کچھ کم ہوجائے۔ یہ تمہارا امتحان بھی ہوگا۔“

”کون ہے وہ؟“

”پہلے ایک ہی تھا۔ اب دو ہوگئے ہیں۔“ اس نے افضل خان کے صبر کو آزمانے کی خاطر اوپر سے ملنے والی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم کس کا انتخاب کرتے ہو؟“

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ پہلے کے مقابلے میں تم زیادہ عقلمند ہوگئی ہو۔ بہر حال، مجھے بتاؤ کہ ان دونوں مخالفین کا نام کیا ہے؟“

”ایک آغا منظور کی جگہ آنے والا نیا ایس پی اورنگ زیب اور دوسرا......“ اس نے توقف سے کہا۔ ”تم شاید اس کو پہلے سے جانتے ہو گے۔ میں سیٹھ رستم علی آغا خانی کی بات کر رہی ہوں۔“

”اس نے کیا کیا؟“ افضل خان نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ایک خیال ہے کہ باس کے بنگلے پر حملہ کرنے والے اسی کے پروردہ افراد بھی ہوسکتے ہیں۔“

”یہ کس کا خیال ہے...... تمہارا یا...... بگ باس کا؟“

”آم کھانے سے مطلب رکھو۔“ شبنم کا لب ولہجہ کاروباری ہوگیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کو دیے گئے موبائل کا کوئی خفیہ میکنزم اس وقت بھی اس کی آواز کو کسی دوسرے برقی آلے پر بھی ٹرانسمٹ (Transmit) کر رہا ہوگا اس لیے بہت محتاط انداز میں بولی۔ ”میں نے اپنے اندازے سے

تمہیں دونوں نام بتا دیے ہیں۔ فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔“

افضل خان تلملا کر رہ گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ شبنم اب پوری طرح بگ باس کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ ایک لمحے تک وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بڑی بے پروائی سے پوچھا۔

”اگر میں ایک پرانے واقف کار کی حیثیت سے فیصلے کا اختیار تمہیں دوں تو تم کس کا نام تجویز کرو گی؟“

”مجھے دفتر جانے کی جلدی ہے۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کوئی جلدی نہیں ہے تم شام تک سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بھی کوئی حتمی فیصلہ کرسکتے ہو۔“

”بگ باس کی کیا خواہش ہے؟...... وہ ان دونوں کو کوئی سبق دینا چاہتا ہے یا انہیں ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹانا پسند کرے گا؟“

”میں نے تم سے روز اول بھی اپنا اندازہ ہی ظاہر کیا تھا۔“ محتاط لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”اس وقت بھی میرا خیال ہے ان دونوں کو کوئی ایسا سبق دینا ضروری ہے کہ ہمارے شبہات دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کرسکیں۔“

”ٹھیک ہے......“ افضل خان کے تجربے نے اسے باور کرا دیا کہ شبنم کھل کر بگ باس کا نام لینے سے گریز کر رہی تھی، پہلے وہ بھی اسی اصول پر کاربند رہا کرتا تھا چنانچہ اس نے شبنم کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر قدرے رومانٹک اور جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں فیصلے کا اختیار تمہیں دیتا ہوں۔ شاید میں سات دنوں تک اس عارضی زندگی کا کچھ بوجھ ہلکا کر سکوں جو تم نے رسک لے کر......“

”کیا تم میرے کسی بھی فیصلے کو قبول کرلو گے؟“ جواب میں شبنم نے بھی رومانٹک انداز اختیار کیا۔

”آزما کر دیکھ لو۔“

”میرے مشورے پر اگر تم ان دونوں کو فی الحال کوئی سبق دے سکو تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”پہلے تم کسے ترجیح دو گی؟“

”رستم علی آغا خانی۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”نئے ایس پی کے سلسلے میں، میں اس حد تک تمہیں آگاہ کرسکتی ہوں کہ مرکزی حکومت میں اس کے بھی دو چار خاص واقف کار ہیں۔ نہ ہوتے تو شاید اب تک اس کا تبادلہ بھی ہوچکا ہوتا۔“

”ہم جیسے کارندوں کے لیے یہ سوچنا ضروری نہیں ہوتا کہ ہمارا شکار کتنا اہم ہے۔ اس سے زیادہ باس کا اشارہ اہمیت رکھتا ہے۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم کوئی اوچھا وار کرنے سے دریغ کرو گے۔“ شبنم نے دبی زبان میں جواب دیا پھر خاص انداز سے الوداعی بوسہ ہوا میں اچھالتی، اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر دفتر کے ارادے سے باہر چلی گئی۔ افضل خان نے دروازہ اندر سے بولٹ کرلیا۔ اس وقت وہ زندگی اور موت کے دہانے پر کھڑا کوئی آخری فیصلہ کر رہا تھا۔ اس کا ذہن شبنم کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو خلاف توقع بہت زیادہ بے باک اور ماڈرن ثابت ہو رہی تھی۔ اس تبدیلی کے عقب بھی اسے بگ باس کی خباثت ہی نظر آرہی تھی۔

دفتر پہنچ کر شبنم نے سب سے پہلے کنول کے ذریعے بگ باس کو اپنی آمد کی اطلاع دی، اسے یقین تھا کہ اگر افضل خان اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کسی بھی ذریعے سے بگ باس کے کانوں تک پہنچ چکی ہے تو وہ اسے اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں بلانے میں دیر نہیں کرے گا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ دو منٹ بعد اسے کنول کی طرف سے مخصوص کمرے میں پہنچنے کی ہدایت بھی مل گئی۔ ہدایت کے مطابق وہ پورے دس منٹ ساؤنڈ پروف کمرے میں شیخ حامد کے سامنے بیٹھی رہی۔

”کیا تمہیں اس وقت مجھ سے کوئی ضروری کام تھا؟“ خطرناک مگرمچھ نے اس انداز میں مخاطب کیا جیسے وہ کسی بات سے مطلق آگاہ نہیں ہے۔ شبنم نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ سنبھل کر بولی۔

”اگر میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا تو معذرت خواہ ہوں لیکن کچھ ضروری بات کرنی تھی۔“

”اب ان عارضی تکلفات کو چھوڑو مائی ڈیئر......“ شیخ حامد نے اس کو بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”میرے اور تمہارے درمیان سے سارے پردے جب سرک چکے ہیں تو اب ہمیں ایک دوسرے سے بلا جھجک، بے تکلفی سے بات کرنی چاہیے۔“

”شکریہ باس......“ اس نے دل پر جبر کرکے بگ باس کا اشارہ بھانپ کر قدرے برداشت سے کام لیا۔ ”میں آپ سے افضل خان کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔“

”اوہ......“ اس بار بھی لاعلمی کا بے حد کھلا ہوا مظاہرہ کیا گیا۔ ”کوئی خاص بات......؟“

”میں نے آج ناشتے پر اس کے ساتھ کھل کر بات کی تھی۔“

”کرسی لے کر میرے قریب آجاؤ......“ اس نے شبنم

کے گدرائے ہوئے چہرے پر نظر جمائے جمائے بڑی فیاضی کا اظہار کیا۔ ”کسی ورکر کو اپنے قریب بیٹھنے کی آفر میں پہلی بار دے رہا ہوں۔“

شبنم انکار نہ کرسکی، جبراً زبردستی مسکراتی ہوئی کرسی لے کر اس کے قریب چلی گئی۔ اس نے دبی زبان میں باس کی آفر کا شکریہ بھی ادا کیا۔

”مجھے یقین ہے کہ زندگی اور عزت دو ایسی قیمتی اور کمزور چیزیں ہیں جن کو بچانے کی خاطر انسان اکثر مجبوری کا شکار ہوجاتا ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ شبنم کے شانوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”افضل خان بھی اس وقت ایسی ہی کشمکش سے دوچار ہوگا۔“

”یس باس......“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”میں نے اسے یہی مشورہ دیا ہے، اسے ہمارے دونوں حریفوں کو کم از کم اتنی سزا ضرور دینی ہے جو انہیں اس بات کا احساس دلادے کہ وہ دوبارہ آپ کی طرف بھول کر بھی نگاہیں اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔“

”دونوں کون؟“ اس بار بھی معصومیت سے دریافت کیا گیا۔

”نیا ایس پی اور رستم علی آغا خانی......“

جواب میں خطرناک مگرمچھ نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا، اس کے ہاتھوں کی حرکت شبنم کے شانوں پر بتدریج بڑھنے لگی، نظریں خلا میں کچھ تلاش کرتی رہیں پھر اس نے ہاتھ کی جنبش روک کر شبنم کی طرف دیکھا۔

”مجھے تمہارا مشورہ پسند آیا لیکن فی الحال رستم علی کے کچھ پیچ ٹائٹ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، ایس پی کے بارے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے...... اس کے لیے میں نے کچھ اور پلان بنایا ہے۔“

”ایز یو وش...... سر!“

”میڈم سے تمہاری بے تکلفی کس حد تک ہوچکی ہے؟“ سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔

”آپ کے حکم کے مطابق میں میڈم کو بڑی حد تک شیشے میں اتار چکی ہوں۔“

”گڈ......“ شیخ حامد نے بڑی بے تکلفی سے شبنم کے گالوں پر ہاتھ پھیرا...... معنی خیز لہجے میں سرسراتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اسے شیشے میں اتار کر اس کا زہر نکالنا چاہتا ہوں...... زہر نکال دیا جائے تو پھر ناگن بھی اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔“

شبنم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، زبردستی مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔

”کیا تم اس کو کسی تفریحی مقامات پر لے جاسکتی ہو......؟“

”ابھی تک ایسا تجربہ نہیں ہوا......“ اس نے مصلحتاً حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بڑی رازداری سے جواب دیا۔ ”ایک دوبار کوشش میں کامیاب ہوجانے کے بعد پورے یقین سے اس ناگن کا زہر بھی نکالنے کا پروگرام زیادہ مناسب ہوگا۔“

”تمہارا جواب سن کر مجھے خوشی ہوئی۔“ شیخ حامد کا ہاتھ شبنم کے جسم پر ادھر ادھر بہکنے لگا تو شبنم نے کسمسا کر کہا۔

”یہ دفتر ہے سر......!“

”گھبراؤ مت...... میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ایک حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

شبنم خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ سات آٹھ منٹ تک شیخ حامد اس کے جسمانی گداز سے خود کو عارضی سکون پہنچاتا رہا پھر اس نے شبنم کو جانے کی اجازت دی تو وہ اس وقت بھی مسکراتی ہوئی اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آگئی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس وقت ہی اس خطرناک مگرمچھ کو زندہ درگور کرنے سے گریز نہ کرتی۔

اس روز دفتری اوقات میں بھی وہ بگ باس کے موجودہ برتاؤ پر غور کرتی رہی۔ کھیل ایک بار شروع ہوجائے تو ہمیشہ درمیان میں نہیں رکتا، کبھی کبھی اس کا اختتام بھی عمل میں آجائے تو جیت اور ہار کا وقت ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، شیر کے منہ میں خون کا ذائقہ بدلنے لگے تو وہ ہر کسی کو پھاڑ کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ شبنم اپنی تصاویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ چکی تھی، خطرناک مگرمچھ میڈم کو بھی اسی کے ذریعے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

تنہا عورت جو خود بے بس ہوچکی ہو کسی خطرناک مجرم کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ لوہے کو کاٹنے کی خاطر ہمیشہ لوہا ہی کارآمد ہوتا ہے، یہ مثال وہ بچپن سے سنتی چلی آئی تھی۔ شبنم کو بھی ان نازک حالات میں کسی ایسے مرد کی ضرورت تھی جو شیخ حامد کے مقابلے کی ہمت رکھتا ہو، انہی خیالات کے تیز بہاؤ میں اسے افضل خان کا خیال آیا۔ جب وہ باس کا دست راست تھا اس وقت شبنم کے علاوہ خود میڈم نے بھی اسے استعمال کرنے کی ٹھانی تھی لیکن افضل خان نے اپنی فطرت کے مطابق ڈبل کراس کی پالیسی اپنائی مگر اس وقت وہ زندگی کے بجائے موت کو اپنانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ لوہا گرم ہو تو اسے معمولی ضرب لگا کر بھی اپنی خواہش کے مطابق موڑا جاسکتا ہے۔ شبنم

نے ایک بار حالات کے پیش نظر افضل خان کو آزمانے کی ٹھان لی۔ وہی اس کے لیے آخری آپشن تھا۔

دن بھر وہ اپنی سوچ کر مختلف زاویوں سے پرکھنے کے بعد ایک آخری فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ دفتر سے اپارٹمنٹ پہنچی تو افضل خان سامنے ہی ایک صوفے پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ شاید جو دو ٹارگٹ اسے دیے گئے تھے وہ دونوں ہی مشکل تھے۔ پہلی والی پوزیشن ہوتی تو وہ اجرتی قاتلوں اور بدمعاشوں کے علاوہ خطرناک مگرمچھ کے پروردہ ٹاپ کلاس اشتہاری مجرموں کو بھی استعمال کرسکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اسے تنہا اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کا سخت امتحان درپیش تھا۔ وہ اس وقت موت کے کنویں میں تھا جہاں جیت کے امکان کم اور بربادی کے امکان بہت زیادہ تھے۔

”کیا بات ہے گریٹ خان۔“ شبنم نے اسے دوستانہ انداز میں گریٹ خان کے خطاب سے نوازا تو افضل خان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تڑپ کر رہ گئی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”تم نے جو امتحان کا پرچہ صبح دیا تھا اسی کو موثر طریقے سے حل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہوں۔“

”اوہ...... کم آن۔“ وہ ہینڈ بیگ ایک طرف اچھال کر افضل کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ ”مجھے اب بھی امید ہے کہ بگ باس کو خوش کرنے کے لیے تم جان کی بازی لگا کر بھی اپنا کھویا ہوا مقام کسی حد تک حاصل کرسکتے ہو...... ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ سے کم کا نہیں ہوتا۔“

”کسی حد تک سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ جواب میں اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا گیا۔

”بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ بگ باس کے خوف سے پھر محتاط ہوگئی، سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”اس کی جگہ اگر میں بھی ہوتی تو شاید میں بھی فوری طور پر تمہیں تمہارا کھویا ہوا مقام واپس نہ کرتی، اس کو حاصل کرنے کی خاطر تمہیں ایک نئے سرے سے محنت کرنی ہوگی، بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مجھے ذاتی مفاد کی خاطر جب قربانی کا جانور بنادیا گیا تو پھر بگ باس سے......“

”ہوش میں رہو، افضل خان۔“ شبنم نے بھڑک کر تیز لہجہ اختیار کیا پھر پرس کھول کر ایک تحریر شدہ پرچہ افضل خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بہ دستور انتہائی درشت آواز میں بولی۔ ”اگر تم نے باس کے لیے کوئی غلط بات زبان سے نکالی تو پھر تمہیں میرے اپارٹمنٹ میں ایک پل کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔“

افضل خان، شبنم کے اس تضحیک آمیز جملے پر تلملا کر رہ گیا پھر اس نے تہ کیا ہوا پرچہ کھول کر دیکھا تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ پرچے پر صرف ایک مختصر مگر اہم پیغام درج تھا۔

”ہماری اس کمرے میں ہونے والی گفتگو بھی دوسری جانب سنی جارہی ہے۔ محتاط رہنا، ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں، کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی کام آسکوں۔“

”مجھے تمہارے جواب کا اندازہ تھا۔“ افضل خان نے پوزیشن کی نزاکت سمجھ کر کینچلی بدلی۔ ”بگ باس کے میری ذات پر بے شمار احسانات ہیں، میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن خدا گواہ ہے کہ میڈم کے سلسلے میں مجھے......“

”وہ بھی ایک مصلحت تھی۔“ شبنم نے بہ دستور روکھے لہجے میں اس کا جملہ درمیان سے اچک لیا۔ ”تم تصویر کا دوسرا رخ کیوں نظر انداز کر رہے ہو؟“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”تمہیں اب جو موقع ملا ہے وہ بھی بگ باس ہی کی مہربانی ہے ورنہ اسے رعایت دینے کی کیا ضرورت تھی......؟“

”میں اس بات کو نظر انداز نہیں کر رہا لیکن اب میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ میں تنہا دو خطرناک محاذ سر کرسکوں۔“

”یہ سوچنا میرا کام نہیں......“ اس نے تیزی سے دو ٹوک جواب دیا پھر توقف سے بولی۔ ”ویسے میں کوشش کروں گی کہ بگ باس سے تمہارے لیے کچھ مزید رعایت حاصل کرسکوں۔“

”وہ آمادہ نہیں ہوگا......“ افضل خان نے نورا کشتی جاری رکھی۔

”ہو بھی سکتا ہے...... کوشش کرلینے میں کچھ حرج بھی نہیں ہوگا۔“

”کیا تمہیں اعتماد ہے کہ تم اس سخت لوہے کو موم کرسکو گی؟“

”فضول باتوں سے پرہیز کرو......“ اس نے تلخ انداز میں جواب دیا پھر کچھ تامل کے بعد بولی۔ ”تم صرف اپنی پسند بتادو، تمہارے لیے دونوں میں کون سا ٹارگٹ زیادہ آسان ہوگا؟“

”رستم علی آغا خانی۔“

”ٹھیک ہے، تم اس محاذ کو تین دن کے اندر سر کرلو

تا کہ مجھے بگ باس کے سامنے زبان کھولنے کا موقع مل سکے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرے ٹارگٹ کے لیے تمہیں مزید وقت مل جائے۔"

اس کے بعد شبنم نے گفتگو کا موضوع بدل دیا پھر نہانے کی خاطر واش روم میں چلی گئی۔ افضل خان کو شبنم کے دیے ہوئے خفیہ اشارے سے مایوسی کے گھپ اندھیروں میں امید کی ایک مدھم سی کرن نظر آنے لگی۔

☠☠☠

لیاقت حسین اس وقت خلاف توقع کچھ زیادہ ہی خاموش تھا۔

فرحین نے اس تبدیلی کو خاص طور پر محسوس کیا۔ لیاقت حسین نے اسے صرف شریک حیات نہیں کیا بلکہ اپنے ہر معاملے میں شریک رکھتا تھا۔ سراج کی پوچھ گچھ سے اسے جو دکھ ہوا تھا وہ بھی اس نے فرحین سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہر چند کہ سراج اور سیٹھ عثمان دونوں اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ جب سیٹھ عثمان نے دفتر جاتے وقت اسے اپنے کام سے راستے میں چھوڑ دیا تھا تو پھر اس سے کس بات کی چھان بین کی جارہی تھی؟ ہم زاد کی ہدایت کے بعد اسے اپنے اغوا کیے جانے اور رہائی حاصل کرنے والے حیرت انگیز واقعات کی کوئی بات یاد نہیں تھی۔ ہر بات اس کے ذہن سے حرف غلط کی طرح حذف ہوچکی تھی۔ صرف ایک بات ایسی تھی جو لیاقت حسین کو روز اول کی طرح یاد تھی۔ دیوانے کا ایک چٹکی خاک سے نوازنا پھر منظر عام سے غائب ہوجانا۔ دیوانے سے اس کی ملاقات ایک نابینا ریش دراز بزرگ کے طفیل ہوئی تھی، وہ بھی شاید خدا کی طرف سے اسی کام کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ اسی کی ہدایت پر لیاقت خان نے گل خان کو...... کچھ نہیں بتایا تھا۔ نابینا بزرگ کی ہدایت اکثر اس کے ذہن میں صدائے بازگشت کی طرح مختلف مواقع پر گنبد کی صدا بن کر گونج چکی تھی۔

"دیوانے سے اپنی ملاقات اور ایک چٹکی خاک کا ذکر کبھی بھول کر بھی اپنی زبان پر مت لانا ورنہ بڑے خسارے میں رہو گے۔" یہی ایک بات تھی جو اس نے فرحین سے بھی راز میں رکھی تھی۔

اسے کب، کہاں سے، کس وقت اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا؟ کن پراسرار حالات میں وہ واپس آگیا تھا، لیاقت حسین کو کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ بھی یہ جانتا تھا کہ سیٹھ عثمان اور سراج پر کسی دیوانگی کا دورہ نہیں پڑا ہوگا جو ان دونوں نے اس سے سوال جواب کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایکسیڈنٹ والی بات بھی اسے ایک معما ہی لگی تھی۔ سراج کو اگر اس پر اعتبار اور اعتماد نہ ہوتا تو پولیس کے محکمے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہونے کے باوجود ہفتہ دس دن کے لیے اسے اپنے ساتھ رہنے کی بات بھی زبان پر نہ لاتا۔ الماس کے بارے میں بھی اسے ایک ہی بات یاد تھی، وہ گھر پر سو رہا تھا لیکن کسی طرح آنکھ کھلنے پر اس نے خود کو سراج کے گھر میں اس کے ڈرائنگ روم میں پایا تھا۔ اس موقعے پر الماس نے بھی اس سے دبی زبان میں کچھ سوالات کیے تھے، وہ ان کا بھی جواب دینے سے قاصر تھا۔ واپسی کے وقت اس نے سراج سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے گھر میں کس طرح پہنچ گیا؟ سراج بھی گول مول جواب دے کر ٹال گیا تھا۔

اس وقت بھی اس کا ذہن انہی باتوں کی کھوج میں الجھ رہا تھا جب فرحین اس کے قریب آگئی۔

"تیری کھوپڑی میں جو ایک بات سما جائے وہ مشکل ہی سے نکلتی ہے۔" اس نے پیار سے شکوہ کیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو جان لیاقت لیکن......" اس نے فرحین کے قرب کو باعث تسکین سمجھتے ہوئے اپنے ذہن کی گرہ کو سلجھانے کی کوشش کی۔ "میں تمہاری بات مانتا ہوں لیکن...... جو باتیں میرے ساتھ پیش آرہی ہیں، اس کا علم دوسروں کو ہوجاتا ہے...... میں بے خبر رہتا ہوں، یہ کیسی بے خبری ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے......؟"

"میری بات دھیان سے سنے گا؟" فرحین نے بڑی اپنایت سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا تو لیاقت حسین نے اس کو کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

"میں سنجیدہ ہوں اور تمہیں مستی سوجھ رہی ہے۔" وہ مچل کر بولی۔

"اس طرح تمہاری بات میرے کھوپڑی میں زیادہ آسانی سے آجائے گی۔" لیاقت کے دل کی بات زبان پر آگئی۔

"دنیا بولتا ہے کہ مرد زیادہ عقلمند ہوتا ہے لیکن عورت کی عقل مردوں سے زیادہ کام کرتی ہے۔ جو بات مرد کی کھوپڑی میں نہیں آتی، عورت وہ بھی جان لیتی ہے۔"

"اچھا......" لیاقت حسین نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ "تیری کھوپڑی کیا سمجھ رہی ہے؟"

"بڑے کہتے ہیں کہ انسان جب دوسروں کے ساتھ نیکی کرتا ہے تو اوپر والا بھی اس کی حفاظت کرتا ہے۔" وہ کسمساتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "تو نے بھی سنا ہوگا کہ جو بندہ اللہ کی ذات پر توکل کرلے وہ بغیر حساب کتاب کے

جنت میں جائے گا۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "تیرے ساتھ ماں کی دعائیں بھی ہیں جو قدم قدم پر تیرے کام آتی ہیں۔"

"اس لیے میں ہر بات بھول جاتا ہوں؟" لیاقت حسین نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔

"میں مذاق نہیں کررہی......" فرحین بہ دستور سنجیدہ رہی۔ "اوپر والے کی مصلحت اس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ رہا تیری کھوپڑی کا سوال تو وہ ہوائی جہاز کے کل پرزوں کی طرح کام کرتی ہے مگر...... کچھ باتیں خدا کے حکم سے تیرا بھول جانا ہی بہتر ہوگا اور...... تو یہ کیوں بھول رہا ہے کہ ماں کی دعاؤں ہی نے ہمیں اس پلید چمار سے محفوظ رکھا جو دشمن بن گیا تھا۔ صاحب اور بیگم صاحب کا دوسری کوٹھی خریدنا، ہمارا کچے مکان سے نکل کر بنگلے کی اس اینچی تک......"

"اینچی نہیں جان لیاقت...... انیکسی۔"

"چل ہٹ پرے......" فرحین کسی مچھلی کی طرح اس کی آغوش سے مچل کر نکل گئی۔ "تو میرا مذاق اڑائے گا تو پھر میں بیگم صاحب سے تیری شکایت لگا دوں گی...... کام کی باتوں کے وقت بھی تجھے اپنی سوجھتی رہتی ہے۔"

"اچھا...... چل دور بیٹھ کر بتا دے، تو کیا سمجھانا چاہ رہی تھی؟"

"آج تو جس قابل ہے وہ سب اللہ کا کرم اور تیری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے، میری ایک بات کو اپنی کھوپڑی میں بٹھالے، اوپر والے پر بھروسا رکھ...... اور بال کی کھال نکالنا چھوڑ دے۔ تیری ساری الجھن دور ہوجائے گی۔ کبھی کبھی تیرا دماغ کسی بات کو بھول جائے تو اسے بھی اوپر والے کی مرضی سمجھ کر لمبے لمبے غوطے لگانے کی عادت ختم کردے۔"

"شاباش ہے...... بیگم صاحبہ کی صحبت نے تجھے بڑی بڑی باتیں سکھا دی ہیں۔" لیاقت حسین نے کسی حد تک اس کی باتوں سے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے وعدہ کر لیاقت......" فرحین نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ "تو آئندہ اس طرح منہ بنا کر گہرے سمندر میں ڈبکی لگانے کی غلطی نہیں کرے گا، تجھے اداس دیکھ کر میرا دل بھی برا ہونے لگتا ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہے؟"

"نہیں...... تیرے ساتھ ٹھٹول کر رہی ہوں۔"

"برا مان گئی میری جان......"

"تو بات ہی ایسی کر دیتا ہے کہ دل اندر سے، تیز آنچ پر رکھی ہوئی ہانڈی کی طرح جلنے لگتا ہے۔"

"میں تیرا کہا مان لوں تو کیا انعام دے گی؟" لیاقت حسین نے اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ٹھینگا......" فرحین اس کو ٹھینگا دکھا کر منہ چڑاتی ہوئی تیزی سے کترا کر انیکسی سے باہر نکل گئی۔ اسے راحیلہ خاتون کے پاس جانے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ لیاقت کی خوشی سے منہ بھی نہ موڑتی۔

☠☠☠

میڈم روبی اور تھریسا دونوں ہی اس وقت کہیں جانے کے موڈ میں تھیں جب شبنم گھر میں داخل ہوئی۔ میڈم نے بڑے پرتپاک انداز میں اسے خوش آمدید کہا، جبکہ تھریسا نے گلے ملنے کے بجائے صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ وہ شبنم سے خفا نہیں تھی لیکن اب وہ جس مقصد سے میڈم سے تعلقات استوار کررہی تھی، وہ اس کے لیے مشکوک تھا۔ میڈم نے ہر چند کہ شبنم کے بارے میں اس کے ماضی کے حوالے سے بھی تمام وضاحتیں کردی تھیں۔ پھر بھی شبنم چونکہ ابھی تک حامد ایسوی ایٹس میں کام کررہی تھی اس لیے یہ بات کم از کم تھریسا کے اصول کے خلاف تھی کہ دشمن کے کسی کارندے پر آنکھ بند کرکے مکمل اعتماد کرسکے۔ ایسی صورت میں کہ وہ میڈم کی دست راست بھی تھی اور اس کے تحفظ کا خیال رکھنا اس کی اول ترجیح تھی، اس نے شبنم کے بارے میں ذاتی طور پر مختلف انداز میں سوچا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس کی بھی کوئی ایسی دکھتی رگ خطرناک مگرمچھ کے ہاتھ آگئی ہو جو اسے اشارے پر ناچنے پر مجبور کررہی ہو۔ میڈم کا تاج ہوٹل والا سانحہ اس کے لیے سب سے بڑی روشن مثال تھا۔ اگر میڈم کا اندھا جوا ناکام ہوجاتا؟ افضل خان کی دوست نما دشمنی اگر کامیاب ہوجاتی؟ میڈم کی قابل اعتراض تصاویر اس کے ذریعے شیخ حامد کے قبضے میں چلی جاتیں تو شاید خود میڈم کے پاس بھی دو ہی راستے ہوتے، خطرناک مگرمچھ کے اشاروں پر ناچنا، یا بدنامی سے بچنے کے لیے خودکشی۔ اس نے میڈم سے اس گہرائی کی حد تک شبنم کے موجودہ کردار کے بارے میں تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ بہرحال شبنم کی طرف سے وہ پوری طرح مطمئن بھی نہیں تھی۔

"کہاں جانے کی تیاری ہورہی ہے؟" شبنم نے بے تکلفی سے دریافت کیا اور ادھر ادھر دیکھ کر ہاتھ میں دبا مختصر تحریری پیغام اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم بڑے موقعے سے آگئیں۔" میڈم نے پرچہ

لیتے ہوئے بہ دستور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں نے اس وقت بڑی مشکل سے تھریسا کو مجبور کر کے رینبو جانے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔“

”گڈ......“ شبنم نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”گھومنا پھرنا، تفریحی مقامات پر آنا جانا، کھلی فضا میں سانس لینا بھی اچھی صحت اور زندگی کی علامت ہے، گھر میں کتنی ہی آسائشیں کیوں نہ میسر ہوں لیکن گھٹن کا احساس پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔“

”یو آر رائٹ......“ میڈم نے تائید کی۔ ”تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اگر وقت ہو تو تم بھی ساتھ چلو۔“

”ایز یو وش...... آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتی۔“

”فائن......“ میڈم نے بڑی خوبصورتی سے کچھ وقت حاصل کرنے کی خاطر کہا۔ ”تم جب تک تھریسا کے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھو، میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔“

میڈم تیزی سے پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ شبنم کی دی ہوئی پرچی کھول کر پڑھی تو اس کا پورا وجود تمتما اٹھا۔ لکھا تھا...... ”جو ڈراما افضل خان کی ہدایت کاری میں فیل ہو گیا۔ وہ اب میرے ذمے کیا گیا ہے۔ میں آپ کو ہوشیار رہنے کا مشورہ دوں گی۔“ ایک لائن کا وہ پیغام میڈم کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ وہ غصے کی شدت سے لرزنے لگی پھر اس نے خود پر تیزی سے قابو پانے کی کوشش کی۔ پرچی کو ریزہ ریزہ کر کے کموڈ میں بہا دیا۔ بالوں کو ایک آخری ٹچ دیتے ہوئے ہنستی مسکراتی باہر آگئی۔ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر شبنم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے تھریسا سے پوچھا۔ ”کیا گفتگو ہو رہی تھی......؟“ شبنم اس کے اشارے پر پچھلی نشست پر آگئی تھی۔

”میں شبنم کو بتا رہی تھی کہ آپ کھڑے کھڑے پرسہ دینے کی خاطر شیخ حامد کے گھر پر بھی ہو آئی ہیں۔“ تھریسا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا کیا آپ نے......“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر محتاط انداز میں بولی۔ ”لیکن ایک بار انسان کو کسی بات کا تلخ تجربہ ہو جائے تو پھر اسے زیادہ محتاط......“

”تمہارے بگ باس سے ملنے سے پیشتر میرا بھی یہی خیال تھا لیکن اب اس میں وہ شدت نہیں رہی۔“

”کیا مطلب......؟“

”میں نے شاید پہلے نہیں بتایا۔ تمہارے باس سے ہمارے بہت پرانے لیکن فیملی جیسے تعلقات بھی رہ چکے ہیں۔“

”پھر...... آپ باس سے اتنے عرصے دور کیوں رہیں؟ میرا مطلب ہے کہ میں نے کبھی آپ کو باس سے ملتے جلتے نہیں دیکھا۔“

”وقت کے گھاؤ بڑے گہرے ہوتے ہیں مائی ڈیئر...... تم ابھی کمسن ہو، ان باتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی خاطر انسان کو کبھی کبھی بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ حالات کے شکنجوں میں خود کو گھونٹ لینا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔“ میڈم نے لہجہ سوگوار بنا کر کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ”ایک مشرقی عورت کو بیوگی کا غم، دنیا کے رسم و رواج، خاندان والوں کی جا، بے جا تنقید سے بچنے کی خاطر اور...... اس لازوال محبت کو قائم رکھنے کے لیے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ بندشیں عائد کرنی لازم ہوتی ہیں۔ میں آج بھی روٹھ کر چلے جانے والے سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی کل کرتی تھی۔ ان کی موت کے بعد میں مکمل آزاد تھی۔ کوئی میرے اوپر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا پھر بھی میں نے ان کے پیار کو دل کی گہرائیوں میں سمو کر اپنی سوشل لائف ایک دم ترک دی۔“ وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ ”لوگ یہی کہتے ہیں کہ خالد ریاض کو مرے ایک زمانہ بیت گیا لیکن وہ...... وہ آج بھی میرے دل میں روز اول کی طرح ہر سانس کے ساتھ دھڑکتے ہیں، یہی دھڑکنیں تو دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہیں۔ باقی سب فریب ہے۔“

”خود کو سنبھالیں میڈم......“ تھریسا نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ”آج ایک عرصے بعد آپ نے رینبو جانے کا پروگرام بنایا ہے، خود کو وقت اور حالات کے گراف میں سمونے کی کوشش کریں۔ یہ بھی آپ کی صحت کے لیے ضروری ہے۔“

”تم سناؤ شبنم......“ میڈم نے کچھ توقف کے بعد شبنم سے سوال کیا۔ ”تمہاری حامد ایسوسی ایٹس میں کیسی گزر رہی ہے؟“

”فرسٹ کلاس......“

”اگر کبھی میری سفارش کی ضرورت پڑے تو گریز نہ کرنا۔“

”شکریہ میڈم...... باس نے ابھی حال ہی میں میری ترقی کی ہے۔“ اس نے دل پر جبر کر کے خطرناک مگرمچھ کی تعریف کی۔

”مجھے اندازہ ہے کہ وہ اپنے اسٹاف کا خیال رکھنے کا عادی ہے لیکن......“ میڈم کچھ کہتے کہتے دیدہ و دانستہ خاموش ہو گئی۔

”لیکن کیا......؟“ شبنم نے بے چینی سے دریافت

کیا، اسے ڈر تھا کہ کہیں میڈم کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو بگ باس کی پیشانی پر ایک ناگوار شکن کا اضافہ کر دے۔

”ترقی کے ساتھ ہی اگر تم فلیٹ کے بجائے کسی چھوٹے موٹے ذاتی مکان میں منتقل ہو جاؤ تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔“ میڈم نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”اگر تم برا نہ مانو تو میں اس ضمن میں...... ایک بزرگ اور دوست کی حیثیت سے بھی تمہاری مشکل ذاتی حیثیت میں......“

”ابھی نہیں میڈم......“ شبنم نے اسے ممنونیت بھری نظروں سے دیکھا۔

”سمجھ گئی۔“ تھریسا نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اگر تنہا کسی مکان میں نہیں رہنا چاہتیں تو جلدی سے ایک سے دو ہونے کے لیے کسی کا انتخاب کر لو۔ اس کے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔“

”اگر آپ اتنی فیاضی کا اظہار کر رہی ہیں تو مجھے بیک وقت ایک کے بجائے دو کا انتخاب کرنا پڑے گا۔“ شبنم نے شوخی سے جواب دیا۔

”نان سینس......“ میڈم نے برا منہ بنا کر کہا۔ ”یہ تمہارے ذہن میں دو کا خیال کس طرح آگیا؟“

”میں سمجھ گئی......“ تھریسا نے برجستہ کہا۔ ”آج کل ہر چیز میڈ ان چائنا ہوتی ہے۔ دو ہوں تو ایک خراب ہو جانے کی صورت میں دوسرا......“

تھریسا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی بات پر میڈم کے علاوہ خود تھریسا اور شبنم بھی اپنا بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکیں، پانچ منٹ بعد ہی تھریسا نے اپنی کار کلب کی وی آئی پی پارکنگ میں ممبر شپ کارڈ دکھانے کے بعد روکی تھی۔

ریسیپشن سے گزر کر وہ تینوں مین ہال میں داخل ہوئیں تو وہاں بیٹھے ہوئے اکثر پرانے ممبران کی نظریں میڈم کی جانب گھوم گئیں، وہ اب بھی ٹھوس جسم اور پرکشش نشیب و فراز کی مالک تھی۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ماریا بھی جو ڈیوٹی کے اوقات میں ہمیشہ میک اپ سے لیس اور بھڑکیلے مغربی مختصر لباس میں رہنے کی عادی تھی، ہنستی بل کھاتی میڈم کے قریب آگئی۔

”آج بہت عرصے بعد آپ کے دیدار ہوئے۔ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“

”آج بھی ذاتی مصروفیات سے بہ مشکل وقت نکال سکی ہوں۔“ میڈم نے خوشگوار سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

تھریسا نے ہال میں بیٹھے ہوئے ملکی اور غیر ملکی ممبران کا سرسری جائزہ لیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔ میڈم کے تحفظ کی خاطر اس نے اس کے علم میں لائے بغیر جو حفاظتی انتظامات کیے تھے وہ اسے حسب منشا نظر آگئے۔ راستے میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی اس نے کئی بار کن انکھیوں سے بیک ویو مرر میں اس سیاہ رنگ کی ویگن کو دیکھا تھا جو بڑی احتیاط سے کبھی لمحہ دو لمحہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہوتی پھر سامنے آجاتی۔

میڈم نے سات نمبر کی میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی جس پر ”مخصوص“ درج تھا، اس کا بندوبست بھی تھریسا نے کیا تھا۔ ریزرویشن کے وقت بھی اس نے میڈم کا نام نہیں لیا تھا۔ ماریا انہیں ان کی نشستوں پر چھوڑ کر اپنی سیٹ پر چلی گئی۔ ہال میں موسیقی کی مدھم دھن اور لباس سے پھوٹنے والی مختلف پسندیدہ سینٹ کی مہک اور مدھم خواب ناک روشنی کا اہتمام بھی بے حد رومانٹک تھا۔ نشستوں کے درمیان ”بکنی لباس“ میں ملبوس کمسن اور بے باک لڑکیاں اعلیٰ قسم کی مختلف ڈرنکس اور اس کے لوازمات لیے گردش کر رہی تھیں۔ حسب معمول سب ہی اپنے اپنے رنگ میں نظر آ رہے تھے۔ میڈم نے اپنے لیے کولڈ کافی کا آرڈر دیا جبکہ تھریسا اور شبنم نے سافٹ ڈرنکس کو ترجیح دی تھی، چند منٹ بعد ہال کی موسیقی رک گئی۔ ایک جانب تکون ٹائپ مختصر اسٹیج کے برقی قمقمے جھلملانے لگے پھر ”رمبا سمبا“ کی میوزک شروع ہوئی تو تین چار جوڑے اسٹیج پر جا کر اس کی دھن پر رقص کرنے لگے۔ سب ہی کی نظریں اسٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔ شبنم بھی دوسروں کی طرح ماحول کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب کلب کا ایک پرانا ممبر جس سے اس کی علیک سلیک تھی اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

”ہیلو مس شبنم......“ اس نے میڈم اور تھریسا سے مہذب انداز میں ایکسکیوز کرنے کے بعد شبنم کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گی؟“

”نو...... سوری۔“ اس نے مسکرا کر مگر مایوس کن جواب دیا تو رقص کی فرمائش کرنے والا نو نمبر کی میز کی جانب چلا گیا جہاں دو تین کال گرلز موجود تھیں۔ ان میں سے ایک نے رقص پر بخوشی آمادگی کا اظہار کر دیا۔

”تم اس شخص کو جانتی ہو؟“ میڈم کے بجائے تھریسا نے شبنم سے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

”یہیں کلب میں ایک دو بار...... ہائے ہیلو ضرور ہوئی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ میں اس کی آفر قبول کر لیتی۔“

”ہے کون......؟“

”میں اس سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔“ شبنم

نے کاندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن تھریسا اس کے جواب پر مطمئن نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اسٹیج پر رقص کرتے ہوئے اس شخص کی نظریں کئی بار شبنم کی جانب اٹھ چکی تھیں۔ میڈم کولڈ کافی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے رہی تھی۔

ڈانس کا میوزک ختم ہوا تو رقص کرنے والے افراد کی جسمانی جنبش بھی تھم گئی۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

☠☠☠

سراج نے ایس پی اورنگ زیب کے آفس میں داخل ہوکر باقاعدہ سیلیوٹ کیا تو اورنگ زیب نے اسے حیرت سے دیکھا پھر بے تکلفی سے مسکرا کر مخاطب کیا۔ ''علیم احمد صاحب کے درمیان میں آجانے کے بعد اب ہمارے درمیان اس قسم کے رسمی تکلفات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت اچانک کیسے آنا ہوا، سب خیریت تو ہے؟''

''علیم صاحب کے حوالے کے بعد ہی اس وقت میں ایک اور ضروری دستاویز کی نقل آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔'' سراج نے اشارہ پاکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی محبت میرے لیے اب آفیسر سے زیادہ بڑے بھائی سے کم نہیں ہے۔''

''اس نوازش کا شکریہ......'' اورنگ زیب نے اپنایت کا اظہار کیا۔ ''کس قسم کی دستاویز ہے؟''

جواب میں سراج نے مرحومہ صبا بیگم کے آخری خط کی ایک کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔ اورنگ زیب نے ڈیوٹی کانسٹیبل کو بلا کر چائے کا آرڈر دیا پھر اس کے بعد وہ خط کے مطالعے میں محو ہوگیا۔ ہر سطر کے اختتام کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جارہا تھا، مکمل تحریر پڑھنے کے بعد وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

''یہ تو ایک مظلوم عورت کے ساتھ درندگی کی انتہا ہے۔ ایک شوہر اپنی بیوی کی تذلیل بازاری عورتوں کی موجودگی میں اس حد تک بھی کرسکتا ہے، ایسا تو طوائفوں کے دلال بھی نہیں کرتے، جنگلی قبائل کے ان پڑھ وحشی درندہ صفت انسانوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ نام کے ساتھ شیخ لگا ہو تو انسان کم از کم اس کی حرمت کا خیال رکھتا ہے، لیکن بگ باسٹرڈ تو اس سے بھی گیا گزرا ہے۔''

''ہر فرعون کے لیے اللہ ایک موسیٰ بھی ضرور بھیج دیتا ہے۔'' سراج نے کسمسا کر کہا۔ ''اس شہر میں آپ کی تعیناتی بھی شاید اسی کی مصلحت ہو، میں اس خط کو پڑھ کر خود بھی لرز اٹھا تھا۔''

''اس تحریر میں جن اشتہاری مجرموں کا ذکر ہے یا جن بدنام فاحشہ عورتوں کا حوالہ دیا گیا ہے، آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں......؟ میرا مقصد ہے کہ ہم انہیں قانون کے تحفظ کا یقین دلا کر باقاعدہ گواہ بنا سکیں اور اگر کچھ اشتہاری مجرم بھی ہاتھ لگ جائیں تو ہم بہ آسانی اس فرعون سے بدتر شخص کو پھانسی کے پھندے تک لے جاسکتے ہیں۔ مرحومہ نے بھی اسی آخری خواہش کا اظہار کیا ہے۔''

''میں آپ کے ساتھ۔ آخری حد تک مکمل تعاون کرنے کو گلے گلے تیار ہوں لیکن اگر آپ کسی وقت علیم احمد سے ملاقات کرلیں تو شاید وہ بہتر طور پر اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں۔''

''یو آر رائٹ۔'' اورنگ زیب نے خط تہ کر کے دراز میں رکھی ایک پرسنل فائل میں محفوظ کیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہمیں اس کام کے لیے کچھ اور ایماندار پولیس ورکرز کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے۔ میں اپنے خاص ذرائع سے اس کا بندوبست بھی کرلوں گا۔ ممکن ہوا تو ایک دو روز میں وقت نکال کر علیم احمد سے ان کے گھر جاکر تفصیلی ملاقات بھی کرلوں گا۔''

کانسٹیبل چائے کی ٹرے لیے داخل ہوا تو ان کے درمیان موضوع بدل گیا۔ حسب معمول کانسٹیبل نے ایس پی آفس کے اس کمرے میں اسکرین کے پیچھے جاکر چائے تیار کی پھر دونوں افسران کے سامنے سرو کر کے الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

''سر......!'' سراج نے کانسٹیبل کے جانے کے بعد دبی زبان میں کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آپ کو اپنی حفاظت کے لیے بھی فی الحال ایسے سادہ لباس والوں کی ایک ٹیم تشکیل دینی ضروری ہے جو ہر وقت آپ کی طرف سے چوکس رہیں۔''

''میں سمجھا نہیں......'' اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ''آپ یہ مشورہ کس بنیاد پر دے رہے ہیں؟''

''میں کسی وجہ سے انفارمر کا نام نہیں بتا سکتا لیکن یہ بات مجھے ایسے ذریعے سے معلوم ہوئی ہے جو ہمارے دوست ہی ہیں۔'' سراج نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''بگ باسٹرڈ آپ کو...... خدانخواستہ...... راستے سے ہٹانے کے لیے ایک ایسے شخص کو تعینات کرسکتا ہے، جس کے پاس اس پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن نہیں ہوگا۔''

ایس پی ایک لمحے تک سراج کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''آپ کا اشارہ غالباً افضل خان کی طرف ہے جو آج کل شیخ حامد کے دفتر میں کام کرنے والی شبنم نامی

لڑکی کے فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہے؟''

''آپ کو اس کا اندازہ کس طرح ہوا سر......؟'' سراج چونکا۔

''میں اس شہر میں نیا ضرور ہوں لیکن مجھے بگ باسٹرڈ کا کچھ بیک گراؤنڈ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شبنم اس فلیٹ میں تنہا رہتی ہے اور ڈبل بی کی اجازت کے بغیر وہ کسی پٹے ہوئے مہرے کو پناہ دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔''

''یو آر رائٹ سر......'' سراج نے تائید کی۔ ''لیکن آپ کو متوقع خطرے کی اطلاع مجھے کسی اور مستند ذریعے سے ملی ہے۔''

''ڈونٹ وری...... میں آپ سے اس کا نام دریافت نہیں کروں گا لیکن آپ نے بڑا بھائی بنایا ہے تو آپ کی بات کا یقین کرنا میرے اوپر لازم ہے، بہرحال آپ اس ضمن میں پریشان نہ ہوں۔ میں نے ڈیوٹی رپورٹ کرنے سے پیشتر ہی اپنی حفاظت کا کچھ ایسا انتظام کرلیا تھا کہ دشمن کو کامیابی نہ ہوسکے۔ اب اگر اوپر والے ہی کو منظور ہو تو پھر بندہ کیا کرسکتا ہے۔''

''ایک درخواست اور کروں گا، سر۔''

''کم آن سراج...... دو بھائیوں کے درمیان کم از کم تنہائی میں تم آئندہ اس قسم کی...... سر اور بیروالی فارمیلٹیز سے پرہیز ہی کرنا......'' اورنگ زیب نے اس بار سراج کو ''تم'' کے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب کیا۔ ''اب بولو، کیا کہنا چاہتے تھے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ شیخ حامد اب بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے کہ میں اسی کا خاص نہیں تو کام کا آدمی بہرحال ہوں۔''

''گڈ...... تم فکر مت کرو، کبھی آئندہ ایسی نوبت آئے تو تم میری موجودگی میں بھی اسے سپورٹ کرسکتے ہو۔''

''یہ صرف نورا کشتی ہوگی سر......!''

''پھر وہی سر......؟'' اورنگ زیب نے محبت سے ٹوکا۔

''سوری......'' سراج نے ہنس کر کہا پھر اٹھ کر اپنے آفس کے لیے روانہ ہوگیا۔ احتیاطاً اس نے راستے میں کئی بار بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ بہ ظاہر اس کا اندازہ یہی تھا کہ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کا سلسلہ ختم کردیا گیا ہے جو پچھلے دنوں بڑی شد و مد سے جاری تھا۔

☠☠☠

شہر کے سب سے زیادہ مہنگے اور پوش علاقے میں ایک گرے کلر کی دو منزلہ کوٹھی اس وقت بہ ظاہر رات کے

اندھیروں میں کسی بیوہ کی طرح اداس نظر آرہی تھی لیکن کوٹھی کے باہر موجود گارڈز بہ دستور پوری طرح چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔ کوٹھی کے اطراف سنگاپوری ناریل کے درخت موجود تھے۔ قریب و جوار کی کوٹھیوں کے برعکس جہاں صرف ایک یا دو مدھم پاور کے بلب موجود تھے۔ اس دو منزلہ کوٹھی کے چاروں کونوں پر انرجی سیورز کی روشنی رات کی تاریکی سے ہم آغوش ہوکر بڑا طلسماتی منظر پیش کررہی تھی۔ اس کوٹھی کی چہار دیواری بھی دوسری کوٹھیوں کے مقابلے میں قدرے اونچی تعمیر کرائی گئی تھیں۔

کوٹھی کے اندرونی حصے میں ڈیڑھ فٹ اونچے چبوترے پر ڈھاکا گھاس کا خوبصورت مخملی لان ہر دو جانب موجود تھا، گیٹ سے پورٹیکو تک جانے کا راستہ سرخ ٹائلز کی وجہ سے ریڈ کارپٹ کا منظر پیش کرتا تھا۔ لان میں چہار دیواری کے ساتھ قیمتی پودوں کو بڑے سلیقے اور مہارت سے لگایا گیا تھا۔ اس میں زیادہ پودے بیرون ملک سے درآمد کیے گئے تھے جن کے پھولوں کی مہک بھی اپنی مثال آپ تھی۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک طرف فیملی لان تھا اور دوسری طرف سرونٹس کوارٹرز تھے جن کو ایک حد بندی کی دیوار کھڑی کرکے فیملی لان سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ غرضیکہ وہ عمارت ہر اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔

کوٹھی کی دونوں منزلوں پر سامنے کی جانب نصف دائرے کی شکل میں کشادہ راہداری عمارت کے حسن میں اضافہ کرتی نظر آتی تھی۔ ہر منزل پر تین بڑے سائز کے کمرے، کشادہ لاؤنج اور ڈرائنگ روم کم ڈائننگ روم موجود تھے۔ ڈرائنگ اور ڈائننگ کو بہ وقت ضرورت درمیان میں موجود ویلویٹ کے پردوں کے استعمال سے علیحدہ بھی کیا جاسکتا تھا لیکن اس کی نوبت شاذ و نادر ہی پیش آتی تھی۔ کچن، باتھ، پاؤڈر روم اور ڈریسنگ روم بھی غیر ملکی اسٹائل پر تعمیر کیے گئے تھے، عمارت کے اندر رہائشی حصوں کو ڈیکوریٹ کرنے کے لیے ایک غیر ملکی ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

اس پرشکوہ کوٹھی کے باہر، براس کی پلیٹ پر رستم علی آغا خانی کا نام اور کوٹھی کا نمبر جلی حروف میں دور سے نظر آتا تھا۔ رستم علی کوٹھی کی پہلی منزل پر اپنی بیوی شمائلہ بیگم کے ساتھ رہتے تھے جبکہ دوسری منزل پر ان کا اکلوتا لڑکا دارا رستم علی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا جو جرمن نژاد تھی۔ شادی کے بعد اس نے مشرقی انداز کے لباس کا استعمال شروع کیا تو مغرب اور مشرق کے امتزاج نے اس کے حسن کو چار چاند لگادیے۔ اس کا نام روشنا تھا جو مذہب تبدیل کرنے کے بعد دارا نے تجویز کیا تھا۔ دونوں منزلوں پر علیحدہ علیحدہ لائبریری بھی موجود تھی۔ دوسری منزل پر روشنا نے اپنی پرانی ہابی کو برقرار رکھنے کی خاطر ایک دیدہ زیب فش ایکوریم بھی بنا رکھا تھا۔ شام کی چائے وہ اور دارا اسی ایکوریم کے سامنے بیٹھ کر پینے کے عادی تھے۔ دارا بیرون ملک سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ کاغذات میں اس کی حیثیت مینجنگ پارٹنر ظاہر کی گئی تھی۔

اس وقت رات کے تقریباً دو کا عمل تھا جب مذکورہ کوٹھی کے عقبی حصے کی سمت دو بلاک چھوڑ کر ایک نئے ماڈل کی کرولا دو چار جھٹکے لینے کے بعد رکی تھی۔ بہ ظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس میں کوئی فنی خرابی پیش آگئی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شبنم موجود تھی جو ضروری میک اپ کے بعد آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر خود اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کرچکی تھی، برابر والی سیٹ سے اترنے والا جوان خلاف معمول اسٹیل براؤن کلر کے جاگنگ سوٹ میں نظر آرہا تھا۔ وہ افضل خان تھا جسے کوئی بھی پلاسٹک میک اپ کے بعد اس کی اصلی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے بونٹ کھول کر تین چار منٹ ادھر ادھر کل پرزوں کو ٹٹولا پھر بونٹ بند کرکے شبنم کے قریب آکر دبی زبان میں بولا۔

''تم نے اس موقعے پر کثیر رقم خرچ کرکے جو اہتمام کیا ہے، میں اسے بھی فراموش نہیں کروں گا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ...... یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔'' آخری جملہ اس نے قدرے جذباتی انداز میں ادا کیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''اگر میں کام کرنے میں ناکام ہوگیا تو پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بجائے موت ہی کو ترجیح دوں گا، تم بگ باس کو میرا آخری سلام کہنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتادینا کہ میڈم کے سلسلے میں میری پلاننگ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ پولیس کو اس کی اطلاع کیسے ہوئی، میں نہیں جانتا۔''

''اوکے۔'' شبنم نے آگے پیچھے دیکھ کر تیزی سے جواب دیا۔ ''آئی وش یو بیسٹ آف لک...... جلدی کرو، احتیاط سے کام لینا۔ کامیابی کی صورت میں تم بگ باس کی ہمدردی کے مستحق بھی ہوسکتے ہو۔''

افضل خان نے الوداعی نظروں سے شبنم کو دیکھا پھر جاگنگ کرنے کے انداز میں بنگلوں کے درمیانی راستے پر ہولیا۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد کرولا دوبارہ حرکت میں آکر برق رفتاری سے فراٹے بھرنے لگی۔ دس منٹ بعد افضل خان جاگنگ کرتا ہوا مطلوبہ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف پہنچ گیا۔ اس نے کوٹھی کے ساتھ بنی ہوئی فٹ پاتھ

کا آخری سرے تک چکر لگانے کے بعد جیسے ہی واپسی کا ارادہ کیا۔ ایک مسلح گارڈ کہیں سے نکل کر اچانک اس کی پشت پر پہنچ کر رک گیا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔

''رک جاؤ ورنہ میں گولیاں چلانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

افضل خان جاگنگ کرنے کے انداز میں ہی گھوما اور گارڈ کو حقارت سے گھورنے لگا، اس وقت بھی وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے جاگنگ میں مشغول تھا۔

''کون ہو تم اور اس وقت......''

''شٹ اپ......'' گارڈ کا جملہ درمیان سے اچک کر افضل خان نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''رستم انکل نے تمہیں جس کام پر مامور کیا ہے صرف اسی سے تعلق رکھو ورنہ اگر دارا کو بھی معلوم ہوا کہ تم نے کس کو وارننگ دینے کی حماقت کی تھی تو کوئی انعام پانے کے بجائے عتاب کا بھی شکار ہوسکتے ہو۔''

''آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔'' گارڈ اس کا دبنگ لہجہ سن کر مرعوب نظر آنے لگا۔

''میں تمہیں جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا لیکن تم نے چونکہ فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے اس لیے بتادوں کہ میں دو بلاک پیچھے رہنے والے ڈاکٹر جہاں زیب کا بیٹا ہوں، ایک ہفتہ پہلے ہی لندن سے آیا ہوں اس لیے شاید تم واقف نہ ہو لیکن اتنا ضرور جانتے ہوگے کہ ڈاکٹر جہاں زیب...... رستم انکل کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ تم اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کے بیٹے دارا کو جگا کر یہاں بلا لو تو تمہاری مزید تسلی بھی ہوجائے گی۔''

''آپ اتنی رات کو بھی......''

''ایڈیٹ......'' افضل خان نے بہ دستور اپنی جاگنگ کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''غیر ممالک میں صرف مرد ہی نہیں، بوڑھی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو بھی جس وقت فرصت ملتی ہے وہ اپنی صحت کا خیال رکھنے کی خاطر سڑکوں کی فٹ پاتھ پر جاگنگ کرتے نظر آتے ہیں لیکن تم ان باتوں کو......''

''سوری سر......'' گارڈ پوری طرح افضل خان کی باتوں میں آگیا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ اگر رکنے والا کوئی مشکوک فرد ہوتا تو اس طرح اچھل کود کرنے کے بجائے اس کے سامنے ہاتھ اٹھائے کھڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ڈاکٹر کو بھی سیٹھ رستم علی کی کوٹھی پر آتے دیکھا تھا۔

''بائی دا وے......'' افضل خان نے اپنی جسمانی ورزش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلے تو صرف انکل کے مین گیٹ پر گارڈز ہوا کرتے تھے۔ اب کیا انہیں کسی بات کا خوف ہے کہ......''

''میں اپنی ڈیوٹی کا پابند ہوں جناب۔'' گارڈ نے سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''اصل بات کیا ہے یہ سیٹھ یا پھر ہماری کمپنی کو معلوم ہوگی۔''

''گڈ...... مجھے خوشی ہے کہ اب پاکستان میں بھی تم لوگ فرض شناسی سے کام کررہے ہو جس کے لیے تم انعام کے بھی مستحق ہو۔'' افضل خان نے اوپری جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹ نکالے پھر گارڈ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میری طرف سے یہ تمہارا انعام ہے۔''

''شکریہ جناب......'' گارڈ ہاتھ میں دبی ریپیٹر کو کاندھے سے لٹکاتا ہوا انعام لینے کی خاطر افضل خان کے قریب آگیا۔ یہی اس کی پہلی اور آخری غلطی تھی جو اسے مہنگی پڑی۔

افضل خان نے، جو جرائم کی دنیا کی جانی مانی شخصیت تھا، ایک پل میں گارڈ کا ہاتھ اس طرح اچانک تھام کر موڑا کہ وہ کراہ کر رہ گیا، پھر کلوروفام کے رومال نے باقی کام کر دکھایا۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا، افضل خان اسے بغل میں ہاتھ ڈال کر اندھیرے میں لے گیا پھر اسے بے ہوش کرنے، اپنا اور اس کا لباس تبدیل کرنے اور اسے مزید تاریکی میں اس طرح ٹکا کر بٹھانے میں بہ مشکل دس منٹ لگے تھے کہ کوئی اسے دیکھتا تو فوری طور پر یہی گمان کرتا کہ جاگنگ کرنے والا تھک کر سکون کا سانس لینے کی خاطر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔

گارڈ کی وردی تبدیل کرنے کے بعد چہرے کا پلاسٹک میک اپ چھپانے کی خاطر اس نے بیری کیپ کو پیشانی پر زیادہ جھکا لیا۔ اتفاق ہی تھا جو اس کی اور گارڈ کی جسامت ملتی جلتی تھی ورنہ لباس میں زیادہ فرق ہونے کی صورت میں اسے پہچانا بھی جاسکتا تھا۔ لباس تبدیل کرتے وقت افضل خان نے وہ ضروری چیزیں بھی جو جاگنگ کرتے وقت اس نے لباس کے نیچے چھپا رکھی تھیں نکال کر وردی کے اندر رکھ لیں۔ شاید قدرت بھی اس کی مدد کررہی تھی جو وہ ملازموں کے عقبی راستے والے آہنی پھاٹک کو آزما ہی رہا تھا کہ اندر سے کسی عورت کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ کسی مرد سے مخاطب تھی۔ ''تو جان پر کھیل کر آتو گیا تھا ہیرو بن کر...... لیکن دوبارہ جب تک وردیوں کی ڈفٹی ختم نہیں ہوجاتی ادھر کا رخ بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ بلا نجول مارا جائے گا۔''

''کیوں......؟'' مرد نے بہکی بہکی آواز میں پوچھا۔

''کیا تو دوبارہ میری مدد نہیں کرے گی؟''

”میرے باپ کی توبہ......“ جواب ملا۔ ”یہ تو میرا وقت طے تھا جو میں دروازے کے قریب چھپی کھڑی تھی ورنہ کام کرنے والوں کو سمجھا دیا گیا ہے کہ دس بجے کے بعد اپنی اپنی ڈفلیوں سے ادھر ادھر نہ ہوں...... بس نکل جلدی، باہر دیکھ سنبھل کر جانا۔ کوئی آواز دے تو بھاگنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ ٹھائیں کی آواز سے تیرا انگٹ بھی کٹ جائے گا۔“

”اگر روکنے والا پوچھے کہ میں اندر کیا کرنے آیا تھا تو......؟“

”کہہ دینا کہ تو کھانے پکانے والے کا سگے والا ہے۔ دو روز پہلے آیا تھا، طبیعت کھراب ہوگئی تھی اسی نے روک لیا تھا۔ نام پوچھے تو بابا رمضانی بتا دینا...... اب پھوٹ جا جلدی سے......“

اس کے ساتھ ہی اندر سے بولٹ کھولا گیا تھا، ذرا سی جھری ہوتے ہی افضل خان ان دونوں کو پیچھے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا، سائلنسر لگے پستول کا بٹ مار کر اس نے جوان کو کلوروفام سے پل بھر میں دو تین گھنٹے کی نیند سلا دیا پھر سہمی ہوئی ملازمہ کو گھورا جس کا جوان سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک گارڈ کو سامنے دیکھ کر ہی اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔

”تو کون ہے......؟“ اس نے گارڈ جیسے لہجے میں ملازمہ کو للکارا۔

”مم...... میں...... ادھر کام کرتی ہوں۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ”یہ میرا سگے والا تھا دو تین دن پہلے گاؤں سے......“

”کوارٹر میں چل کر بات کر۔“ افضل خان نے نوجوان کو کاندھے پر ڈال کر نوعمر ملازمہ کو دبی زبان میں مخاطب کیا۔ ”مجھے بھی گاؤں کا سگے والا سمجھ کر سیدھی طرح سودا نمٹا دے ورنہ ابھی بڑے سیٹھ کو......“

”نن...... نہیں وردی بابو......“ ملازمہ نے سہم کر ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں تمہاری بات سے انکاری نہیں ہوں۔ پر بعد میں اس حرامی کو بھی سڑک پھلانگ کی اجازت دے دینا۔“

افضل خان نے ملازمہ کا بازو تھام کر چپ رہنے کو کہا پھر اسی کی رہنمائی میں وہ اس کے کوارٹر تک آگیا جہاں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ پوری طرح اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اس نے سہمی سہمی ملازمہ کو بالوں سے پکڑ کر سرد آواز میں پوچھا۔

”تو یہاں اکیلے رہتی ہے؟“

”ہاں آں...... آں۔“ وہ کراہ کر بولی۔

”خاموشی سے میری باتوں کا جواب دے ورنہ تجھے اور تیرے اس یار کو جان سے مار دوں گا۔“ افضل خان کا لہجہ اور سرد ہوگیا۔ ”میں وہ نہیں...... جو تو سمجھ رہی ہے۔“

”بھلے کوئی بھی ہو لیکن مجھے جان سے نہ مارنا۔“ ملازمہ بید مجنوں کی طرح لرزنے لگی۔ ”جو تم کہو گے میں...... وہ، وہ، وہی کروں گی۔“

”تیرا سیٹھ رستم علی کس منزل پر رہتا ہے؟“

”پپ...... پپ...... پہلی...... مں...... منزل پر۔“ ملازمہ بڑی مشکل سے اپنا جملہ ادا کرسکی۔

”تو مجھے اس کے کمرے تک پہنچا دے تو تیری اور تیرے یار کی زندگی کی ضمانت دیتا ہوں ورنہ......“ افضل خان نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پستول تان لیا۔ ”جلدی فیصلہ کرلے...... میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس کے لہجے میں درندگی شامل ہوگئی۔

”مم...... میں...... کک کوشش...... کک...... کرتی ہوں لیکن...... بب...... ہلو بھی ایک وردی والا پھیرے لگاتا...... رہتا ہے۔“

”سمجھ گیا......“ افضل خان کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”تو شاید اس کے ساتھ بھی منہ کالا کر چکی ہے ورنہ اس وقت تیرا یہ دوسرا یار بھی یہاں زندہ نہ ہوتا...... سچ بتا دے ورنہ......“

”اس...... ور...... وردیے نے بھی اسی حرامی کی وجہ سے اپنی رشوت...... جور جبردستی سے وصول لی تھی۔“

افضل خان کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگیں۔ وہ ملازمہ کو ضروری دھمکی دے کر دوبارہ دروازے پر لے آیا۔ پستول کی نال اس کی چھاتیوں کے بیچوں وبیچ رکھ کر بولا۔

”ادھر ہی خاموش کھڑی رہ...... وہ پھیرا لگاتا ہوا ادھر آئے تو اسے آواز دے کر بلا لینا۔“

”ٹھ...... ٹھیک ہے۔“ جواب دیتے وقت وہ موت کے تصور سے ہی زرد پڑ گئی تھی۔ افضل خان کو بارہ تیرہ منٹ تک صبر آزما انتظار کرنا پڑا پھر دوسرا گارڈ بھی ملازمہ کے اشارے پر کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک کاری ضرب لگنے کے بعد چکرا کر ڈھیر ہوگیا۔ افضل خان نے اسے بھی کلوروفام سنگھایا اور گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔ نوجوان ملازمہ دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھے شاید اپنی آواز بند رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سنو......“ اس نے ملازمہ پر دوبارہ پستول تان کر سفاک آواز میں کہا۔ ”تمہیں مجھے سیٹھ رستم علی کے کمرے تک پہنچانا ہوگا۔“

”نن...... نن...... وو...... وہ مجھے...... مم...... مار ڈالیں گے۔“

”انکار کی صورت میں، تمہارا انجام اس سے زیادہ اذیت ناک ہوگا۔“

”نن...... نہیں...... مم...... ابھی مرنا نہیں چاہتی۔“ وہ بدستور ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بڑے مالک کے کمرے تک راستہ دکھا سکتی ہوں لیکن...... دروازہ کھلوانا تمہاری جمہ داری ہوگا۔“

”منظور ہے......“ افضل خان نے اقرار کرلیا۔

نوجوان ملازمہ بری طرح تھر تھرا رہی تھی لیکن اس نے ملازموں والے راستے سے افضل خان کی رہنمائی کردی۔ ایک ہاتھ کے اشارے سے اس نے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے اپنے منہ پر جما رکھا تھا۔ نگاہوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ راہداری میں بند شیڈ کے اندر سے مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔

”دروازہ میں کھلواتا ہوں لیکن اگر اندر سے کوئی سوال کیا گیا تو جواب تم دوگی۔ کہہ دینا کہ گارڈ ملنے کو آیا ہے۔“

ملازمہ نے اثبات میں سر کو جنبش دی، اس کی آنکھیں خوف سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ افضل خان نے پستول پر گرفت مضبوط کی، اس کے ساتھ ہی اس نے ریپیٹر پر بھی دوسرا ہاتھ جما لیا۔ اندر ہونے والی کسی نائٹ بلب کی ہلکی روشنی کھڑکی کے شیشوں پر نظر آرہی تھی۔

افضل خان نے دستک دینے سے پیشتر چھت کے علاوہ ادھر ادھر نظر دوڑا کر کسی کلوز سرکٹ کیمرے کے امکانات کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہوکر دروازے پر دستک دی۔ دوسری یا تیسری دستک پر کسی عورت کی آواز ابھری۔

”کون ہے......؟“

افضل خان نے پستول پھر ملازمہ کی چھاتی پر رکھ کر جواب دینے پر کا اشارہ کیا۔

”میں ہوں بیگم صاحبہ...... گلابو۔“

”گلابو...... اس وقت کیا مصیبت پیش آگئی؟“

”میں باہر والے گارڈ صیب کو لائی ہوں۔ وہ بڑے مالک سے کوئی جروری بات کرنا چاہتے ہیں۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ افضل خان کا دل دھڑکنے لگا، وہ سر سے کفن باندھ کر آیا تھا، خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتا تھا، ملازمہ کو دروازے کے ساتھ چھوڑ کر خود دیوار سے چپک گیا۔ پانچ منٹ تک سکوت برقرار رہا پھر کسی عورت نے دروازہ کھولا جو نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ افضل خان لپک کر ملازمہ کو ساتھ لیتا ہوا آنے والی سے ٹکرا گیا۔ سامنے بستر پر کوئی محو خواب تھا۔ قبل اس کے بیگم رستم علی کچھ سمجھ پاتی۔ افضل خان نے دھمکی دے کر ملازمہ کو اندر کی طرف فرش پر گرا دیا اور ریپیٹر کی نال سیدھی کرتا ہوا بدلی ہوئی آواز میں غرایا۔

”خبردار...... آواز نکالنے یا شور مچانے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔

”کک...... کون ہو تم......؟“ شمائلہ رستم علی نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”کیا بات کرنی ہے؟“

”میں تمہارا گارڈ نہیں...... تم دونوں کی موت ہوں۔“ اس نے سوئے ہوئے آدمی کو بھی شامل کرلیا۔ ”جگاؤ اسے۔“ وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

شمائلہ رستم علی آغا خانی کے لیے وہ کھردرا لب ولہجہ ہی کسی خطرے سے کم نہیں تھا۔ اس نے شوہر کو جگانے میں دیر نہیں کی۔ رستم علی ہڑبڑا کر اٹھا تو موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر اس کے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ گلابو بھی تھر تھر کانپنے لگی۔

”کک...... کیا بات ہے؟“ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کون ہو تم...... کیا چاہتے ہو......؟“

”میرے پاس وقت کم ہے رستم علی۔“ افضل خان غرا کر بولا۔ ”زندگی چاہتے ہو تو میرے کہنے پر کسی بے جان کٹھ پتلی کی طرح عمل کرتے رہو۔ کسی حماقت کا ثبوت دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ میرے علاوہ تم دونوں اور شاید تمہارے بیٹے اور اس کی بیوی کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میں تنہا نہیں مروں گا۔“

رستم علی کی آنکھیں سر پر منڈلاتے خطرے کو دیکھ کر اپنے حلقوں میں چکرانے لگیں۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

”تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا؟...... کاروباری زندگی میں تو تم نے بڑے بڑے سودے نمٹائے ہیں۔ اس وقت موت اور زندگی کا بیوپار کرنے سے کیوں ہچکچا رہے ہو؟“

”تم...... کیا چاہتے ہو؟“ رستم علی نے ہارے ہوئے جواری کے انداز میں دریافت کیا۔

”تمہاری اور تمہاری بیوی کی سہاگ رات والے انداز میں ایک تازہ تصویر۔“ اس نے زہریلے انداز میں ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”دو تین پوز لینے کے بعد میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو زندہ چھوڑ کر واپس جانے کا وعدہ کرتا ہوں...... کیا خیال ہے؟“

”تت...... تم...... شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو۔“ رستم علی نے جھلا کر کہا۔ ”تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے بجائے میں

موت کو ہی ترجیح دوں گا۔''

''یہ موت بڑی اذیت ناک ہوگی۔ اس کا ایک نمونہ دیکھ لو۔'' افضل خان نے کہا پھر اس نے پلک جھپکتے میں فائر کیا۔ ''ٹچ'' کی مدھم آواز کے ساتھ ہی ملازمہ گلابو قیمتی قالین پر گر کر کسی ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی، اس کے بائیں شانے سے خون ابل رہا تھا۔

''اب تمہارا کیا جواب ہے؟'' اس نے سفاک نظروں سے رستم علی کو گھورا۔ ''ملازمہ کے بعد کیا تم اپنی چہیتی بیوی کو بھی اسی اذیت میں دیکھنا پسند کرو گے؟''

''نن...... نن...... نہیں۔'' شائلہ بیگم نے مردہ آواز میں ہاتھ جوڑ لیے۔ ''مم...... میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھ...... مجھے نہ مارنا، پلیز۔''

''مم...... میں تمہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔'' رستم علی نے کاروباری انداز میں کہا۔ ''تم اپنا پہلا مطالبہ واپس لے لو۔''

''سوری...... میں نے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا...... ہاں یا نہیں...... کیا کہتے ہو؟''

''تم...... کس کے لیے کام......''

''فضول باتیں مت کرو......'' اس نے پستول کا رخ شائلہ بیگم کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تین تک گنوں گا اس کے بعد۔ تم دونوں کی لاشوں کی تصویر بھی میرے لیے کافی ہوگی۔''

''میں تمہیں تین کروڑ اس وقت بھی کیش دے سکتا ہوں۔''

''ون......'' افضل خان نے جواب میں گنتی شروع کر دی، اس کی نظریں رستم علی پر مرکوز تھیں، پستول کا رخ شائلہ بیگم کی طرف تھا، گلابو شاید بے ہوش ہوگئی تھی اس لیے ساکت نظر آرہی تھی۔

''پانچ کروڑ......''

''ٹو......'' افضل خان کے لہجے میں درندگی جاگ اٹھی۔

دو کی گنتی مکمل ہوتے ہی شائلہ بیگم کی کیفیت موت کے خوف سے دیوانوں جیسی ہوگئی۔ اس نے شوہر کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر شاید اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا جو اس نے ایک ہی جھٹکے میں اپنا ڈریسنگ گاؤن پھاڑ کر اس طرح جسم سے علیحدہ پھینک دیا جیسے وہ اس کے لیے کفن سے زیادہ کربناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا اوپری جسم برہنہ ہوگیا تو اس نے شوہر کی طرف دیکھ کر سسکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے موت سے بچالو...... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

رستم علی بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر بوکھلا گیا، اس کی سودے بازی دم توڑ گئی۔ افضل خان کی طرف دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''تم ہماری تصویر کا کیا کرو گے؟''

''فرصت کے اوقات میں دیکھوں گا۔''

''ایک بار میری آفر پر بھی غور کرلو...... میں رقم دگنی بھی کرسکتا ہوں۔''

جواب میں افضل خان کی گرفت پستول کے دستے پر مچلی تو شائلہ بیگم نے اپنی برہنگی کی باقی کسر بھی پوری کردی۔ ہذیانی انداز میں شوہر سے بولی۔

''میں تمہیں دارا کی زندگی کا واسطہ دیتی ہوں۔ ایک مجبور ماں کو اپنی ضد کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔''

''جلدی کرو سیٹھ......'' افضل خان نے سرد لہجے میں وارننگ دی۔ ''تم دونوں کی موت کے بعد بھی میں اپنے مقصد کی تصویریں بنا سکتا ہوں۔''

رستم علی نے بیوی کی طرف دیکھا پھر خود بھی جلدی جلدی اپنا نائٹ سوٹ اتارنے لگا۔ شائلہ کی کیفیت دیکھنے کے بعد وہ اپنی عزت کے جنازے میں آخری کیل ٹھونکنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ شائلہ بیگم نے شوہر کو سرتاپا برہنہ دیکھا تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی پھر اس نے خود کو بستر پر گرانے کے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی گھسیٹ لیا۔ افضل خان نے الٹے ہاتھ سے حساس مووی بنانے والی ڈوائس جیب سے نکال لی۔

شائلہ بیگم نے جنونی انداز میں شوہر کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا، جو کچھ وہ کررہی تھی اس میں ہوس کو کوئی دخل نہیں تھا، محض دیوانگی اور زندگی بچانے کی خواہش تھی۔ موت سر پر سوار ہو تو کوئی ان لمحوں کو خوشگوار بنانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رستم علی بیوی کے ساتھ محض جنونی اداکاری کا رول نبھا رہا تھا جب گارڈ کے لباس میں کھڑے افضل خان کی فاتحانہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''اب کھیل تماشا ختم کر دو رستم علی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے زندگی کو موت پر ترجیح دی۔''

''تم...... تم اب ہمیں مارو گے تو نہیں؟'' شائلہ بیگم نے بڑی رحم طلب نظروں سے سوال کیا۔

''نہیں...... تم اب لباس پہن سکتی ہو۔''

ایک منٹ بعد ہی وہ دونوں ڈریسنگ گاؤن پہن کر مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔ شائلہ بیگم کا جسم اب بھی پھٹے ہوئے گاؤن سے جھانک رہا تھا۔

''جانے سے پہلے میں تمہیں ایک آخری وارننگ اور دے رہا ہوں۔'' افضل خان نے بہ دستور بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے کمرے سے باہر نکلنے کے آدھے گھنٹے بعد تک تم دونوں کسی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے۔ باہر میرا ایک گونگا اور بہرا ساتھی پوری طرح محتاط ہے۔ وہ صرف اسلحہ کی زبان میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔''

''مم...... میں اب بھی تم سے ایک سودا کرنے کو تیار ہوں۔'' رستم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بڑی سرد آواز میں کہا۔ ''تم تصویریں اور نگیٹو مجھے واپس کرکے منہ مانگی رقم حاصل کرسکتے ہو۔''

''وعدہ نہیں کرتا۔ تمہارے مطالبے پر غور ضرور کروں گا۔'' افضل خان نے سرسراتے ہوئے دوبارہ وارننگ دی۔ ''آدھے گھنٹے تک تم دونوں کوئی حماقت نہیں کرو گے۔'' جملہ مکمل کرکے وہ تیزی سے پلٹا، دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے بڑی احتیاط مگر برق رفتاری سے واپسی کا سفر طے کیا تھا۔

عمارت کے عقبی حصے کی جانب اب بھی پہلا والا گارڈ بے ہوشی کی کیفیت میں دیوار سے ٹیک لگائے موجود تھا، افضل خان نے ادھر ادھر دیکھا پھر دوبارہ اس کے جسم سے اپنا جاگنگ والا لباس اتار کر پہنا۔ اس کا لباس اسی کے جسم پر ڈال دیا۔ وقت ضائع کیے بغیر وہ دوبارہ بڑے اطمینان سے جاگنگ کرتا ہوا اسی مخصوص پوائنٹ کی طرف جارہا تھا جہاں اسے شبنم نے ڈراپ کیا تھا۔ اپنا مشن کامیابی سے پورا کرنے میں اسے چالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے جبکہ شبنم نے اسے واپس آنے کے لیے ایک گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ افضل خان کے واپس نہ ہونے کی صورت میں وہ پندرہ منٹ کے وقفے سے صرف دو چکر اور لگائے گی پھر واپس اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لوٹ جائے گی۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہی نئے ماڈل کی کرولا اس کے قریب پہنچ کر رک گئی، نمبر بھی وہی تھے لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر شبنم کی جگہ کوئی مرد موجود تھا۔ افضل خان ایک لمحے کو الجھ گیا۔ اس کے ذہن میں بگ باس کا خوفناک تصور ابھرا جو کسی واردات میں کوئی سراغ چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔ میڈم روبی کے سلسلے میں بھی اس نے افضل خان کے بے قصور ہونے کے باوجود اسے کسی بیکار پرزے کی طرح کباڑ خانے کی طرف پھینک دیا تھا۔ کہیں اس وقت بھی وہ کام مکمل ہوجانے کے بعد مجھے اپنے راستے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور تو نہیں کرنا چاہتا؟ اس تصور ہی سے اس کے جسم میں موت کی سرد لہر دوڑ گئی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے اسے گھورا۔ ''جلدی کرو...... کم آن۔''

افضل خان نے خاموشی سے تعمیل کی، اس کے سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی نے حرکت کی پھر برق رفتاری سے سنسان سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

''شبنم کہاں ہے؟'' اس نے تھوڑے توقف سے دریافت کیا۔

''تمہارا سوال میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔'' دوسرے شخص نے بڑے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو شاید میں بھی یہی سوال کرتا۔ ڈونٹ وری...... وہ پروگرام کے عین مطابق نہیں آئی، کسی بدلی ہوئی صورت میں، میں تمہارے لیے شبنم کے مقابلے میں زیادہ مددگار ثابت ہوسکتا ہوں۔''

''ہم اس وقت کہاں جائیں گے؟'' افضل خان نے کسمسا کر دوسرا سوال کیا۔

''فی الحال تمہیں دو روز تک شبنم کے فلیٹ سے دور رہنا ہوگا۔'' سنجیدگی سے جواب ملا۔ ''حالات اگر سازگار ہوئے تو شبنم تم سے خود مل لے گی۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

''میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے۔ کیا اس کے ثبوت تمہارے حوالے کردوں؟'' افضل خان نے کچھ سوچ کر اسے پھر ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''مجھے ہیرو بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' بے پروائی سے شانے اچکا کر جواب ملا۔ ''اوپر سے ملنے والی ہدایت صرف اتنی ہے کہ میں تم کو پک کرکے ایک محفوظ جگہ تک پہنچا دوں۔ تمہارے لیے ایک چیز بھی میرے پاس ہے۔'' اس نے جیب سے ایک موبائل نکال کر افضل خان کی طرف بڑھاتے ہوئے ہدایت کی۔ ''تم اس پر صرف کال ریسیو کرو گے۔ کسی کو کال کرنے کی غلطی مت کرنا۔ بگ باس اپنی ہدایت کی خلاف ورزی کرنے والوں سے کس طرح پیش آتا ہے؟ اس کا اندازہ تمہیں بھی بخوبی ہوگا۔''

افضل خان نے موبائل لے کر جیب میں ڈال لیا پھر ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ پون گھنٹے بعد اسے کسی عمارت کے اندر چھوڑ دیا گیا جہاں موجود دو مسلح گارڈ اسے کور کرتے ہوئے اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے گئے۔

☆☆☆

سفید رنگ کی میٹرو کیب اس وقت پوش علاقے کی سمت جانے والی اس سڑک سے گزر رہی تھی جو متوازی سڑک سے تقریباً دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر

بیٹھا ہوا سرحدی علاقے کا باشندہ نظر آنے والا دراصل پستہ قد اور مارشل آرٹ کا ماہر لوچن تھا جس نے میک اپ کے بعد اپنی اصلی شخصیت کو بڑی مہارت سے چھپا لیا تھا۔ کیب چلانے والے ڈرائیوروں کی وردی نے اس کی ظاہری حالت کو خاصا اجاگر کر دیا تھا، اس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں لیکن ذہن عقبی نشست پر تھا جہاں ہاشم اپنی اصلی صورت میں بیٹھا بڑی توجہ سے ذیلی سڑک کے کنارے بنے ہوئے مختلف وضع قطع کے مکانات اور دکانوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

لوچن کو ٹیکسی ڈرائیور کا رول ادا کرنے کی ہدایت بھی ہاشم ہی نے مخصوص کوڈ ”سیون اسٹار“ کے حوالے سے دی تھی لیکن کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لوچن کے ذہن میں یہ شبہ ایک بار پھر کلبلانے لگا کہ وہی اس مہم کا سربراہ ہے جس نے لوچن کے علاوہ بیرونی باشندے ڈوما کا بھی انتخاب کیا تھا۔ سیون اسٹار کا مخصوص کوڈ استعمال کرنے والی بھی غالباً ہاشم ہی کی کوئی ماتحت رہی ہوگی۔ یہ شبہ اس وقت سے لوچن کے ذہن میں جڑیں مضبوط کر رہا تھا جب ہاشم نے پہلی بار اس سے جہاز میں ملاقات کی تھی اور ڈوما کے بارے میں کچھ خدشات ظاہر کیے تھے جو بعد میں درست ثابت ہوئے۔

ہاشم اس وقت گرے کلر کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ ہوشنگ کو اس نے اپنے ہوٹل کے بجائے ایک تجارتی مال کے باہر سے بہ طور مسافر انگیج کیا تھا۔ اس میں بھی یقیناً ہاشم کی کوئی مصلحت رہی ہوگی جس کا علم ہوشنگ کو مطلق نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے سے وہ صرف ڈرائیور کا رول ادا کر رہا تھا، ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی، ہاشم کی اس بے اعتنائی پر وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا، جب پچھلی نشست سے ہاشم نے اسے پہلی بار مخاطب کیا۔

”رائٹ ہینڈ پر کشمیری فرنیچرز کی دکان پر ایک نظر ڈال لو، واپسی پر ہمیں وہیں رکنا ہے۔“

”کیا اب تمہیں کسی پرائیویٹ مکان میں رہنے کی ہدایت ملی ہے جو اس کے لیے فرنیچر درکار ہے؟“

”میرے پاس تمہاری مس انڈر اسٹینڈنگ کا کوئی... علاج نہیں ہے۔“ ہاشم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ایک بار پھر یہی کہوں گا میری ذاتی پوزیشن بھی تم سے یا ڈوما سے مختلف نہیں ہے۔“

”لیکن زیادہ تر ہدایتیں تمہارے ہی ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔“

”ہوسکتا ہے یہ محض اتفاق ہو۔“ ہاشم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”مطلوبہ فرنیچر کی دکان میں مجھے تنہا جانا ہوگا لیکن پوری طرح محتاط رہنا۔ ہمیں وہاں کچھ غیر یقینی صورت حال بھی پیش آسکتی ہے۔“

”کشمیری فرنیچرز ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ شہر میں فرنیچر کی اور بھی بے شمار دکانیں موجود ہیں۔“

”تم نے شاید روڈ سائڈ پر بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں اور کچے پکے مکانوں کی ساخت پر غور نہیں کیا۔ یہ ایک پرانی کالونی ہے جو ابھی تک ماڈرن حالات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوسکی، شاید اس لیے کہ یہاں مختلف کلاس کے لوگ آباد ہیں جو اپنی اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلا رہے ہیں۔“

”کیا ہم یہاں صرف فرنیچر خریدنے آئے ہیں!“ لوچن نے کسمسا کر سوال کیا۔

”نہیں......“ ہاشم نے اس بار ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے یہاں ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنی ہے جو کسی اچھی شہرت کا مالک نہیں ہے۔ فرنیچر کا کاروبار محض ڈھونگ ہے، میرا خیال ہے کہ فرنیچر کی دکان کے اندر ہی اندر کچھ چور راستے بھی ہوں گے جسے پولیس وغیرہ کی ریڈ کے وقت استعمال کیا جاتا ہوگا۔ مجھے صرف یہی بتایا گیا ہے کہ جس شخص سے ملاقات کرنی ہے وہ ایک جرائم پیشہ گروہ کا سردار ہے۔“

”ملاقات کی نوعیت کیا ہوگی؟“ لوچن نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”سوری...... میں سیون اسٹار کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔ تمہیں اور ڈوما کو بھی یہی ہدایت ملی ہوگی۔“

لوچن نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ کشمیری فرنیچرز کی دو منزلہ عمارت پر ایک نظر وہ بھی ڈال چکا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے ذیلی سڑک پر آتے ہوئے اپنی نئی ماڈل کرولا کیب مطلوبہ دکان سے کچھ پہلے ہی روک دی، ہاشم خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ گاڑی کچھ فاصلے پر روکنے کی مصلحت وہ بھی بھانپ چکا تھا، وہاں سے کسی متوقع خطرے کو بہ آسانی بھانپا جاسکتا تھا۔

فرنیچر کی وہ دکان چوڑائی میں زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن لمبائی میں شاید اسے دو پلاٹوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ شوروم کے اندر ہی اسے وہ گول زینہ بھی نظر آگیا جو دکان کی پہلی منزل پر جاتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ مختلف فرنیچر کو دیکھتا رہا۔ دکان پر دو افراد نظر آرہے تھے، ایک ملازم تھا جو ہاشم کے ساتھ ساتھ تھا، دوسرا ایک میز پر اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ غالباً وہ منیجر رہا ہوگا۔

”آپ کو کس قسم کا فرنیچر درکار ہے؟“ ملازم نے ہاشم کے ساتھ چلتے چلتے اسے کاروباری انداز میں مخاطب کیا۔

”میری بات فون پر کسی قدیر صاحب سے ہوئی تھی۔“ ہاشم نے جواب دیا تو ملازم نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو میز پر بیٹھا تھا۔ ہاشم قدم بڑھاتا میز کے قریب چلا گیا۔

”مسٹر قدیر......؟“

”جی، تشریف رکھیے۔“ چھریرے بدن والے شخص نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہاشم نے اپنے شانوں سے مختصر سا بیگ اتار کر فرش پر رکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”مجھے دراصل جے، بی سے ملنا ہے۔“

”کون جے، بی؟“ مخاطب کیا جانے والا چونکا۔ ”آپ شاید غلط جگہ آگئے ہیں، یہاں اس نام کا......“

”آپ مسٹر وزیر ہی ہیں نا؟“

”جی ہاں، لیکن......“

”کسٹمر سروس نمبر ایف...... تھرٹی فور (F-34) جے، بی کے لیے اتنا حوالہ کافی ہوگا۔“ ہاشم نے مسکرا کر کہا۔ اس بار اسے مزید نہیں کریدا گیا۔ فون سیٹ پر ایک نمبر پنچ کرنے کے بعد میز پر بیٹھے ہوئے شخص نے مختصراً ہاشم کا دیا ہوا حوالہ دہرایا پھر ہاشم کو لے کر دکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ لکڑی کے مارسی پارٹیشن سے گزر کر وہ دوسری طرف گئے۔ یہ حصہ بظاہر ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا تھا جہاں ایک بھاری جسامت کا شخص دیواروں کی صفائی میں مصروف تھا۔ قدیر نے ہاشم کو اس کے ساتھ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ان کو بڑے سیٹھ سے ملوا دو۔“ اس کے بعد ہاشم کو اندر ہی اندر کئی بھول بھلیوں سے گزارنے کے بعد ایک مختصر کمرے میں روکا گیا۔ ساتھ آنے والا اندر چلا گیا۔ ہاشم بہ دستور نارمل نظر آرہا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر صورت حال ساز گار نہ ہوئی تو ہوشنگ کے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ کچھ دیر بعد اسے ساتھ لانے والا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ ”آپ اندر جاسکتے ہیں۔“ اس نے ہاشم سے کہا پھر قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

ہاشم نے بے پروائی سے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو اس ہائی دس کے مختصر کمرے میں اس نے ایک شخص کو سامنے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے دیکھا، اس کی میز کے ساتھ دوسری دو کرسیاں بھی موجود تھیں، ہاشم نے اس شخص کو غور سے دیکھا جو گٹھے ہوئے بدن اور تیکھے نقوش کا مالک تھا، اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ سخت گیر طبیعت کا مالک ہے، آنکھوں کی چمک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ کسی کے ہدایت کرنے کا عادی نہیں ہے۔ اس کی کرسی کے بائیں جانب ایک خونخوار السیشین بیٹھا اپنی زبان لپلپا رہا تھا۔

”بیٹھو......“ ہاشم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ”تمہارے کام میں ہمارے نگینے ضائع ہوگئے۔ مجھے ان کی پروا نہیں، تمہارا کام ہوگیا تھا پھر کیسے آنا ہوا؟“

”میرا نام ہاشم ہے اور تم......“

”تم جگا ہی سے مخاطب ہو۔“ جواب دینے والے نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر تم غیر ملکی گاہک نہ ہوتے تو میں تم کو اندر بلانے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ مقامی لوگ ڈبل کراس کرنے کی حماقت کرتے ہیں اس لیے میں ان سے کم ہی ملتا ہوں۔“

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن میں اس وقت ایک خاص کام سے آیا ہوں۔“ ہاشم نے کاروباری انداز اختیار کیا۔ ”تمہارے نگ جو باقی بچ گئے تھے ان کے بارے میں کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”کام ہوجانے کے بعد اب ان سے تمہارا کیا تعلق رہ جاتا ہے؟“ درشت لہجے میں دریافت کیا گیا۔

”صرف اتنا کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔“ ہاشم نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”انہیں اپنی زبان ہر حال میں بند رکھنی ہوگی۔ اس کی ضمانت کون دے گا؟“

”اوہ......“ جگا نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”آدمی دور اندیش اور تجربے کار معلوم ہوتے ہو۔“

”نہ ہوتا تو کسی پارٹی نے منہ مانگے داموں پر افریقا کے وحشی قبیلے سے یہاں درآمد بھی نہ کیا ہوتا۔ کام کھرا کرتا ہوں اس لیے بیرونی منڈی میں ڈیمانڈ بھی ہے۔“

”خوشی ہوئی تم سے مل کر۔“ اس بار جگا نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”فکر مت کرو، جو دو پیس باقی رہ گئے ہیں وہ زبان نہیں کھولیں گے۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔“

”تھینکس۔“ ہاشم نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا پھر نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر بے پروائی سے ڈال دی۔

”یہ...... یہ کس لیے؟“ جگا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جو نگینے ضائع ہوجائیں ہم اس کی قیمت بھی ضرور ادا کرتے ہیں۔“

”ہم جو سودا کرتے ہیں اس میں ٹوٹ پھوٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ تم یہ رقم واپس اٹھالو۔“

”نہیں جگا......“ ہاشم نے اٹھتے ہوئے سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہوسکتا ہے مجھے پھر کوئی کام پیش آئے۔

تم میری طرف سے یہ رقم ان کی فیملی کو دے دینا۔"

جگا مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاشم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارا یہ کاروباری انداز اچھا لگا۔ جب بھی جگا کی ضرورت پیش آئے، دوست بن کے ایک آواز دینا۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔"

ہاشم کا تجربہ گواہی دے رہا تھا کہ جگا اپنی زبان کا دھنی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکلا، باہر بیٹھا ہوا شخص پھر اس کی رہنمائی کرتا ہوا فرنیچر کے شوروم تک لے آیا۔ قدیر کی میز پر ایک اور شخص بیٹھا تھا جسے دیکھ کر ہاشم چونکا۔ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا، پہناوے اور رکھ رکھاؤ سے اس کا تعلق اونچے لوگوں میں شمار کیا جا سکتا تھا، اس نے سنہری فریم کا لائٹ کلر والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ ہاشم کی دوررس نگاہوں میں مخصوص چمک پیدا ہوئی۔ یہ اس بات کا پیش خیمہ تھا کہ وہ اسے کہیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ پھر قدیر کے ساتھ ہی اس شخص نے بھی پلٹ کر ہاشم کی طرف دیکھا تو ہاشم نے اسے شناخت کرلیا۔ وہ اس شخص کو اپنے ہوٹل کے باہر بھی ایک دوبار منڈلاتا دیکھ چکا تھا۔ جگا کے ٹھکانے پر دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ وہ بھی کسی بڑی پارٹی کا خاص آدمی ہوگا۔ فوری طور پر ہاشم کے ذہن میں ایک ہی آدمی کا نام ابھرا شیخ حامد اور دوسرے ہی لمحے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا شوروم سے باہر آگیا۔ احتیاطاً اس نے باہر کھڑی گاڑی کے نمبر بھی ذہن نشین کرلیے۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار تھی۔

☠☠☠

سیٹھ عثمان نے اپنا ذاتی آفس نئے بنگلے میں شفٹ کرلیا تو راحیلہ بیگم نے سکون کا سانس لیا، ذاتی آفس کے علاوہ انتظامیہ کا مخصوص شعبہ اور کچھ کاروباری سیکشن بھی نئے بنگلے میں بہ آسانی سما گئے تھے۔

اس روز نئے آفس میں وہ پہلا دن تھا جب راحیلہ بیگم خود بھی شوہر کے ساتھ دفتر گئی تھیں۔ آفس کا رسمی افتتاح بھی انہی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مٹھائی بھی تقسیم کی گئی۔ لیاقت حسین اور فرحین بھی خوش تھے لیکن ڈی ایس پی سراج کی غیر موجودگی کو سیٹھ عثمان کے علاوہ راحیلہ بیگم بھی محسوس کر رہی تھیں۔ مختصر سی تقریب کے بعد جب وہ شوہر کے ساتھ نئے آفس میں گئیں تو انہوں نے اس کا اظہار شوہر سے بھی کیا۔ شاید اس لیے کہ سراج ہی نے وقتی طور پر انہیں کچھ دنوں کے لیے باہر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں نئے بنگلے کی خریداری اور پرسنل آفس شفٹ کرنے کا پروگرام بھی سراج ہی کی دوڑ دھوپ اور مشوروں کا مرہون منت تھا۔

"اس موقع پر مجھے سراج کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس موقع پر بھی سراج نے دوراندیشی ہی کا ثبوت دیا ہے۔" سیٹھ عثمان نے کہا۔ "ایک پولیس آفیسر ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے نیوٹرل رہنا بھی ضروری ہے۔"

"کیوں؟ کیا شیخ حامد کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ سراج آپ کا کلاس فیلو ہے اور ہمارے درمیان فیملی ٹرمز ہیں؟"

"یقیناً ہے، اور اسی وجہ سے سراج نے احتیاط سے کام لیا ہوگا۔"

"سراج بھائی خود نہیں آئے تو کم از کم ہماری خوشی کی خاطر الماس کو ہی بھیج سکتے تھے۔" راحیلہ بیگم نے شکوہ کیا۔ "آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں ان دونوں سے شکوہ ضرور کروں گی۔"

سیٹھ عثمان بیوی کو کچھ اونچ نیچ سمجھانا چاہتے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، انہوں نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو......"

"نیا آفس مبارک ہو۔" دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔ "کیسا فیل کر رہے ہو؟"

"آج پہلا دن ہے لیکن کچھ مسائل یہاں بھی سر ابھار رہے ہیں۔" سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"خیریت......؟"

"میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہاری پوزیشن اب زیادہ نازک ہو رہی ہے۔" اس بار سیٹھ عثمان نے بیوی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھ کر جواب دیا تو راحیلہ بیگم پر شوہر کے پہلے جملے سے پیدا ہونے والا تناؤ یکلخت ختم ہوگیا۔ انہوں نے ریسیور جھپٹ کر کان سے لگالیا۔

"فکر مت کرو...... میں جانتا ہوں دشمنوں کے کان ضرور کھڑے ہوں گے لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔" دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔

"بہت خوب...... گویا اب آپ مجھے بھی دشمن سمجھنے لگے۔" راحیلہ بیگم نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ "کم از کم آپ سے اس کی امید نہیں تھی۔ شاید اس لیے آپ اور الماس دونوں غیر حاضر ہیں۔"

"سب سے پہلے میری اور الماس کی طرف سے مبارک باد قبول کریں اور یہ بھی فیصلہ کریں کہ الماس کو جو دکھ پہنچا ہے اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔"

"کیسا دکھ......؟"

"انوی ٹیشن نہ ملنے کا۔" سراج نے شکایت کی۔ "میں واقف ہوں کہ عثمان شروع ہی سے کنجوس واقع ہوا ہے لیکن الماس کو امید تھی کہ کم از کم آپ اسے ضرور بلائیں گی۔"

"سراج بھائی......" راحیلہ بیگم نے تیزی سے کہا۔ "آپ کی یہ پولیس والی چال بالکل نہیں چلے گی۔ مجھے واقعی دکھ ہوا ہے آپ دونوں کے شریک نہ ہونے کا......"

"کیا کچھ لے دے کر بھی کک مکا نہیں ہو سکتا؟" سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا تو راحیلہ بیگم مسکرا دیں۔

"الماس کی خاطر گنجائش نکال سکتی ہوں۔ آپ کو پہلی فرصت میں مجھے اور عثمان کو ایک شاندار ٹریٹ دینی ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ بہت سستا چھوٹ گیا۔" سراج نے دیور بھابی کے رشتے کے تحت اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا۔ "میرے علاقے میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بھی آتا ہے۔ آپ جب چاہیں پروگرام بنالیں۔"

"ہوٹل نہیں...... آپ کو گھر پر سارا اہتمام کرنا ہوگا۔ میں آج ہی الماس سے بات کر کے پروگرام طے کرلوں گی۔"

"منظور ہے لیکن ایک شرط پر......"

"وہ کیا......؟"

"الماس آپ کو انوائٹ کرے گی لیکن میں عثمان کو منانے پر غور کرنے کے بعد ہی جواب دوں گا۔"

کچھ دیر بعد راحیلہ بیگم کی گفتگو ختم ہوئی تو ملازم نے داخل ہو کر ایک کارڈ سیٹھ عثمان کے سامنے رکھ دیا جسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر راحیلہ بیگم نے پوچھا۔

"کس کا کارڈ ہے؟"

"شیخ حامد باہر گاڑی میں موجود ہے...... مجھے اس کی امید نہیں تھی۔"

سیٹھ عثمان کے ساتھ ہی راحیلہ بیگم بھی باہر آگئیں جہاں شیخ حامد اپنی شاندار گاڑی میں موجود تھا، سیٹھ عثمان نے بذات خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو شیخ حامد مسکراتا ہوا باہر آگیا۔

"ایسی بھی کیا بے مروتی کہ آپ نے چپکے چپکے نیا آفس قائم کرلیا۔" شیخ حامد نے مخصوص انداز میں شکوہ کیا۔ "ہمیں اطلاع بھی نہ دی۔"

"ہم نے یہ سب کچھ سادگی سے کیا ہے۔" راحیلہ بیگم مسکرا کر کہا۔ "آپ تشریف لائیں اور خود دیکھ لیں کہ ہم نے کسی کو مدعو نہیں کیا۔"

شیخ حامد ایک نظر بنگلے پر ڈالتا ہوا اندر اس کمرے میں آگیا جو خاص خاص کاروباری پارٹنرز سے ملنے کی خاطر مخصوص تھا۔

"میرا بن بلائے آجانا آپ کو برا تو نہیں لگا؟" اس نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے باری باری عثمان اور راحیلہ کو وضاحتی نظروں سے دیکھا، اس کے جملے میں طنز کے علاوہ برتری کا احساس بھی جھلک رہا تھا۔

"قطعاً نہیں...... یہ تو ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے آپ اپنوں کی طرح ہماری خوشیوں میں شریک ہوگئے۔" سیٹھ عثمان نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ راحیلہ بیگم اہتمام کی خاطر اجازت لے کر باہر چلی گئیں تو شیخ حامد نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کیا آپ نے تجارتی علاقے میں گھر کے قریب اپنا آفس بنانے کو کسی خاص وجہ سے ترجیح دی ہے؟"

"جی نہیں...... یہ بنگلا خالی پڑا تھا اس لیے میں نے صرف اسے اپنا پارٹ ٹائم آفس بنایا ہے۔" سیٹھ عثمان نے سنبھل کر جواب دیا۔ "زیادہ تر وقت تو آپ لوگوں کے درمیان ہی گزرے گا۔"

"بہرحال دیکھ لیں کہ مجھے بروقت بھنک مل گئی اور میں آپ کو مبارک باد دینے آگیا۔"

"یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے غیریت نہیں برتی۔"

دونوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ راحیلہ بیگم نے اتنی دیر میں خاصا اہتمام کرلیا تھا، شیخ حامد نے تکلف سے کام نہیں لیا لیکن زیادہ دیر رکا بھی نہیں۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ بیگم نے دلی زبان میں کہا۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ شیخ حامد یہاں صرف اپنی خوشی کا اظہار کرنے نہیں آیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوگا۔"

"شاید......" سیٹھ عثمان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "کچھ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خواہش زیادہ شدت سے ہوتی ہے، میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کے آنے کا اصل مقصد کیا تھا۔ وہ شاید یہ باور کرانے آیا تھا کہ میں اس کے خوف سے میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں۔"

"دفع کیجیے...... دوسرے کیا سمجھتے ہیں، ہمیں اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" راحیلہ بیگم نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا، اس روز وہ خاصی دیر تک شوہر کے ساتھ آفس میں رہی بعد میں گھر آگئیں۔ ذاتی طور پر وہ بھی شیخ حامد کی اچانک آمد کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکی تھیں۔ جو شخص کسی کو دعوت میں بلا کر تخریبی کارروائی

کے حربے اختیار کرسکتا تھا، اس سے کوئی نیک توقع بھی وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی۔

☠☠☠

اس بار افضل خان کے ساتھ اس کی نگرانی کرنے والوں کا وہ سلوک نہیں تھا جو میڈم روبی والے معاملے کی ناکامی کے بعد۔ وہ غلطی نہ ہونے کے باوجود بھگت چکا تھا۔

دو روز سے اسے ایک بیڈروم میں رکھا گیا تھا۔ یہاں اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی لیکن ایک بار بگ باس کی دوغلی پالیسی اور مصلحتوں کا ہدف بننے کے بعد وہ خاصا محتاط ہوگیا تھا۔ ایک ہی جھٹکے نے اس کی ساری خوش فہمی دور کردی تھی۔ اگر شبنم نے اسپتال سے نکالے جانے کے بعد بروقت اسے اپنے فلیٹ میں سر چھپانے کی جگہ نہ دی ہوتی تو شاید وہ خودکشی کے ارادے کی تکمیل کرنے کے بعد اخباروں کی سرخیاں بن کر رہ گیا ہوتا۔ شبنم نے خود کو نیوٹرل ثابت کرنے کی خاطر جو کچھ کہا تھا اس کی پشت پر بھی یقیناً بگ باس کی مرضی ضرور شامل رہی ہوگی۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی جبکہ بڑے بڑے سورما بھی بگ باس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز ہی کرتے تھے۔ افضل خان کے اس شبہے کو اس وقت تقویت مل گئی جب شبنم نے اسے بگ باس کے دو مخالفین کے بارے میں بتا کر یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اس نادر سے فائدہ اٹھائے تو بگ باس اس کے سلسلے میں نرم بھی پڑسکتا ہے۔ اس آفر کے پیچھے بھی افضل خان کو بگ باس کی چالاکی محسوس ہوئی تھی۔ شبنم کو یقینی طور پر اسی نے اشارہ کرکے افضل خان کے ساتھ ذاتی ہمدردی کا مشورہ دیا ہوگا۔ اس کا ثبوت بھی اس روز مل گیا جب شبنم نے ایک موقعے پر افضل خان کو ایک مختصر چٹ پر یہ پیغام لکھ کر دیا تھا۔ ”ہماری اس کمرے میں ہونے والی گفتگو دوسری جانب بھی سنی جارہی ہے۔ محتاط رہنا۔ ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں، کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی کام آسکوں۔“ اس پرچے کو پڑھ لینے کے بعد افضل خان کے اس شبہے کی تصدیق ہوگئی تھی کہ شبنم نے اسی کے اشارے پر اسے پناہ دی تھی۔

شبنم کا وہ خاموش پیغام، اس وقت بھی افضل خان کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ بگ باس کا دست راست ہونے کی حیثیت میں بھی اس نے کئی بار شبنم کو اپنی طرف جھکتے محسوس کیا تھا۔ اگر وہ آفس میں ایک ساتھ کام نہ کررہی ہوتی تو شاید افضل خان اسے بھی شکار کرچکا ہوتا لیکن اب وہ شبنم کی اپنی ذات میں اس دلچسپی کو دوسری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شیخ حامد کی فرم میں ملازمت محض اچھی تنخواہ کی خاطر نہیں کی ہوگی۔ اگر وہ غلط قسم کی لڑکی ہوتی تو بھول کر بھی افضل خان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہ کرتی۔ بگ باس کی سخت پالیسی سے وہ بھی ناواقف نہیں رہی ہوگی۔ اس نے جو قدم افضل خان کی طرف بڑھانے کی کوشش کی تھی اس میں یقیناً کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ کوئی ایسی افتاد جس میں اسے افضل خان کی مدد درکار ہوگی۔ اس مشکل کا کوئی نہ کوئی تعلق بھی بگ باس سے ضرور ہوگا ورنہ وہ افضل خان کے بجائے کسی اور کو بھی شیشے میں اتارنے کی کوشش کرسکتی تھی۔

رستم علی آغا خانی سے ٹکراؤ کے سلسلے میں شبنم نے خلاف توقع ذاتی طور پر بھی افضل خان کی مدد کی تھی۔ شاید اسی وجہ سے افضل خان نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اس ٹارگٹ کو حاصل کرلیا تھا۔ جس شخص نے اسے شبنم کی عدم موجودگی میں واپسی میں پک کیا تھا اس نے بھی یہی کہا تھا کہ ”تمہیں دو روز تک شبنم کے فلیٹ سے دور رہنا ہوگا۔ حالات اگر سازگار ہوئے تو شبنم تم سے خود ہی مل لے گی۔ فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

بہرحال بگ باس کے دیے مشکل محاذ کو سر کرلینے کے باوجود افضل خان کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔ ایک بار اپنے ناکردہ گناہ کی اذیت ناک سزا بھگتنے کے بعد اس نے طے کرلیا تھا کہ اب وہ اپنا راستہ الگ بنانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ پہلے وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اگر چاہتا تو اس خطرناک مگرمچھ کو بہت قریب سے شکار کرسکتا تھا۔ اب حالات نے بگ باس کو بھی پہلے سے زیادہ محتاط کردیا ہوگا لیکن...... وہ اس کے باوجود اسی دغابازی کی پالیسی پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کرچکا تھا جو اس کے ساتھ عمل میں آچکی تھی۔

جس کمرے میں اسے رکھا گیا تھا وہاں سے اسے باہر نکلنے کے علاوہ ہر قسم کی سہولت حاصل تھی لیکن وہ متواتر اپنی زندگی کے آنے والے باب کو اپنے انداز میں رقم کرنے کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا۔ اس وقت بھی شام کا ہلکا ناشتا کرنے کے بعد وہ ایک ایزی چیئر پر بیٹھا انہی خیالوں میں گم تھا جب اس کو دیے گئے موبائل پر پہلی بار کال کی گئی...... اس نے سنبھل کر موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی جہاں کسی نمبر کے بجائے ”ان نون“ درج تھا۔

”ہیلو......“ اس نے موبائل آن کرکے سنجیدگی سے اٹینڈ کیا۔

”تم نے اپنی نئی زندگی کا پہلا ہرڈل (HURDLE) کامیابی سے پھلانگ لیا ہے۔“ دوسری

جانب سے شیخ حامد کی کھردری آواز سنائی دی جس میں حقارت کا پہلو بھی شامل تھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ شبنم نے تمہاری جو سفارش کی تھی اسے اس میں مایوسی نہیں ہوئی۔''

''میں آپ دونوں کا شکر گزار ہوں۔'' افضل خان نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔

''اب کیا سوچا ہے؟'' سپاٹ اور سرد لہجے میں دریافت کیا گیا۔

''میں اس وقت کچھ سوچنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''گڈ...... مجھے تمہارا جواب پسند آیا، جب انسان ہر طرف سے مایوس ہو جائے تو اسے اسی انداز میں بات کرنا چاہیے۔''

''میں مایوس پھر بھی نہیں ہوں۔'' افضل خان نے دیدہ و دانستہ خوشامدی انداز اختیار کیا۔ ''اس بات کی توقع رکھتا ہوں کہ آپ مجھے آزمائش کے کچھ اور مواقع بھی ضرور دیں گے۔''

''ضروری نہیں ہے۔ تم جو مقام کھو چکے ہو اس کے بارے میں خواب میں بھی نہ سوچنا۔''

اس بار افضل خان نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، کسمسا کر رہ گیا۔

''خاموش کیوں ہو گئے؟''

''میں...... میں ایک درخواست کروں گا۔''

''کہو......''

''آپ ایک بار حکم دے کر دیکھیں، میں آپ کے اشارے پر خود اپنی شہ رگ پر چھری پھیر لوں گا۔''

''زندگی سے اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔'' طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔ ''کبھی تو اسی شہر میں تم سینہ تان کر اور سر اٹھا کر چلتے تھے؟''

''وہ بھی آپ کی مہربانی تھی......''

''ایک بات کا خیال رکھنا...... جب انسان کے گھٹنے عارضی لگا دیے جائیں تو اس کو دوبارہ اپنے قدم زمین پر جما کر چلنے میں بڑی اذیت ناک قوت برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔''

''ہم...... میں ہر امتحان کے لیے تیار ہوں۔'' افضل خان نے مردہ آواز میں جواب دیا۔

''میڈم والے کیس میں تمہیں جو سزا ملی تھی اس کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے......؟ تم ایک ہی جھٹکے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے۔''

''میں اسے مصلحت کا نام دوں گا۔'' افضل خان نے پھر دل پر جبر کیا۔ ''جو کچھ ہوا میں اس پر شاکی نہیں ہوں۔''

''فائن......'' شیخ حامد کے لہجے میں نمرودیت اتر آئی۔ ''مجھے ہر حال میں دم ہلاتے شکاری کتے زیادہ پسند ہیں۔''

افضل خان خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس وقت وہ اس سے زیادہ کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

''آزمائش صداقت کی کسوٹی ہوتی ہے...... کبھی فرصت ملی تو اپنے قدموں میں تمہارے لیے کوئی جگہ نکالنے کے بارے میں غور کروں گا۔''

''میرے لیے یہ بھی بہت ہوگا۔''

''شبنم ابھی کچھ دیر میں تمہارے پاس آرہی ہے۔'' اس بار سرد لہجے میں کہا گیا۔ ''اس کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا تو افضل خان کے پورے وجود میں چنگاریاں چٹخنے لگیں۔ ایک بار پھر وہ ''تخت یا تختہ'' کی راہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک اسلحہ بردار اندر داخل ہوا، چھ گھنٹے کی شام کی ڈیوٹی میں وہی نظر آتا رہا تھا، افضل خان نے پہلے ہی روز محسوس کیا تھا کہ وہ بہ ظاہر اس پوزیشن کا حامل نہیں ہے جسے اس نے وقتی طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ فون پر گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی کمرے میں اس کی آمد نے افضل خان کو ایک لمحے کو چونکنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ پرانا اور منجھا ہوا کھلاڑی تھا، اس نے خود کو ایسا ظاہر کیا جیسے وہ کچی نیند میں بیدار ہو گیا ہو۔

''آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' آنے والے نے سپاٹ آواز میں دریافت کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ناشتا کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... میں نے یوں ہی مہمان نوازی کی خاطر دریافت کر لیا تھا، اوپر سے یہی آرڈر ملا ہے کہ آپ کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔'' وہ جانے کے ارادے سے پلٹا تو افضل خان نے کچھ سوچ کر اسے روکتے ہوئے بڑے مایوس انداز میں دریافت کیا۔

''کیا یہاں غم غلط کرنے کی دوا مل سکتی ہے؟''

''کھل کر بات کریں...... ہم کو معموں میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''ہم...... میں، اس وقت وہسکی پینے کا خواہش مند ہوں۔'' افضل خان نے دیدہ و دانستہ زندگی سے بے حد

مایوس ہو جانے والا انداز اختیار کیا۔ آنے والا جواب دینے کے بجائے خاموشی سے پلٹ گیا۔ پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس بھی موجود تھا۔

''اسے میری موجودگی میں حلق کے نیچے اتار لیں۔ ہم کو شیشے کا گلاس یا بوتل دینے کی اجازت نہیں ہے۔''

''کیوں......؟'' افضل خان نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''انسان جب زندگی سے مایوس ہو جائے تو پھر خودکشی سے بھی گریز نہیں کرتا۔''

''میں ایسا کوئی قدم یہاں سے جانے کے بعد بھی اٹھا سکتا ہوں......؟''

''وہ ہماری ذمے داری نہیں ہوگی۔''

جواب میں افضل خان نے مایوسی اور جھلاہٹ کا ملا جلا ردعمل ظاہر کیا پھر گلاس ہاتھ میں لے کر دو ہی گھونٹ میں ختم کر کے بے زاری سے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر اچھال دیا۔ اسلحہ بردار نے معنی خیز نظروں سے افضل خان کو گھورا پھر گلاس اٹھا کر خاموشی سے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

افضل اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، اس کے ساتھ جو نفسیاتی حربے استعمال کیے جا رہے تھے وہ ان کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ شبنم کی آمد کا بھی شدت سے منتظر تھا۔ بگ باس کے تلخ لہجے نے اس کے اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے ارادے کو اور مہمیز کر دیا تھا۔ آدھے گھنٹے تک اس کے ذہن میں مختلف منصوبے ابھرتے رہے۔ اسے میڈم روبی کی آفر یاد آئی۔ اگر اس وقت وہ بگ باس کے مقابلے پر خاموشی سے میڈم کا ہاتھ تھام لیتا۔ اس کی حسین پیشکش کو قبول کر لیتا تو اس وقت حالات یکسر مختلف ہوتے، بگ باس کا قصہ پاک کرنے کی خاطر اسے کوئی دشواری نہ ہوتی۔ وہ اس سے بہت قریب تھا، کسی بھی موقعے پر کسی اور کی گردن پھنسا کر پولیس کے پھندے سے بھی گلوخلاصی حاصل کر سکتا تھا لیکن اب...... اب شاید میڈم بھی اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا گوارا نہ کرے۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی اور بھی کئی نام اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے لیکن وہ جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اسے مالی طور پر خود کو مستحکم کرنا تھا۔ سر چھپانے کی خاطر کوئی مستقل ٹھکانا تلاش کرنا تھا۔ ان مرحلوں کو طے کرنے کی خاطر خاصا وقت درکار تھا۔

وہ اپنے خیال میں گم تھا جب قدموں کی آہٹ سن کر تیزی سے پلٹا...... شبنم اس کے سامنے موجود تھی، ساتھ میں مسلح گارڈ بھی کھڑا تھا۔ افضل خان اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا، وہ مسلح شخص کو یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ ابھی تک کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے، شبنم بھی اس کی کیفیت کو محسوس کرتی رہی پھر اس نے گارڈ سے کہا۔

''تم جاؤ...... دروازہ باہر سے بند کر لینا۔''

''کچھ دیر پہلے ہمارے مہمان نے وہسکی کے پیگ پیے ہیں۔'' گارڈ نے شبنم کو باخبر کرنے کی خاطر اپنا فرض ادا کیا۔

''تم فکر نہ کرو...... میں محتاط رہوں گی، ضرورت پڑی تو وہی سگنل دوں گی جو طے ہوا ہے۔''

''جو حکم میڈم۔'' گارڈ افضل خان پر اچٹتی نظر ڈال کر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔

''اس وقت کیسا فیل کر رہے ہو؟'' شبنم نے گارڈ کے جانے کے بعد سنجیدگی سے افضل خان کو مخاطب کیا۔ ساتھ ہی اس نے بائیں آنکھ کی پلکوں کو ہلکا سا جھپکا کر افضل خان کو محتاط رہنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

''ایک بار پھر خودکشی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔'' افضل خان نے مایوسی کا اظہار کیا۔

''کوئی خاص وجہ......؟''

''بگ باس کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے قدموں میں بھی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے۔''

''جلد بازی میں کوئی حماقت مت کرنا...... زخم بھرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔'' شبنم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بگ باس کی طرف سے میں تمہیں پہلے بھی باور کرا چکی ہوں کہ وہ تمہارا کھویا ہوا مقام نہیں دے سکتا۔ اس کی جگہ تم ہوتے تو شاید تم بھی کچھ ایسا ہی فیصلہ کرتے۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو لیکن...... تم نے تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا۔''

''کس نتیجے پر پہنچنے کی بات کر رہے ہو؟''

''جان بوجھ کر انجان بننے کی اداکاری مت کرو۔'' افضل خان نے تلملا کر پوچھا۔ ''فرض کر لو میری جگہ تم ہوتیں...... تمہیں بھی وہی مقام حاصل ہوتا جو مجھے حاصل تھا لیکن کیا تم بگ باس کی مخالفت اور ناراضی مول لے کر اس شہر میں کہیں پناہ حاصل کر سکتی تھیں؟''

''میں تمہاری اس دلیل سے انکار نہیں کروں گی مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ بگ باس نے میری سفارش پر تمہیں

خدمت کا ایک موقع دینے سے انکار بھی نہیں کیا۔"

"اور میں نے بھی تمہاری سفارش کا بھرم رکھنے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا کر کامیابی حاصل کی ہے۔ بگ باس کی توقع کے عین مطابق میں نے اس کے دشمن کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ اب نظریں اونچی کر کے بات کر سکے۔" اس نے مایوسی کا اظہار کیا۔ "تم شاید اس وقت مجھ سے میری کامیابی کا ثبوت حاصل کرنے آئی ہو؟ اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم بھی یقین سے نہیں کہہ سکتیں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ حالات نے تمہیں منفی سوچوں میں الجھا رکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں تم سے ضروری چیزیں لینے آئی ہوں لیکن تمہیں اس بات کا یقین بھی دلا سکتی ہوں کہ موجودہ کامیابی کے بعد بگ باس تمہیں......"

"کچھ کہنے سے پہلے وہ چیزیں مجھ سے لے لو۔" افضل خان نے حساس کیمرا جیب سے نکال کر شبنم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی سودے بازی کروں۔ تم نے مجھے کچھ دن زندگی کی ضمانت دے کر جو مہربانی کی تھی اسے اس کا بدل سمجھ لو۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں...... میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کسی سے کچھ بارگین کر سکوں۔"

"تمہیں چوبیس گھنٹے بعد یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔ جو لوگ سینہ تان کر سامنے آرہے تھے، اب انہوں نے پولیس تک جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ باس نے تمہاری آزادی کا پروانہ بھی جاری کر دیا ہے۔"

"اس میں بھی تمہاری سفارش کا دخل ہوگا؟"

"ہاں ...... اور میری ہی سفارش پر تمہارے لیے کچھ ضروری رعایتیں بھی دی گئی ہیں۔" شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "یہاں سے باہر نکل کر تم کسی بھی ہوٹل میں کچھ دن سکون سے رہ سکتے ہو، حالات کا رخ دیکھنے کے بعد تمہاری کسی معقول رہائش کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ تمہارے اخراجات تمہیں کسی نہ کسی طرح سے ملتے رہیں گے۔"

"اس کے بعد......؟"

"ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنا پڑے جس کا کوئی تعلق کسی بھی طرح بگ باس سے نہیں ہوگا۔ ساری مراعتیں تمہیں ملتی رہیں گی، البتہ جب تک باس کی اجازت نہ ہو تم اس سے بالکل الگ تھلگ رہو گے۔"

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خالی خالی نظروں سے شبنم کو دیکھتا رہا جو کل تک اس کے ایک اشارے پر کسی کٹھ پتلی کی طرح عمل کرنے پر مجبور تھی۔ آج وہی پوزیشن افضل خان کی تھی۔

"خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟"

"یہاں سے نکلنے کے بعد کیا میں تم سے آزادی سے مل جل سکتا ہوں؟"

"اس پر فی الحال کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی۔" اس نے شانے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ "تم میرے فلیٹ پر، میرے ساتھ رہ چکے ہو۔ اس کا علم بگ باس کے علاوہ مختلف ایجنسی کے لوگوں کو بھی ہے۔"

"یقیناً ہوگا...... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان سے کوئی سر پھرا ہی بگ باس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کر سکے گا۔"

"تمہارے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ جو کچھ مل رہا ہے اسی پر قناعت کرو...... کل کیا ہوگا؟ اس کے لیے تمہیں وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

شبنم نے افضل خان کا دیا ہوا حساس کیمرا اپنے بیگ میں رکھا پھر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ رقم تمہارے کام کا معاوضہ نہیں...... صرف انعام کی ایک قسط ہے۔"

"میرے اوپر کچھ پابندیاں بھی ضرور عائد ہوں گی؟"

"کوئی خاص نہیں...... لیکن تمہیں اپنے ماضی کی طرح اب بھی ان تمام معاملات میں محتاط رہنا ہوگا جسے باس پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا، تم عقل مند ہو اور تجربے کار بھی...... میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے؟"

"ٹھیک ہے......" افضل خان نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ "میں باس کی نظروں سے گرنے کے بعد بھی اس کا وفادار رہوں گا۔"

"میں اب چلتی ہوں۔" شبنم نے کہا پھر جاتے وقت بھی اس نے افضل خان کو ایسی ہی نظروں سے دیکھا جیسے اسے سمجھانا چاہ رہی ہو کہ...... میری طرف سے بدگمان نہ ہونا...... کچھ مجبوریاں مجھے بھی لاحق ہیں جنہیں فوری طور پر پھلانگنا میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔

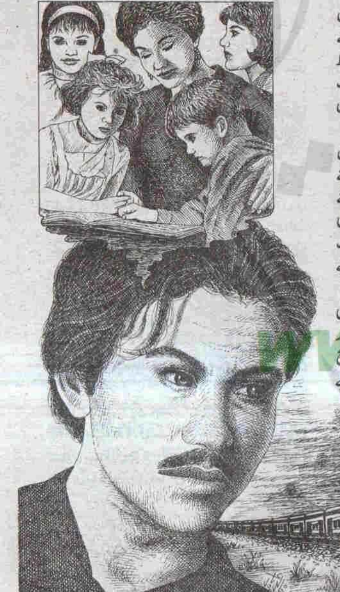
اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

پرعزم حوصلے اور سچے خیالات سے گندھی ایک مفلس کی روداد

بزنس فیملی

مختار آزاد

"جس نے دیا کوڑا... وہی دے گھوڑا" یعنی جس خدا نے تھوڑا دیا وہی زیادہ بھی دے گا... یہ ضرب المثل اگرچہ سادہ سی ہے مگر اپنے اندر ایک بڑی حقیقت پوشیدہ رکھتی ہے۔ اسی سطح پر سوچتے ہوئے جب اس نے بھی اس راز کو پالیا تو قطرہ قطرہ سمندر جمع کرتا رہا مگر جانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اب بھی بوند بوند کو ترس رہا ہے... اس کے باوجود وہ اسی محاورے پر عمل پیرا رہا حتیٰ کہ... کامیابی اس کے قدم چومنے کو بے تاب ہو گئی۔



اس بار گرمیوں میں ہم سمجھے تھے کہ چلو پاپا کی بے روزگاری کا خاتمہ ہو گیا، اب ہمارے گھر کے دن بھی پھرنے والے ہیں۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ انہیں قصبے کے اُن تین پرانے بے روزگاروں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا جن کے نام بے روزگاری وظیفہ حاصل کرنے کے لیے ضلعی انتظامیہ کو بھجوائے جانے تھے۔ سب ہی خوش تھے مگر بہت جلد ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ کیونکہ انتظامیہ نے فہرست موصول ہو جانے کے بعد قصبے کی انتظامیہ کو وظیفے کی رقم کے بجائے ایک خط بھجوا دیا اور تینوں نامزد بے روزگاروں کو اس خط کی ایک ایک نقل بھی ارسال کر دی تا کہ یہ بات یقینی ہو سکے کہ وہ تینوں ان کی طرف سے کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔

وہ خط کیا تھا، ارمانوں کا دھڑن تختہ تھا جس میں انتظامیہ نے نہ صرف وظیفہ دینے سے معذرت کی بلکہ اپنے وسائلوں کا رونا بھی رو دیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ دو سال ہو گئے ہیں، اس فنڈ میں تو ایک پائی بھی نہیں ہے۔ ریاستی انتظامیہ کی اس جانب بارہا توجہ دلوائی گئی مگر ایک پھوٹی کوڑی بھی اب تک نہیں مل سکی ہے۔ اگر فنڈز فراہم ہونے تک یہ تینوں بے روزگار رہے تو تصدیق کر کے وظیفہ جاری کر دیا جائے گا۔

وظیفہ ملنے کا یہ مرحلہ کب آئے گا، خط میں اس بات کی کوئی یقین دہانی نہیں کروائی گئی تھی۔ بس ایک امید تھی۔ اگر امید پہ دنیا قائم رہنے کا مقولہ سچا ہے تو ہمیں اسے مزید سچ ثابت کر دکھانا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پاپا اپنی بے

روزگاری پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہتے اور ہم ہر رات کھانے سے پہلے جہاں خدا کا شکر ادا کرتے تھے وہیں اب ریاستی انتظامیہ کے لیے بھی دعا گو ہو جاتے کہ خدا انہیں فنڈز جاری کرنے کی استطاعت عطا فرمائے مگر صرف دعا سے کام کہاں چلتا ہے، کچھ ہاتھ پیر بھی ہلانے پڑتے ہیں۔ یہ بات ہمارے نہیں پاپا کے سمجھنے کی تھی۔

ضلع انتظامیہ کے روح فرسا خط نے ہم بچوں پر تو مایوسی طاری کی ہی تھی مگر سب سے زیادہ پریشان مما تھیں۔ وہ تو بھلا ہو اُس پیپر مِل والوں کا جہاں وہ پارٹ ٹائم سیکریٹری کے طور پر کام کرتی تھیں۔ مما کی تنخواہ ہماری ضروریات کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی مگر پھر بھی کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہی تھی۔

اِدھر ہمیں ضلعی انتظامیہ کا معذرت خواہانہ خط ملا، اُدھر مما کی ترقی ہو گئی۔ پیپر مِل والوں نے ان کی کارکردگی دیکھتے ہوئے ترقی دے دی تھی جس کے نتیجے میں تنخواہ بھی بڑھ گئی اور کچھ دیگر مراعات بھی مل گئی تھیں۔ البتہ اب انہیں سارا دن وہیں گزارنا تھا۔ پاپا نے پیشکش کی تھی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں گھر سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔ دکھ اور خوشی کے لمحات ہماری زندگی میں آگے پیچھے آئے تھے۔

وظیفے کی امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کے بعد مما کی ترقی سے پاپا کو کچھ حوصلہ ملا۔ انہوں نے دل میں ٹھان لیا کہ اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کچن ٹیبل پر قابلِ ادائیگی یوٹیلٹی بلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو گھٹنے کے بجائے ہر ماہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مما کی تنخواہ میں ان بلوں کی ادائیگی ممکن نہیں تھی۔ اوپر سے دوستوں کے قرضے الگ تھے۔ ہم سب اچھی طرح جانتے تھے کہ گھر پر مالی بحران کا بدترین سایہ ہے۔ سو ان حالات میں ایک دن پاپا کے کام کرنے کے فیصلے پر عملدرآمد کی گھڑی آ ہی گئی۔

"ہم بہت پریشانی میں گھر گئے ہیں اور اس سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ کام کریں اور ہم سب مل کر کام کریں۔" مما کے پیپر مِل چلے جانے کے بعد پاپا نے ہم سب کو پورچ میں جمع کیا اور سامنے کھڑے ہو کر کمانڈر کی طرح تقریر شروع کر دی۔ "ہم پر بہت قرض چڑھ چکا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں کی بے روزگاری کے باعث بہت کچھ فروخت کیا جا چکا ہے اور اب ہماری بقا کا سوال ہے۔ جو کچھ چلا گیا، جو کچھ ہم سے چھن گیا، اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے۔"

"تو ہم کیا کریں؟"

"بہت اچھا سوال ہے۔" پاپا نے میرے چھوٹے بھائی ٹونی کا سوال سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے خاندان کی بقا کا معاملہ ہے اور تم سب کو اسی طرح سوچنا چاہیے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک لمحے کی خاموشی اختیار کی اور ہم سب کے چہروں کو گہری نظروں سے تکتے رہے۔ "کام کرنا ہوگا، ہم سب کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ ان تھک محنت ہماری مجبوری ہے۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایک بار پھر پرانی بات دہرائی۔

"مگر کیا کام......؟" ٹونی نے پھر پوچھا۔

"بُرے حالات سے نکلنے اور پیسے کمانے کے لیے ہم اپنا فیملی بزنس شروع کرنے جا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہم سب پر طائرانہ نظر ڈالی۔ "اور تم سب اس فیملی بزنس میں کام کرو گے۔"

میں بے دلی سے ان کی تقریر سن رہی تھی۔ "سنو سوزی......" پاپا نے مجھے پکارا۔ "تم میرے اور اپنی مما کے بعد اس گھر کی سب سے سینئر ممبر ہو۔ تمہیں زیادہ ذمے داری سے فیملی بزنس میں کام کرنا ہوگا۔" انہوں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"کوشش کروں گی۔" میں نے بے دلی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ یہ کہتے ہوئے میری نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ عمر کا تیرھواں سال شروع ہوئے تین دن گزرے ہیں۔ دو سال سے سالگرہ منائے بغیر کیا کوئی بچی اتنی جلدی بڑی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے ذمے دار فیملی ممبر کہنے لگے۔

میرے پاپا فراغت پسند نہ تھے۔ دو برس پہلے وہ بھی قصبے کی ایک پیپر مِل میں کام کرتے تھے مگر چند وجوہات کی بنا پر مِل مالکان نے اسے بند کر دیا۔ یوں بے روزگار ہونے والے کافی سارے لوگوں میں سے ایک پاپا بھی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی جگہوں پر ملازمت کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں مما کو پارٹ ٹائم سیکریٹری کی ملازمت مل گئی۔ وہ خوش تھیں کہ اس بہانے بچوں کو صحت اور انشورنس کی سہولتیں مل جائیں گی۔ یوں ہم پاپا کی بے روزگاری کے اُن دنوں میں شدید بحران کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے مگر پھر بھی کئی ایسے مسائل تھے جو ان کی بے روزگاری کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

ہم دریا کے کنارے نہایت خوبصورت بنے ایک چھوٹے سے فارم ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہ گھر میرے دادا نے بنایا تھا جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہاں ہمارا راج تھا۔ گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا اور گھنا جنگل تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ سرکاری ملکیت میں تھا اور اسے نیشنل پارک قرار دے دیا گیا تھا۔ ہم نے کئی بار وہاں محکمۂ جنگلات کے

فاریسٹ گارڈز آتے جاتے دیکھے تھے۔ ہمارے گھر کے اردگرد کے حسین قدرتی منظر کی وجہ سے لوگ اسے جنت کا ٹکڑا کہتے تھے۔ واقعی یہ تھا بھی مگر پاپا کی بے روزگاری نے اس کے اندر جہنم بھی بنا دیا تھا اور کئی اخراجات تھے جن کے باعث ہم پر قرضہ بڑھ گیا تھا۔ اب ان سب حالات سے نمٹنے کا یہی طریقہ تھا کہ ہم کام کریں۔

جب سے پاپا بے روزگار ہوئے تھے اور مما سارا دن پیپر مِل میں کام کرنے لگی تھیں، تب سے پاپا بہت ہی زیادہ ذمے دار ہو گئے تھے۔ آتشدان میں جلانے کے لیے لکڑی کاٹنا، گھر کی مرمت، ہم بچوں کی ورزش، گھمانا پھرانا...... اس طرح کے کئی اور کاموں سے مما کی جان چھوٹ چکی تھی۔ پاپا کی اسی لگن کی وجہ سے جب وہ شام کو گھر لوٹتیں تو کئی کام ایسے تھے جو انہیں کرنا نہیں پڑتے تھے۔ یہ بات ان کے لیے سکون کا باعث تھی مگر پھر بھی شوہر کی بے روزگاری کی تلوار ان کے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔

جس وقت پاپا اپنے پرانے منی ٹرک کا انجن آئل تبدیل کرنے کے بعد پورچ میں کھڑے ہو کر ہم سب کو کام کرنے اور اپنے پرانے فیملی بزنس کو شروع کرنے کے بارے میں بتا رہے تھے، اس وقت میں یہی سوچ رہی تھی کہ چلو بہتر ہے، اس طرح پاپا گھر پر ہی رہیں گے اور ہم سب کو بھی کچھ کر دکھانے کا موقع مل جائے گا۔ ویسے بھی پاپا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں گھر کی سب سے بڑی اولاد تھی اور شاید اسی وجہ سے مجھے گھر کے مالی مسائل کا زیادہ اچھی طرح اندازہ تھا۔ ویسے اُس وقت میری عمر صرف تیرہ برس تھی۔

"تو ساری بات سمجھ آ گئی نا۔" انہوں نے ہم سب کو اپنا منصوبہ سمجھانے کے بعد کہا۔

"جی ہاں۔" ہم سب یک زبان ہو کر بولے۔

"سوزی......" انہوں نے میری طرف چہرہ کیا۔ "تمہیں میرے ساتھ بازار بھی جانا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس بار میں نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ پاپا کے ساتھ بازار اور گھر گھر جا کر اپنی تیار کردہ مصنوعات کی فروخت کا مطلب یہ تھا کہ میرا شوق بھی پورا ہوگا۔

شام کو مما نے اسپیگیٹی بنائی تھی۔ اُس وقت مما کو پتا نہیں تھا کہ پاپا کیا کرنے جا رہے ہیں۔ "میں چاہتا ہوں کہ ایک بار ہم وہ بات کریں جو آج دن میں، پورچ میں کھڑے ہو کر کی تھی۔" پاپا نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا۔

رخصتی

ایک دلہن جب رخصت ہونے لگی تو وہ اپنے عزیزوں سے گلے مل مل کر رو رہی تھی۔ یکایک دولہا بھی رونے لگا۔ ایک دوست جو پاس کھڑا تھا گھبرا کر بولا۔ "یار دلہن تو اپنے عزیزوں سے بچھڑنے پر رو رہی ہے تم کیوں رو رہے ہو؟"

دولہا روتے ہوئے بولا۔ "میں بھی اپنے غم پر رو رہا ہوں کیونکہ اس کے جاتے ہی میرے عزیز بھی بچھڑ جائیں گے۔"

مرسلہ: محمد آصف ساجد، ارزانی پور قصور

"کیا بات ہے؟" مما برتن اٹھا رہی تھیں۔ یہ سن کر وہ چونک گئیں۔

"ہم اپنا پرانا فیملی بزنس شروع کرنے جا رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ واقعی تم کام کرنے کو تیار ہو۔" مما نے قطع کلامی کی اور حیرت و استفساریہ نگاہوں سے انہیں گھورا۔

"ظاہر ہے، اب بے روزگاری کے وظیفے کی امید میں غیر معینہ مدت کے لیے بیکار تو نہیں رہ سکتا۔" انہوں نے ناگوار انداز سے مما کو دیکھا۔ "اگر بچوں کو کچھ بتایا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ کام ہی کرنے جا رہا ہوں۔"

"کیا کام کرو گے؟" مما نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ان کا انداز طنزیہ تھا۔

"بتایا تو ہے اپنا پرانا فیملی بزنس۔"

"ذرا کھل کر بتاؤ کیا بات ہے؟" اس بار وہ تھوڑا سا سنجیدہ نظر آئیں۔

"تو سنو۔" یہ کہہ کر پاپا نے وہ تقریر ایک بار پھر دہرا دی جو ہم دن میں سن چکے تھے۔

"بات تو ٹھیک ہے، ہم یہ کر سکتے ہیں۔" مما نے ان کے خاموش ہوتے ہی پُرجوش انداز میں کہا۔ اب لگ رہا تھا کہ وہ بات جسے پہلے وہ مذاق سمجھ رہی تھیں، وہ ایک حقیقت ہے۔

"جانتا ہوں۔" اس بار پاپا کا لہجہ فخریہ تھا۔ "اب ہم سب کو ایک ساتھ مل کر کڑی محنت کرنا ہوگی۔" وہ مما کو مرعوب دیکھ کر خود کو فاتح سمجھ بیٹھے تھے۔

"جانتی ہوں۔" مما نے جواب دیا اور میں نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔

دوسرے دن پاپا کے پرانے فیملی بزنس کا ایک بار پھر افتتاح ہو گیا۔

صبح سویرے میں اور پاپا جنگل گئے، جہاں سے پائن ٹری کی کچھ پرانی ڈنٹھلیں جمع کیں۔ مختلف اقسام کے جنگلی پھول اکٹھا کیے۔ جنگلی بیریاں توڑیں اور جب گھر پہنچے تو مما بازار سے سیب اور چیری لاکر انہیں کاٹ چکی تھیں۔ اس مقصد کے لیے مما نے مل سے ایک دن کی اتفاقیہ رخصت لی تھی۔ دوپہر کو میں اور پاپا شہر گئے اور تھوک میں دس درجن شیشے کی بوتلیں لے آئے۔ سرمایہ کاری اور تیاری کے مراحل گزر چکے تھے۔ اب ہمیں پھلوں کا مربا تیار کرنا اور پھر اسے بوتلوں میں بھر کر بازار لے جاکر بیچنا تھا۔

پاپا نے جنگل سے جمع کی گئی تمام چیزیں، سیب اور چیری کاٹ کر ایک بڑے سے پتیلے میں ڈالیں۔ ان میں ایک شہد کی بوتل اور کافی ساری چینی انڈیلی اور پھر اس ملغوبے کو اچھی طرح ملا دیا۔ اس کے بعد پتیلے کا ڈھکن بند کرکے اس کے منہ کو گیلی مٹی سے پیک کردیا۔ اس ساری کارروائی میں، میں پاپا کی مددگار تھی۔

''تیاری کا یہ طریقہ اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔ یہ ہمارا فیملی بزنس ہے۔'' انہوں نے پتیلے کے چاروں طرف تھوڑی جگہ چھوڑ کر لکڑیاں چنتے ہوئے کہا۔ ''ویسے یہ ترکیب کسی کتاب میں نہیں ملنے والی۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے فخریہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے کافی کچھ سمجھ آگیا ہے۔'' مجھے اندازہ تھا کہ پاپا کو یہی جواب سننے کی توقع تھی۔

''شاباش......'' انہوں نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا اور لکڑیوں کو آگ لگادی۔ ''اب یہ آگ ساری رات یونہی جلتی رہے گی اور اس سے پتیلے کے اندر کی چیزیں ایک خاص درجۂ حرارت پر پکتی رہیں گی۔''

''ساری رات......؟'' میں نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔

''ہاں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''صبح ہم پتیلے کا ڈھکن کھولیں گے تو اس وقت بھی یہ گرم ہوں گی۔ بس! اُس کے بعد ہمارا مربا تیار۔''

وہ شام ہم سب کے لیے تجسس سے لبریز تھی۔ مما بھی بہت خوش تھیں۔ ڈنر کے بعد ہم سب قالین پر بیٹھے لیبل لکھ تیار کررہے تھے:

''ہیری کا ہاتھوں سے تیار کردہ مربا۔''

لیبل لکھنے کے بعد مما نے انہیں بوتلوں پر چسپاں کرنا شروع کردیا۔ ''کتنی بوتلیں کافی رہیں گی؟'' انہوں نے اچانک ہاتھ روک کر پوچھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ دو درجن بوتلوں سے زیادہ کا مال ہے۔''

''اوکے۔'' یہ سن کر مما نے بوتلوں کی گنتی شروع کردی۔

''یہ چالیس تو تیار ہوچکی ہیں۔''

''کافی ہوں گی اس مال کے لیے۔'' پاپا بھی لیبل لکھ رہے تھے مگر یہ سنتے ہی انہوں نے ہاتھ روک دیا۔ ''اب تم لوگ بھی اٹھو اور جاکر سوجاؤ۔ کل صبح بہت کام کرنا ہے۔'' انہوں نے ہم بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد مما تو کام پر چلی گئیں اور پاپا مجھے لے کر وہاں آگئے جہاں پتیلے میں مربا پک رہا تھا۔

آگ بجھ چکی تھی۔ چاروں طرف سفید راکھ نظر آرہی تھی۔ پاپا نے پتیلے کو ہاتھ لگایا۔ ''کافی گرم ہے۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

پاپا اور میں نے پتیلے کو کپڑے سے پکڑ کر اٹھایا اور کچن میں لاکر رکھ دیا۔ ''یہ دوپہر تک یونہی رکھا رہے گا۔'' انہوں نے کہا اور پھر باہر جاکر راکھ صاف کرنے لگے۔

لنچ کے بعد پاپا نے ہم سب کو جمع کیا اور پتیلے کے ڈھکن کو بند کرنے کے لیے لگائی گئی مٹی کو کھرچ کھرچ کر اتارنا شروع کردیا۔ رات بھر آگ کی تپش لگنے سے وہ سرخ پڑ چکی تھی۔ رات والی گیلی مٹی اب ٹھیکروں کی شکل میں ٹوٹ کر فرش پر گر رہی تھی۔

''یہ دیکھو۔'' ڈھکن اتارنے سے پہلے انہوں نے ہم سب کو مخاطب کیا۔ پاپا نے جیسے ہی پتیلے کا ڈھکن اٹھایا تھا، کچن میں بہت شاندار مہک پھیل گئی۔ ہم سب پتیلے کے گرد جمع ہوکر حیرت سے اندر جھانکنے لگے۔

''ہے نا بڑھیا مال۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر شہادت کی انگلی پتیلی میں ڈال کر مربا نکال کر چکھا اور کافی دیر تک چٹخارے لیتے رہے۔ ''واہ...... کیا خوب ذائقہ ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''لو...... تم بھی لو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر پتیلی میں انگلی گھمائی اور تھوڑا سا مجھے چٹایا۔

''واقعی۔'' میں نے منہ میں گول گول زبان گھماتے ہوئے کہا۔

''اب سب تیار ہوجاؤ۔ ہمیں اسے بوتلوں میں بھرنا ہے۔'' پاپا نے حکم صادر کیا۔

دو تین بوتلیں تو انہوں نے خود بھریں۔ یہ ایک طرح سے ہمارا تربیتی کورس تھا کہ بوتلیں اس طرح بھری جائیں۔

اس کے بعد وہ پاؤں پسار کر کرسی پر بیٹھ گئے اور سگار پینے لگے۔ ہم سب بہن بھائی بوتلیں بھرنے لگے۔ کبھی کبھار کوئی پاپا کی نظر بچا کر مربے پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرتا تو وہ وہیں سے زوردار انداز میں ''اونہوں'' کہہ کر اسے کارروائی سے روک دیتے۔

تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کے اندر بوتلیں بھری جاچکی تھیں۔ ایک پتیلے سے چالیس بوتلیں بھری گئی تھیں۔ پاپا کا خیال تھا کہ مال ان کے اندازے سے زیادہ بنا ہے۔ اس وجہ سے وہ اور بھی خوش تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے مجھے اور پاپا کو یہ مال لے کر فروخت کے لیے نکلنا تھا۔

صبح ناشتا کرنے سے پہلے پاپا نے مربے کی بوتلیں اپنے منی ٹرک کے پیچھے لادیں۔ ناشتے کے بعد ہم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ہم اوریگن میں واقع بلینگ اسٹیٹ کی طرف جارہے تھے جہاں ہمارے خیال میں خاصے مال دار لوگ بستے ہیں۔ پاپا کا خیال تھا کہ شہروں کی تیز رفتار زندگی سے بھاگ کر یہاں بڑے بڑے محل نما مکانوں میں بسنے والے لوگ ہاتھ سے بنے مربے کے لیے سب سے بہترین گاہک ثابت ہوں گے۔

راستے میں ٹرک کا ایک ٹائر پنکچر ہوگیا۔ جتنی دیر میں پاپا ٹائر بدلتے، میں نے سامنے والے گارڈن سے بہت سارے پھول توڑ لیے اور راستے میں ان پھولوں کے چھوٹے چھوٹے گلدستے بنانے لگی۔

''ان کا کیا کروگی؟'' انہوں نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

''بوتل خریدنے والے ہر گاہک کو بہ طور تحفہ دوں گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اوریگن میں رہنے والوں کے پاس قدرتی نظاروں اور پھولوں کی کمی ہے؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے جھٹ سے کہا۔ ''لیکن ہوسکتا ہے وہاں رہنے والوں کو پھولوں کا تحفہ دینے والوں کی کمی ہوتی ہو۔''

''مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''ہوسکتا ہے آجائے۔'' میں ہنس دی۔

''ارے لو...... بس ہم پہنچ ہی گئے۔'' پاپا نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔

اوریگن اسکاٹ لینڈ کا بہت خوبصورت مضافاتی علاقہ ہے۔ یہاں کے قدرتی نظارے انسان کو تر و تازہ کردیتے ہیں۔ شاید اسی لیے بہت زیادہ دولت کما کر لوگ باقی زندگی چین سے بسر کرنے یہاں آجاتے ہیں، تبھی تو وہاں خاموشی کا راج تھا۔ ہر طرف سکون اور سناٹا تھا مگر اس میں خوف نہیں لطف تھا۔

''اے سوزی...... چلو یہ بوتلیں اٹھانے میں میری مدد کرو۔'' میں ٹرک سے باہر نکل کر ماحول سے لطف اندوز ہورہی تھی کہ پاپا نے پکارا۔ وہ ٹرک کے پچھلے حصے پر سے میز اتار رہے تھے۔

''آرہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں بھی ان کی طرف لپکی۔

یہ ایک بڑا سا، اونچا نیچا، چھوٹی چھوٹی ڈھلوانوں والا سرسبز میدان تھا جہاں اوریگن کا ہفتہ وار بازار لگتا تھا۔ ہر سنیچر کو لگنے والے اس بازار میں عام طور پر جو لوگ اپنی چلتی پھرتی دکانیں سجاتے تھے، وہ کوئی باقاعدہ دکان دار نہ تھے بلکہ پارٹ ٹائم کے طور پر یہ کام کرتے تھے۔ اس بار ہم بھی اُن میں شامل تھے مگر پاپا کا کہنا تھا کہ ہم میں اور اُن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ہمارا فیملی بزنس ہے جبکہ وہ لوگ ایسے نہیں۔

بازار میں طرح طرح کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ گھریلو مرغیوں کے انڈے، گھر پر بنائے گئے بسکٹ، کیک، دستکاری کے نمونے، آرائشی اشیا، پرانی چیزیں، گھر کے فارم پر اُگی تازہ سبزیاں، نوادرات، پرانی تصاویر، کتابیں اور اسی طرح کی چیزیں فروخت ہورہی تھیں۔ یہ سب عارضی دکانیں دو رویہ تھیں۔ 'پہلے آؤ، پہلے پاؤ' کی بنیاد پر جگہ ملتی تھی۔ ہمیں بازار کے شروع کے حصے میں جگہ مل گئی تھی۔

پاپا نے میز لگا کر میز پوش بچھایا اور نہایت سلیقے سے ساری بوتلیں اس پر سجادیں۔ بوتلیں اس رخ رکھی تھیں کہ سامنے سے ان پر لگا لیبل صاف نظر آرہا تھا۔ ''ہیری کا ہاتھوں سے تیار کردہ مربا۔''

میز پر بوتلوں کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے گلدستے رکھے ہوئے تھے۔ ہم یہاں سب سے پہلے پہنچنے والے گنتی کے چند دکان داروں میں شامل تھے۔ پاپا نے عارضی دکان کھول لینے کے بعد فولڈنگ کرسیاں کھولیں اور ہم مزے سے بیٹھ کر گاہکوں کی راہ تکنے لگے۔ صبح صبح کا وقت تھا اور وہ بھی ہفتہ وار تعطیل کا۔ امید تھی کہ نو بجے سے پہلے گاہک بازار کا رخ نہیں کریں گے۔ اُس وقت آٹھ بج کر دس منٹ ہورہے تھے۔

''یہ لو۔'' پاپا نے ٹانگیں پھیلا کر کرسی کی پشت سے کمر ٹکاتے ہوئے میری طرف چاکلیٹ بڑھائی۔ ''میں ذرا

ستالوں۔ تم دکان کا خیال رکھنا۔" یہ کہہ کر انہوں نے دھوپ سے بچانے کے لیے تنکوں کے ہیٹ سے چہرہ ڈھانپ لیا اور نیند کے مزے لینے لگے۔

بہت خوش گوار صبح تھی۔ موسم گرمیوں کا تھا لیکن اس پہاڑی وادی میں گرمیوں کی دھوپ بھی اوس میں نہا کر نکلی تھی اس لیے ہلکی سی خنکی بھی تھی جو آہستہ آہستہ چلتی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ مل کر جسم سے ٹکراتی تو ایسا لگتا جیسے کسی نے بدن میں گدگدی کر دی ہو۔ میں بڑے مزے سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے، ماحول سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پاپا کے ساتھ دو پیسے کمانے کے لیے کام پر نہیں بلکہ تفریح کرنے آئی ہوں۔ اسکول میں میرا پسندیدہ مضمون لٹریچر تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اس بار ٹیچر نے مضمون لکھنے کو دیا تو میں اس تجربے پر مضمون لکھوں گی۔

دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ بازار کی رونق عروج پر تھی لیکن ہم اپنی دکان بڑھا رہے تھے۔ پاپا کا خیال بالکل ٹھیک نکلا کہ گاہک نو بجے سے پہلے نہیں آئیں گے، اسی لیے انہوں نے بھی صبح جلدی اٹھنے کی کسر یہاں سو کر پوری کر لی تھی۔ اِدھر بازار میں گاہکوں کا رش بڑھا، اُدھر پاپا کی آنکھ بھی ایسے کھلی جیسے اُن کے کان پر گھڑی رکھ کر پوری آواز میں الارم بجا دیا گیا ہو۔

شروع شروع میں تو گاہکوں نے ہمارے اسٹال پر کچھ خاص توجہ نہ دی مگر اسی دوران ایک بوڑھا جوڑا آیا۔ بڑی بی نے بوتل لی اور خریدنے سے پہلے اجازت چاہی کہ کیا وہ کھول کر اسے چکھ سکتی ہیں۔ پاپا نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور مربا انگلی پر لگا کر چاٹا تو فوراً دو بوتلیں خرید لیں۔

پاپا بہت خوش تھے کہ ایک گاہک نے صرف چکھ کر دو بوتلیں خرید لیں۔ "دیکھا، یہ ہے ہمارے خاندان کی وہ ترکیب جو کسی مربا بنانے والے کے پاس نہیں۔" انہوں نے نوٹ واسکٹ کی جیب میں اُڑستے ہوئے کہا۔ "ہماری کامیابی کی پہلی سیڑھی مبارک ہو۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔

پہلے گاہک کے جانے کے بعد تو گاہکوں کی بھیڑ لگ گئی۔ پاپا نے ایک بوتل کھول کر صرف چکھنے کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ جو آتا، وہ مربا چکھتا تو مفت میں مگر اس کے بعد بوتل خریدے بغیر نہیں جاتا تھا۔ ڈھائی تین گھنٹوں میں ہی سارے کا سارا سامان فروخت ہو چکا تھا اور اب ہم جا رہے تھے دکان سمیٹ کر اپنے گھر۔

"برگر کھاؤ گی؟" دوپہر کا ایک بجنے والا تھا جب پاپا نے ایک جگہ ٹرک روکتے ہوئے کہا۔ سامنے فاسٹ فوڈ ریستوران نظر آ رہا تھا۔

"کیوں نہیں، آپ کو بھی تو بھوک لگ رہی ہوگی۔" میں نے شرارتی لہجے میں کہا تو وہ ہنس دیے۔

برگر بڑے مزے کا تھا۔ میں تو لطف لے لے کر کھاتی رہی مگر پاپا کھانے سے پہلے نوٹ گنتے رہے۔ برگر آ گیا، تب بھی وہ کھانے کے ساتھ ساتھ اپنی چھوٹی نوٹ بک پر حساب کتاب کرتے رہے۔ ان کے چہرے کی خوشی بتا رہی تھی کہ سودا منافع بخش رہا۔

"تجربہ بہت ہی شاندار رہا۔" آخر انہوں نے نوٹ بک اور پین جیب میں رکھا اور برگر اٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "اب اس تجربے کی روشنی میں ہمیں مال کی تیاری بڑھانی ہوگی، جس کا مطلب ہے اور زیادہ منافع۔" وہ اپنے ٹرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے مگر میرا پورا دھیان برگر کی طرف تھا۔

آج کے تجربے سے مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ پاپا کام جتنا چاہے بڑھا لیں، مجھے پروا نہیں۔ میں تو پہلے ڈر رہی تھی کہ پاپا کے فیملی بزنس میں نہ جانے کتنا سخت کام کرنا پڑے گا مگر اب سمجھ میں آ گیا کہ یہ کام تو مزے کا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میرے چھوٹے کاہل بھائی ٹونی کو پتا چل گیا کہ یہ کام اتنے مزے کا ہے تو کہیں اگلے ہفتے دکان پر وہی پاپا کے ساتھ نہ ہو۔ اس لیے میں نے اپنی نوکری پکی کر لینی چاہی۔

"پاپا، میں ہی آپ کے ساتھ کام پہ آیا کروں گی۔" میں نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں، تمہیں تو اب تجربہ بھی ہو گیا ہے۔" انہوں نے خوشی خوشی ہامی بھر لی۔

اُن کے جواب کے بعد میں پاپا کے فیملی بزنس کی تجربہ کار ممبر بن گئی تھی۔

ہم لوٹے تو مما بھی گھر پر تھیں۔ اُن کی ہفتہ وار چھٹی تھی اور وہ بے چینی سے اس بات کی منتظر تھیں کہ پاپا کے فیملی بزنس کا تجربہ کیسا رہا۔ ٹرک کی آواز سنتے ہی وہ باہر نکل آئیں۔ پاپا کے خوشی سے دمکتے چہرے سے ہی وہ بھانپ گئی تھیں کہ سب کچھ بہت اچھا رہا۔ گھر پہنچ کر مما پاپا تو کچن کی میز پر بیٹھ کر حساب کتاب کرنے لگے اور میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

کئی مہینوں کے بعد وہ شام ہمارے گھرانے کے لیے پہلی پُرلطف شام تھی۔ آج پاپا لگ بھگ دو سال کے بعد پہلی بار کچھ اپنے ہاتھ سے کما کر لائے تھے۔ مما شام سے ہی کچن میں مصروف تھیں۔ جب ہم ڈنر کے لیے کچن میں پہنچے تو ہم سب بچوں کی پسند کی علیحدہ علیحدہ ڈشیں موجود تھیں۔ کھانے کے بعد مما نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا کیک نکالا۔

"تمہارے پاپا کی دو سال کے بعد پہلی کمائی کی خوشی میں۔" انہوں نے کیک پر چھری رکھ کر کہا اور ہم سب بچوں نے تالیاں بجا دیں۔

اس وقت پاپا کا چہرہ ایسے تمتما رہا تھا جیسے وہ مربے کی اُنتالیس بوتلیں بیچ کر نہیں آئے بلکہ اُنتالیس ملک فتح کر کے لوٹے ہوں۔ ویسے آپس کی بات ہے، انہیں خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ پچھلے دو سال کے دوران مما ان گنت بار لڑنے جھگڑنے کے دوران انہیں ہڈحرام کا طعنہ دے چکی تھیں اور اب خود ہی ان کی کمائی کا جشن منا کر گویا اپنے کہے پر معذرت کر رہی تھیں۔

میری ٹیچر کہتی تھیں کہ خوشی انمول ہے مگر نہ جانے کیوں اس وقت مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ خوشی پوری طرح انمول نہیں، اس کا کچھ مول بھی ہے، چاہے وہ مول مربے کی اُنتالیس بوتلیں ہی کیوں نہ ہوں۔

ہمارے چھوٹے سے گھر کی کھوئی ہوئی خوشیاں ایک بار لوٹ آئی تھیں۔ ہم پورے ہفتے تیاری کرتے رہے۔ اگلے ہفتے ہم سو بوتلیں مربا بیچنے گئے اور صرف تین گھنٹے میں وہ بک گئیں۔ اُس سے اگلے ہفتے دو سو بوتلیں تھیں مگر وہ بھی ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ پاپا کے فیملی بزنس نے ہماری فیملی کی ساری مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ میں اور دوسرے چھوٹے بہن بھائی اسکول سے واپسی پر پاپا کے ساتھ کام میں جُت جاتے اور پھر ہر سنیچر کو بازار کا رخ کرتے۔ دو تین مہینے میں ہی ہمارا کاروبار اچھا خاصا چل پڑا تھا۔ اب تو پاپا کو بھی دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ مما بھی ہسپتال سے واپسی کے بعد گھر کے کام نمٹاتیں اور پھر مربا بنانے کے کاموں میں پاپا کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کاروبار خوب چمک اٹھا تھا۔

ادھر گھر میں چار پیسے اور دو سال کی تنگدستی کے بعد ذرا خوش حالی آئی تو پاپا کے کاروباری ذہن نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اگر وہ اپنی ہفتہ وار دکان کو روزانہ میں بدل دیں تو کئی گنا زیادہ منافع ہو سکتا ہے۔ اس رات ڈنر کے بعد مما اور پاپا اسی موضوع کو لے کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے وہیں بٹھا لیا تھا۔

"خیال تو بہت اچھا ہے۔" مما نے تائید کی۔ "مگر ہم مال اتنی جلد کیسے تیار کر سکتے ہیں؟" یہ سن کر میں نے بھی پاپا کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"آج ہر چیز مشینی طور پر تیار ہو رہی ہے۔" پاپا نے اپنی تقریر شروع کی۔ "اب لوگ مشینی چیزیں استعمال کر کر کے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو ذائقہ روایتی ہاتھ کے طریقوں سے تیار کی گئی چیزوں میں ہوتا ہے، وہ مشین کے استعمال اور مدد سے تیار ہونے والی مصنوعات میں نہیں ہے۔ یہی دیکھ لو کہ ہمارا مربا ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے جو میں بتا چکا ہوں مگر......"

"لیکن اتنی زیادہ مقدار میں چیزیں تیار کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔" مما نے قطع کلامی کر کے پرانا سوال دہرایا۔

"یہی تو میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" پاپا نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "اب خاموشی سے میری پوری بات سنو۔" یہ کہہ کر انہوں نے پھر اپنی بات شروع کی۔ "بات یہ ہے کہ اب ہم مربے کے ساتھ ساتھ فارم کا قدرتی طور پر تیار کردہ شہد بھی فروخت کریں گے۔"

"مگر یہ آئے گا کہاں سے۔" مما نے حسب عادت پاپا کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر مداخلت کی۔ "ہمارا فارم تو بہت ہی چھوٹا ہے۔"

"یہ ہمیں پتا ہے گاہکوں کو نہیں۔" پاپا نے ذرا منہ بنا کر جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ہم بازار سے کم قیمت کا مربا اور شہد خریدیں گے۔ پھر شہد میں شیرہ ملا دیں گے، ساتھ ہی مربے میں کچھ کم قیمت پھل اور کچھ خودرو جنگلی بیریاں شامل کر کے انہیں ہلکا سا دم دے لیں گے۔ یوں ان کی مقدار بڑھ جائے گی اور لاگت کم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہم انہیں اپنے ہاتھ سے لکھے لیبل والی شیشے کی بوتلوں اور مرتبان میں بھر کر اپنے فارم کا برانڈ بنا کر بیچیں گے۔"

"اوہ......" پاپا کا منصوبہ سن کر مما نے سر پکڑ لیا۔ "یہ تو سراسر بے ایمانی ہے۔" وہ ناراض لگ رہی تھیں۔

"بھوکے مرنے سے تو اچھا ہے۔ ایمانداری میں صرف بے روزگاری ہی ملی ہے۔" پاپا نے جھٹ سے جواب دیا۔

"پھر بھی......"

"مجھے یہی کرنا ہے، سمجھ گئیں تم۔" انہوں نے مما کو دھمکانے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"تم جانتی نہیں ہو اس کام میں کتنا فائدہ ہے۔" پاپا نے لہجے کو نرم بناتے ہوئے کہا۔ "میں نے سارا حساب کتاب کر کے دیکھ لیا ہے۔ ایک روپیہ لاگت اور دو روپے

منافع۔'' انہوں نے ایک کاغذ مما کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''واقعی......'' یہ سن کر ان کی آنکھیں بھی حیرت کے مارے کھل گئی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ زیادہ منافع سن کر ان کی نیت اور رائے بھی بدل گئی تھی۔

''مگر وہ لیبل......'' مما نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہاتھ دکھ جاتے ہیں انہیں لکھتے ہوئے، ہم وہ چھپوا لیں گے۔''

''ہرگز نہیں۔'' پاپا نے جھٹ سے ان کی یہ خواہش مسترد کر دی۔ ''تم نہیں جانتیں کہ شہروں میں رہنے والے لوگ قصبوں کی سوغات کو ان کے ہاتھوں سے لکھے لیبل کی وجہ سے ہی خریدتے ہیں۔ ہاتھ کے لکھے لیبل اس بات کا تصدیق نامہ ہیں کہ یہ شے خالص ہے۔ مشینی چیزیں انہیں بے زار کر چکی ہیں۔''

''چلو...... ایسا ہے تو ہم سب مل جل کر لکھ لیں گے۔'' مما نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے سوزی اور میری ہینڈ رائٹنگ تو بہت ملتی ہے۔'' مما کی تجویز سن کر تو میری جان نکل گئی۔ ویسے بھی لیبل لکھنا مجھے بیزار کر دیتا تھا۔

''ہم لیبل کی تحریر بھی بدل دیں گے۔'' پاپا نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''اب اُس پر لکھیں گے:

''ہیری فارم کا تیار کردہ خالص قدرتی شہد اور مربا۔''

''لیبل ہی کیوں بوتل کا ڈیزائن بھی بدل دیں۔'' مما نے تجویز دی۔

''مگر وہ کیوں؟'' پاپا نے تیوری پر بل چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ جب لوگ مشینی انداز سے عاجز ہیں تو وہ اُن بوتلوں کو ناپسند کریں گے جو ہم ابھی استعمال کر رہے ہیں۔''

مما کی بات سن کر وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور پھر کہنے لگے۔ ''یہ اچھی تجویز ہے مگر یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہ آئی۔''

''مما میں جا رہی ہوں۔'' میں یہ سب سن سن کر بے زار ہو چکی تھی۔ اس لیے اٹھ کر سونے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔

دوسرے دن سے گھر میں بڑے پیمانے پر بڑے کاروبار کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ مما نے پیپر مل سے پانچ دن کی چھٹی لے لی تھی۔ مما اور پاپا زور و شور سے شہد اور مربا بنانے میں جتے ہوئے تھے اور میں اسکول چھوڑ کر بس دن رات لیبل ہی لکھ رہی تھی۔ تقریباً ایک ہفتے کی سخت محنت کے بعد پاپا مال تیار کر چکے تھے۔ انہیں امید تھی کہ اب بہت جلد شہد سے بھرے شیشے کے چھوٹے چھوٹے مرتبان اور مربے کی بوتلیں نوٹ بن کر ان کی جیبیں بھرنے والی ہیں۔

ہفتہ بھر بعد میں اور پاپا اپنے منی ٹرک پر ساری بوتلیں لاد کر گھر سے ساٹھ میل دور واقع قصبے کی طرف جا رہے تھے۔ آرویل قصبے کی خاص بات یہ تھی کہ وہاں دو ہائی وے ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ اس جگہ ایک بڑی سی مارکیٹ بن چکی تھی، جس پر ہر وقت آنے جانے والے مسافروں کا ہجوم رہتا تھا۔ یہاں پر رکنے والے زیادہ تر سیاح ہوتے تھے جو وائٹ ماؤنٹین وادی کی سیاحت کے لیے جاتے ہوئے یہاں سستانے اور کھانے پینے کے لیے ٹھہرتے تھے۔ پاپا کو یقین تھا کہ اگر وہ اس جگہ سڑک کے کنارے ڈیرا جما لیں تو بہت جلد سیاحوں کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ بڑے بڑے شہروں سے آنے والے سیاحوں کو یہ یقین کر لینے میں ذرا دیر نہیں لگے گی کہ وہ جو چیز خرید رہے ہیں، سو فیصد خالص ہے۔ شہروں میں رہنے والوں کا تو یہ خیال ہے کہ دیہات کی ہر چیز خالص ہوتی ہے۔ انہیں کیا پتا کہ مربے اور شہد میں ملاوٹ ہے۔ ویسے بھی اگر انہیں ملاوٹ کا پتا چل گیا تو کون سا شکایت کرنے کے لیے واپس پلٹیں گے۔

وہ سنیچر کی صبح تھی۔

آرویل تک کا راستہ کافی لمبا مگر بے حد خوبصورت تھا۔ ہم سورج نکلنے سے کافی پہلے گھر سے نکل گئے تھے اور تقریباً [illegible] گھنٹے بعد ہم اپنی دکان سجا رہے تھے۔ پاپا کا خیال تھا کہ زیادہ تر لوگ ویک اینڈ منانے کے لیے سنیچر کی صبح ہی گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ ویک اینڈ اور عام دنوں میں کتنا مال فروخت ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ہفتے کے اندر اندر یہ بات صاف ہو جائے گی کہ ہمیں ہر ہفتے کتنا مال تیار کرنا ہوگا۔

''اور کتنا منافع ہوگا؟'' میں نے لقمہ دیا تو وہ ہنس پڑے۔

صبح کی نرم دھوپ چہار سُو پھیلی ہوئی تھی جب ہم دونوں ہائی وے کے سنگم پر، پائین کے اونچے اونچے درختوں کی ایک قطار کے سائے تلے ٹرک روک کر اپنی عارضی دکان کھول رہے تھے۔ ہماری دکان کے عین سامنے کھانے کی چیزیں فروخت کرنے والی کئی دکانیں، موٹیل اور فاسٹ فوڈ ریسٹوران بنے ہوئے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے

کئی گاڑیاں وہاں آ کر رک چکی تھیں۔ ان سے اترنے والے لوگوں کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ تفریح کے لیے نکلے ہیں۔ پاپا مستعد بیٹھے گاہکوں کی توجہ حاصل ہونے کے منتظر تھے۔ مجھے وہ صبح بہت خوش گوار لگ رہی تھی۔

پاپا بڑے کائیاں آدمی تھے۔ ان کا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ ریسٹورانوں سے باہر نکل کر سگریٹ نوشی کرنے والے کچھ لوگ ہماری طرف بڑھے۔ شاید وہ سگریٹ کے ساتھ ساتھ وقت کو مزید خوش گوار بنانا چاہتے تھے اس لیے وقت گزاری کے لیے ہمارے اسٹال پر آ رہے تھے۔

سب سے پہلا گاہک ایک انگریز جوڑا تھا۔ درمیانی عمر کے یہ مرد و عورت بہت باتونی تھے۔ پہلے تو انہوں نے مربا چکھا۔ اس کے بعد شہد کو انگلی پر لگا کر چاٹا اور اس طرح سوچتے رہے کہ جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ یہ ذائقہ خالص ہے یا پھر......

''دو بوتلیں دے دو۔'' اسی دوران وہ عورت ایک قدم آگے بڑھی اور شہد کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''نہیں......'' مرد نے اسے ٹوکا۔

یہ سن کر بوتلوں کی طرف پاپا کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرانی نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ پاپا سوچ رہے ہوں گے کہ کہیں اس نے ملاوٹ تو نہیں پکڑ لی۔

''سنو......'' لگ بھگ ایک منٹ کے توقف کے بعد مرد نے پاپا سے کہا۔ انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا بلکہ اسے خاموش نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''چھ بوتلیں شہد اور اتنی ہی مربے کی بوتلیں، ذرا اچھی طرح پیک کر دینا۔ ہمیں بہت دور لے جانا ہے۔'' اس نے جیب سے بٹوا نکالتے ہوئے کہا تو پاپا نے گہری سانس لی۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سکھ کی سانس ہے۔ ویسے اس آدمی نے جس انداز سے کہا تھا 'ٹھہرو' اس سے تو لمحہ بھر کے لیے میں بھی سہم گئی تھی۔

''تمہاری یہ سوغات تو بہت لذیذ ہے۔'' جب پاپا گتے کے ایک ڈبے میں بوتلیں پیک کر رہے تھے تو اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''شکریہ...... یہ ہمارا دو سو سال پرانا فیملی بزنس ہے۔'' کہتے ہوئے پاپا کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا تھا۔ ''میرے دادا کے پرداد نے یہ کام شروع کیا تھا۔'' وہ نہایت سچے لہجے میں سفید جھوٹ بول رہے تھے۔

وہ میاں بیوی ہاتھ میں بڑے سے گتے کا ڈبا تھام کر پلٹے تو انہیں دیکھ کر کچھ اور لوگ بھی ہماری طرف بڑھے۔ شاید بازار میں یہ اصول 'بھیڑ چال' کہلاتا ہوگا۔ اسی لیے تو اس انگریز جوڑے کے بعد ہماری دکان پر گاہکوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو خریدے بنا پلٹا ہو۔ ایک، ایک نے کئی کئی بوتلیں خریدی تھیں۔ شام تک ہم نے کئی بار ٹرک سے بوتلیں اتار کر میز پر سجائیں۔ اُس دن خوب بکری ہوئی۔ دکان اور کھلی رہتی تو مزید مال بک سکتا تھا مگر کیا کریں کہ سورج کو بھی ڈوبنے کی جلدی تھی۔ جب ہم نے اپنی دکان بڑھائی، تب تک آدھا سامان فروخت ہو چکا تھا۔ پاپا کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ بھوک پیاس کا احساس بھی کھو بیٹھے تھے مگر میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ ناشتے کے بعد سے کچھ کھایا جو نہیں تھا۔

ہم نے آتے ہوئے پروگرام طے کیا تھا کہ ایک بجے لنچ کریں گے اور وہ بھی فاسٹ فوڈ ریسٹوران پر مگر دن بھر گاہکوں کا تانتا بندھا رہا جس کے باعث پاپا کو ایک لمحے کے لیے بھی اٹھنے کا موقع نہ ملا۔ وہ تو شکر ہے کہ سورج کو غروب ہونا تھا ورنہ تو شاید مجھے نہ جانے کب تک بھوکا رہنا پڑتا۔

جب ہم سامان ٹرک پر لوڈ کر کے واپسی کے لیے نکل رہے تھے، تب پاپا کو پورے دن میں پہلی بار میرا خیال آیا۔ ''تمہیں تو بھوک لگ رہی ہوگی۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بھوک کی وجہ سے منہ کھول کر مزید توانائی ضائع کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔

''ٹھیک ہے، تو ہم چلتے ہیں ریسٹوران پر۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ٹرک اسٹارٹ کیا، موڑ کاٹا اور تھوڑی دور جا کر ایک فاسٹ فوڈ ریسٹوران کے سامنے ٹرک روک لیا۔

''کھانا بہت مزیدار تھا۔'' ریسٹوران سے باہر نکلتے ہوئے پاپا نے پیٹ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مزہ آ گیا۔''

''ہاں......'' میں نے راستے کے لیے برگر بھی پیک کروا لیا تھا اور کولڈ ڈرنک بھی لے لی تھی۔ پاپا نے بھی دریا دلی کا مظاہرہ کیا اور یہ چیزیں خریدتے ہوئے مجھے ٹوکا نہیں۔ ویسے بھی اس وقت ان کی جیب بہت بھاری ہو رہی تھی۔

گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔

اُس سنیچر کے بعد تو آرویل قصبہ ہمارا مستقل ٹھکانا بن گیا تھا۔ ہم روز صبح گھر سے نکلتے اور رات کی تاریکی میں لوٹتے تھے۔ اسکولوں میں موسم گرما کی تعطیلات تھیں۔ اس لیے میں بھی پاپا کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر پتا چل گیا کہ سنیچر اور اتوار کو اتنا مال فروخت ہو جاتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ہفتے کے باقی دن

آرام کر سکتے ہیں مگر پاپا کو تو چسکا لگ گیا تھا۔ مما بھی ان کی ہمنوا تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ دو سال کی کسر نکلنی ہے، تب تک آرام بند۔ خود انہوں نے بھی پیپرمل سے ایک ماہ کی چھٹی بغیر تنخواہ کے لے لی تھی۔ وہ دن بھر سامان خریدتیں، مال تیار کرتیں، لیبل لکھتیں، بوتلیں بھرتیں اور ہم بیچا کرتے تھے۔

پاپا کا کہنا تھا کہ انہوں نے آرویل میں پندرہ روز میں اتنے پیسے کما لیے تھے جتنا وہ اور مما مل کر تین ماہ میں بھی کما نہیں پاتے۔ کاروبار بہترین چل رہا تھا مگر اچانک ایک مسئلہ جنم لینے لگا۔

میں نے شروع میں کہا تھا نا کہ ہمارے قصبے میں تین پرانے بے روزگار تھے۔ پاپا نے تو فیملی بزنس شروع کر دیا تھا۔ ایک کہیں چلا گیا اب ایک ہی بے روزگار رہ گیا تھا اور وہ تھے انکل تھامس جواب تک وظیفے کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ وہ آخری سانس اور رہتی دنیا تک امید کا دامن تھام کر بیٹھنے والوں میں سے تھے۔

انکل تھامس بہ ظاہر بے ضرر سے انسان تھے مگر غصے کے بہت تیز تھے۔ موٹے، بھدے، کاہل، دن بھر جھیل پر مچھلیاں پکڑتے یا کمیونٹی کلب میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے تاش کھیلتے رہتے تھے۔ عمر میں وہ پاپا سے کافی بڑے تھے۔ وہ اور ان کی بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ جیری میرا ہم عمر تھا۔ ان کا چھوٹا سا فارم ہاؤس ہمارے گھر سے تھوڑا ہی دور تھا۔ پڑوسی ہونے کی وجہ سے ہم ان کے گھر کی اچھی خاصی ٹن گن رکھتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ ویسے میری مما کے مقابلے میں مسز تھامس بے حد تیز طرار عورت تھیں۔ وہ بھی شوہر کی طرح آرام پسند تھیں مگر لوگوں کی خبر رکھنے میں بہت مستعد۔ وہ ہر اس بات کو جاننا اپنا حق سمجھتی تھیں جس کی وجہ سے وہ دوسروں پر طنز کر سکیں۔

شروع شروع میں تو مسز تھامس کو اس بات کی بے حد فکر تھی کہ ہم لوگ مالی مسائل کے سبب بہت پریشان ہیں۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتیں تو یہی کہتیں کہ تم نے برے دن گزارنے کے لیے اچھے دنوں میں کچھ سوچا ہی نہیں، ورنہ یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ یہ سن کر مما کو غصہ تو بہت آتا مگر دل پہ جبر کر کے خاموش ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی وہ ان کے جیسی زبان دراز تو تھیں نہیں۔

جب سے ہمارا فیملی بزنس شروع ہوا، نہ جانے انہیں کیسے خبر ملی اور ایک بار پھر ہمارے ہاں باقاعدگی سے آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ جب بھی گھر آتیں تو یہ جاننے کی کوشش کرتی تھیں کہ مما نے بغیر تنخواہ چھٹی کیوں لی ہے، سوزی اور ہیری کہاں ہیں؟ مما دن بھر باورچی خانے میں کیا کرتی رہتی ہیں...... انہیں بہت کھوج تھی کہ ہم کس طرح اپنے برے حالات کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر مما انہیں کچھ بتانے کے بجائے گول مول جواب دے کر ٹال جاتی تھیں۔ مگر مسز تھامس کہاں رکنے والی تھیں۔

آرویل ہائی وے کراسنگ پر پاپا کا فیملی بزنس جمنے لگا تھا۔ وہ وہاں اپنی نوع کی اشیا فروخت کرنے والے واحد دکان دار تھے۔ اسی لیے انہیں ڈر تھا کہ کہیں کوئی اور ان کی دیکھا دیکھی یہ کام شروع نہ کر دے۔ ایسا ہوتا تو ان کا دھندا چوپٹ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے وہ مسٹر اینڈ مسز تھامس سے کتراتے تھے۔ ویسے بھی مسٹر تھامس بے روزگار تھے اور اگر انہیں کچھ ٹن گن مل جاتی تو وہ خود بھی اس دھندے میں کود سکتے تھے۔ یہی ڈر مما کو بھی تھا مگر مسز تھامس تو جیسے دل میں ٹھان چکی تھیں کہ ہمسائیوں کے راز سے پردہ اٹھانا ہے۔

☆☆☆

ہمارے فیملی بزنس کو دو ماہ ہونے والے تھے۔ کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ اس رات پاپا نے مربا بنانے کا تمام سامان تیار کر کے، صحن میں آگ جلانے کے لیے لکڑیاں رکھنا شروع ہی کی تھیں کہ مسز تھامس کا فون آ گیا۔

''پلیز ذرا جلدی سے گھر آئیے، تھامس کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' مما نے ان کا فون اٹھایا تو وہ بنا کسی رسمی تمہید کے کہنے لگیں۔ ''ہیری کو بھی لیتی آئیں، ہم انہیں اسپتال لے کر چلتے ہیں۔''

یہ سن کر مما دوڑی ہوئی پاپا کے پاس آئیں اور انہیں ساری بات بتائی۔ پاپا اس وقت آگ جلا چکے تھے۔ ''تم یہاں کا خیال رکھو، ہم ہو کر آتے ہیں۔'' انہوں نے مجھے ہدایت کی اور وہ دونوں ان کے گھر کی طرف چل دیے۔

انہیں گئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ان کا بیٹا جیری ہمارے گھر آ گیا۔ جیری مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ہماری دوستی بھی بہت تھی۔ اکثر ہم دونوں ساتھ گھومتے پھرتے تھے مگر جب سے فیملی بزنس شروع ہوا ہے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہارے ڈیڈی کو؟'' اسے دیکھتے ہی میں نے حیرت سے کہا۔

''پتا نہیں، الٹیاں کر رہے تھے کافی دیر سے۔'' اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب وہ کہاں ہیں؟''

''مما اور تمہارے والدین انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔''

''تم ساتھ نہیں گئے؟''

''کار میں جگہ نہیں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اب گھر پر بور ہونے سے بہتر تھا کہ تمہارے پاس آ جاؤں، سو چلا آیا مگر تم کہاں غائب رہتی ہو؟'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''اور یہ کیا پک رہا ہے؟'' اس نے پتیلے کے گرد جلتے الاؤ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا کا فیملی بزنس۔''

''کیا......؟'' یہ کہتے ہوئے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ ''یہ کیسا بزنس ہے؟'' وہ میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''زیادہ مت سوچو، میں بتاتی ہوں۔'' میں نے اس کی حیرت دور کرنے کے لیے اسے سب کچھ بتا دیا کہ ہمارا فیملی بزنس کیا ہے، ہم کیسے یہ سب کچھ تیار اور فروخت کرتے ہیں اور میں اتنے دنوں اس سے کیوں نہیں مل سکی تھی۔

''تو یہ بات ہے۔'' اس نے پورا قصہ سن کر کہا۔

جتنی معصومیت سے میں نے اسے پاپا کے فیملی بزنس کا سارا راز بتا دیا تھا، اتنی ہی معصومیت سے اس نے ہاں میں سر ہلا دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ سمجھ گیا تم کہاں دن بھر غائب رہتی ہو۔

ہم کافی دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پتیلے کے گرد دہکتا الاؤ سرد پڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''مجھے بھی۔'' جیری نے کہا اور اپنے گھر چلا گیا۔

مما پاپا اب تک نہیں لوٹے تھے۔

میں بستر پر لیٹی تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں لیکن سخت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ میں پانی پینے کے لیے اٹھی تو اسی وقت وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے رسماً پوچھ لیا۔

''ہونا کیا ہے اُس موٹے ریچھ کو۔'' پاپا نے بےزاری سے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگے۔ ''مفت کا مال سمجھ کر کہیں ٹھونسا ہوگا، بدہضمی ہو گئی۔ اب الٹیاں کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ممی کی طرف مڑے۔ ''دیکھا ڈاکٹر پر کتنا بگڑ رہا تھا۔ غصہ تو اس کی ناک پر بیٹھا رہتا ہے۔''

''وہ تو ہے۔'' مما نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''یہ دونوں میاں بیوی ہیں ہی سازشی مفت خورے۔'' مما کو شاید اس بات پر غصہ تھا کہ جو وقت ان کے بستر میں لیٹنے کا تھا، وہ وقت اسپتال میں گزار آئی تھیں۔

مجھے ویسے بھی انکل تھامس سے کوئی دلچسپی تو تھی نہیں، خاموشی سے کمرے کی طرف چل دی۔ دوسرے دن صبح سویرے آرویل بھی تو جانا تھا۔

☆☆☆

اسکول کھلنے میں دو ہفتے باقی تھے۔ مما پاپا منصوبہ بنا رہے تھے کہ کس طرح میری کمی کو پورا کیا جائے۔ پاپا خود اکیلے بھی دکان لگا سکتے تھے لیکن ان کا مزاج ایسا تھا کہ ایک مددگار ضرور چاہیے۔ اب میں اسکول جاتی تو پھر میری جگہ کون ہو؟ پاپا کا اصرار تھا کہ مما نوکری چھوڑ دیں مگر وہ ایسا کرنے سے ہچکچا رہی تھیں۔ وہ یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ اضافی آمدنی ہو رہی ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ آخر طے یہ پایا کہ اسکول کھلنے کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

اسکول کھلنے میں ابھی چار روز باقی تھے کہ ایک روز شام کو ہم آرویل سے لوٹے تو گھر پر دو پولیس والے پاپا کے منتظر تھے۔ شہر کی بلدیہ نے ان کے مربے اور شہد کا خفیہ طور پر لیبارٹری ٹیسٹ کروایا تھا، جس میں دونوں میں ملاوٹ پائی گئی تھی۔ بلدیہ نے ان کے خلاف مقدمہ درج کروا دیا اور اب پولیس انہیں پکڑنے آئی تھی۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ ایک معزز شہری نے بلدیہ کو مربے اور شہد کی ایک، ایک بوتل نمونے کے طور پر دے کر لیبارٹری تجزیے کی درخواست دی تھی۔

پاپا کیا پکڑے گئے فیملی بزنس پورے کا پورا ٹھپ ہو گیا۔ اچھی بات صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ مما کی نوکری سلامت تھی اور پاپا نے اتنا ضرور کما لیا تھا کہ ہم چھ آٹھ مہینے

چھٹی کی درخواست

جنابِ عالی!

کل رات سے مجھے مسلسل چھینکیں آ رہی ہیں۔ کبھی کبھی گرج چمک کے ساتھ نزلہ گرتا ہے۔ نزلے کی وجہ سے ناک بند ہے اور سانس میں نمی کا تناسب پانچ فیصد ہے۔ اس وقت میرا ٹمپریچر زیادہ سے زیادہ 42 اور کم سے کم 34 ہے۔ ڈاکٹر نے گلابی دوا تجویز کی ہے۔ انجکشن بھی لگا دیا ہے مگر ری ایکشن کا بھی امکان ہے۔ آج مزاج خشک رہنے کا امکان ہے اور کل میری بیماری کا سورج پتا نہیں کب طلوع ہوگا۔ اس لیے میری چھٹی کی درخواست منظور کر کے میرے حال پر رحم فرمائیں۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

مزے سے گزار سکتے تھے۔

اسکول کھل گئے مگر پاپا جیل میں تھے۔ انہیں مجسٹریٹ نے دو ماہ کی سزا دی تھی۔ سزا کاٹ کر وہ لوٹے تو ایک بار پھر بے روزگار تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر سوشل سیکیورٹی کے ذریعے ضلعی دفتر کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ اب بھی بے روزگار اور منتظر وظیفہ ہیں مگر اس بار ندارد رہا، وظیفے کی طرح۔

ہمارے شب و روز ایک بار پھر پرانے ڈھب پر آگئے۔ کچن میں یوٹیلٹی بلوں کے ڈھیر لگنا شروع ہو چکے تھے۔ مما کی چڑچڑاہٹ بڑھ رہی تھی اور پاپا ایک بار پھر نوکری کی تلاش میں تھے۔

اُس دن بھی سنیچر تھا۔ میری اسکول سے چھٹی تھی۔ پاپا مجھے لے کر آرویل جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں کسی موٹیل، ریستوران یا پب وغیرہ میں ملازمت کا پتا کرتے ہیں۔ جب ہم آرویل ہائی وے کراسنگ پر پہنچے تو پاپا کو پرانے دنوں کی یاد آگئی اور انہوں نے ٹرک ایک کنارے پر روک لیا۔

”یہ کیا!“ ان کے منہ سے حیرت سے نکلا۔ میں نے بھی چونک کر اس طرف دیکھا۔ سامنے بڑا سا بینر لگا ہوا تھا:

”تھامس فارم کا اصلی شہد۔“

لوگوں کے ہجوم میں انکل تھامس کھڑے تھے اور ان کے سامنے میز پر شہد کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

”یہ کمینہ۔“ انہوں نے غصے سے ٹرک اسٹارٹ کیا اور واپسی کے لیے موڑنے لگے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ جب انہوں نے ٹرک گھر والے راستے پر ڈالا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

”واپس گھر۔“ انہوں نے غصے سے جواب دیا۔ ”میں ساری بات سمجھ گیا۔“ وہ دانت کچکچاتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔

پاپا بہت تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے گھر پہنچے۔ ہفتہ وار چھٹی تھی۔ مما بھی گھر پر تھیں۔ میں پورے راستے خاموش بیٹھی رہی کہ کہیں وہ مجھ پر ہی اپنا غصہ نہ نکال دیں۔

”اندر چلو۔“ مما باہر دھلے ہوئے کپڑے لٹکا رہی تھیں، جب پاپا تیزی سے ٹرک سے اترے اور مما کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اندر لے گئے۔

”کیا ہوا؟“ مما بھی پریشان تھیں کہ ہم اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے۔

”وہ سب کچھ تھامس کا کیا دھرا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے سارا قصہ مما کو سنا دیا۔

”مگر انہیں بوتلیں کس نے دی تھیں، جو انہوں نے بلدیہ کو اپنی درخواست کے ساتھ بھیجی تھیں؟“

”مجھ سے تو نہیں خریدی تھیں؟“ پاپا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی میں اسے کیوں بیچتا۔“ یہ کہہ کر وہ میری طرف مڑے۔ ”کہیں تم سے، وہاں آتے جاتے تو نہیں خریدی تھیں اس نے۔“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب تو میں مر بھی جاتی، تب بھی نہ بتاتی کہ اُس رات جب وہ انکل تھامس کو لے کر اسپتال گئے تھے، تب میں نے جیری کو دوستی میں تحفے کے طور پر ایک شہد اور ایک مربے کی بوتل دی تھی۔ ویسے مجھے ہلکا سا شبہ بھی نہیں تھا کہ دوستی میں دیا گیا میٹھے کا تحفہ اتنا کڑوا ثابت ہوگا۔

اگلے دو روز یہ موضوع مما اور پاپا کی گفتگو کا اہم ترین حصہ تھا۔ پاپا انکل تھامس کی اس حرکت پر بہت غصے میں تھے۔ ”بدلہ لوں گا۔“ جب سے ہم آرویل سے اس انکشاف کے بعد لوٹے تھے، تب سے وہ اس موضوع پر ہر بار گفتگو کا اختتام اس جملے پر کر رہے تھے۔

☆☆☆

فیملی بزنس کی بہار تو کب کی گزر چکی تھی۔ ہمارے بُرے دن ایک بار پھر لوٹ آئے تھے۔ مما کے شب و روز بھی اب پہلے جیسے ہی تھے۔ البتہ اب پاپا اکثر گھر سے باہر رہنے لگے تھے۔ کئی بار میں نے انہیں بندوق کے ساتھ باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک بار تو وہ دو جنگلی خرگوش بھی مار کر لائے تھے۔ اُس سرد رات میں خرگوش کے گوشت کی یخنی ہمارے لیے بہت بڑی ضیافت تھی۔ دن تو دن، کئی بار پاپا رات کو بھی بندوق لے کر باہر نکل جاتے تھے۔ میرا اور مما کا خیال تھا کہ شاید وہ شکار کر کے ہمارے لیے گوشت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی سردیوں میں گوشت کی یخنی تو صحت کے لیے بڑی مفید تھی۔

اس رات ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ میں کمرے کی کھڑکی کا پردہ برابر کرنے اٹھی تو پاپا کندھے پر بندوق تھامے باہر جاتے دکھائی دیے۔ میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ان کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ میں چپ چاپ آ کر بستر پر لیٹی اور سو گئی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ ہم سب ناشتا کر رہے تھے۔ پاپا خلافِ توقع نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں پاپا کے بارے میں کچھ پوچھتی، اچانک وہ کچن میں داخل ہوئے۔

”لورنا، لورنا......“ وہ مما کو پکار رہے تھے۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”تھامس پکڑا گیا۔“

”کیا؟“ مما کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

”کل رات اس نے جنگل میں ایک فاریسٹ گارڈ کو گولی مار دی تھی؟“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ مما حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”یہ لو اخبار میں پڑھ لو۔“ انہوں نے جیب سے اخبار نکال کر مما کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”اخبار میں لکھا ہے کہ وہ جنگل کے شہد فارم سے شہد چرا کر بیچا کرتا تھا۔“ پاپا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ”کل رات اسے ایک فاریسٹ گارڈ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور اس نے بچنے کے لیے اس پر گولی چلا دی۔ اندھیرا تھا مگر اس کے باوجود وہ فرار نہ ہو سکا۔ گولی کی آواز سنتے ہی ایک اور فاریسٹ گارڈ دوڑا اور اس نے پکڑ لیا موٹے کو۔ اب مزے سے جیل کی روٹی توڑے گا خونی موٹا ریچھ۔“ یہ کہتے ہوئے پاپا کے چہرے پر شدید نفرت نظر آ رہی تھی۔

”ویسے بھی جو انہوں نے کیا، ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“ میں یہ سن کر بڑبڑائی۔ مما خبر پڑھ رہی تھیں۔

”بہت برا ہوا۔“ مما نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ گارڈ بچا یا مر گیا؟“ انہوں نے پاپا سے پوچھا۔

”ابھی تو زخمی ہے، آگے کا پتا نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے رکے اور پھر مما کو گھورتے ہوئے کہنے لگے۔ ”کچھ برا نہیں ہوا اس کے ساتھ۔ وہ کمینہ اسی لائق تھا۔“ وہ غصے میں نظر آ رہے تھے۔ ”اتنی جلدی بھول گئیں کہ اس کمبخت نے میرے پیٹ پر لات ماری تھی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور پھر جوشیلے انداز میں کہنے لگے۔ ”اب زخمی گارڈ بچے یا مرے مگر وہ تو گیا۔“

”اب بھول جاؤ وہ بات۔“ مما نے انہیں سمجھایا۔

”کیسے بھول جاؤں؟“

”اے سنو......“ کچھ دیر تک کچن میں خاموشی رہی اور پھر مما یہ کہتے ہوئے پلٹ کر ان کی طرف بڑھیں اور قریب پہنچ کر آہستہ سے کہنے لگیں۔ ”ہیری، کہیں تم نے تو......“

”ہاں...... میں نے...... مگر تم بے فکر رہو، میں نے اپنی بچت کا انتظام کر کے ہی یہ سب کچھ کیا ہے۔“ ان کا انداز فاتحانہ تھا۔ ”اب وہ لاکھ کہتا پھرے کہ گولی اس نے نہیں چلائی مگر مانے گا کون؟“ یہ کہہ کر وہ رکے اور مما کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔ ”فیملی اور فیملی بزنس کے لیے سب کچھ جائز ہے۔“

”سنو بچو......!“ پاپا نے ان کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور تالی بجا کر ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگلے ہفتے سے ہم ایک بار پھر اپنا پرانا فیملی بزنس شروع کرنے والے ہیں۔“

”واقعی......“ یہ سن کر میرے اور مما کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ ہم دونوں یہ سن کر حیران ہو گئے تھے۔

”ہاں۔“ انہوں نے فخر سے کہا۔ ”سنو...... اس بار ہم آرویل میں نہیں، کہیں اور دکان لگایا کریں گے۔“

”مگر وہ شہد......“ مما نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر پاپا نے بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

”اب بھی شہد ہم اپنے خاندانی روایتی طریقے سے تیار کریں گے مگر اس بار منافع کی شرح زیادہ ہوگی۔“

”وہ کیسے؟“ حسبِ عادت مما نے قطع کلامی کی۔

”اب ہم اصلی شہد بازار سے نہیں خریدیں گے بلکہ مفت میں حاصل کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے اور مسکرا کر مما کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”کمبخت جاتے جاتے یہ طریقہ ضرور سجھا گیا کہ ملاوٹ کے لیے مفت میں خالص شہد کہاں سے مل سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ ”سنو، آج سے ہی ہم مربے اور شہد کی تیاری کا کام شروع کر دیتے ہیں۔“ انہوں نے مما کو ہدایت کی۔

یہ سن کر مما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ دوستی اور فیملی بزنس کو کبھی اکٹھا نہیں ہونے دوں گی۔ دوستی اپنی جگہ، بیٹ اپنی جگہ۔ اب میں بھی کچھ کچھ پاپا کی طرح ہی سوچنے لگی تھی۔

اگلے سنیچر کی صبح سویرے ہم ایک بار پھر شہد اور مربے کی بوتلیں منی ٹرک کے پیچھے لاد کر نئے قصبے کی طرف جا رہے تھے۔ پاپا کا کہنا تھا کہ وہاں تین ہائی وے آ کر ملتے ہیں۔ وہیں سے فلاوروِیلی کا راستہ نکلتا ہے۔ وہاں سیاحوں کی بڑی تعداد روزانہ آتی ہے۔ ویسے بھی موسمِ بہار میں لوگ گھومنے تو نکلتے ہی ہیں۔ جیبیں بھری ہوں تو سوغات ضرور خریدیں گے اور سیاح خالی جیب نہیں ہوتا۔

ان کی بات سن کر میں نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔ سوچ رہی تھی کہ کتنے مہینوں بعد آج فاسٹ فوڈ ریستوران پر برگر اڑاؤں گی۔

بیمار گھوڑا

ملک صفدر حیات

"اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے" شاید اس نے اتنا ہی پڑھا اور سمجھا تھا، تب ہی یہ بھول گیا کہ خلوص نہ ہو تو محبت کا یہی دریا اترنے والوں کو ڈبو کر مار ڈالتا ہے، اس کے باوجود آگ ہے کہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ وہ جو موج مستی میں گم تھے اچانک آنے والی نہر انہیں اپنے ساتھ بہا لے گئی اور ایسے کنارے پر لا پھینکا جس پر ملک صفدر حیات تمام تر ہتھیاروں کے ساتھ لیس کھڑے تھے... ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا، آخر کب تک کوئی مجرم راہ فرار اختیار کر سکتا ہے... بالآخر ایک روز تھک ہی جاتا ہے۔

نادانی میں دل دینے اور جان لینے والوں کا عبرت ناک قصہ

ان دنوں میں تھانہ مرید کے میں تعینات تھا۔ لاہور سے یہ راستہ جی ٹی روڈ راولپنڈی کی طرف سفر کریں تو مرید کے، لاہور اور گوجرانوالہ کے تقریباً درمیان میں پڑتا ہے۔ اس زمانے میں یہ چھوٹا سا قصبہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل خاصا پھیل چکا ہے اور خبروں میں بھی رہنے لگا ہے۔

وہ اگست کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ میں ایک صبح حسبِ معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا، رات سے ایک جوڑا حوالات میں بند ہے۔ میری رہائش تھانے کے عقبی حصے میں واقع چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں تھی۔ رات کو جب میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف گیا تو حوالات خالی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہ کارنامہ نائٹ ڈیوٹی والے عملے نے انجام دیا تھا۔ میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے کہا۔

"افضل! ہارون کو فوراً میرے پاس بھیجو۔"

"جی ملک صاحب!" وہ مجھے سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

ہارون ایک اے ایس آئی تھا اور آج کل رات کی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ وہی صحیح معنوں میں مجھے بتا سکتا تھا کہ اس جوڑے کا کیا قصور تھا جسے رات سے انہوں نے تھانے کی حوالات میں بند کر رکھا تھا اور مجھے اس واقعے کی اطلاع تک نہیں دی گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اے ایس آئی ہارون کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے حسب دستور مجھے سیلوٹ کیا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"ملک صاحب! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا اور آپ نے یاد فرما لیا......"

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ تم لوگوں نے رات کسی جوڑے کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

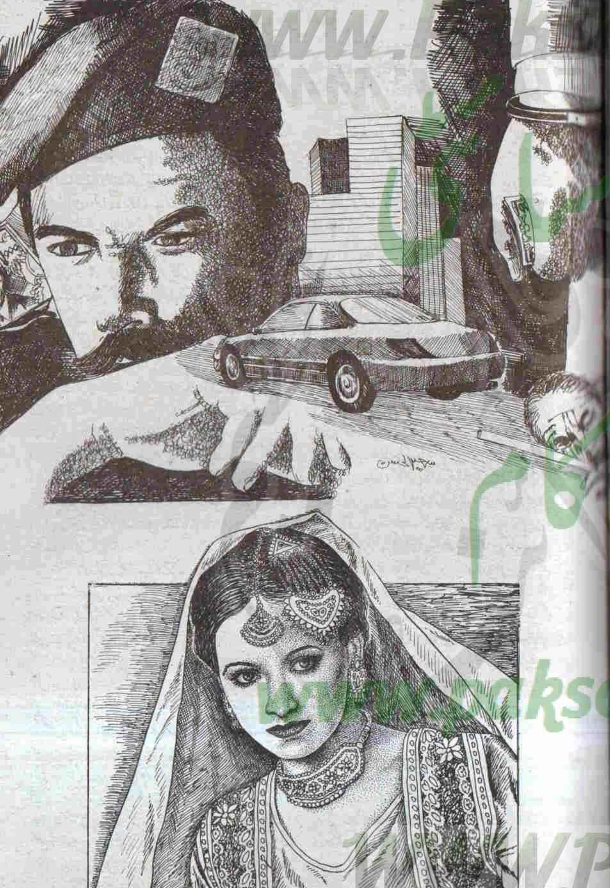
"جناب! میں انہی کے بارے میں بتانے کے لیے تو آپ کے پاس آرہا تھا۔" وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے انہیں سرِعام فحش حرکتیں کرتے ہوئے، رنگے ہاتھوں پکڑا ہے جناب......"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" میں نے چونک کر اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ "تم لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"ملک صاحب! جب ہم اس جوڑے کو گرفتار کر کے تھانے لائے اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔" اے ایس آئی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "میں نے آپ کو بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"یہ ہیں کون لوگ......" میں نے اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "اور آدھی رات کو کس قسم کی فحش حرکتیں کر رہے تھے جو تمہیں مجبوراً انہیں گرفتار کر کے تھانے میں بند کرنا پڑا؟"

"جناب! ان کا تعلق ہمارے قصبے سے نہیں ہے۔"



اے ایس آئی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”یہ لوگ کہیں اور سے یہاں آئے ہیں۔ جب میں نے انہیں گرفتار کیا تو کانسٹیبل حفیظ بھی میرے ساتھ تھا۔ حفیظ اسی قصبے کا رہنے والا ہے اور یہاں کے بچے بچے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی نے تصدیق کی ہے کہ ان لوگوں کا مرید کے سے کوئی تعلق نہیں۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اے ایس آئی سے پوچھا۔

”وہ لوگ اپنے بارے میں کیا بتاتے ہیں؟“

”ان دونوں کا دعوٰی ہے کہ وہ میاں بیوی ہیں۔“

”لیکن یہ میاں بیوی آئے کہاں سے ہیں۔“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”جب وہ یہاں کے وسنیک نہیں ہیں تو پھر سرعام فحش حرکتوں کے لیے انہوں نے ہمارے قصبے ہی کا انتخاب کیوں کیا......؟“

”ملک صاحب! میں نے ان سے جو پوچھ گچھ کی ہے اس کے مطابق......“ اے ایس آئی ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔ ”ان لوگوں کا تعلق موضع رتاں والی سے ہے۔ وہ دو دن پہلے مرید کے آئے ہیں اور یہاں ایک بیوہ نعمت بی بی کے گھر کا ایک کمرا کرائے پر حاصل کر کے رہ رہے ہیں۔ مرد کو منڈی مرید کے میں کوئی نوکری وغیرہ بھی مل گئی ہے۔“

موضع رتاں والی علیہ مرید کے مغرب میں لگ بھگ آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رتاں والی سے مرید کے تک ایک کچا راستہ آتا تھا۔ اے ایس آئی ہارون کی پیش کردہ وضاحت مجھے ہضم نہ ہوئی اور میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”تم فوراً اس جوڑے کو میرے پاس لے کر آؤ۔“

اے ایس آئی نے فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کی اور چند لمحات کے بعد وہ دونوں میرے سامنے حاضر تھے۔ میں نے بہ غور سرتاپا ان کا جائزہ لیا۔

مرد کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک خوش شکل اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر گہرے زخم کا ایک نشان بڑا واضح تھا۔ اس نے مناسب سائز کی گھنی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جو بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ عورت...... بلکہ اسے لڑکی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اس کی عمر اٹھارہ انیس کے درمیان نظر آتی تھی۔ وہ بوٹے قد کی مالک ایک حسین و جمیل اور تیز طرار لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑی مقناطیسی چمک (کشش) تھی۔ وہ خاموشی کی حالت میں بھی آنکھوں سے باتیں کرتی محسوس ہوتی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال ابھرا وہ کچھ اس قسم کا تھا...... یہ کم بخت اس لڑکی کو کہیں سے بھگا کر لایا ہے۔

وہ دونوں میرے سامنے مجرموں کی طرح کھڑے تھے اور خاصے خفا دکھائی دیتے تھے۔ میں نے مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں پوچھا۔

”نام کیا ہے تمہارا......؟“

”جی......“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”فرید......“

میں نے نگاہ کا زاویہ لڑکی کی جانب موڑا اور کہا۔

”تمہارا نام......؟“

”نرگس!“ فرید کی بہ نسبت اس نے زیادہ اعتماد سے جواب دیا۔

”تم دونوں موضع رتاں والی سے آئے ہو؟“ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”اور تمہارا دعوٰی ہے کہ میاں بیوی ہو......؟“

فرید نے فریادی انداز میں وضاحت کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ ان کی شادی کو لگ بھگ ایک سال ہو گیا ہے۔ گاؤں میں اس کے لیے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں تھا اور کھیتی باڑی وہ کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اپنی بیوی کو لے کر مرید کے آ گیا۔ وہ معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں کوئی چھوٹی موٹی مناسب سی نوکری مل جائے گی۔ اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا اور ایک آڑھتی برکت باجوہ نے منڈی مرید کے میں اسے اپنی دکان پر منشی رکھ لیا چنانچہ وہ نعمت بی بی سے ایک کمرا کرائے پر لے کر یہاں رہنے لگے، وغیرہ وغیرہ......!

اس کی وضاحت مجھے متاثر نہ کر سکی۔ عام طور پر دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ گاؤں دیہات سے جو مرد کمانے کے لیے شہروں یا قصبے جات کا رخ کرتے تھے وہ اپنے ساتھ بیوی بچوں کو اٹھائے نہیں پھرتے تھے۔ اگرچہ ان دونوں کی ابھی کوئی اولاد نہیں تھی تاہم ان کی مرید کے میں آمد، سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

”میں ابھی اپنے ایک بندے کو بھیج کر تمہارے بیان کی تصدیق کروا لوں گا، وہ پہلے نعمت بی بی سے جا کر ملے گا اور بعد ازاں منڈی پہنچ کر برکت باجوہ سے تمہارے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا۔“

”جی ضرور...... آپ تصدیق کروائیں۔“ نرگس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ہمیں گھر جانے دیں۔ رات ہم نے حوالات میں بڑی مشکل سے گزاری ہے۔ ایک تو قیامت کی گرمی اوپر سے...... مکھیوں سے بھی بڑے سائز کے مچھروں نے ایک لمحے کے لیے چین نہیں لینے دیا۔“

”تم دونوں کو جانے کی اجازت تو مل جائے گی۔“ میں نے یکے بعد دیگرے ان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن

ابتدائی تصدیق کے بعد۔“

”آخر ہمارا قصور کیا ہے؟“ فرید نے شپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟“

”تم دونوں کو میرے بندوں نے جس نازیبا حالت میں گرفتار کیا ہے وہ تو میاں بیوی کو بھی یوں سرعام زیب نہیں دیتی۔“ میں نے فرید کو تیز نظر سے گھورا۔ ”اور ابھی تک تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا کہ تم دونوں میاں بیوی ہو یا......“

اے ایس آئی ہارون نے مجھے بتایا تھا کہ بیوہ نعمت بی بی کے گھر کے باہر گلی میں ایک چھوٹا سا چبوترا بنا ہوا تھا جہاں سے اس جوڑے کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ہارون کے مطابق فرید ٹانگیں لٹکائے چبوترے پر اس طرح بیٹھا تھا کہ نرگس اس کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور وہ اللہ کا بندہ، نرگس کے چہرے پر جھکا بوس و کنار میں مصروف تھا۔ پولیس کی آمد پر وہ ہڑبڑا کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔

”آپ ہم سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔“ نرگس نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”اس بات میں ذرا بھی جھوٹ نہیں...... ہم اصلی میاں بیوی ہیں۔ ایک سال پہلے ہماری باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔“

”یہ معاملہ قسم لینے یا قسم دینے سے حل نہیں ہوگا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تصدیق بہت ضروری ہے۔ جہاں تم لوگوں نے آدھی رات حوالات میں گزار دی ہے، ایک دو گھنٹے اور صبر کر لو۔“

فرید اپنی پوزیشن صاف کرنے کی غرض سے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ نے موسم تو دیکھا ہے نا...... کتنی زبردست گرمی پڑ رہی ہے۔ ادھر گاؤں میں تو ہم لوگ کھلے آسمان کے نیچے بھی آرام سے سو سکتے تھے لیکن نعمت بی بی نے ہمیں اپنی جو بیٹھک کرائے پر دی ہے، اس کی تو دیواروں میں سے آگ نکلتی ہے۔ پورا دن اس پر دھوپ پڑتی ہے اور رات کو یہ تنور بن جاتی ہے۔ ہم گھبرا کر باہر چبوترے پر آ بیٹھے تھے...... بس اتنی سی بات ہے۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے دبکا مارا۔ ”گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھنے سے تم لوگوں کو کس نے منع کیا ہے۔ تمہاری گرفتاری تو اس خطرناک حرکت کا نتیجہ ہے جو فحاشی کے زمرے میں آتی ہے۔“

نرگس ہونٹ کاٹنے لگی جبکہ فرید پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو ضروری ہدایات دے کر اس جوڑے کے بیانات کی تصدیق کے لیے روانہ کر دیا پھر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

اپنی بات کے اختتام پر میں نے میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ ایک ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اے ایس آئی ہارون کو نگاہ کے اشارے سے کہا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔ جب صرف میں اور زیرِ حراست جوڑا باقی رہ گئے تو میں نے فرید سے کہا۔

”جب تک تم دونوں کے بیانات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم ادھر میرے سامنے ہی بیٹھو گے لہٰذا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

ان کی جان میں جان آئی۔ ظاہر ہے، حوالات کی بہ نسبت میرا کمرا بدرجہا بہتر جگہ تھی تاہم تھانے کے مخصوص ماحول کی اپنی ایک دہشت اور وحشت ہوتی ہے جو ان کی آنکھوں اور چہروں سے جھلک رہی تھی۔ میں چند لمحات ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے میاں بیوی والے رشتے کے حوالے سے ابھی تک میرا ذہن مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اپنی تسلی کی خاطر میں انہیں انٹرویو کے انداز میں گھسنے لگا۔

”تم لوگوں کے سب عزیز رشتے دار تو ادھر رتاں والی ہی میں ہوں گے؟“

”جی...... جی ہاں!“ نرگس نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ نرگس جواب دینے میں پہل کی کوشش کر رہی تھی جیسے اسے خدشہ ہو کہ کہیں فرید کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ ڈالے۔ نرگس کا یہ احتیاط بھرا انداز بھی میرے مبینہ شک کو مہمیز کرتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

”تمہارے ماں باپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے نرگس ہی سے پوچھ لیا۔

”میرے باپ کا نام یعقوب اور ماں کا عائشہ بی بی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور تمہارے......؟“ میں نے سوالیہ نظر سے فرید کی طرف دیکھا۔

”نصیب بیگم اور کرم دین۔“

میں نے باری باری ان دونوں کو دیکھا اور پوچھا۔ ”ایک سال پہلے تم دونوں کا نکاح کس نے پڑھایا تھا؟“

فرید نے متذبذب انداز میں نرگس کی جانب دیکھا، وہ جلدی سے بولی۔ ”جی...... ان کا نام مولوی شرافت ہے۔“

"کیا تمہیں یہ نام پتا نہیں تھا؟" میں نے گھور کر فرید کو دیکھا۔

"پتا تھا جناب......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "رتاں والی کے ایک ہی تو مولوی صاحب ہیں جو مدینہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھاتے ہیں، ہم دونوں کا نکاح بھی انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔"

"تو پھر تم میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے نرگس کی جانب کیوں دیکھنے لگے تھے؟" میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

"وہ جی...... وہ جی۔" وہ متاملانہ انداز میں بولا۔ "میں ڈر گیا تھا۔"

"ڈر گئے تھے...... کس سے......؟"

"مجھے یوں لگا تھا کہ آپ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے کسی بندے کو ہمارے گاؤں بھیجیں گے۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں بتایا۔ "وہاں سے بھی آپ ہمارے بارے میں تصدیق کریں گے۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ وہ تو میں ضرور کروں گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس میں تمہارے خوف زدہ ہونے کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر تم دونوں میاں بیوی ہو تو پھر پریشانی والی کون سی بات ہے؟"

"جناب......" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "آپ کا جو بندہ گاؤں جا کر ہمارے بارے میں پوچھ پڑتال کرے گا وہ ان لوگوں کو یہ بھی بتائے گا کہ ہمیں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"اچھا...... تو تمہاری پریشانی کا یہ سبب ہے۔" میں نے متاسفانہ انداز میں گردن ہلائی۔ "اگر اپنی عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو اس قسم کی حرکت کیوں کی تھی؟"

"وہ جناب...... بس غلطی ہو گئی۔" وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ "معاف کر دیں جی۔"

"تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے اس لیے میں نے تمہیں معاف کر دیا لیکن تمہارے بیانات کی تصدیق ضروری ہے۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "اور اس حوالے سے بھی تمہیں بے فکر رہنا چاہیے کہ ادھر رتاں والی میں تمہارے کرتوتوں کا بھانڈا نہیں پھوڑا جائے گا۔"

ان دونوں کی جان میں جان آئی اور وہ مطمئن ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں باری باری گھما پھرا کر ان سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بندہ واپس آ گیا جسے میں نے فرید اور نرگس کے بیانات کی تصدیق کے لیے نعمت بی بی اور برکت باجوہ کی طرف بھیجا تھا۔ میرے بندے کی رپورٹ کی روشنی میں وہ جوڑا اصاف ثابت ہوا لہٰذا میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی، اس ہدایت کے ساتھ......!

"تم لوگ یہ نہیں سمجھنا کہ میں تمہاری طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ابھی رتاں والی سے تصدیق کرنا باقی ہے۔"

"جی......!" نرگس نے مختصراً کہا۔

"اور اس دوران میں تم دونوں علاقے کو چھوڑ کر کہیں جانے کی کوشش نہیں کرو گے۔" میں نے مزید کہا۔ "اگر کہیں آنا جانا بہت ہی ضروری ٹھہرا تو پہلے تم تھانے میں رپورٹ کرو گے۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھاؤ گے۔"

"ہم آپ کی ہدایت پر عمل کریں گے جناب۔" وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔

"میں ایک سادہ لباس اہلکار کو تم دونوں کی خفیہ نگرانی پر بھی مامور کر رہا ہوں۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو مجھے تم لوگوں کی سرگرمیوں کی خبر دے گا اس لیے زیادہ ہوشیار اور چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

انہوں نے ایک مرتبہ پھر بہ یک زبان ہو کر کہا۔ "جی......"

میں نے انہیں رخصت کر دیا۔

خفیہ نگرانی والی بات میں نے محض انہیں ڈرانے کے لیے کہی تھی ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے خصوصی ہدایات دے کر اس اہلکار کو رتاں والی روانہ کر دیا جو اس سے پہلے نعمت بی بی اور برکت باجوہ سے مل کر آیا تھا۔ میرے اسٹاف کے اس بندے کا نام حنیف تھا۔ حنیف کی ایک خالہ موضع رتاں والی میں رہتی تھی اور اس نے مجھ سے خصوصی درخواست کی تھی کہ وہ آج کی رات وہاں گزار کر صبح واپس آئے گا۔

میں نے حنیف کی استدعا قبول کر لی۔

❀❀❀

گزشتہ رات گرج چمک کے ساتھ وقفے وقفے سے ہلکی بارش ہوتی رہی تھی۔ وہ ساون کے آخری ایام تھے۔ بارش برستی تو موسم خوشگوار ہو جاتا اور دھوپ نکل آنے پر یہی موسم بڑی خطرناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک سنسنی خیز

بری خبر میری منتظر تھی۔ پچھلی رات کسی نے فرید پردیسی کو قتل کر دیا تھا۔

جی ہاں...... میں اسی فرید کی بات کر رہا ہوں جس کا روزگار اسے رتاں والی سے کھینچ کر مرید کے لے آیا تھا اور اس کی مبینہ بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں نے ایک اہلکار کو ساتھ لیا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

پچھلی رات ہونے والی بارش نے زمین کو اچھا خاصا سیراب کر ڈالا تھا۔ بیوہ نعمت بی بی کا گھر میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں مختلف گلیوں میں سے گزر کر جب اس کے دروازے پر پہنچا تو وہاں اچھے خاصے لوگوں کو جمع پایا۔ وہ صبح کا وقت تھا لیکن دھوپ کا دور دور تک نشان نظر نہیں آتا تھا۔ آسمان بادلوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ بارش تھم گئی تھی تاہم آثار سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو سکتا تھا۔

میں نعمت بی بی کے گھر میں داخل ہونے کے بعد بیٹھک میں آ گیا کیونکہ مقتول فرید کی لاش اسی کمرے میں پڑی تھی۔ میں فوراً سے پیشتر لاش کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوا کہ فرید کو سوتے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وہ بستر سے عاری، ایک چارپائی پر چت پڑا تھا، اس طرح کہ ایک خطرناک خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست دکھائی دیتا تھا اور بلاشبہ یہی قاتل خنجر اس کی موت کا سبب بھی تھا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر اور گردن جھکا کر چارپائی کے نیچے متلاشی نگاہ دوڑائی تو وہاں خون ہی خون پھیلا دکھائی دیا۔ یہ خنجر کی دھار کا کمال تھا۔ دل کا سارا خون نکل کر چارپائی کے نیچے ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں تھا کہ میں نے گزشتہ روز جس فرید سے تھانے میں ملاقات کی تھی، وہ اب قید حیات سے آزاد ہو چکا تھا۔

جائے واردات پر ضروری کارروائی کے دوران میں مجھے دو چیزوں نے بری طرح چونکا دیا تھا۔ نمبر ون...... لاش کی پوزیشن، نمبر ٹو...... نرگس کی غیر موجودگی۔

جب کسی شخص کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو وہ بڑی شرافت کے ساتھ چپ چاپ لیٹ کر قتل نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی کی آخری سانسوں میں اس کا بدن بے طرح تڑپتا پھڑکتا ہے مگر چارپائی پر پڑی مقتول کی لاش کو دیکھ کر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرتا تھا اور...... مقتول کی مبینہ بیوی نرگس بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے آئندہ آدھے گھنٹے میں موقع کی کارروائی مکمل کی پھر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے کے بعد وہاں موجود افراد کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔ جب اس کوشش میں مجھے خاطر خواہ کامیابی نہ ملی تو میں نے تمام لوگوں کو گھر سے باہر نکالا اور گھر کی مالکن کو لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

بیوہ خاتون نعمت بی بی کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ ایک فربہ اور پستہ قامت عورت تھی۔ آنکھوں پر اس نے نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔

"نعمت بی بی! تم اس اندوہناک واقعے کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں پتر!" وہ ڈرے سہمے انداز میں بولی۔ "میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، رات کو یہ دونوں جی ٹھیک ٹھاک سوئے تھے۔"

"رات کو ٹھیک ٹھاک سوئے تھے......" میں نے تشویش بھرے انداز میں اسی کے الفاظ دہرائے اور کہا۔ "اب ان دونوں میں سے ایک قتل ہو چکا ہے اور دوسری منظر سے غائب ہے۔ تم مجھے مقتول کی بیوی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟"

"کیا......؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

"یہی کہ وہ کہاں چلی گئی ہے......؟"

"تھانے دار پتر! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، وہ دونوں میاں بیوی رات کو بیٹھک میں سوئے تھے۔" وہ سادگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پچھلے دن آپ نے تھانے میں انہیں خوب ڈانٹا تھا۔ ان لوگوں نے رات کو مجھے ساری کہانی سنا دی تھی۔ وہ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ صبح اٹھوں گی تو یہ حادثہ پیش آ چکا ہو گا۔"

"تو تمہیں اس واقعے کے بارے میں آج صبح پتا چلا ہے؟"

لاش کی حالت کو دیکھ کر میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ مقتول فرید کی موت نصف شب کے آس پاس واقع ہوئی ہو گی۔ خون کا جماؤ بھی میرے اس اندازے کی تصدیق کرتا تھا۔ نعمت بی بی نے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔

"ہاں...... مجھے صبح پتا چلا ہے۔"

"تمہیں کس طرح پتا چلا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "میرا مطلب ہے، کیا تم بیٹھک کے اندر گئی تھیں؟"

"ہاں، میں اندر گئی تھی...... بلکہ مجھے اندر جانا پڑ گیا تھا۔"

''کیوں......؟'' میں نے چونک کر نعمت بی بی کو دیکھا۔

''وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں اور تھوڑی دیر کے بعد نرگس بھی بیٹھک سے نکل آتی ہے۔ اس کے گھر والے کو ڈیوٹی پر منڈی جانا ہوتا تھا اور وہ فرید کے لیے ناشتا وغیرہ میرے گھر کے باورچی خانے ہی میں بناتی تھی۔ پچھلے دو تین دن سے تو یہی ہو رہا تھا جناب، کھانا پکانے اور کھانے پینے کے لیے میں نے انہیں اپنے برتن اور باورچی خانہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی، ایک گہری سانس لے کر تنفس کو درست کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

''فرید کے ناشتے کا وقت ہو گیا تھا اور نرگس بیٹھک سے باہر نہیں نکلی تو مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے سوچا، جا کر پوچھوں تو سہی کہ ان لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔ بیٹھک کا ایک دروازہ باہر گلی میں اور دوسرا گھر کے اندر کھلتا ہے۔ میں نے اندرونی دروازے پر دستک دی۔ اس کے ساتھ ہی نرگس کو آواز بھی دی۔ پتا ہے جناب، پھر کیا ہوا؟''

نعمت بی بی نے اتنا اچانک یہ سوال کیا کہ میں چونک اٹھا، چونکہ اس کے استفسار کا جواب مجھے معلوم نہیں تھا اس لیے بڑی سادگی سے کہہ دیا۔

''نہیں پتا......!''

''میں سمجھ رہی تھی کہ شاید آج ان کی آنکھ نہیں کھلی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں نے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو دوسرا ہی معاملہ نکلا۔''

میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''کون سا دوسرا معاملہ؟''

''یہ لوگ رات کو سوتے وقت بیٹھک کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لیا کرتے تھے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''لیکن میرے دروازہ بجانے پر اندر سے کوئی جواب نہ آیا اور ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی دروازہ کھل گیا حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، رات کو انہوں نے دروازے کو کنڈی لگائی تھی۔''

''اوہ......!'' میں نے متذبذب نظر سے نعمت بی بی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''تو کیا دروازہ کھلا پا کر تم بیٹھک کے اندر چلی گئی تھیں؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر ایک جھرجھری لے کر بتانے لگی۔ ''میں بیٹھک میں پہنچی تو دیکھا کہ فرید چارپائی پر مردہ پڑا تھا اور نرگس کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔''

''اور گھر کے داخلی دروازے کی کیا پوزیشن تھی؟''

''وہ......وہ جی......وہ بھی کھلا پڑا تھا۔'' وہ لکنت زدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا مطلب ہے جی...... دروازہ تو بند ہی تھا لیکن اس کی کنڈی اتری ہوئی تھی جبکہ رات کو سوتے وقت میں نے یاد سے دروازے کی کنڈی چڑھائی تھی۔''

''تم بیٹھک میں داخل ہوئیں تو فرید چارپائی پر مردہ پڑا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اپنے کرایے دار کی لاش دیکھنے کے بعد تم نے کیا، کیا؟''

''کرنا کیا تھا جی......'' وہ اپنے ہاتھوں کو افسوس ناک انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''میں گھر سے باہر نکل آئی اور آس پڑوس والوں کو اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجن سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ انہی میں سے کسی نے تھانے جا کر اطلاع دی اور آپ تفتیش کرنے میرے گھر آ گئے...... اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی جناب......''

''معاملہ خاصا الجھا ہوا ہے نعمت بی بی!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''کیا تم نرگس کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتی ہو؟''

''نہیں جی...... بالکل نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

''اور فرید کے قتل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''تمہاری نظر میں یہ کام کس نے کیا ہوگا؟''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھانے دار جی۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔ ''ان لوگوں کو اس علاقے میں آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ یہاں ان کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔''

''یہاں ان کے کتنے دوست ہیں اور کتنے دشمن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اہم نکتہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی پیش آیا وہ کسی دوست کا کام نہیں ہو سکتا۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے نعمت بی بی کو دیکھا اور کہا۔

''نرگس کی پراسرار گمشدگی دو راستوں کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ نمبر ایک، وہ فرید کو قتل کر کے کہیں فرار ہو گئی ہے۔ نمبر دو، فرید کا قاتل جو کوئی بھی ہے وہ نرگس کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ ساتھ لے جانے والے معاملے پر بھی دو راہیں

کھلتی ہیں...... یا تو قاتل زبردستی نرگس کو اپنے ساتھ لے گیا ہے اور یا پھر وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے۔ اگر مرضی والی بات پر غور کیا جائے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نرگس، قاتل کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے نعمت بی بی؟''

''جی...... میں کیا...... بتا سکتی ہوں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''مجھے تو نہیں لگتا کہ نرگس نے فرید کو قتل کیا ہوگا۔''

''تمہیں کس بنا پر ایسا نہیں لگتا؟'' میں نے پوچھا۔

''تھانے دار جی! ابھی ان کی شادی کو ایک سال ہوا تھا۔'' وہ متاملانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ دونوں روزی روٹی کے چکر میں اپنے گاؤں سے یہاں آئے تھے۔ میں نے پچھلے تین، چار دنوں میں انہیں بڑے پیار اور اتفاق سے رہتے دیکھا ہے۔ میں نہیں سوچ سکتی کہ نرگس نے فرید کو قتل کیا ہوگا۔''

''نرگس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے یا نہیں، میں بہت جلد اس حقیقت کو کھوج نکالوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم ان میاں بیوی کے بارے میں جو کچھ بھی جانتی ہو وہ مجھے بتاؤ؟''

''میں تو جی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا نرگس نے مجھے بتایا تھا۔''

''میں بھی وہی پوچھ رہا ہوں......؟''

میرے استفسار کے جواب میں نعمت بی بی نے مجھے جو تفصیل سنائی وہ بہ عین وہی تھی جو گزشتہ روز تھانے میں نرگس اور فرید کی زبانی مجھ تک پہنچی تھی۔ کوئی نئی بات نہ پا کر میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔

''یہ کہانی انہوں نے مجھے بھی سنائی تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان کے بیان پر بالکل یقین نہیں آیا تھا اسی لیے میں نے کل ہی اپنے ایک بندے کو موضع رتاں والی روانہ کر دیا تھا تاکہ ان کے سچ جھوٹ کا اندازہ ہو سکے۔ وہ بندہ آج کسی وقت واپس آ جائے گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نظر ہو جائے گا۔'' میں نے توقف کر کے سوچتی ہوئی نظر سے نعمت بی بی کو دیکھا اور ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

''جب تم دروازہ کھلا پا کر بیٹھک میں داخل ہوئیں تو تم نے فرید کو مردہ حالت میں چارپائی پر پڑا پایا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، اس وقت بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا یا بند تھا؟''

''وہ دروازہ تو بند تھا جی......'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''صرف بند تھا یا کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی؟''

''کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کنڈی بھی چڑھی ہوئی تھی۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں دہرایا پھر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، نرگس بیٹھک کے اندرونی دروازے سے نکل کر صحن میں پہنچی ہو گی اور پھر گھر کا بیرونی داخلی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ہو گی۔''

''ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔'' وہ قیاس آرائی کے انداز میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''ان تین چار دنوں میں کوئی ان سے ملنے بھی آیا تھا...... خاص طور پر پچھلی رات......؟''

''نہیں جی...... کوئی نہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''نعمت بی بی! پچھلی رات تمہیں ٹھیک طرح نیند آئی تھی یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ''جی...... جی...... میں تو ٹھیک ہی سوئی تھی اور ٹھیک وقت پر صبح میری آنکھ بھی کھلی تھی لیکن آپ یہ سوال...... کیوں کر رہے ہیں؟''

''یہ سوال میں نے اس لیے کیا ہے کہ......'' میں نے نعمت بی بی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فرید کو جس طرح سینے میں خنجر اتار کر موت کی نیند سلایا گیا ہے وہ نظر انداز کر دینے والی بات نہیں۔ یہ کام چپ چاپ خاموشی سے نہیں ہوا ہوگا۔ فرید نے زندگی ہارنے سے پہلے بھرپور مزاحمت کی ہو گی۔ کیا پچھلی رات تم نے ایسی آوازیں سنی تھیں جن سے اندازہ ہو کہ بیٹھک میں کچھ گڑبڑ ہے؟''

''نہیں جناب، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''میں رات کو جب سوئی تو پھر صبح ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ بیٹھک میں رات کو کیا واقعہ پیش آیا اس بارے میں، میں بالکل نہیں جانتی۔''

''ایک بات بتاؤ نعمت بی بی!'' میں نے سوال و جواب کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے اس جوڑے کو آنکھیں بند کر کے اپنی بیٹھک کرایے پر دے دی تھی یا ان کے بارے میں کچھ پوچھ پڑتال بھی کی تھی؟''

''پوچھ پڑتال کہاں سے کرتی جی۔'' وہ بے بسی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''ان لوگوں کو یہاں کوئی نہیں جانتا، میں کس کے پاس جا کر تصدیق کرتی یا کس کی ضمانت پر انہیں بیٹھک کرایے پر دیتی......'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی اس لیے

میں نے انہیں، رہنے کے لیے بیٹھک کرایے پر دے دی۔"

"ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں......؟"

"سیدھی سی بات ہے جناب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "انہیں رہنے کے لیے ایک کمرا چاہیے تھا اور مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے انہیں گھر کی بیٹھک کرایے پر دے دی۔"

"تم نے ان کے ساتھ کتنا کرایہ طے کیا تھا؟"

"دس روپے مہینا۔" نعمت بی بی نے جواب دیا۔

نعمت بی بی کے جواب سے پریشان یا حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے میں ایک عام آدمی کی ماہانہ تنخواہ تیس سے پچاس روپے تک ہوا کرتی تھی۔ اس حساب سے کرایہ ماہانہ آمدنی کا لگ بھگ تیس فیصد تھا۔ لوگ خوامخواہ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ آج بھی پندرہ ہزار کمانے والا پانچ ہزار روپے کرایے کے گھر میں رہتا ہے۔ نہ تو چیزوں میں کوئی بدلاؤ آیا ہے اور نہ ہی انسان کی ضروریات زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔

میں نے نعمت بی بی سے سوال کیا۔ "انہوں نے تمہیں کرایے کی مد میں کچھ رقم ایڈوانس بھی دی تھی؟"

"نہیں جی......" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "فرید نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تنخواہ ملتے ہی وہ مجھے دو ماہ کا کرایہ ایک ساتھ دیدے گا۔"

"فرید کا وعدہ اور یقین دہانی تو اس کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔" میں نے خیال افروز لہجے میں کہا۔ "اب تم کسی کرایے وغیرہ کی توقع نہیں رکھنا۔"

"ظاہر ہے جی...... اب مجھے کون کرایہ دے گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی پھر تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ "تھانے دار جی! میں اس واقعے کی وجہ سے کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس جاؤں گی......؟"

"یہ سب کچھ تو تمہارے ہاتھ میں ہے نعمت بی بی!" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے جی......؟" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"مطلب...... بہت سیدھا سادا ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے، اگر وہ صداقت پر مبنی ہے تو پھر تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور اگر...... تم نے مجھ سے کوئی غلط بیانی کی تو پھر تم کسی بھی خطرناک صورت حال کے لیے تیار رہنا۔"

"نہیں جناب......" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ سے کوئی جھوٹی بات نہیں کی۔"

"بس تو پھر تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی پرچھائیں لہرانے لگی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، نعمت بی بی ایک بیوہ عورت تھی۔ اس کے شوہر کرامت علی کو فوت ہوئے کئی سال گزر گئے تھے۔ کرامت علی مرتے وقت نعمت بی بی کے لیے دو چیزیں چھوڑ گیا تھا۔ ایک یہ مختصر سا مکان اور دوسرے تین ایکڑ زمین۔ اس زمین کو نعمت بی بی نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا اور وہاں سے اتنا اناج آجاتا تھا کہ اس کی اچھی خاصی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے مکان کی بیٹھک کو اکثر و بیشتر کرایے پر اٹھا دیتی تھی۔

میں نعمت بی بی کے گھر سے واپس آنے لگا تو اس نے پوچھا۔ "جناب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بیٹھک میں سے خون وغیرہ صاف کر دوں؟"

"ابھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "جب تک لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہو جاتا، اس کمرے کی ہر شے جوں کی توں رہے گی بلکہ یوں سمجھو کہ میں تمہارے گھر کی اس بیٹھک کو تالا بند کر کے جا رہا ہوں۔"

اس نے میری اس بات پر کوئی بھی اچھا یا برا ردعمل ظاہر نہیں کیا اور میں اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد گھر سے نکل آیا۔

❀❀❀

جب میں تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ برکت باجوہ میرے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے فوراً اسے کمرے میں بلا لیا۔ باجوہ، منڈی مرید کے میں آڑھتی تھا اور مقتول فرید اس کے پاس بطور منشی کام کر رہا تھا۔

"تھانے دار صاحب! میں نے سنا ہے کہ فرید کو کسی نے قتل کر دیا ہے......؟" اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے اس کی لاش کو اسپتال بھجوا دیا ہے۔"

"یہ سب کیسے ہو گیا جناب......!" اس کے لہجے سے گہری تشویش جھلکتی تھی۔

"میں بھی یہی پتا لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر آپ اس سلسلے میں کچھ جانتے ہیں تو مجھے بتائیں۔"

"مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے جناب۔" وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو اسے میرے پاس کام کرتے ہوئے دو تین دن ہی گزرے تھے اور...... مجھے پتا چلا ہے کہ اس کی بیوی بھی غائب ہے۔"

"آپ کو بالکل درست پتا چلا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور مقتول کی بیوی کی گمشدگی نے اس کیس کو بہت ہی تشویش ناک بنا دیا ہے۔"

"کہیں جناب یہ......" وہ آنکھیں سکیڑ کر خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "قتل اور اغوا کی کوئی سنگین واردات تو نہیں......؟"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ "اور ایسا نہیں بھی ہو سکتا۔"

"جی، میں سمجھا نہیں۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی اس دہری بات کا مطلب کیا ہے جناب؟"

"بہت سیدھا سا مطلب ہے باجوہ صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "عین ممکن ہے کہ یہ قتل اور اغوا کی واردات ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نرگس نے خود ہی اپنے شوہر فرید کو قتل کیا ہو اور راتوں رات کہیں فرار ہو گئی ہو۔"

"وہ ایسا کیوں کرے گی تھانے دار صاحب......" وہ متاملانہ لہجے میں بولا۔ "ان کی شادی کو ابھی بہ مشکل ایک سال گزرا ہے اور وہ رزق روزگار کے سلسلے میں یہاں آئے تھے۔ فرید نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیوی بڑی محبت کرنے والی عورت ہے۔"

"باجوہ صاحب!" میں نے آڑھتی برکت باجوہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے سوال کے مطابق نرگس نے فرید کو قتل کیوں کیا ہوگا، یہ تو میں اس سے اس وقت پوچھوں گا جب وہ میرے ہتھے چڑھے گی اور جہاں تک ان کی شادی کی عمر کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں کوئی فارمولا وضع نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی شخص اپنے شریک حیات کو شادی کے فوراً بعد بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور سال، دو سال یا پانچ، دس سال کے بعد بھی وہ ایسا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔"

"اس صورت حال نے مجھے تو ذہنی طور پر بہت الجھا دیا ہے جناب۔" وہ تشویش ناک انداز میں بولا۔ "فرید کی موت مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔"

"آپ اپنے ذہن اور ہاضمے کو قابو میں رکھیں باجوہ صاحب۔ ابھی مجھے آپ سے ضروری معلومات حاصل کرنا ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تو اچھا ہو گیا کہ آپ خود ہی تھانے تشریف لے آئے ہیں ورنہ مجھے بندہ بھیج کر آپ کو یہاں بلوانا پڑتا۔"

"مث...... مثلاً...... کیسی معلومات......؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"مثلاً یہ کہ......" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ فرید کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں جی!" وہ قطعی انداز میں بولا۔ "بالکل نہیں جناب!"

"آپ نے ایک اجنبی شخص کو اپنے پاس ملازم رکھنے سے پہلے اس کے بارے میں کوئی چھان بین تو ضرور کی ہو گی؟"

"نہیں جناب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس کی زبان پر بھروسا کر کے اسے نوکری دے دی تھی"

"زبان پر بھروسا کر کے......!" میں نے خود کلامی کے انداز میں برکت باجوہ کے الفاظ دہرائے اور پوچھا "مقتول نے اپنے بارے میں آپ کو کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ وہ......" برکت باجوہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اُن کی شادی کو لگ بھگ ایک سال ہوا تھا۔ فرید گاؤں کی زندگی میں خود کو زیادہ فٹ محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے وہ روزگار کے سلسلے میں یہاں آگیا تھا۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ بہ خوبی لکھنا پڑھنا جانتا ہے تو میں نے اسے اپنے پاس منشی رکھ لیا۔ سچی بات تو یہ ہے جناب......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ان دنوں مجھے اپنے کاروبار کے لیے ایک منشی کی اشد ضرورت تھی اور دوسری طرف فرید بھی مجھے انتہائی ضرورت مند نظر آیا لہٰذا کسی قسم کی جانچ پڑتال کے بغیر میں نے اسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا۔"

"وہ کم و بیش تین دن تک آپ کے پاس کام کرتا رہا......" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس دوران میں آپ نے اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی معاملہ دیکھا؟"

"غیر معمولی معاملہ......!" وہ پُرسوچ انداز میں

بولا۔ ”جناب پرسوں رات آپ کے بندے ان دونوں میاں بیوی کو پکڑ کر تھانے لے گئے تھے اور اگلی صبح آپ نے ایک اہل کار کو تصدیق کے لیے میرے پاس بھیجا تھا۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور واقعہ ......“ میں نے کہا۔ ”خاص طور پر کل دن میں آپ نے کوئی ایسی بات نوٹ کی ہو جسے خلاف معمول کہا جا سکے......؟“

”نہیں جی ......“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔“

”پچھلے دو چار دنوں میں کوئی شخص مقتول سے ملنے آیا ہو؟“

جب برکت باجوہ نے میرے اس سوال کا بھی نفی میں جواب دیا تو پھر میں نے اس سے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اس ہدایت کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔ ”باجوہ صاحب! اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیے گا اور مقتول کے بارے میں اگر کوئی بھی چھوٹی بڑی بات آپ کے علم میں آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔“

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا پھر پوچھا۔ ”آپ نے اس واقعے کی اطلاع رتاں والی بھی پہنچائی ہے یا......“

”میں اپنے ایک بندے کا انتظار کر رہا ہوں۔“ باجوہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے کہہ دیا۔ ”جس طرح کل میں نے ایک بندہ بھیج کر آپ سے اور نعمت بی بی سے مقتول اور اس کی مبینہ بیوی نرگس کے بیان کی تصدیق کرائی تھی، اسی مقصد کے لیے میں نے اپنے عملے کا ایک بندہ موضع رتاں والی بھی روانہ کیا تھا۔ وہ اب تب میں آنے ہی والا ہے۔ ذرا ادھر کی رپورٹ مجھے مل جائے تو پھر میں رتاں والی جانے یا اس واقعے کی اطلاع وہاں پہنچوانے کے بارے میں فیصلہ کروں گا۔“

برکت باجوہ مزید دس منٹ تک میرے پاس رکا پھر اپنی دکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں اس عجیب و غریب قتل کی واردات کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس واقعے میں بہت سی باتیں میرے لیے الجھن کا باعث تھیں۔ پہلے تو مجھے ان کے میاں بیوی ہونے پر ہی یقین نہیں تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، فرید نرگس کو بھگا کر لایا تھا۔ ایک یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ فرید قتل ہو گیا تھا اور نرگس موقعے سے غائب تھی۔ اس سے دھیان اس امر کی جانب جاتا تھا کہ ہو نہ ہو، نرگس ہی نے فرید کو قتل کر دیا ہو اور پھر کہیں فرار ہو گئی ہو لیکن کہاں......؟

اس ”کہاں ؟“ کا جواب حاصل کرنے کے لیے میرے پاس ایک ترکیب تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ حالات اس ترکیب کو آزمانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ گزشتہ رات ہونے والی بارش اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ کیونکہ بارش کی وجہ سے ہر طرف اتنا پانی کھڑا ہو گیا تھا کسی کھوجی کی خدمات حاصل کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ایک اور بات بھی میرے دل میں کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ نعمت بی بی کے بیان کے مطابق، جب وہ صبح نرگس کو اٹھانے کے لیے گئی تو بیٹھک کا اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا، علاوہ ازیں گھر کے داخلی دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی جبکہ نعمت بی بی کو اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو سوتے وقت اس نے بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھائی تھی۔ یہ بات بھی اس کی یادداشت میں محفوظ تھی کہ نرگس نے بھی اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ فرید کو نرگس ہی نے قتل کیا تھا اور وہ بیٹھک کا دروازہ کھول کر صحن میں آئی تھی پھر گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر وہاں سے فرار ہو گئی تھی ......تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ......فرار ہونے کے لیے نرگس نے بیٹھک کا بیرونی دروازہ استعمال کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ راستہ اس کے لیے سب سے آسان ثابت ہوتا۔ اس نے خوا مخواہ ایک پے چیدہ راہ کیوں اختیار کی......؟

ان تمام تر سوال کے علاوہ ایک اور اہم پہلو بھی میری نظر میں تھا اور وہ یہ کہ فرید کو سینے میں خنجر گھونپ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس صورت میں اس کی جانب سے شدید ترین مزاحمت کا مظاہرہ دیکھنے کو ملنا چاہیے تھا جو کہ جائے وقوعہ پر کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ سینے پر خنجر کھانے والا آدمی بڑا تڑپتا پھڑکتا ہے۔ آسانی سے اس کی جان نہیں نکلتی۔ وہ حلق کے بل چیختا چلاتا ہے اور لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارتا ہے مگر گزشتہ رات ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ نعمت بی بی کی سماعت تک ایسی کوئی آواز نہیں پہنچی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ بیٹھک میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اب اس پُراسرار اور ”خاموش“ قتل کا ایک ہی سبب سمجھ میں آتا تھا کہ اس کے معدے میں کوئی زود اثر، خواب آور شے اتار دی گئی ہو......اگر ایسا کچھ تھا تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس راز سے پردہ اٹھا سکتی تھی!

میں نے گھوم پھر کر جائے وقوعہ کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ بیٹھک نامی اس کمرے میں دو دروازے اور ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی اندرونی دیوار میں تھی جو صحن کی جانب کھلتی تھی ......اور وہ کھلی ہوئی تھی۔ شدید ترین گرمی کے موسم میں دونوں دروازے بند

کر کے سونے کا راز یہی تھا کہ وہ لوگ کھڑکی کو کھلا چھوڑ دیتے تھے پھر گزشتہ رات تو وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا جس سے گرمی کی حدت اور شدت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی۔ بہرحال، یہ کیس اور اس کی تفتیش ایک خاص مقام پر آ کر رک گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ تو ایک دو روز کے بعد ہی آنا تھی۔ مجھے اس وقت حنیف کی واپسی کا شدت سے انتظار تھا۔ حنیف کی خالہ رتاں والی میں رہتی تھی اور میں نے اسے مقتول اور اس کی مبینہ بیوی نرگس کے بیانات کی تصدیق کے لیے کل رتاں والی روانہ کیا تھا۔

حنیف کی روانگی سے لے کر اب تک صورت حال میں خاص تبدیلی آ چکی تھی۔ جس شخص کے بیان کی جانچ پڑتال کے لیے وہ رتاں والی گیا تھا...... اب وہ ایک لاش کی صورت میں سرکاری اسپتال بھجوایا جا چکا تھا اور اس اندوہناک واقعے کی اطلاع رتاں والی پہنچانا بھی ضروری تھا لیکن میں حنیف کی آمد سے پہلے کوئی بھی عملی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا اور اس کا ایک تکنیکی سبب تھا!

یہ بات نرگس اور مقتول فرید کی زبانی مجھے پتا چلی تھی کہ ان کا تعلق موضع رتاں والی سے تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ انہوں نے راست گوئی ہی سے کام لیا ہو۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ کسی اور علاقے سے یہاں آئے ہوں چنانچہ جب تک حنیف آ کر ان دونوں کے بیان کی تصدیق یا تردید نہ کر دیتا، رتاں والی کا رخ کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں بے چینی سے حنیف کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

٭٭٭

حنیف دوپہر کے وقت تھانے پہنچا تو وہ اکیلا نہیں تھا......!

وہ بارش کو بھی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کی آمد سے چند منٹ پہلے ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور جیسے ہی اس نے تھانے کی حدود میں قدم رکھا، بارش نے زور پکڑ لیا۔ میرے کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ اچھا خاصا بھیگ چکا تھا۔

اس نے میرے پاس آ کر سلام کیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”حنیف! پہلے تم اپنا لباس تبدیل کرو، پھر بات کرتے ہیں......“

”جناب! میں رتاں والی سے بڑی سنسنی خیز خبریں لایا ہوں۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ”آپ سنیں گے تو دنگ رہ جائیں گے......“

”یہاں بھی کچھ کم سنسنی نہیں پھیلی ہوئی......“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہارا فوراً لباس تبدیل کرنا بھی ضروری ہے ورنہ تم بیمار بھی پڑ سکتے ہو!“

”میں ابھی دو منٹ میں، حاضر ہوتا ہوں ملک صاحب......!“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

حنیف کی بات نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ اگر وہ رتاں والی سے سنسنی خیز خبریں لایا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مقتول فرید اور اس کی مبینہ بیوی نے جو بیان دیا تھا اس میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ ورنہ اگر سب کچھ ٹھیک تھا تو پھر سنسنی خیزی کیسی......؟

دو منٹ تو نہیں البتہ، لگ بھگ آٹھ منٹ کے بعد حنیف دوبارہ میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔ ”ہاں بھئی! اب بتاؤ، تم رتاں والی سے کون سی خبریں لائے ہو؟“

جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”ملک صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ کسی نے فرید کو قتل کر دیا ہے اور......اس کی بیوی بھی غائب ہے......؟“

لباس کی تبدیلی کے دوران میں عملے کے کسی آدمی نے حنیف کو نعمت بی بی کی بیٹھک میں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

”تمہیں بالکل ٹھیک پتا چلا ہے لیکن اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم مجھے وہاں کی سناؤ۔ رتاں والی کی رپورٹ کیا ہے......؟“

”جناب، وہاں کی رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”ان دونوں بندوں نے ہمارے ساتھ بہت سے جھوٹ بولے ہیں......“

”مثلاً......!“ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ”ان لوگوں نے کس قسم کی دروغ گوئی کی تھی؟“

”ان کا بیان صرف اس حد تک درست ہے کہ وہ موضع رتاں والی کے رہنے والے تھے۔“ حنیف مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ”یا پھر یہ کہ انہوں نے اپنے والدین کے نام درست بتائے تھے۔ باقی سب گھپلا ہی گھپلا ہے ملک صاحب......!“

”کہیں تم ...... یہ تو نہیں کہنا چاہ رہے کہ وہ دونوں...... میاں بیوی نہیں تھے؟“ میں نے سب سے پہلے اپنے ذہن میں موجود خدشے کی تصدیق ضروری جانی۔

حنیف نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔ ”آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں جناب۔ ان کی شادی ہوئی ہی نہیں تھی۔ رتاں والی میں مولوی شرافت علی نامی ایک پیش امام

بھی موجود ہیں تاہم انہوں نے فرید اور نرگس کا نکاح نہیں پڑھایا تھا۔“

”کیا تمہاری تفتیش سے گاؤں والوں پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی ہے کہ فرید اور نرگس میاں بیوی کی حیثیت سے ہمارے علاقے میں رہ رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، رہ رہے تھے......؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”بالکل نہیں جناب!“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس بات کا خاص طور پر دھیان رکھا ہے کہ کسی کو رتاں والی میں میری آمد کے مقصد کا پتا نہ چلے۔ میں نے یہ تمام تر معلومات اپنی خالہ آمنہ کے توسط سے حاصل کی ہیں۔“

”شاباش!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب ذرا جلدی سے بتادو کہ تمہاری خالہ نے تمہیں کس قسم کی سنسنی خیز خبریں دی ہیں؟“

”جناب! پہلی بات تو یہ کہ......“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”فرید اگست کی دو تاریخ کو رتاں والی سے روانہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا کہ وہ ہفتے دس دن کے لیے لاہور جارہا ہے۔ لاہور میں عرفان نامی اس کا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ اسی کے پاس جانے کا کہہ کر گھر سے نکلا تھا......“

”اور نرگس......؟“ حنیف سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”اس لڑکی کا کیا قصہ ہے؟“

”نرگس ایک منگنی شدہ لڑکی ہے جناب!“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”گاؤں ہی کے ایک شخص جاوید سے اس کی منگنی ہوچکی ہے اور عنقریب ان کی شادی بھی ہونے والی تھی کہ......“

”کہ کیا......؟“

”کہ...... چار اگست کی صبح وہ اچانک گاؤں سے غائب ہوگئی۔“ حنیف ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ”اور اب تک وہ وہاں واپس نہیں پہنچی۔ رتاں والی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اس لیے نرگس کی گم شدگی کی خبر چند گھنٹوں سے زیادہ چھپی نہیں رہی۔ اس وقت گاؤں کا بچہ بچہ اس راز سے واقف ہے کہ یعقوب اور عائشہ کی بیٹی نرگس کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے...... کس کے ساتھ؟ اس بارے میں مختلف قسم کی باتیں ہورہی ہیں۔ کوئی متفقہ رائے سامنے نہیں آئی......“ وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”رتاں والی کا صرف ایک بندہ اس وقت گاؤں سے باہر ہے اور وہ ہے، فرید۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ نرگس، فرید کے ساتھ ہی کہیں بھاگ گئی ہے لیکن فرید کا باپ کرم دین اس الزام کی پرزور تردید کررہا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ فرید تو نرگس کی گم شدگی سے دو دن پہلے اپنے دوست سے ملنے لاہور چلا گیا تھا، وہ نرگس کو کس طرح بھگا کر لے جاسکتا ہے۔ یہ ہے ساری صورت حال جناب......“

”خاصی دلچسپ اور سنسنی خیز صورت حال ہے۔“ حنیف کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”اس تمام تر خرابے میں ایک امر وضاحت طلب ہے کہ نرگس کے ماں باپ کو اس کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرانے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ رتاں والی ہمارے تھانے کی حدود میں آتا ہے مگر یہ خبر ابھی تک ہمارے پاس نہیں پہنچی......“

”دو تین دن تو دونوں پارٹیوں نے بحث مباحثے میں گزار دیے ہیں۔“ حنیف نے بتایا۔ ”تازہ ترین یہ ہے کہ کل کسی وقت کرم دین لاہور جائے گا تاکہ یہ پتا چلایا جاسکے کہ فرید اپنے دوست عرفان کے پاس ہی موجود ہے یا وہاں سے کہیں اور چلا گیا ہے۔ نرگس کے گھر والے بھی اسے مختلف رشتے داروں کے ہاں ڈھونڈنے کی کوشش کررہے ہیں۔“

”ان حالات میں جاوید کے کیا تاثرات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

حنیف کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ نرگس کی جاوید نامی ایک شخص سے منگنی ہوچکی تھی اور مستقبل قریب میں ان کی شادی ہونے والی تھی۔ اس واقعے کی روشنی میں نرگس کے منگیتر جاوید کا نقطۂ نظر جاننا بھی بہت ضروری تھا۔

”جناب! وہ تو ٹھنڈا ٹھار سکون سے بیٹھا ہوا ہے......!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اسے کوئی پروا نہیں کہ نرگس کہاں گئی ہے......“

”یہ کیا بات ہوئی!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”نرگس کی جاوید کے ساتھ شادی ہونے والی تھی پھر بھی وہ اس کی گم شدگی پر خاموش کیوں بیٹھا ہوا ہے؟“

”ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ جاوید نے اپنے باپ کے زور دینے پر نرگس سے شادی کی ہامی بھری تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ وہ اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دراصل جاوید کے باپ اور نرگس کے باپ میں بڑی گہری دوستی ہے۔ اسی دوستی کے زیر اثر جاوید کا باپ اللہ رکھا اس کی شادی اپنے دوست کی بیٹی نرگس سے کرنا

چاہتا تھا جبکہ جاوید کی ماں شہناز، نرگس کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ وہ جاوید کی شادی اپنی بھانجی سے کرنے کی خواہاں تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اللہ رکھا اپنی سالی کو پسند نہیں کرتا اسی لیے وہ شہناز کی بھانجی عطیہ یعنی اللہ رکھا اپنی سالی کی بیٹی کو کسی بھی قیمت پر اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھا......“

”بعض اوقات خاندان میں رشتے داریاں عجیب گورکھ دھندے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”جاوید اس صورتِ حال میں خوش ہے یا ناخوش؟“

”میں نے بتایا ہے نا جناب......“ حنیف تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”وہ عجیب مست الست بندہ ہے۔ نہ تو وہ نرگس سے منگنی پر بہت زیادہ خوش تھا اور نہ ہی اس کی گم شدگی پر وہ پریشان ہے۔ لگتا ہے، جیسے اس واقعے کا اس کی صحت پر کوئی اثر ہی نہیں پڑا۔ وہ مزاج کے اعتبار سے ایک بے زار اور الجھا ہوا انسان نظر آتا ہے۔“

”ہاں بھئی...... دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”تم نے کیا بتایا ہے کہ فرید کا باپ کرم دین کل لاہور جائے گا؟“

”وہ کہہ تو یہی رہا تھا جناب لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس کا ارادہ بھی ہو۔“ حنیف نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، اس نے دوسری پارٹی کا منہ بند کرنے کے لیے ایسی بات کردی ہو اور اب......“ تھوڑی دیر کو رک کر اس نے ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔ ”اب تو اس کے لاہور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب اسے پتا چلے گا کہ فرید کو مریدکے میں قتل کردیا گیا ہے تو سیدھا وہ اسی طرف دوڑے گا۔“

”اور کرم دین کو اس حادثے کی اطلاع بھی تم ہی دوگے!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں......؟“

”بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک مرتبہ پھر مجھے رتاں والی کا رخ کرنا ہوگا......“

”تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن بارش تھم جانے کے بعد۔ تم اگر بار بار مینہ میں بھیگتے رہے تو یقیناً بیمار پڑجاؤ گے۔“

موضع رتاں والی، مریدکے سے لگ بھگ آٹھ میل کے فاصلے، پر مغرب میں واقع تھا۔ مریدکے سے ایک کچا راستہ رتاں والی گاؤں تک جاتا تھا جس پر سائیکل، تانگے اور بیل گاڑیاں وغیرہ محوِ سفر رہتی تھیں۔ حنیف نے رتاں والی آمد و رفت کے لیے اپنی سائیکل استعمال کی تھی۔

میں آئندہ آدھے گھنٹے تک اسے حالات سے آگاہ کرتا رہا۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہاں جاکر اسے کیا کہنا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس واقعے کی اطلاع پاتے ہی دونوں پارٹیاں تھانے پہنچ جائیں گی یعنی مقتول فرید کے گھر والے اور گم شدہ نرگس کے والدین۔ دونوں فریقین سے ملاقات کے بعد ہی اس معمے کا کوئی حل سامنے آسکتا تھا۔

جب سہ پہر تک بھی بارش نے رکنے کا ارادہ ظاہر نہ کیا تو میں نے حنیف کو رتاں والی بھجوانے کے لیے ایک تانگے کا بندوبست کروادیا۔ فرید کی اندوہ ناک موت کی خبر اس کے گھر والوں تک پہنچانا بہت اہم تھا۔

میں امید کررہا تھا کہ حنیف دو گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کے بعد واپس آجائے گا لیکن مغرب کی اذان تک بھی جب اس کی واپسی نہیں ہوئی تو میں تھانے سے اٹھ آیا۔ شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو میں نے خاص طور پر ہدایت کردی تھی کہ جیسے ہی حنیف واپس آئے مجھے بلالیا جائے۔

ان دنوں میری رہائش تھانے کے عقبی حصے میں واقع سرکاری کوارٹر میں تھی۔ جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، میں اپنے قیام کے لیے سرکاری کوارٹر ہی کو استعمال کرتا تھا۔ شادی کے بعد اور خصوصاً جب میں بچوں والا ہوگیا تو پھر میری یہی کوشش ہوا کرتی تھی کہ میں تھانے سے قریب ترین کسی محلے میں رہائش اختیار کروں۔ مجھے اپنی فیملی کو تھانے کی حدود میں رکھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

میں نے اپنے کوارٹر میں آکر مغرب کی نماز ادا کی پھر رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کوارٹر کے برآمدے...... میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک بارش کا زور تو ٹوٹ چکا تھا تاہم بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔

میرا ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ میں رات کا کھانا یعنی ڈنر مغرب اور عشا کی نماز کے درمیان کرلیا کرتا ہوں اور عشا کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں سونے کے لیے لیٹ جایا کرتا ہوں تاکہ فجر کی نماز کے لیے علی الصباح اٹھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ شہری زندگی میں ان فطری معمولات کا جاری رکھنا بہت مشکل ہے لیکن چونکہ گاؤں دیہات کا مزاج ہی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے اس لیے اس روٹین کو فالو کرنے کے لیے کوئی ہل لگتے ہیں اور نہ ہی بیل......!

میں اپنے کوارٹر کے برآمد میں آرام کرسی پر بیٹھا

فریداور نرگس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ حنیف کی زبانی جو حالات مجھ تک پہنچے تھے ان کی روشنی میں میرا ذہن ایک خاص زاویے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ نرگس، جاوید کی منگیتر تھی لیکن جاوید کو اس کی ذرا پروا نہیں تھی۔ میرے سامنے تھانے میں، بلکہ نعمت بی بی اور برکت باجوہ کو بھی فرید نے یہی بتایا تھا کہ نرگس اس کی بیوی ہے اور ان کی شادی ایک سال پہلے ہوئی تھی جبکہ یہ ایک کھلا جھوٹ تھا۔ اس صورت حال میں تو یہی کہا جاسکتا تھا کہ نرگس، جاوید کو قطعی ناپسند کرتی ہوگی جب کہ نرگس اور فرید میں پسندیدگی کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور استوار تھا جبھی وہ اس کے ساتھ نظر آرہا تھا۔

یہ امر بھی مصدقہ ہی نظر آتا تھا کہ چار اگست کی صبح نرگس نے فرید ہی کی خاطر رتاں والی کو خیرباد کہا تھا۔ جبکہ فرید دو دن پہلے رتاں والی سے نکل چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کس قسم کی منصوبہ بندی طے تھی، وہ دونوں کہاں پر ایک دوسرے سے ملے اور کیا سوچ کر انہوں نے مرید کے کا رخ کیا...... یہ تمام تر سوالات غور طلب تھے اور ان سب سے زیادہ تشویش ناک ایک سوال یہ بھی تھا کہ آیا انہوں نے آپس میں شادی کرلی تھی یا بغیر نکاح کے ایک چھت کے نیچے میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے؟

میں جیسے جیسے اس مسئلے پر سوچ کے گھوڑے کو دوڑانے لگا، میرا ذہن الجھتا چلا گیا۔ جب رات کے دس بجے تک بھی حنیف کی واپسی نہ ہوئی تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رات گزارنے کے لیے میں نے صحن کے بجائے برآمدے ہی میں چارپائی لگالی تھی کیونکہ بارش نے ایک مرتبہ پھر انگڑائی لے کر چھما چھم رقص شروع کردیا تھا۔

حنیف کے واپس نہ آنے کا بنیادی سبب بھی یہ بارش ہی تھی۔

❀❀❀

اگلی صبح بڑی روشن اور خوش گوار تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ٹکڑیوں کی صورت بادل دکھائی دیتے تھے تاہم مطلع مجموعی طور پر صاف تھا۔ نرم اور گوارا دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ صبح کا سماں تھا۔ اگر دن بھر یہی صورت حال رہتی تو پھر فضا کی خوش گواریت کو رفو چکر ہونے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ ساون اور بھادوں میں موسم کا یہی وتیرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ کی سی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

میں حسب معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو دس منٹ کے بعد مجھے حنیف کی آمد کی اطلاع مل گئی۔ وہ کل سہ پہر جس تانگے پر سوار ہوکر رتاں والی گیا تھا اسی میں اس کی واپسی بھی ہوئی تھی اور وہ اپنے ساتھ رتاں والی سے دو افراد کو بھی لے کر آیا تھا۔ نمبر ایک، مقتول فرید کا باپ کرم دین۔ نمبر دو، نرگس کی ماں عائشہ بی بی۔ میں نے فوراً ان لوگوں کو اپنے پاس بلالیا۔

کرم دین کی عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہوچکے تھے۔ اس کے بدن کی مضبوطی اس بات کو گواہی دیتی تھی کہ اس کی جوانی اور ادھیڑ عمری محنت و مشقت میں گزری تھی تاہم ان لمحات میں وہ بری طرح ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔ بیٹے کی موت کی اطلاع نے اس کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

عائشہ بی بی پچپن کے پیٹے میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ پستہ قد اور فربہ اندام عورت تھی۔ وہ شکل ہی سے تیز طرار اور ہوشیار لگتی تھی۔ نرگس کے خدوخال میں بڑی حد تک عائشہ کا عکس جھلکتا تھا۔

میں نے حنیف کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور کرم دین و عائشہ بی بی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ انہوں نے میری پیش کش کے مطابق عمل کیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی کرم دین امداد طلب انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نہایت ہی جامع اور مختصر الفاظ میں انہیں مقتول اور نرگس کی مرید کے میں آمد، رہائش اور اس اندوہ ناک واقعے کے بارے میں بتایا۔

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کرم دین پھٹ پڑا۔

''تھانے دار صاحب! یہ کیا غضب ہوگیا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''ایک ہفتہ پہلے تو فرید اچھا خاصا لاہور گیا تھا۔ اسے تقدیر مرید کے کیسے کھینچ لائی اور...... کس بدبخت نے میرے بچے کا خون کیا ہے......؟''

وہ چونکہ بے حد پریشان تھا لہٰذا ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ میں نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''میں بھی اسی بدبخت کی تلاش میں ہوں جس نے تمہارے بیٹے کی جان لی ہے اور اس سلسلے میں مجھے آپ دونوں کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے......'' بات ختم کرتے ہی میں نے باری باری اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کرم دین اور عائشہ بی بی کو دیکھا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ نرگس نے کیوں گھر چھوڑا؟'' عائشہ بی بی اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''اس کی تو منگنی ہوچکی تھی اور تین چار ماہ کے بعد شادی

ہونے والی تھی۔ پتا نہیں، وہ کس طرح فرید کے بہکاوے میں آگئی اور......''

''ایک منٹ عائشہ......!'' کرم دین نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرے بیٹے نے کسی کو نہیں بہکایا۔ پورا پنڈ جانتا ہے کہ وہ دو تاریخ کو لاہور گیا تھا اور تمہاری بیٹی چار تاریخ کو گھر سے غائب ہوئی ہے۔ تم خوامخواہ میرے بیٹے پر الزام لگانے کی کوشش نہیں کرو!''

''میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہی ہوں کرم دین۔'' عائشہ نے گھور کر کرم دین کی طرف دیکھا۔ ''تم نے سنا نہیں تھانے دار نے تھوڑی دیر پہلے ان دونوں کے بارے میں کیا بتایا ہے۔ وہ میاں بیوی بن کر یہاں رہ رہے تھے۔ ان کے ایک ساتھ پائے جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت آگے پیچھے گاؤں سے نکلے تھے۔ ہائے اللہ! میں کیا کروں......'' وہ باقاعدہ سینہ کوبی کرنے لگی۔ ''پتا نہیں، اس مردود نے میری بچی کے ساتھ نکاح بھی کیا تھا یا......!''

''خبردار! جو میرے مرحوم بیٹے کو مردود کہا۔'' کرم دین غصے سے دہاڑا۔

''ان دونوں نے نکاح کیا تھا یا نہیں، اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ یہ ہے کہ میرے بیٹے کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا ہے اور تمہاری بیٹی جائے وقوعہ سے غائب ہے۔ مجھے تو نرگس پر ہی شک ہے۔ تھانے دار صاحب......!'' وہ میری جانب متوجہ ہوا پھر قدرے تیز لہجے میں بولا۔

''میں اپنے بیٹے کے قتل کے سلسلے میں عائشہ کی بیٹی نرگس کے خلاف پرچہ کٹوانا چاہتا ہوں۔ آپ رپورٹ لکھیں جی۔''

''اس سے پہلے آپ میری رپورٹ درج کریں گے تھانے دار صاحب!'' عائشہ نے ترش لہجے میں کہا۔ ''کرم دین کے بیٹے نے میری معصوم بچی کو بہلا پھسلا کر بلکہ بہکا کر گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا اور پھر اسے کہیں غائب کرکے خود قتل ہوگیا۔ مجھے میری بچی چاہیے جناب، کرم دین جہاں سے بھی پوری کرے......''

''تمہاری مت ماری گئی ہے عائشہ بی بی!'' کرم دین لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا بات کردی تم نے کہ...... فرید نے تمہاری بیٹی کو غائب کیا اور خود قتل ہوگیا۔ بھلا کوئی اپنی رضا سے بھی قتل ہوتا ہے۔ تم اپنی بیٹی کے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ الٹی سیدھی باتیں کیوں کررہی ہو؟''

''الٹی سیدھی باتیں میں نہیں کررہی کرم دین!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے......!''

''بس!'' میں نے کڑک کر کہا۔ ''یہ تم لوگوں نے کیا تماشا لگا دیا ہے۔ یہ تھانا ہے، تمہاری خالہ جان کا گھر نہیں......''

میرے دبکے نے خاطر خواہ اثر دکھایا اور وہ خاموش ہوکر سہمی ہوئی نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے کرم دین کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم اس وقت کہاں بیٹھے ہوئے ہو......؟''

''جناب......!'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تھانے میں بیٹھا ہوں جی!''

''اور یہاں کا تھانے دار کون ہے؟''

''آپ ہیں جی تھانے دار......!''

''بس تو پھر تھانے داری بھی مجھے ہی کرنے دو!'' میں نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں نے یہاں آتے ہی مچھلی بازار کھول دیا ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے......؟''

''معاف کردیں جناب، میں جذبات میں آگیا تھا۔'' کرم دین نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''جوان بیٹے کی موت نے میرے دماغی توازن کو گڑبڑا کر رکھ دیا ہے۔''

''تمہارے بیٹے کی موت کا مجھے بھی گہرا صدمہ ہے اور میں پہلی فرصت میں اس کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں کو بھی اسی سلسلے میں یہاں بلایا ہے کہ اس کیس کو حل کرنے میں تم میری مدد کرو۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے تعاون کرنا تو رہا ایک طرف، تم تو الٹا آپس ہی میں جھگڑا کرنے لگے ہو۔ یہ تو میرا کام بگاڑنے والی بات ہے نا؟''

''میں تو آرام ہی سے بیٹھا ہوا تھا تھانے دار صاحب۔'' کرم دین عاجزی سے بولا۔ ''پہل تو عائشہ نے کی ہے۔''

''پہل میں نے نہیں، تم نے کی ہے کرم دین!'' وہ الجھ کر بولی۔

''میں نے کہا ہے...... بس!'' میں نے باری باری انہیں تیز نظر سے گھورا۔ ''کس نے پہل کی ہے اور کس نے دوج، اس بحث میں مت پڑو۔ یہ پہل دوج کھیلنے کا وقت نہیں

ہے۔ میں تم سے جتنی بات پوچھوں، بس اس کا جواب دو اور ......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"اور جب میں ایک سے بات کروں تو دوسرا بالکل چپ بیٹھے گا...... بالکل خاموش، میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا......؟"

انہوں نے بڑی شرافت سے اثبات میں گردنیں ہلا دیں۔

میں کرم دین کی طرف متوجہ ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تمہارا بیٹا فرید دو اگست کو یہ بتا کر گھر سے نکلا تھا کہ وہ ہفتہ، دس دن کے لیے اپنے کسی دوست کے پاس لاہور جا رہا ہے؟"

"جی ہاں...... حقیقت یہی ہے۔"

"اس کے بعد سے تمہیں اپنے بیٹے کی کوئی خیر خبر نہیں تھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کل جب میرے بندے نے تمہیں رتاں والی جا کر فرید کی الم ناک موت کے بارے میں آگاہ کیا تو تم پر غم کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ فرید کی موت کی خبر سن کر ہماری کیا حالت ہو گئی تھی۔ اس کی ماں کا تو رو رو کر برا حال ہے۔ ہماری تو دنیا ہی اجڑ گئی ہے تھانے دار صاحب......!"

"میں آپ لوگوں کے غم کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔" میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "فرید لاہور میں اپنے جس دوست کے پاس گیا تھا اس کا نام عارف ہی ہے نا......؟"

میں نے جان بوجھ کر مقتول کے لاہوری دوست کا نام غلط بتایا تھا، کرم دین جلدی سے بولا۔

"نہیں جناب...... اس کا نام عرفان ہے۔"

"فرید کی عرفان سے کب اور کس طرح دوستی ہوئی تھی؟" میں نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کرم دین کو کریدنا شروع کیا۔

"ان کی دوستی تو بہت پرانی ہے جناب...... بلکہ تھی۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ "عرفان بھی رتاں والی کا ہی رہنے والا ہے۔ پچھلے دو سال سے وہ روزگار کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا ہے اور مہینے دو مہینے میں وہ ایک آدھ بار گاؤں کا چکر لگا لیتا ہے۔"

"عرفان لاہور میں کیا کام کرتا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "اور اس نے رہائش وغیرہ کہاں رکھی ہوئی ہے؟"

"وہ لاہور میں، ڈبل روٹی بنانے والی کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے جو فیروز پور روڈ پر واقع ہے۔" کرم دین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "اور ادھر قریب ہی کسی آبادی میں اس نے کرایے پر مکان لے رکھا ہے۔"

کرم دین نے بعد میں مجھے بن اور ڈبل روٹی بنانے والی اس فیکٹری کا نام بھی بتایا تھا لیکن بہ وجوہ میں نے وہ نام یہاں ظاہر نہیں کیا۔ میں نے کرم دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بس، ایک آخری سوال...... اور اس کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دینا۔ تمہاری غلط بیانی بعد میں کوئی بہت بڑی مصیبت بھی کھڑی کر سکتی ہے......!"

وہ چوکنا نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جی پوچھیں۔ میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی آئندہ ایسی کوئی حرکت کروں گا۔"

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارے بیٹے فرید اور عائشہ بی بی کی بیٹی نرگس میں کوئی عشق محبت کی کہانی چل رہی تھی؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!" عائشہ چمک کر بولی۔

"میں نے تم سے پوچھا ہے......؟" میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"جناب! چند ماہ کے بعد نرگس کی شادی ہونے والی تھی۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ اس قسم کے کام میں کیسے ملوث ہو سکتی ہے اور جہاں تک......"

"میں نے کہا تھا نا، جب تک میں خود نہ پوچھوں، تم اپنی طرف سے کچھ نہیں بولو گی؟" میں نے غراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے جی۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی "اب میں کچھ نہیں بولوں گی......"

میں نے کرم دین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی، تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "جی، میرا خیال ہے...... فرید، نرگس کو پسند کرتا تھا......"

"کیا اس نے اپنی پسندیدگی کے بارے میں خود تمہیں بتایا تھا؟"

"مجھے تو نہیں بتایا تھا لیکن اس سلسلے میں اس نے اپنی

ماں سے ذکر کیا تھا۔" کرم دین نے جواب دیا۔ "مجھے اپنی بیوی نصیب بیگم کی زبانی پتا چلا تھا"

"کیا نرگس بھی اسے پسند کرتی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا جناب......!"

"تم اپنے بیٹے کے کسی دشمن کو تو جانتے ہو گے؟"

"دشمن...... نہیں جناب، اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "وہ تو سب کو دوست بنا کر رکھتا تھا۔ بہت ہی ملنسار اور محبت کرنے والا تھا۔"

"کرم دین!" میں نے اسے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ "انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں انہی خیر خواہوں میں کہیں ایک آدھ دشمن بھی چھپا ہوتا ہے۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ مقتول کا کوئی دشمن نہیں تھا؟"

"جناب! میں جو جانتا تھا، وہ آپ کو بتا دیا ہے......" وہ بے بسی سے بولا۔

"تمہارے خیال میں فرید کو کسی دوست نے موت کے گھاٹ اتارا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "یہ کام کوئی دوست نہیں بلکہ کوئی دشمن ہی کر سکتا ہے۔"

"لیکن جناب......" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "آپ نے تو بتایا ہے کہ وہ اور نرگس یہاں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے اور نرگس اب غائب ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ......" وہ جملے کو ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے عائشہ بی بی کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھ لیں تھانے دار صاحب!" عائشہ خاموش نہ رہ سکی اور شکایت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "یہ کرم دین تو ہاتھ دھو کر میری بچی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ یہ نرگس کو فرید کا قاتل سمجھ رہا ہے......"

"کرم دین نے ایسی کوئی بات نہیں بلکہ مجھے یہ شک ہے کہ فرید کی موت میں کسی نہ کسی زاویے سے نرگس ضرور ملوث ہے یا کم از کم وہ قتل کی اس واردات کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے......" میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ تم دونوں کا ایک جگہ موجود رہنا ٹھیک نہیں اس لیے کرم دین......" میں نے کرم دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔ اگر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں اندر بلا لوں گا۔"

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں عائشہ بی بی کی طرف متوجہ ہو گیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھو عائشہ! اس حقیقت کو تو دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی کہ پچھلے تین چار دن تمہاری بیٹی نرگس یہاں مقتول فرید کے ساتھ، اس کی بیوی کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ فرید اسے زبردستی اغوا کر کے اپنے ساتھ نہیں لایا تھا بلکہ اس کام میں نرگس کی مرضی پوری طرح شامل رہی ہو گی اور اس "مرضی" کا میں بھی چشم دید گواہ ہوں......"

"جی کیا......" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔ "آپ نے ایسا کیا دیکھا تھا تھانے دار صاحب......؟"

"دو روز پہلے، ایک رات جب انہیں کھلے عام نازیبا...... حرکات کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے لایا گیا تھا تو میں نے ان کا تفصیلی انٹرویو کیا تھا!" میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "جبھی مجھے پتا چلا تھا کہ وہ دونوں اپنی مرضی اور خواہش سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ وہ میاں بیوی تھے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے لہٰذا یہ خیال تو ذہن سے نکال دو کہ نرگس کو اس کی مرضی کے خلاف اغوا کیا گیا تھا۔ اب ہم فرید کے قتل کی طرف آتے ہیں......"

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں نے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وقوعہ کی رات حسب معمول مقتول اور تمہاری بیٹی نرگس اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئے تھے لیکن اگلی صبح اسی کمرے میں مقتول فرید کی لاش پائی گئی اور تمہاری بیٹی جائے وقوعہ سے غائب تھی، اس لیے لامحالہ نرگس کی طرف دھیان جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی زاویے سے اس قتل کے راز میں ضرور شریک ہے۔ تمہاری عقل اس بارے میں کیا کہتی ہے عائشہ بی بی......؟"

"میری عقل تو بالکل کام نہیں کر رہی تھانے دار صاحب!" وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولی۔ "ایک بار نرگس مجھے مل جائے تو میں اُسی سے پوچھوں گی کہ یہ سارا چکر کیا ہے اور کس طرح پیش آیا ہے۔"

"مجھے بھی صرف اور صرف نرگس ہی کی تلاش ہے" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مقتول فرید تو اس دنیا سے جا چکا۔ وہ واپس آ کر میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا لہٰذا میری ساری امیدیں اب تمہاری بیٹی نرگس ہی سے بندھی ہوئی ہیں اسی لیے میں پہلی فرصت میں اسے تلاش

کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں سانس درست کرنے کے لیے رکا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''عائشہ بی بی! تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہو؟''

''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ نرگس جلد از جلد مل جائے۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن خدا گواہ ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

اس بات کا مجھے بھی بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ عائشہ بی بی اپنی بیٹی کی گم شدگی یا غیاب کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور اس حوالے سے میں اس پر کوئی دباؤ بھی نہیں ڈال رہا تھا۔ میں تو کسی ایسے سرے کی تلاش میں تھا جسے تھام کر میں قاتل تک رسائی حاصل کر سکوں اور یہ سرا نرگس تک پہنچنے کے بعد ہی میرے ہاتھ آ سکتا تھا۔ میں دوبارہ عائشہ بی بی کی طرف متوجہ ہوا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نرگس کا باپ تھانے کیوں نہیں آیا۔ اس نے تمہیں کیوں بھیج دیا ہے؟''

''جب سے نرگس گم ہوئی ہے، یعقوب گہرے صدمے میں ہے۔'' وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''ہر وقت یہی دہراتا رہتا ہے کہ نرگس نے گھر سے باہر قدم نکال کر اس کی ناک کٹوا دی ہے۔ اس نے اپنے دوست کو جو زبان دے رکھی ہے، اس کا کیا ہوگا...... وہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا......''

''کون دوست...... تم کہیں اللہ رکھا کی بات تو نہیں کر رہی ہو......؟'' میں نے کرید نے والے انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نرگس کی منگنی اللہ رکھا کے بیٹے جاوید سے ہوئی ہے اور یہ معاملہ یعقوب کے زور دینے پر ہی ہوا ہے ورنہ میں تو اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی مگر یعقوب نے نہ میری سنی اور نہ ہی نرگس کے مستقبل کا کوئی خیال کیا، یاری نبھانے کے لیے جاوید سے نرگس کا رشتہ طے کر دیا......''

''تم اس رشتے کی مخالفت میں کیوں تھیں؟''

''بس جی، مجھے جاوید بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''عجیب ست اور بونگا سا لڑکا ہے۔''

''تو کیا تم کسی خاص بندے کے ساتھ نرگس کی شادی کرنا چاہتی تھیں؟''

''نہیں جی، میرے ذہن میں کوئی خاص بندہ نہیں تھا'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''کسی بھی معقول آدمی سے اُس کی شادی ہو جاتی مگر جاوید سے نہیں۔ پتا نہیں، کیا بات ہے، جاوید کو دیکھتے ہی مجھے عجیب سا محسوس ہونے لگتا ہے......''

''میں نے سنا ہے، جاوید کی ماں شہناز بھی اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھی۔'' میں نے حنیف کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں عائشہ کو ٹٹولا ''اللہ رکھا نے زور زبردستی کر کے ہی یہ ناتا جوڑا تھا......؟''

''شہناز کے انکار کی وجہ نرگس کو ناپسند کرنا نہیں تھی۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولی۔ ''بلکہ اس کی نگاہ کسی اور پر لگی ہوئی تھی۔''

میں نے بالکل ان جان بنتے ہوئے کہا ''اور...... کس پر؟''

''اپنی بہن آسیہ کی بیٹی عطیہ پر!'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''وہ جاوید کی شادی عطیہ سے کرنا چاہتی تھی لیکن اللہ رکھا اپنی سالی آسیہ کو سخت ناپسند کرتا ہے اس لیے وہ عطیہ کو کسی بھی صورت اپنی بہو بنانے پر تیار نہیں تھا لہٰذا اس نے نرگس کا رشتہ مانگ لیا۔ اگرچہ میں جاوید کو پسند نہیں کرتی لیکن یعقوب نے میری ایک نہ سنی اور یہ رشتہ پکا کر دیا اور...... اب چند ماہ بعد تو ان کی شادی ہونے والی تھی......''

''نرگس کے گھر سے غائب ہو جانے پر جاوید یا اس کے گھر والوں کا کیا تاثر تھا؟'' میں نے سوال و جواب کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ نرگس کے گھر سے چلے جانے کے بعد شہناز نے سکھ کی سانس لی تھی۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ''اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ بلا ٹل گئی۔ اب وہ اپنی مرضی سے جاوید کی شادی عطیہ سے کر سکے گی۔ یہ رشتے داری چونکہ اللہ رکھا اور یعقوب کی دوستی کے نتیجے میں ہو رہی تھی لہٰذا نرگس کی گم شدگی کا سب سے زیادہ دکھ بھی انہی دونوں کو ہوا۔ اوپر سے شہناز نے طعنے دے دے کر اللہ رکھا کی زندگی اور بھی عذاب بنا دی ہے۔''

''اور اس سلسلے میں جاوید کا کیا رویہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بے پروا بنا پھرتا ہے۔'' عائشہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسے اس بات سے قطعاً کوئی غرض نہیں کہ نرگس کہاں چلی گئی ہے حالانکہ اس موقع پر تو سب سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ اسی کو کرنا چاہیے۔ نرگس اس کی منگیتر ہے مگر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے، ان ماں بیٹے کو نرگس کی گم شدگی سے بہت خوشی ملی ہو۔ میرے سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ شہناز اور جاوید لوگوں سے کہتے پھر رہے ہیں کہ ان کی طرف سے یہ رشتہ ختم ہی سمجھا جائے۔ جو لڑکی گھر سے بھاگ جائے اسے کوئی اپنے گھر کی عزت کیسے بنا سکتا ہے......!''

''جب ہم نرگس کے گھر سے بھاگ جانے کی بات کرتے ہیں تو فوراً ذہن میں یہ سوال سر اٹھاتا ہے...... وہ کس کے ساتھ بھاگی ہوگی؟'' میں نے عائشہ کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''حالات و واقعات چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ مقتول فرید کے ساتھ تھی اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ ان دونوں میں پہلے سے کوئی معاملہ چل رہا تھا لیکن تم کہتی ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، یہ نکتہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا......''

''جناب! میں تو یہی جانتی ہوں کہ نرگس کا فرید کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں تھا۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''باقی دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے......''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے سامنے کرم دین نے کہا ہے کہ اس کا بیٹا یعنی مقتول فرید، تمہاری بیٹی نرگس کو پسند کرتا تھا اور اس پسندیدگی کا اظہار اس نے اپنی ماں نصیب بیگم سے بھی کیا تھا۔'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''اور تم بالکل انجان بن رہی ہو؟''

''اب آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولی۔ ''جو سچ تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔''

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد عائشہ بی بی کو فارغ کر دیا اور اسے باہر بھیج کر کرم دین کو اندر بلا لیا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا اور امداد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''کرم دین! میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ میں تمہارے بیٹے کو تو زندگی میں واپس نہیں لا سکتا البتہ، یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ بہت جلد اس کے قاتل کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا۔''

''کیا آپ کو کچھ پتا چلا کہ فرید کو کس بدبخت نے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟'' اس نے زخمی لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ جلد یا بہ دیر میں قاتل کی گردن ناپنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بس......'' میں نے توقف کیا پھر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس، ایک بار مجھے نرگس کا سراغ مل جائے تو پھر بعد کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔''

''میں بھی دعا کروں گا کہ آپ جلد از جلد نرگس کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔'' وہ قدرے مضبوط لہجے میں بولا۔

''آمین......!'' میں نے تہ دل سے کہا پھر اسے ہدایت کی۔ ''کرم دین! اگر اس دوران میں تمہیں کوئی خاص بات پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا۔ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔''

''جی...... میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا پھر منت ریز انداز میں پوچھا۔ ''فرید کی لاش کب تک اسپتال سے آ جائے گی؟''

''مجھے امید ہے کہ کل دوپہر تک لاش تھانے پہنچ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

اس نے استفسار کیا ''میں لاش وصول کرنے کے لیے کب آپ کے پاس آؤں۔ مجھے اس کے کفن دفن کا بندوبست بھی تو کرنا ہے......'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''کرم دین! بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے تمہیں تھانے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی نگرانی میں عملے کے دو افراد کو لاش کے ساتھ رتاں والی بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔ تم تدفین کا پروگرام عصر اور مغرب کے درمیان رکھو تو سارے مرحلے خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں گے۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اے ایس آئی کو اپنے پاس بلایا اور اس کیس کے حوالے سے مختلف ہدایات دینے کے بعد کہا۔ ''عائشہ بی بی...... اور کرم دین کو واپس رتاں والی بھجوانے کا انتظام کر دو۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے......''

''او کے سر......!'' اے ایس آئی نے فرض شناس لہجے میں کہا۔

میں مطمئن ہو گیا۔

٭٭٭

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہی مقتول فرید کی لاش اسپتال سے واپس آ گئی۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی موجود تھی۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل

کرنے کے بعد لاش وصول کرلی اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر مذکورہ رپورٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔

اس رپورٹ کے مطابق مقتول فرید کی موت سات اور آٹھ اگست کی درمیانی رات ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ رپورٹ میں اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ موت کے وقت مقتول گہری بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس میں کسی قسم کی مزاحمت کرنے کی سکت باقی نہیں تھی تاہم موت کا واضح سبب وہی خطرناک قاتل خنجر تھا جو اس کے سینے میں پیوست ملا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے ساتھ ہی کیمیکل ایگزامنر کی تفصیلی رپورٹ بھی منسلک تھی۔ جس میں بعض سنسنی خیز انکشافات کیے گئے تھے۔ مقتول کے معدے سے حاصل کیے گئے ایک نمونے میں بے ہوشی کی دوا کے آثار ملے تھے یعنی وقوعہ کی رات اسے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی جس کے زیر اثر وہ بے خبر اور گہری نیند میں چلا گیا تھا لہٰذا جب قاتل نے بے رحمی سے اس کے سینے میں خنجر اتارا تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں کو حرکت میں نہ لاسکا اور بغیر تڑپے پھڑکے اس نے موت کو گلے لگالیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس کے ساتھ منسلک کیمیکل ایگزامنر کے تجزیے نے میرے بہت سے خدشات کی تسکین کردی۔ اب میں پورے یقین کے ساتھ یہ جان چکا تھا کہ فرید نے قتل ہوتے وقت کسی قسم کی کوئی مزاحمت پیش کیوں نہیں کی تھی!

نعمت بی بی کے تفصیلی بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ وقوعہ کی رات نرگس اپنا اور مقتول کا کھانا بیٹھک میں لے کر گئی تھی۔ دونوں مبینہ میاں بیوی نے رات کا کھانا ایک ساتھ بیٹھک میں بیٹھ کر کھایا تھا پھر اندر سے کنڈی لگا کر سو گئے تھے۔ ان حالات میں ذہن اسی نتیجے پر پہنچتا تھا کہ نرگس نے رات کے کھانے میں کوئی زود اثر نشہ آور دوا ملا کر مقتول کو کھلا دی تھی۔ آدھی رات کے بعد جب اس نے دیکھا کہ مقتول بے خبری کی نیند میں پہنچ چکا ہے تو اس نے نہایت ہی سنگ دلی سے ایک خوف ناک خنجر مقتول کے سینے میں اتارا اور وہاں سے غائب ہوگئی......!

یہ سب کچھ سوچنا بہت آسان تھا اور بالکل منطقی بھی نظر آتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تھیوری چند توجہ طلب سوالات کو بھی جنم دیتی تھی اور ان سوالات کے تسلی بخش جوابات حاصل کیے بغیر کسی راسخ اور حتمی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ یہ سوالات علی الترتیب کچھ یوں تھے۔

اگر نرگس، مقتول کو پسند کرتی تھی اور اس کی خاطر گھر چھوڑ آئی تھی تو پھر وہ اسے قتل کر کے غائب کہاں ہوجائے گی؟ اگر ان دونوں کے بیچ کوئی سنجیدہ تعلق نہیں تھا اور نرگس کسی بھی بنا پر مقتول کی جان کی دشمن تھی تو پھر وہ اپنے ایک دشمن کے ایما پر گھر سے کیوں بھاگی؟ اگر اس تمام تر خطرناک کھیل میں کوئی تیسرا شخص بھی ملوث تھا تو وہ کون تھا؟ وہ صرف مقتول کا دشمن تھا یا پھر نرگس کی مدد سے اس کی دوستی تھی؟ کیا اس نامعلوم شخص کی مدد سے نرگس نے یا نرگس کی مدد سے اس نامعلوم شخص نے فرید کو ٹھکانے لگایا تھا؟ اگر مذکورہ نامعلوم شخص اور نرگس اندر سے آپس میں ملے ہوئے تھے تو پھر یہ دونوں اب کہاں تھے؟

یہ تمام تر اور ان سے ملتے جلتے متعدد سوالات نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا تھا اور سر دست میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جب تک نرگس ہاتھ نہیں آئے گی، اس کیس کا اونٹ کسی مناسب کروٹ نہیں بیٹھ سکے گا لیکن پھر یہ سوال مجھے ایک بند گلی میں لا کھڑا کرتا تھا کہ میں نرگس کو کہاں تلاش کروں......؟

یہ بات سامنے آچکی تھی کہ مقتول اپنے گھر سے دو اگست کو یہ بتا کر نکلا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست عرفان کے پاس لاہور جا رہا ہے۔ وہ پہلے بھی عرفان سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ مقتول ہمارے علاقے میں چار اگست کو پہنچا تھا۔ اس سے یہ اندازہ قائم کیا جاسکتا تھا کہ اس نے دو اور تین اگست کے دونوں دن عرفان کے پاس گزارے ہوں گے۔

میں نے فوری طور پر لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے یقین تھا کہ عرفان سے ایک تفصیلی ملاقات اس کیس کے معاملے میں بہت سود مند ثابت ہوگی۔ ہوسکتا ہے، وہاں سے کوئی ایسا اشارہ مل جاتا جو مقتول کی پُراسرار موت اور نرگس کی گم شدگی پر سیر حاصل روشنی ڈال سکتا۔

میں نے آئندہ آدھے گھنٹے میں، مقتول فرید کی لاش کو موضع رتاں والی بھجوانے کا بندوبست کیا اور خود سرسری تیاری کے بعد لاہور روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

عرفان ڈبل روٹی، بن اور شیر مال بنانے والی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا جو فیروز پور روڈ پر، نہر کے پل کے قریب واقع تھی۔ اس وقت دن کے ڈھائی بجے تھے۔ مرید کے سے فیروز پور روڈ لاہور کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مجھے مذکورہ فیکٹری تک پہنچنے میں لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹا لگا ہوگا۔

میں اس وقت عوامی لباس میں تھا اور احتیاطاً میں نے

متعلقہ تھانے میں حاضری لگا کر اپنی لاہور میں آمد سے محکمے کے ذمے دار افراد کو آگاہ کردیا تھا۔ تھانا انچارج صدیق راؤ نے میرے ساتھ اپنے عملے کے کسی آدمی کو بھیجنے کی پیش کش کی تھی جسے میں نے بڑی اخلاقی خوب صورتی سے رد کردیا تھا اور ایک بس میں بیٹھ کر اپنی مطلوبہ فیکٹری پہنچ گیا تھا۔

میں فیکٹری کے دفتری حصے میں داخل ہوا اور وہاں موجود انتظامیہ کے ایک سینئر آدمی سلیمان بخاری سے ملاقات کی۔ وہ فیکٹری میں منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"بخاری صاحب! میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں مرید کے تھانے کا انچارج ہوں۔ ایک ضروری کام سے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ امید ہے، آپ مجھ سے پورا پورا تعاون کریں گے......"

"کیوں نہیں جناب!" یہ جان کر کہ میں تھانا انچارج ہوں، بخاری اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر دوبارہ گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔ "میرے لائق جو بھی خدمت ہو، حکم کریں اور اس حکم سے پہلے یہ فرمائیں کہ آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم......؟"

"اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں بخاری صاحب!" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "آپ مجھ سے تعاون کرنے کو تیار ہیں، یہی کافی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے جناب۔" وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ "کام اور کھانا پینا ایک ساتھ ہونا چاہیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی......" میں نے اس کی مخلصانہ پیش کش کے سامنے سپر ڈال دی اور کہا۔ "موسم کی مناسبت سے جو دل چاہے، وہ منگوالیں۔"

بخاری نے ایک ملازم کو بلا کر کھانے پینے کی چند چیزیں لانے کا حکم دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "جی ملک صاحب! اب آپ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"آپ کی فیکٹری میں عرفان نامی ایک بندہ کام کرتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہ مرید کے کے ایک نواحی گاؤں رتاں والی کا رہنے والا ہے اور یہاں قریب ہی کسی بستی میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے آپ کے پاس ملازم ہے......"

"ہاں، میں عرفان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ تھوڑے فاصلے پر واقع کچی آبادی نامی ایک بستی میں رہتا ہے۔"

"مجھے اسی عرفان سے پوچھ گچھ کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اسے ادھر ہی بلالیں۔"

"میں ابھی اسے بلاتا ہوں......" وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔ "لیکن یہ تو بتائیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ادھر مرید کے میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے......؟"

"آپ بالکل ٹھیک محسوس کر رہے ہیں" میں نے گمبھیر انداز میں کہا پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے حالات حاضرہ کی سنگینی سے آگاہ کردیا۔

"اوہ......!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ "معاملہ تو خاصا خطرناک ہے۔"

"اسی لیے میں سادہ لباس میں یہاں آیا ہوں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ بھی اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ کوئی پولیس والا اس سے ملنے آیا ہے ورنہ وہ بدک جائے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں اس معاملے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں......"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے بولا۔ "آپ یہاں آرام سے بیٹھیں۔ میں خود اسے لے کر آپ کے پاس آتا ہوں۔"

سلیمان بخاری کی واپسی لگ بھگ پانچ منٹ بعد ہوئی اور وہ خالی ہاتھ آیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

"ملک صاحب! عرفان تو تھوڑی دیر پہلے چھٹی کر کے اپنے گھر چلا گیا ہے۔"

"کیا آپ کی فیکٹری میں اتنی جلدی چھٹی ہوجاتی ہے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"نہیں جناب! چھٹی میں تو ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔" سلیمان بخاری نے جواب دیا۔ "اس کے ساتھ کام کرنے والے ایک بندے نے بتایا کہ عرفان بتا رہا تھا، گاؤں سے اس کا کوئی دوست ملنے آیا ہے، اس لیے آج وہ جلدی چھٹی کر کے گھر جا رہا ہے......"

"کوئی دوست...... گاؤں سے آیا ہے......!" میں نے چونکے ہوئے انداز میں کہا پھر بخاری کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "میں ابھی عرفان کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ کسی ایسے بندے کو بھیج سکتے ہیں جس

نے عرفان کی رہائش گاہ دیکھ رکھی ہو......؟''

''ملک صاحب! آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو عرفان کے گھر پہنچانے کا بندوبست کردوں گا۔'' بخاری نے کہا'' لیکن پہلے کچھ کھاپی لیں۔ میں نے آپ کے لیے گرم چائے کے ساتھ گرما گرم جلیبیاں اور سموسے منگوائے ہیں......''

''یہ تمام چیزیں میں اطمینان سے بیٹھ کر کھاؤں گا۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔'' پہلے عرفان کی طرف جانا ضروری ہے۔''

''ہوں......!'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔''میں آپ کی فرض شناسی کو سمجھ سکتا ہوں ملک صاحب۔ آپ ایک منٹ رکیں۔ میں قدیر کو ساتھ لے لوں۔''

''قدیر کون؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''قدیر بھی اسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اس نے عرفان کا گھر دیکھ رکھا ہے۔'' بخاری نے بتایا۔''میں اپنی کار میں آپ کو لے کر وہاں جاؤں گا۔ قدیر ہماری راہ نمائی کرے گا۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم تینوں فیکٹری منیجر سلیمان بخاری کی کار میں بیٹھ کر عرفان کے گھر کی طرف جارہے تھے۔ مذکورہ گھر فاضلیہ کالونی کے عقب میں واقع کچی آبادی میں تھا۔ قدیر کی راہ نمائی میں جب سلیمان بخاری نے مین فیروز پور روڈ کو چھوڑ کر کچی آبادی کی سمت گاڑی موڑی تو قدیر نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''باؤجی......ایک منٹ......!''

''باؤجی (بابوجی) سے قدیر کی مراد سلیمان بخاری تھا۔ بخاری نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔''کیا ہوا......؟''

''آپ گاڑی روک دیں۔'' قدیر نے اضطراری لہجے میں کہا۔'' مجھے لگتا ہے، وہ عرفان جارہا ہے......'' بات ختم کرتے ہی اس نے ایک جانب اشارہ بھی کردیا۔

میں نے گردن گھما کر مین فیروز پور روڈ کی طرف دیکھا۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک جوڑا چلا جارہا تھا۔ ان کی پشت ہماری جانب تھی اور وہ اچھرہ کی طرف جارہے تھے۔ میں نے قدیر سے پوچھا۔

''کیا تم اس جوڑے کی بات کررہے ہو......؟''

''جی......جب باؤجی نے کار موڑی تو میں نے عرفان کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں

بولا۔''لیکن اس کے ساتھ یہ عورت......؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں چونکہ سلیمان بخاری کو سارا قصہ سنا چکا تھا لہٰذا اس نے مجھ سے پوچھا۔''کیا کرنا ہے ملک صاحب......؟''

''بخاری صاحب! آپ اپنی کار کو اسی سمت لے چلیں جدھر وہ جارہے ہیں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اور ان سے تھوڑا آگے جاکر رک جائیں۔ میں اس لڑکی کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں......''

''مگر یہ رانگ سائڈ ڈرائیونگ ہوگی......'' وہ اپنی کار کو واپس موڑتے ہوئے بولا۔''آپ کا حکم ہے تو میں چلا چلتا ہوں۔''

''میں آپ کو قانون شکنی کا حکم نہیں دے سکتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''آپ مجھے یہیں اتار دیں اور اگلے کٹ سے گاڑی گھما کر واپس آجائیں، جب تک میں پیدل ہی ان کا تعاقب کرتا ہوں۔''

بخاری نے کوئی سوال کیے بغیر مجھے وہیں ڈراپ کردیا اور گاڑی کو فیروز پور روڈ کی دوسری جانب لے گیا۔ میں تیز قدموں سے اس جوڑے کے پیچھے چل پڑا جس کے بارے میں قدیر نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ عرفان کسی عورت کے ساتھ جارہا ہے۔

میں نے اس سے پہلے عرفان کو نہیں دیکھا تھا لیکن نرگس سے میری ایک بھرپور ملاقات ہوچکی تھی۔ میں اس کا چہرہ دیکھتے ہی پہچان جاتا۔ اگر یہ عورت نرگس ہی تھی تو پھر کیس حل ہونے میں منٹ نہیں، چند سیکنڈ ہی باقی تھے۔ اس خیال نے میرے رگ وپے میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلا دی۔ میرے حواس پوری طرح بیدار ہوگئے اور میں دل وجان سے کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے پوری طرح تیار ہوگیا۔

میں نہایت ہی مہارت کے ساتھ، دبے قدموں ان کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ جب ہمارے بیچ محض دس فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے دیکھا، وہ دونوں دائیں جانب مڑ گئے۔ سڑک کے کنارے اس طرف ایک سینما بنا ہوا تھا۔ گویا وہ دونوں فلم دیکھنے کے لیے گھر سے نکلے تھے......!

جب وہ سینما کے گیٹ کی طرف مڑے تو میں لڑکی کے چہرے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور یہ دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ نرگس ہی تھی......وہی نرگس جس کی تلاش نے مجھے بری طرح بے چین کررکھا تھا۔

میں ان کے پیچھے لپکا اور بہ آواز بلند پکارا "نرگس......!"

وہ ٹھٹک کر رک گئے پھر انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے ان کی آنکھوں اور چہروں پر بڑے ہی متضاد تاثرات دکھائی دیے۔ عرفان مجھے حیرت اور الجھن میں مبتلا نظر آیا جبکہ مجھے دیکھتے ہی نرگس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

نرگس نے ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے کسی عقاب کے مانند جھپٹ کر اسے قابو کرلیا پھر اس کی کلائی کو ایسا مروڑا دیا کہ وہ حلق کے بل چیخنے پر مجبور ہوگئی۔ میں نے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں کہا۔

"ایک بار گھر سے بھاگ چکی ہو، بس یہی کافی ہے۔ اب میں تمہیں اور کہیں نہیں جانے دوں گا...... تم یہاں سے سیدھی جیل جاؤ گی......"

اس ناگہانی صورتِ حال نے عرفان کو بوکھلا دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے ایک طرف دوڑ لگادی۔ میں نے فوراً اپنا سروس ریوالور نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے دھمکانے کے لیے ہوائی فائر کرتا، سلیمان بخاری موقعے پر پہنچ گیا۔ اس نے دور سے ہی مجھے برسرِ پیکار دیکھ لیا تھا اور بڑی تیزی سے اپنی کار ہماری جانب بڑھا دی تھی۔ اتفاق سے عرفان نے بھی اسی سمت فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

وہ ایک زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے بخاری کی کار کے بونٹ سے ٹکرایا اور پھر وہیں سینما کے گیٹ کے قریب زمین پر گر کر کراہنے لگا۔ اس کے گھٹنوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ سلیمان بخاری اور قدیر بھی پلک جھپکتے ہی کار سے باہر نکل آئے اور انہوں نے بڑی آسانی سے عرفان کو اپنے نرغے میں لے لیا۔

اس افراتفری کو دیکھ کر بہت سارے لوگ وہاں جمع ہوگئے جن میں غالب تعداد ان افراد کی تھی جو فلم دیکھنے کی غرض سے سینما ہاؤس پہنچے تھے۔ انہیں ایک زندہ فلم دیکھنے کو مل گئی تھی اور...... وہ بھی ٹکٹ لیے بغیر......!

❀❀❀

جب کوئی مجرم کسی ٹھوس ثبوت کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان کھلوانا مشکل نہیں رہتا۔ اسی شام میں سلیمان بخاری کی کار میں بٹھا کر نرگس اور عرفان کو تھانا مرید کے لے آیا تھا۔ جب بخاری واپس چلا گیا تو میں نے نرگس اور عرفان کو اپنے سامنے کھڑا کرکے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"تم لوگ سیدھی طرح سچ سے پردہ ہٹاؤ گے یا میں تمہاری زبانیں کھلوانے کے لیے تفتیش کا روایتی طریقہ اختیار کروں......؟"

میں نے انہیں ایک موقع فراہم کیا تھا تاکہ وہ سلامت ہڈی پسلی کے ساتھ جیل کی ہوا کھا سکیں لیکن میری بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود وہ اپنے بچاؤ کے لیے الٹی سیدھی تاویلیں گھڑنے لگے ان کی اس نامعقولیت پر مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے انہیں ایک گھنٹے کے لیے حوالدار جمشید کے حوالے کردیا۔

ایک گھنٹے سے بھی پہلے حوالدار کی محنت رنگ لے آئی اور وہ دونوں ملزمان کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے میرے کمرے میں لے آیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے معنی خیز انداز میں بولا۔

"ملک صاحب...... میں نے ان دونوں شکاروں کو سیٹ کردیا ہے۔ ان کی زبانیں رواں ہوچکی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہیں رکیں گی۔ آپ جو بھی پوچھیں گے، یہ فرفر جواب دیں گے۔"

میں نے حوال دار کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور مبینہ ملزمان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ گردنیں جھکائے شرمندہ سے کھڑے تھے۔ میں نے تحکمانہ انداز میں انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد، میری میز کے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اگر تم لوگ شرافت سے میری بات مان کر سب کچھ مجھے سچ سچ بتادیتے تو تمہیں ایسی تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ بہرحال، مجھے امید ہے کہ اب تم میرے کسی سوال کے جواب میں نہیں اٹکو گے......؟"

انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں فرماں برداری کے علاوہ رحم کی اپیل بھی تھی میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں ان کا انٹرویو شروع کردیا۔

آیندہ ایک گھنٹے میں، میری پوچھ گچھ کے جواب میں انہوں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ مجھے جو کہانی سنائی اس میں حیرت انگیز واقعات اور سنسنی خیز انکشافات کی بھرمار تھی۔ میں ان کے بیانات کی غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کہانی کے انجام سے آگاہی حاصل کرسکیں۔

درحقیقت، نرگس اور عرفان میں بڑی خفیہ سیٹنگ چل

رہی تھی۔ انہوں نے اپنے تعلق کو اس قدر خفیہ رکھا ہوا تھا کہ گاؤں میں کسی کو اس معاملے کی بھنک بھی نہیں تھی۔ اسی دوران میں فرید بھی نرگس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ فرید اور عرفان میں اچھے تعلقات تھے لیکن عرفان کے مطابق، اس نے فرید کو کبھی اپنا جگری یار نہیں سمجھا تھا لہٰذا عرفان نے فرید کو اپنے اور نرگس کے تعلقات کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتا رکھا تھا۔ جب نرگس کی زبانی عرفان کو پتا چلا کہ فرید بڑی تیزی سے نرگس کی طرف بڑھ رہا ہے تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ وہ کھلم کھلا فرید کو اس کام سے منع نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ فرید پھر اس ممانعت کی وجوہات جاننے کی کوشش کرتا۔ ابھی یہ الجھن چل ہی رہی تھی کہ یعقوب نے نرگس کی منگنی اپنے دوست کے بیٹے جاوید سے کردی۔ اس رشتے میں یعقوب نے اپنی من مانی کی تھی۔ نرگس اس شادی کے لیے بالکل تیار نہیں تھی چنانچہ نرگس کے علاوہ اس صورت حال نے عرفان کو بھی بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا۔ میدان عمل میں کودنے کا وقت آگیا تھا۔ اگر اب بھی وہ خاموش بیٹھا رہتا تو پھر نرگس اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

عرفان کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ کھلے عام نرگس کو اپنانے کے لیے کوشش نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ان دونوں کے خاندانوں میں دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی۔ شادی بیاہ اور رشتے داری تو دور کی بات ہے، ان دونوں خاندانوں کے افراد کو ایک دوسرے سے ملنے اور بات چیت کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ عرفان کے لیے یہ آزمائش کی گھڑیاں تھیں۔ وہ مسلسل سوچتا رہا پھر اس کے شیطانی ذہن نے ایک سنسنی خیز منصوبہ تیار کرلیا۔

اس نے نرگس کو اعتماد میں لے کر اپنے منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ نرگس اس پر اندھا بھروسا کرتی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی لہٰذا اس کی بتائی ہوئی ترکیب پر آنکھیں بند کرکے عمل کرتی چلی گئی۔ وہ گھر سے بھاگ کر فرید کے پہنچی جہاں عرفان اور فرید نے اس کے ساتھ ایک تفصیلی ملاقات کی اور وہ عرفان کی ہدایت پر چند روز کے لیے فرید کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنے کے لیے تیار ہوگئی۔ عرفان نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ من وعن اس کے کہے پر عمل کرتی رہی تو ہفتے دس دن کے بعد وہ اس کی ہوگی۔ پھر وہ شادی کرکے لاہور ہی میں مستقل رہائش کرلیں گے۔ اس نے نرگس کو سختی سے تاکید کی تھی کہ اندر کی بات کا فرید کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ نرگس نے اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

دوسری جانب فرید کو وہ کوئی اور ہی پٹی پڑھا رہا تھا۔ اس نے فرید سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کی بات مانے گا تو وہ نرگس کو اس کی طرف نہ صرف مائل کرے گا بلکہ ایک دن وہ اسے فرید کی بیوی بھی بنا دے گا۔ عرفان ہی کے ایما پر فرید دو دن پہلے گھر سے نکلا تاکہ نرگس کے غائب ہونے کا اس پر کوئی شک نہ ہو۔ عرفان نے فرید سے کہا تھا کہ وہ ان دونوں کی شادی کرادے گا پھر وہ مرید کے میں رہائش کرلیں گے۔

نرگس کو عرفان نے سمجھا دیا تھا کہ اسے ہفتہ، دس دن فرید کی بیوی کا کردار ادا کرنا ہے، اس طرح کہ وہ خود کو بھی محفوظ رکھ سکے پھر کوئی مناسب موقع دیکھ کر وہ نرگس کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ نرگس چونکہ عرفان پر اندھا اعتماد کررہی تھی لہٰذا اس اللہ کی بندی نے ایک بار بھی یہ سوال نہیں کیا کہ اسے عرفان کی بیوی بننے کے لیے اس گھماؤ پھراؤ کی کیا ضرورت ہے۔ شاید اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے!

سب کچھ عرفان کی پلاننگ کے عین مطابق عمل میں آگیا۔ فرید، نرگس کو پا کر بہت خوش تھا اور خود کو عرفان کا بہت زیادہ احسان مند بھی سمجھ رہا تھا۔ اس بے چارے کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کا دوست کون سی چال چل رہا ہے۔ وہ چونکہ نرگس کے بہت قریب رہ رہا تھا لہٰذا حد سے گزرنے کی کوشش میں بھی تھا لیکن نرگس یہ کہہ کر اسے ٹال رہی تھی کہ نکاح سے پہلے کچھ نہیں ہوگا البتہ ہلکی پھلکی دست درازی کی اسے اجازت دے رکھی تھی۔ وہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا جب ایک رات شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی نے انہیں فحش حرکات کے زمرے میں گرفتار کرلیا تھا۔

پروگرام کے مطابق، ایک رات نرگس نے کھانے میں خواب آور دوا ملا کر فرید کو بے ہوش کرنا تھا جس کے بعد وہ عرفان کے ساتھ لاہور چلی جاتی۔ یہ خواب آور دوا بھی عرفان ہی نے اسے لاکر دی تھی۔ حسب پروگرام عرفان آدھی رات کے بعد نعمت بی بی کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے بیٹھک کے بیرونی دروازے پر مخصوص دستک دی تو نرگس دروازہ کھول کر باہر گلی میں آگئی۔ عرفان نے اسے ادھر ہی رکنے کو کہا اور خود بیٹھک میں داخل ہوگیا۔

اندر آکر اس نے بیٹھک کے دروازے کو کنڈی چڑھائی، بے سدھ پڑے فرید کے سینے میں خطرناک خنجر اتارا، بیٹھک کے اندرونی دروازے سے گزر کر صحن میں پہنچا اور پھر گھر کا داخلی دروازہ کھول کر باہر گلی میں آگیا جہاں نرگس اس کے انتظار میں کھڑی تھی، پھر وہ پروگرام کے مطابق لاہور

کی جانب روانہ ہو گئے۔
اس موقع پر نرگس نے عرفان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ عرفان نے فرید کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ وہ نعمت بی بی کا گھر چھوڑتے وقت بیٹھک کا اور گھر کا داخلی دروازہ اچھی طرح بھیڑ آیا تھا۔ نرگس اس بات سے قطعاً بے خبر تھی کہ عرفان نے فرید کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

وہ دونوں لاہور پہنچے اور پھر مزے سے کچی آبادی والے گھر میں رہنے لگے۔ عرفان نے اپنی پلاننگ کو کامیاب بنانے کے لیے کچھ عرصہ پہلے اپنے محلے میں یہ خبر اڑا دی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور عنقریب وہ اپنی بیوی کو بھی لاہور لے آئے گا چنانچہ جب نرگس کچی آبادی والے گھر میں پہنچی تو کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔

آج ان کی بدقسمتی تھی کہ میں نے انہیں سینما کے گیٹ پر دھر لیا تھا۔ عرفان نے مجھے بتایا کہ وہ اس دن فیکٹری سے جلدی چھٹی کر کے نرگس کو فلم دکھانے سینما لے جا رہا تھا کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔

مجرموں کے اقبالی بیان کے بعد یہ کیس ہر زاویے سے حل ہو گیا تھا تاہم ایک پہلو کسی کانٹے کی طرح میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ میں نے اپنی خلش مٹانے کے لیے عرفان سے یہ سوال پوچھ لیا۔

''اوئے بدبختا! تمہیں فرید جیسا کاٹھ کا الو ملا اور تمہارا سوچا ہوا منصوبہ بھی سو فیصد کامیاب ہو گیا تھا پھر تم نے اس بدنصیب فرید کی جان کیوں لی؟''

''میرے اس فعل کی دو وجوہات ہیں جناب......!''
وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔

''کون سی دو وجوہات......؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

''اول تو مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ جب صبح فرید اٹھے گا تو نرگس کو غائب پا کر وہ سیدھا میرے پاس لاہور پہنچے گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت نرگس کو میرے پاس دیکھے لہٰذا میں نے اس کا قصہ ہی پاک کر دیا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔''

''نرگس اور فرید دو دن کے فرق سے رتاں والی سے غائب ہوئے تھے اور مرید کے میں ان کی موجودگی ریکارڈ کر لی گئی تھی۔ فرید کو قتل کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں اس طرح پولیس کی تفتیش کا رخ بدلنا چاہتا تھا۔ جب نرگس کی گمشدگی کی اطلاع تھانے پہنچتی تو تفتیش کے دوران میں یہ بات سامنے آتی کہ فرید کو قتل کر دیا گیا ہے تو لامحالہ پولیس کا دھیان نرگس کے منگیتر کی طرف جاتا کہ اس نے غیرت میں آ کر فرید کو قتل کر دیا ہے......''

''دوسری طرف تم نے نعمت بی بی کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے نرگس، فرید کو قتل کر کے کہیں فرار ہو گئی ہو......'' میں نے نفرت بھرے انداز میں اس شاطر مجرم کو گھورا۔ ''میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس معاملے کو اس قدر الجھا دینا چاہتا تھا کہ کسی کا بھی دھیان میری طرف نہ جائے''

''تم مجھے ایک نفسیاتی مریض لگتے ہو'' میں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا ''اور اس کے ساتھ ہی تم انتہائی بزدل انسان بھی ہو......!''

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''بزدل کیوں جی؟''

''اگر تم جی دار اور ہمت والے ہوتے تو نرگس کو حاصل کرنے کے لیے اتنا لمبا چوڑا چکر نہ چلاتے کہ جس میں ہر لمحے اس بے چاری کی زندگی اور عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر تم دونوں کے خاندان اس شادی پر تیار نہیں تھے اور تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تھے تو پھر مرد کے بچے بنتے اور نرگس کو اپنے زور بازو پر بھگا لے جاتے۔ تم نے جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے تو مجھے تمہاری مردانگی پر شک ہونے لگا ہے......''

وہ کچھ نہیں بولا اور گردن جھکا دی۔

نرگس نے نفرت بھری نظر سے عرفان کو گھورا اور غراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم اندر سے اتنے بودے اور کمینے ہو تو میں تمہاری باتوں میں کبھی نہ آتی۔ اب میں تمہارے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہوں گی......''

''ساتھ رہنے کی نوبت آئے گی تو پل، گھنٹے یا ماہ و سال کا حساب کرو گی نا!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہارا عاشق تو یہاں سے سیدھا جیل جائے گا۔ تم نے ایک کمزور بلکہ بیمار گھوڑے پر داؤ لگا کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے......!''

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی......!

(تحریر حسام بٹ)

لاحاصل

سیدہ عابدہ نرجس

خواہشوں کا ہو یا مصیبتوں کا... بھنور تو بھنور ہی ہوتا ہے۔ جس میں اگر انسان پھنس جائے تو بعض اوقات نکلنا لاحاصل ہوتا ہے۔ اسے بھی نکلنے کا خیال آیا مگر اس وقت تک اس کے گرد گھیرا تنگ ہو چکا تھا... اور وہ جو کسی کی محبت میں پور پور ڈوبی تھی اسے راستے کا پتھر سمجھ کر جانے کہاں غائب ہو گیا... گویا اس کی زندگی کا حاصل کچھ بھی تو نہیں تھا۔

محبت میں اندھی تقلید کرنے والی ایک دوشیزہ کی بے چارگی کا احوال

ابھی انہیں یہاں آئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور انہوں نے اپنے سامان کی بوری بھی نہیں کھولی تھی کہ انہیں باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''یہ کون ہو سکتا ہے......؟'' میگی نے چونک کر کہا۔

''پتا نہیں۔''...... جیک نے شانوں کو بے پرواسی جنبش دی۔

اس ویران کھنڈر نما مکان میں جو اونچے کھجور کے درختوں میں گھرا ہوا تھا بھلا کون آ سکتا تھا۔ یہ شاید ان کا وہم تھا یا پھر کسی جنگلی جانور کی حرکت کی آواز......

دونوں اتفاقیہ طور پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ میگی اپنے گھر



کی پرسکون لیکن بور زندگی سے اکتائی ہوئی تھی اور کسی تبدیلی کی خواہش مند تھی جیک کو اس کے کرتوتوں کی وجہ سے اس کے سوتیلے باپ نے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ دونوں نے ایک باغ میں مالٹے چننے کی مزدوری کرلی تھی اور یہیں سے دونوں کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ دونوں کا خیال تھا کہ جب وہ بہت سے پیسے جمع کرلیں گے تو ایک گھر بنائیں گے اور شادی کر کے سکون سے رہیں گے۔

لیکن جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ اگر وہ یہاں عمر بھر بھی کام کرتے رہے۔ تو کچھ بھی جمع نہیں کرسکیں گے۔ پورے ہفتے کی کمائی صرف ساٹھ ڈالرز تھی۔ اس لیے دونوں نے کہیں اور جانے کا فیصلہ کیا۔ ساٹھ ڈالرز دو تین دنوں میں ہی ختم ہوگئے اور انہیں کوئی کام نہیں ملا نہ ہی رہنے کی جگہ تھی۔ گھومتے گھماتے وہ اچانک اس ویران مکان میں آنکلے تھے اور ان کا خیال تھا کہ چند دن یہیں گزار لیں۔ یہاں کم از کم ہوٹل میں رہنے کا کرایہ تو نہیں دینا پڑے گا مگر کھانے کے لیے اب بھی کچھ نہیں تھا اور وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے بھوکے تھے اور بھوک کی شدت سے دونوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔

اب انہیں برابر کے ہال کمرے سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میگی کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ خوف سے سمٹ گئی۔ جیک نے ہمت کر کے زور سے للکارا......

''کون ہے......؟'' جواب میں قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر تاریکی میں سگریٹ کا شعلہ سا نظر آیا۔ ایک سایہ آگے بڑھا اور طاقتور فلیش لائٹ کی روشنی سیدھی ان پر آ پڑی...... اور لمحے بھر کو تیز روشنی نے دونوں کو گویا اندھا کر دیا۔ جیک نے اپنی جراب میں رکھا ہوا چاقو ٹٹولا۔

پھر ٹارچ بند ہوگئی اور کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔

''میں نے دروازہ کھلا دیکھا تو اس طرف آنکلا۔''

''بہتر ہے کہ تم خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ، ہم یہاں پہلے آئے ہیں اور یہاں ہمارا حق زیادہ ہے۔'' جیک نے اپنی آواز کو درشت بناتے ہوئے کہا۔

''یہ اتنا بڑا ہے کہ ہم تینوں یہاں آرام سے رہ سکتے ہیں۔ میرے پاس کھانے کے لیے بھی کافی کچھ ہے، مجھے اکیلے کھانا پسند نہیں ہے، اگر تمہیں ضرورت ہو...... تو میں تمہیں کھانے میں شریک کرسکتا ہوں۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

کھانے کا سن کر میگی کے پیٹ میں بل سے پڑنے لگے، اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے آہستہ سے جیک کا بازو دبایا۔ جیک نے اشارہ سمجھ لیا۔ اس کا بھی بھوک سے برا حال تھا۔ اس نے چاقو پر گرفت مضبوط رکھی اور بولا۔ ''اپنی ٹارچ جلا لو اور اندر آجاؤ تاکہ ہم بھی تمہیں اچھی طرح دیکھ لیں۔'' اس نے قدم بڑھائے اور اندر آگیا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور لمبا سا ریڈ انڈین تھا جس کے سیاہ بال شانوں تک لمبے تھے۔ اس نے گہرے پیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جس پر سیاہ پھول بنے ہوئے تھے۔ سیاہ پتلون کے ساتھ اس نے رسی سے بنے ہوئے سلیپر پہنے ہوئے تھے اور اس کے شانے پر سیاحوں والی رُک سیک تھی۔

''تم کون ہو......؟'' جیک نے سوال کیا۔

''میرا نام پوکی ہے اور میں بھی تم لوگوں کی طرح بے گھر ہوں۔'' اس نے اپنی رک سیک زمین پر رکھ دی اور اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟''

''میرا نام جیک ہے اور یہ میگی ہے، میری منگیتر...... ہمارا ارادہ جلد شادی کرنے کا ہے۔''

پوکی نے جیسے غور سے نہیں سنا اور نہ ہی سننے کی زحمت گوارا کی اور اپنی رک سیک میں سے دو موم بتیاں نکال کر جلائیں اور انہیں فرش پر لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے پلاسٹک کا ایک تھیلا نکالا اور روسٹ مرغ کے مختلف حصے نکال کر کاغذ پر رکھے۔

جیک اور میگی کے منہ میں پانی آنے لگا۔ انہیں یہ بھی یاد نہیں تھا کہ آخری دفعہ انہوں نے روسٹ مرغ کب کھایا تھا۔ اس نے چاقو سے روسٹ کے تین برابر حصے کیے۔ ایک لفافے میں سے تلے ہوئے آلو اور چٹنی کے چھوٹے چھوٹے ساشے نکالے اور ان کی طرف بڑھا دیے۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میگی اور جیک نے بے صبری سے بھوک مٹائی۔ یہ روسٹ اس وقت انہیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت معلوم ہو رہا تھا جو اس نے اتنی فراخ دلی سے ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ تینوں کھا چکے تو انہوں نے موم بتی کے شعلے سے سگریٹ سلگائے جو پوکی نے انہیں پیش کیے تھے۔ دو تین کش لینے کے بعد وہ بولا۔ ''تم نوکری کی تلاش میں ہو؟''

''ہاں۔'' ...... جیک نے خشک لہجے میں کہا اور اس سے پوچھا۔ ''اور تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں کل ایک کار خریدوں گا اور پھر آگے جاؤں گا۔'' وہ بولا۔

''تمہارے پاس اتنی رقم ہے؟'' جیک نے پوچھا۔

''میں نے کار چرانے کے لیے تو نہیں کہا...... خریدنے کے لیے کہا ہے۔'' پوکی نے بد مزاجی سے کہا۔

جیک چونکا۔ اس کا مطلب کہ اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ گاڑی خرید سکے۔ گویا وہ ایک ایسا ساتھی ثابت ہوسکتا

تھا جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ اسی لیے اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم ہم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''

''میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟'' پوکی بولا۔

''اگر فائدہ نہیں ہے تو نقصان بھی نہیں۔'' جیک نے جل کے کہا۔

''اچھا...... میں صبح سوچوں گا۔ اس وقت تو مجھے سخت نیند آرہی ہے۔'' اس نے اٹھ کر اپنی بوری اٹھائی اور ایک طرف سر کے نیچے رکھ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

جیک دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس بے وقوف ریڈ انڈین کو وہ سوتے میں بہ آسانی قابو کرسکتا ہے۔ اس ویرانے میں کوئی اس کی چیخ و پکار نہیں سن سکے گا...... اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے میں بھی زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔ اس کے پاس یقیناً اچھی خاصی رقم ہوگی جو وہ کار خریدنے کی باتیں کر رہا ہے۔

''جیک...... موم بتی بجھا دو...... اور ہاں اتنا یاد رکھو کہ میرے پاس پستول ہے اور میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔'' اچانک پوکی کی آواز اس کی سوچوں میں مخل ہوئی تو وہ شرمندہ سا ہوگیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے پوکی اس کی سوچوں کو پڑھ رہا ہو۔ اس نے غصے سے موم بتی کے شعلے کو پھونک ماری...... کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور جیک دل ہی دل میں بکتا جھکتا سونے کے لیے لیٹ گیا۔

⊠⊠⊠

صبح ناشتے کے وقت پوکی نے پھر اپنی بوری کھولی اور اس میں سے باسی ڈبل روٹی، خشک گوشت، پنیر کا ڈبا اور مشروب کی ایک بوتل نکالی...... اور رات کی طرح اس نے پھر تین برابر حصے کیے۔ ناشتا کرتے ہوئے تینوں خاموش رہے، پھر جیک ضبط نہ کرسکا اور اس سے بولا۔ ''پوکی...... تم کب کار خریدو گے، کیا تم نے ہمیں لفٹ دینے کے بارے میں سوچا ہے؟'' وہ کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر شیو کرنے لگا۔ جیک نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم نے سنا نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

اس نے شیو ختم کر کے سامان اپنی بوری میں رکھا اور بولا۔ ''میں ابھی اس معاملے پر غور کر رہا ہوں۔'' جیک ایک مرتبہ پھر شدت سے تمنا کرنے لگا کہ اگر وہ موقع پاسکے تو اپنا چاقو اس کے سینے میں اتارنے میں ایک پل نہ لگائے۔

پوکی نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا خیال ہے، چلتے ہو میرے ساتھ...... نہر پر چل کر نہالیں؟''

جیک کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ اس کے جانے کے بعد میگی اس کے سامان کی تلاشی لے کر رقم نکال سکتی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو پوکی نے پلٹ کر کہا۔ ''رقم میرے پاس ہے، میرے سامان کو کھنگالنے کی زحمت میں نہ پڑنا۔''

یہ سن کر جیک جل کر رہ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پیچھے چل پڑا۔ پوکی نے رک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''مجھے سچ سچ بتاؤ، کہ تم دل ہی دل میں مجھے قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہو ناں...... کہ میری رقم ہتھیا سکو۔''

اس نے کچھ اس انداز میں پوچھا تھا...... کہ جیک انکار نہ کرسکا۔ اس نے صاف بات کرنے میں بہتری سمجھی۔ ''ہاں ...... مجھے روپیہ چاہیے۔''

''یعنی...... تمہیں پیسے کی اتنی ضرورت ہے کہ اس کے لیے تم قتل بھی کرسکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......'' جیک چڑ کر بولا۔

''مجھے تم جیسے ہی ایک شخص کی ضرورت ہے جو میرے منصوبے میں میرا ساتھ دے سکے۔ شاید اس میں ایک دو قتل بھی کرنے پڑیں لیکن پیسے کی اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

جیک کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں...... میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں جس میں بھوک اور فاقے ہیں، میں اسے بدلنا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر تم میرے ساتھ اس معاہدے میں داخل ہو چکے ہو۔ میں بہت جلد تمہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کر دوں گا۔ اب تمہیں اپنی منگیتر کو خود منانا ہوگا...... کہ وہ ہمارا ساتھ دے۔ ورنہ پھر ہمیں کسی اور لڑکی سے کام لینا ہوگا۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میگی کو میں خود دیکھ لوں گا۔ ویسے بھی اگر وہ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہوگئی تو ٹھیک ہے...... ورنہ...... جب انسان کے پاس روپیہ ہو، تو اسے لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی۔''

دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطمینان کر لیا۔ پوکی بولا۔ ''میں گاڑی خریدنے کے لیے جا رہا ہوں، تم لڑکی سے بات کرلو۔''

⊠⊠⊠

جیک واپس آیا تو اسے اکیلے دیکھ کر میگی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''وہ چلا گیا ہے؟''

''نہیں...... وہ گاڑی خریدنے گیا ہے۔'' جیک نے بتایا۔

''اچھا...... تو وہ مان گیا ہے کہ ہمیں ساتھ لے جائے گا؟'' میگی نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں...... میں تو اس کے ساتھ ہی جاؤں گا۔'' وہ بولا۔

''اور میں......؟'' میگی نے بے تابی سے پوچھا۔

”تمہاری مرضی ہے، اگر تم جانا چاہتی ہو تو چلو...... ورنہ تمہیں آزادی ہے۔ تم ہم سے علیحدہ ہو سکتی ہو۔“

”نہیں...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ خفگی سے کہنے لگی۔ ”تم مجھے اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔“

”دیکھو میگی...... میں تمام زندگی اس طرح فاقوں میں نہیں بسر کر سکتا...... میں زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔ مجھے بہت سارو پیہ چاہیے اور اس کے لیے مجھے خطرات مول لینا ہوں گے...... پوکی کے پاس ایک بہت زبردست منصوبہ ہے۔ جس میں تخت یا تختہ دونوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ تو کیا تم میں اتنی جرأت ہے کہ...... تم ہر وقت خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہو۔“

”اوہ...... جیک......“ میگی کانپ گئی۔ ”آؤ...... یہاں سے چلتے ہیں۔ وہ ایک مجرم ہے...... ایک جنونی ہے...... ہمیں اس کا ساتھ دینے کی ضرورت نہیں...... ہم کوئی نوکری کر لیں گے۔ اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائیں گے...... ہم خود اپنی زندگی بنائیں گے، جیسی بھی ہوگی۔ کم از کم اس میں کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا ناں۔“ اس نے جیک کا بازو تھام لیا۔

”بکومت...... اگر تم خود ایسی کسمپرسی کی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو گزارو۔“ جیک نے اپنا بازو زور سے جھٹکا۔ ”اسی لیے میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر تم جانا چاہتی ہو...... تو چلی جاؤ۔“

میگی پریشان ہو گئی۔ وہ جیک سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنی نئی زندگی کے لیے بہت سے سہانے سپنے دیکھے تھے۔ وہ ان کی کرچیاں اپنے ہاتھوں سے نہیں چننا چاہتی تھی۔ اس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے اس سے پوچھا بھی ہے کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔“

”دیکھو میگی!...... سارا کام اس کا ہی ہوگا، ہم جتنا زیادہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے، اتنا ہی پریشان ہوں گے۔ ہمیں پیسے سے غرض ہے اور وہ ہمیں آنے والی رقم کا تیسرا حصہ دے گا۔ جب ہمارے پاس کافی رقم جمع ہو جائے گی تو ہم اس سے علیحدہ ہو جائیں گے اور ایک اچھی زندگی گزاریں گے۔“

”جیک...... کیا تمہیں اس پر اعتماد ہے؟“

”اعتماد تو مجھے خود پر بھی نہیں ہے تو کسی دوسرے کے اعتماد کی بات کیا کروں...... لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے۔ ہم دونوں اپنے حصے کا روپیہ بہت جلد جمع کر لینا چاہتے ہیں تا کہ ایک اچھی زندگی گزار سکیں۔ اب تم سوچ لو کہ تمہیں ہمارے اس پروگرام میں شامل ہونا ہے یا نہیں...... مگر اتنا خیال رہے کہ جب تم ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گی...... تو پھر باہر نکلنا تمہارے اختیار میں نہیں ہوگا۔ نہ ہی تم اپنی رائے بدل سکو گی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

میگی ایک طویل لمحے کے لیے بیٹھی سوچتی رہی...... پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ٹھیک ہے جیک...... میں تمہارے ساتھ ہوں، تم جو بھی کرو گے...... جہاں بھی جاؤ گے...... میں تمہارے ساتھ رہوں گی...... کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“

جیک نے اس کے جذبات کی پروا کیے بغیر خشک لہجے میں اس سے کہا۔ ”تو پھر تمہیں وہی کرنا ہوگا جو تمہیں بتایا جائے گا۔ کوئی سوال...... کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

اس نے مجبوراً اثبات میں سر ہلا دیا...... تو جیک کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”تم ایک بات جانتی ہو میگی؟“

”کیا......؟“

”میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔“ جیک نے کہا۔

میگی نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ یہ چھوٹا سا فقرہ دنیا کا سب سے خوبصورت جملہ تھا، جو اس سے کہا گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر نہیں رہ سکی کھنچ کر جیک تک چلی آئی...... جیک نے اپنا بازو اس کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”جیک...... کیا تمہیں یقین ہے کہ پوکی ہمیں دھوکا نہیں دے گا۔ وہ مجھے جنونی سا لگتا ہے، کہیں وہ ہمیں کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔“

”اس کو تم مجھ پر چھوڑ دو...... اور بس اب تم جلدی سے پیکنگ کر لو، جیسے ہی پوکی گاڑی خرید کر آئے گا۔ ہم اس کے ساتھ چل پڑیں گے۔“

تقریباً بیس پچیس منٹ بعد پوکی واقعی آ گیا۔ دونوں سیڑھیوں پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ایک نیلے رنگ کی بیوک میں آیا تھا۔ جس کی سیٹیں سرخ رنگ کی تھیں اور اس کی حالت ایسی تھی کہ کسی کو اس کا نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

اس نے ایک گہری نگاہ دونوں پر ڈالی۔ میگی کو اس کی سیاہ آنکھیں اپنے جسم میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں، وہ اندر ہی اندر کانپ گئی۔ وہ جیک سے بولا۔

”یہاں سے ہم اگلے شہر روانہ ہوں گے۔ وہاں تم اپنی یہ بے ہنگم ڈاڑھی اور بے ترتیب بالوں سے نجات حاصل کر لینا، میرا مطلب ہے کہ جب ہم نئے شہر میں داخل ہوں،

تو ہم ایسے نظر آئیں جیسے معزز لوگ چھٹیاں گزارنے کے لیے کسی دوسرے شہر میں جاتے ہیں۔ چلو آؤ۔'' وہ کار کی طرف بڑھا اور وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

☒☒☒

نئے شہر میں وہ ایک سستے سے ہوٹل میں جا کر ٹھہرے۔ پوکی نے ان دونوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ شہر کی سیر کر آئیں۔ تب تک وہ کچھ لوگوں سے مل آئے گا۔ وہ تقریباً شام کو گھر آئے تو پوکی موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اس کی گاڑی کہیں نظر آ رہی تھی۔ میگی اور جیک دونوں ہی تھکے ہوئے تھے اس لیے دونوں ہی جلد اپنے اپنے کیبن میں جا کر سو رہے۔ اگلی صبح جب میگی چائے بنا رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ پوکی نے گاڑی ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کی اور اپنے کیبن کی طرف تیز قدموں سے چلا گیا۔

''یہ تمام رات باہر کیا کرتا رہا ہے؟'' میگی نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

''اسی سے پوچھ لینا۔'' جیک نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''نہیں...... مجھے تم بتاؤ...... کہیں وہ کوئی ایسا ویسا کام تو نہیں کر رہا؟'' میگی نے پریشانی سے کہا۔

جیک کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ ''میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم کوئی سوال نہیں کرو گی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں تم کو علیحدہ کرنا ہی پڑے گا۔''

اس کے لہجے کی سنگینی نے میگی کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑا دی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں...... نہیں...... میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ میں تو اس وجہ سے کہہ رہی تھی کہ کہیں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔''

''تمہیں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں تم...... تمہیں جو کہا جائے گا۔ تم وہی کرو گی۔'' وہ درشتی سے بولا تو میگی کو خاموش ہونا پڑا۔

اگلے چند دن بھی اسی طرح گزرے۔ میگی ہوٹل کے اس بدبودار کمرے میں رہ رہ کر پریشان ہو گئی۔ اب کئی بار جیک بھی پوکی کے ساتھ چلا جاتا تھا لیکن دونوں اسے کچھ نہیں بتاتے تھے۔ میگی ٹی وی دیکھ دیکھ کر اکتا گئی تھی جس میں کسی جنونی قاتل کا تذکرہ تھا جو اوپر تلے بڑے پراسرار انداز میں قتل کر رہا تھا۔ اب تک وہ تین قتل کر چکا تھا۔ پولیس دن رات اس کی تلاش میں تھی۔ وہ خوفزدہ سی ہو جاتی مگر جیک سے کچھ کہہ نہیں پاتی تھی۔

ایک دوپہر جیک تیزی کے ساتھ کیبن میں آیا تو وہ اس پر برس پڑی۔ ''حد ہو گئی ہے۔ تم نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہو اور یہاں میں سارا وقت انتظار کر کے بور ہوتی رہتی ہوں۔ آخر تم تھے کہاں؟''

جیک نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایک خوفزدہ کر دینے والا تاثر تھا۔

اس نے سنگین لہجے میں کہا۔ ''جلدی سے سامان باندھو...... ہم ابھی چل رہے ہیں۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور الماری میں سے اپنی چیزیں نکال کر بیڈ پر رکھنے لگا۔

''کہاں چل رہے ہیں ہم......؟'' میگی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

جیک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... آگے بڑھ کر اس کا بازو مروڑ کر ایک زوردار ہاتھ اس کی پشت پر جمایا اور غرایا ''سنا نہیں تم نے...... سامان باندھو۔''

میگی وحشت زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹی...... تو وہ خونخوار لہجے میں بولا۔ ''ایک اور دوں تمہیں ایسا ہی......''

وہ لڑکھڑائی اور جلدی جلدی بیگ میں چیزیں بھرنے لگی۔ اسی وقت کیبن کا دروازہ کھلا اور پوکی نے اندر جھانکا۔

''جیک ذرا یہاں آنا۔'' اس نے اتنا کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔

''میری چیزیں بھی بیگ میں رکھو...... میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جب وہ واپس آیا تو میگی دونوں بیگ بند کر چکی تھی۔ وہ تیزی سے بولا۔ ''چلو...... چلیں......''

''کہاں...... کچھ بتاؤ تو سہی؟'' میگی کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

''تم اپنا یہ منہ بند رکھنا کب سیکھو گی؟'' وہ غرایا۔

''کیا میں اتنا بھی نہیں پوچھ سکتی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میگی نے شکوہ کیا۔

''اوہو...... تم چلو بس...... چلنے والی بات کرو۔'' وہ بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میگی اس کے پیچھے لپکی...... جیک نے دونوں بیگ گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھے اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ ''پوکی کہاں ہے، کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں چل رہا؟'' میگی نے پوچھا۔

جیک نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کون پوکی......؟ تم کس کے بارے میں بات کر رہی ہو؟''

میگی بھونچکا سی رہ گئی۔ اس نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن جیک کے چہرے کی سنگینی دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی...... اور اس نے گاڑی ہوٹل سے نکال کر ہائی وے پر ڈال دی۔

تمام راستہ جیک بالکل خاموش رہا۔ یوں جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ میگی کو بھی چپ رہنا پڑا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا کچھ کہنا لاحاصل ہے...... لیکن اس کے دل میں اطمینان نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی جال میں پھنستی جا رہی ہے۔

وہ شہر میں داخل ہوئے اور جیک نے گاڑی بندرگاہ پر پارک کر دی۔ اسی نے بیگ باہر نکالے اور میگی کا بیگ اسے تھماتے ہوئے بولا۔ ''چلو...... یہاں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا۔''

میگی اس کے پیچھے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ بیگ کے وزن سے اس کی کمر جھکی ہوئی تھی لیکن اسے جیک کے لمبے لمبے ڈگ بھرنے کا ساتھ دوڑ کر دینا پڑ رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ ایک سستے سے ہوٹل میں پہنچے اور جیک نے کاؤنٹر کلرک سے کہا۔ ''ہمارے لیے کمرا بک ہے...... مسٹر اینڈ مسز جانسن......''

اس نے ایک نظر رجسٹر پر ڈالی اور انہیں چابی تھما دی۔

کمرا کسی حد تک گزارے لائق تھا۔ البتہ باتھ روم کی حالت ابتر تھی۔ پہلا ہوٹل اس سے بہت بہتر تھا۔ میگی کو آخر کہنا ہی پڑا۔ ''جیک...... بھلا وہ ہوٹل چھوڑنے کی ضرورت کیا تھی۔ وہ کم از کم اس سے تو بہتر تھا۔''

''کون سا ہوٹل......؟'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اوہ خدایا...... جیک...... تم مجھے پاگل کر کے رہو گے۔ پہلے تم کہہ رہے تھے کہ پوکی کون ہے۔ اب کہہ رہے ہو کون سا ہوٹل...... آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ ''بس تم اتنا یاد رکھو کہ ہم کسی پوکی کو نہیں جانتے...... ہم کبھی اس سے نہیں ملے۔ نہ ہم کبھی اس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، نہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔''

میگی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے پریشانی سے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں یہ بیان پولیس کو دینا ہوگا۔ کیا کوئی خطرہ ہے...... کیا پوکی نے کوئی جرم کیا ہے؟''

''ہاں...... اب تم سمجھی ہو...... شاباش...... تم بہت جلد سیکھ جاؤ گی۔'' جیک مسکرایا۔

''اوہ...... نہیں۔'' میگی اس کی الٹی بات سمجھ کر پریشان ہوئی۔ ''جیک...... تم کس راستے پر چل پڑے ہو۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں اس قسم کے جرائم میں خود کو ملوث نہیں کر سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے تم سے علیحدہ ہونے کا افسوس ہوگا لیکن میں تمہارا ساتھ مزید نہیں دے سکتی۔''

''اچھا...... تو تم جانا چاہتی ہو۔'' اس کے سرد لہجے نے میگی کو ڈرا دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنا چاقو نکال لیا اور اس کے چمکتے ہوئے پھل پر انگلی پھیر کر بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ اگر تم ایک بار اس میں شامل ہو گئیں تو پھر اس میں سے نکل نہیں سکو گی۔ تم یہاں سے ذرا ایک قدم بھی بڑھا کر دیکھو تو میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔''

میگی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے لرز کر جیک کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا اور اس نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ ''چلو آؤ، تمہیں شہر کی سیر کرا لاؤں۔''

میگی کا رواں رواں خوف سے کانپ رہا تھا لیکن اسے جیک کے ساتھ چلنا پڑا۔

☒☒☒

اگلے دن جیک نے تقریباً بارہ بجے میگی سے اچانک کہا۔ ''تمہیں کچھ دور ابھی جانا ہوگا۔''

''مگر کہاں......؟'' میگی نے حیرت سے سوال کیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

''میری بات غور سے سنو...... میں بار بار اپنی بات کو دہرایا نہیں کرتا۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''یہاں سے تم بس میں سوار ہو کر ائرپورٹ پہنچو گی، وہاں لابی میں جا کر دیکھنا کہ تمہارے بائیں ہاتھ...... ٹیلی فون بوتھوں کی ایک قطار ہوگی۔ تم بوتھ اے میں چلی جانا۔ لیکن ہوشیاری سے کہ اگر کوئی تم سے پوچھ لے کہ تم کہاں فون کر رہی ہو، تو تمہیں اس کے بارے میں درست طور پر پتا ہونا چاہیے۔ تم وہاں ایسا ہی ظاہر کرنا کہ جیسے تم کوئی نمبر ڈائل کر رہی ہو اور وہ تمہیں مل نہیں رہا اور اس دوران تم سکوں والے ڈبے کے نیچے اپنا ہاتھ لگا کر دیکھنا۔ وہاں ایک لفافہ ہوگا، جو ٹیپ کے ساتھ وہاں چپکا ہوا ہوگا۔ تم اس لفافے کو وہاں سے اتار کر اپنے پرس میں رکھ لینا۔ لیکن بہت احتیاط کے ساتھ کہ تمہیں کوئی دیکھ نہ پائے۔''

میگی نے اپنے خشک ہونٹ تر کیے اور بولی۔ ''تم خود یہ سب کیوں نہیں کر لیتے؟''

''کیا خیال ہے تمہارا......؟ تم کچھ مزہ چکھنا چاہتی ہو یا آرام سے چلی جاؤ گی۔'' وہ سرد کر دینے والے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، میں کروں گی۔'' میگی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ اور اٹھ کر اپنا پرس اٹھایا اور بس اسٹاپ پر آ گئی۔

وہ سیدھی ائرپورٹ پر اتری۔ اس نے دور سے دیکھا۔ بوتھ اے خالی تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے، لیکن اسے وہ کام کرنا تھا جو جیک نے اسے بتایا تھا۔ بہ مشکل تمام اس نے پرس بند کیا اور بس اسٹاپ پر آ گئی۔ بس تقریباً خالی تھی، وہ

پسینے میں نہائی ہوئی ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔
اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ لفافے کے اندر کیا ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہر کوئی اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جیسے سب کو علم ہے کہ اس کے پرس کے اندر ایک مشکوک لفافہ ہے۔ بس نے رفتار پکڑ لی تھی اور وہ سڑک کی بھیڑ میں بڑھتی چلی جارہی تھی۔ میگی نے آہستگی سے اپنا پرس کھولا اور لفافہ باہر نکال لیا۔ وہ کچھ وزنی سا معلوم ہوتا تھا۔
وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کے اندر کیا ہے......؟ اس نے اپنے ناخن کے ساتھ اسے بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ کھولا۔ اس کے اندر ہزار ہزار کے پانچ نوٹ تھے، کرنسی نوٹ......
میگی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے اتنے نوٹ اکٹھے نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اس خیال نے اسے لرزا دیا کہ یہ کرنسی نوٹ یقیناً کسی کو بلیک میل کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔
اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ کس طرح خود بخود نہ چاہتے ہوئے بھی جرائم کے اس چنگل میں آن پھنسی تھی۔ بس چلتی جارہی تھی اور اس کی سوچیں بھی بڑی تیزی سے سفر کر رہی تھیں۔ آخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی اور اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اسے راستے میں آنے والے بس کے اڈے پر اتار دے۔
''ٹھیک ہے...... بسوں کا اڈا دو یا تین منٹ میں آنے والا ہے۔ تم اترنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔'' وہ بولا۔
میگی نے خود میں اعتماد کو لوٹتے ہوئے پایا۔ اس کے پاس پانچ ہزار ڈالرز تھے۔ وہ اس ماحول سے، اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور چلی جائے گی اور ایک نئی زندگی شروع کرے گی جس میں ان جرائم اور اس خوف کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ وہ جیک کو ہمیشہ کے لیے بھول جائے گی۔ جواب اس کا محبوب نہیں تھا، ایک مجرم بن چکا تھا۔
وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئی۔ اس نے پرس پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ ڈرائیور نے بس روک دی۔ وہ بس سے باہر آئی تو اسے آزادی کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک عرصے بعد تازہ ہوا میں سانس لینے کے قابل ہوئی ہے۔ سامنے ہی بس سروس کا ٹکٹ گھر نظر آرہا تھا۔ میگی نے قدموں کی رفتار کو تیز کیا اور اس طرف بڑھ گئی۔
''ہیلو......!'' یہ آواز اس کے سینے میں جیسے تیز چاقو کا کاری وار بن کر اتر گئی...... اس کا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہوگیا۔ اس نے ساکت سی ہو کر آواز کی سمت دیکھا۔
جیک گاڑی میں سے جھانک رہا تھا...... وہ قریب آیا اور مسکرا کر بولا۔ ''ہیلو...... محترمہ...... کیا آپ کو لفٹ چاہیے۔''
میگی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کا دل چاہا کہ اپنی پوری قوت کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلے۔ لیکن اس کے قدم وہیں گڑھ کر رہ گئے۔ جیک نے دروازہ کھولا اور وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔
جیک گاڑی کو دور ساحل سمندر پر لے گیا۔ جہاں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور میگی کی طرف پلٹ کر بولا۔ ''ہاں...... تو تم نے وہ لفافہ وہاں سے نکال لیا تھا۔'' میگی نے بغیر کچھ کہے لفافہ پرس سے نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔
اس نے لفافہ ہاتھ میں لیا اور اسے کھلا ہوا محسوس کر کے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم نے دیکھ لیا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے؟''
پھر اس نے وہ نوٹ ہاتھ میں لے کر دیکھے اور بولا۔
''واہ...... بہت خوب۔'' اور میگی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں...... تو تم کہاں جارہی تھیں؟''
''مجھے ان پیسوں سے کوئی غرض نہیں...... میں...... میں علیحدہ ہونا چاہتی ہوں...... میں جرم کے اس راستے پر نہیں چلنا چاہتی...... میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی کسی سے کوئی لفظ نہیں کہوں گی۔'' میگی نے بے تابی سے کہا۔
''کچھ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں مگر تم نہیں ہو...... تم کہیں بھی نہیں جاسکتیں۔ تم معاہدہ کر چکی ہو، تم اس میں سے نہیں نکل سکتیں۔'' وہ کرنسی نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔
''پلیز...... مجھے جانے دو جیک...... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی...... وہ شخص پاگل ہے، وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی پھنسائے گا...... وہ لوگوں کو قتل کرتا پھرتا ہے۔ انہیں خوفزدہ کر کے پیسے بٹور رہا ہے۔ ہمیں ایسے پیسے نہیں چاہئیں...... جو ہمیں کسی وقت بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل سکتے ہیں۔ ہمیں ان پیسوں کا کیا فائدہ جو ہمیں خوشی دینے کے بجائے خوف اور پریشانی دیں۔'' وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہتی جارہی تھی۔
لیکن جیک یوں بیٹھا ہوا تھا، جیسے بہرا ہو...... وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔
وہ جھنجلا کر بولی۔ ''میری بات سنو جیک...... مجھے جانے دو...... میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' جیک نے رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر سہما دینے والی سنگینی تھی۔ ''تم زندہ رہنا چاہتی ہو یا نہیں......؟''
میگی لرز کر سیٹ پر اس سے دور ہٹ گئی۔ وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔ ''اس کے بعد مجھے یہ سب کہنے کی ضرورت نہ پڑے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب کوئی کسی مجرم کے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لیتا ہے۔ تو پھر وہ کہیں نہیں جاسکتا۔ اب ہم بھی کہیں نہیں جاسکتے۔ ہم جتنا بھی دور نکل جائیں، پوکی ہمارا پیچھا کرے گا...... اور اس کی گولی ہمارا بھیجا نکال دے گی، سمجھیں تم۔''
میگی نے شانے جھٹک کر اپنے بال پیشانی سے پیچھے ہٹائے اور بولی۔ ''تم مجھے اس طرح خوفزدہ نہیں کر سکتے...... جو بھی ہوگا، میں دیکھ لوں گی۔ روز روز مرنے سے بہتر ہے کہ ایک بار ہی انسان مرجائے۔ میں ابھی جارہی ہوں۔''
''جاؤ......'' جیک نے آواز بلند کی۔ ''جاؤ...... ذرا تم گاڑی سے باہر نکل کر دکھاؤ۔ پوکی تو بعد میں تم سے نمٹے گا، پہلے ہی میں تمہاری طبیعت صاف کر دوں گا۔''
میگی وہیں بیٹھی رہ گئی جیسے پتھر کی ہوگئی ہو۔

⊠⊠⊠

دو دن بعد جیک پھر اس کے ساتھ تھا اور اسے پانچ ٹیلی فون بوتھ سے لفافہ نکال کر لانا تھا۔ خوف، دہشت اور نفرت نے اسے بالکل بے حس سا بنا دیا تھا۔ اب اسے کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔ نہ پولیس کا خوف، نہ جیل کی سلاخوں کا ڈر...... نہ بہتر زندگی حاصل کرنے کی آرزو۔ وہ سب سے پہلے بوتھ نمبر 3 میں گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے سکوں کے بکس کے نیچے ہاتھ مارا۔ لفافہ وہاں چپکا ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے لفافہ اکھاڑا...... اور اپنے پرس میں ڈال لیا۔ اسی طرح اس نے دو اور لفافے نکالے۔ انہیں پرس میں ڈالا اور گاڑی تک آگئی جہاں جیک اس کے انتظار میں تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر لفافے اس کی گود میں پھینک دیے۔ وہ پاگلوں کی طرح نوٹ گننے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو جیب میں ڈالا اور بولا۔ ''اب ہمیں اسٹیشن پر بوتھ نمبر 8 دیکھنا ہے۔ میں وہاں گاڑی پارک نہیں کروں۔ ادھر ادھر گھومتا رہوں گا۔ جب تم لفافہ نکال لاؤ گی تو میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔''
وہ گاڑی سے اتری اور تیزی سے فون بوتھ کی طرف بڑھی۔ اس بوتھ میں پہلے سے کوئی موجود تھا۔ اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ شخص چلا گیا...... تو میگی اندر داخل ہوئی، اس نے جلدی سے سکوں کے بکس کے نیچے ہاتھ مارا...... اس کی انگلیاں دھات سے مس ہوئیں۔ وہاں کوئی لفافہ نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، یہ بکس نمبر 8 ہی تھا۔ تو پھر یہاں لفافہ کیوں نہیں تھا؟
اس وقت تک باہر کوئی اور شخص آچکا تھا اور اسے باہر نکلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ پریشان سی ہو کر باہر نکلی۔ کچھ دور تک وہ پیدل چلی گئی۔ پھر جیک نے گاڑی اس کے برابر لا کر

کھڑی کی، وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔
"ہاں...... ملا لفافہ......؟" جیک نے پوچھا۔
"نہیں۔" میگی نے مختصر سا جواب دیا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" وہ اکھڑپنے سے بولا۔
"وہاں کوئی لفافہ نہیں تھا۔"
"یہ کہیں تم مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہیں؟" وہ دانت پیس کر بولا۔
"مجھے یہ سب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں......" میگی نے اپنا پرس اس کی طرف اچھالا۔ "یہ لو، تلاشی لے لو۔"
"مجھے تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔" اس نے پرس پھر اس کی گود میں پھینک دیا اور بولا۔ "جاؤ، جا کر تمام بوتھ دیکھ کر آؤ...... ہوسکتا ہے اسے نمبر بتانے میں غلطی ہوگئی ہو۔"
"اب تم جاؤ، میں نہیں جاؤں گی۔" میگی نے چڑ کر کہا۔
"تم ہی جاؤ گی...... سمجھیں تم۔" اس نے ایک زوردار مکا اس کے گھٹنے پر اس طرح مارا کہ وہ درد سے دہری ہوگئی۔
"اٹھو اور جا کر سارے بوتھ دیکھ کر آؤ۔"
وہ باہر نکلی تو گھٹنے کی چوٹ کی وجہ سے لنگڑا رہی تھی۔ سڑک کے پار ٹیلی فون بوتھ کی پوری قطار تھی اور اکثر میں لوگ فون کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن میگی کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ جیسے حواس باختہ سی ہوگئی تھی۔ وہ بغیر کسی خوف کے...... بغیر کسی کی پروا کیے، ایک ایک بوتھ میں داخل ہو کر ٹیلی فون کرنے والے کو پیچھے ہٹاتی...... تیزی کے ساتھ سکوں والے باکس کے نیچے ہاتھ مارتی، وہاں کچھ نہ ملتا تو باہر نکل آتی۔
اب لوگ بھی اس کی طرف دیکھنے لگے تھے لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی، نہ کسی کا خیال۔ وہ جلد از جلد تمام بوتھوں کا جائزہ لے لینا چاہتی تھی۔ پورا اطمینان کر لینے کے بعد وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ جیک نے چھوٹتے ہی کہا۔ "مل گیا؟"
"نہیں......" میگی نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کہا۔
"پوکی...... غلط تو نہیں کہتا۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔ "کہیں کسی اور نے تو پیسے نہیں نکال لیے؟"
میگی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔ جیک نے لفافوں میں سے کرنسی نوٹ نکالے اور انہیں گنا...... پھر سرشار سے لہجے میں بولا۔ "بیس ہزار......! واہ بہت خوب...... یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی زمین پر گری ہوئی چیریاں چنتا جائے...... بس اتنا ہمارے لیے کافی ہے، اتنی رقم سے ہم ایک نئی زندگی شروع کرسکتے ہیں۔"
میگی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جیک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بس اب ہم پوکی سے علیحدہ ہوجائیں گے۔ ہم اسی وقت یہ رقم لے کر اس شہر سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اس کی کار راستے میں چھوڑ کر سب سے پہلے مل جانے والی فلائٹ پکڑیں گے اور پھر اس زندگی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔"
میگی کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اٹھی۔ "جیک...... کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"
"ہاں...... بالکل سچ...... میں سوچتا ہوں کہ اتنی رقم بھی بہت ہے کہ ابھی ہم سلاخوں کے پار نہیں...... ابھی ہم اپنی زندگی بنا سکتے ہیں...... بس ہم ہوٹل جا کر اپنا سامان اٹھائیں گے، بل ادا کریں گے اور وہاں سے سیدھے نئے راستے پر نکل جائیں گے۔"
میگی کو یقین نہیں آرہا تھا لیکن جس انداز میں وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اسے خوشی اور نجات کا پیغام دے رہا تھا۔
دونوں خوشی خوشی گاڑی سے اترے...... تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے تک پہنچے۔ جیک نے دروازہ کھولا اور ٹھٹک گیا۔ پوکی بیڈ پر بیٹھا بڑے مزے سے ایک مالٹا کھا رہا تھا۔ اس نے ایک بیج منہ سے نکال کر دور پھینکا اور بولا۔ "ہاں بھئی...... آج کتنے پیسے ہوئے؟"
پھر اس نے آدھا کھایا ہوا مالٹا فرش پر پھینکا اور اپنے ہاتھ اپنی پتلون سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ "لاؤ...... آج کی آمدنی......"
جیک یوں آگے بڑھا، جیسے اسے قتل کیا جانے والا ہو، اس نے بڑی دقت سے چار لفافے اپنی جیب سے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیے۔ پوکی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
"اور پانچواں لفافہ کدھر ہے؟"
"پانچواں لفافہ وہاں نہیں تھا۔" جیک نے اطلاع دی۔
"اس بوتھ کا کون سا نمبر تھا؟" وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔
"شاید آٹھ نمبر......"
"ٹھیک ہے...... میں اسے دیکھ لوں گا۔" وہ بڑبڑایا اور رقم گننے لگا۔ پھر اس نے کچھ نوٹ علیحدہ کیے اور جیک کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ لے لو، تمہارا حصہ......! کل پھر پانچ لفافے اسی طرح لانے ہوں گے۔"
جیک کچھ نہیں بولا۔ کرنسی نوٹوں کی ایک بڑی گڈی پوکی کی جیب میں جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے اندر ابال سے اٹھ رہے تھے۔ اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ اگر یہ مردود پوکی یہاں نہ پہنچ گیا ہوتا، تو وہ اس وقت بیس ہزار کے ساتھ ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہوتا۔

پوکی بیڈ سے اترا اور اس کے برابر سے گزرتے ہوئے اسے کاغذ کا ایک پرزہ تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ لو، ٹیلی فون بوتھ کے نمبر ہیں۔ کل تم لوگ جا کر یہ لفافے جمع کر کے لے آنا۔ مجھے امید ہے کہ زیادہ تر لوگ رقم ادا کردیں گے، خوف ایسی چیز ہے جو انسان کو حکم ماننے پر مجبور کردیتی ہے اور جو پوکی کا حکم نہیں مانتا۔ اسے اس کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔"
وہ کمرے سے نکل گیا تو جیک نے کاغذ کا وہ ٹکڑا کھول کر پڑھا۔ اس میں مختلف ٹیلی فون بوتھ کے نمبر اور ایڈریس لکھے ہوئے تھے۔ جیک نے میگی کو مخاطب کیا جو ایک طرف لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ "کل ہم یہ رقم اکٹھی کرلیں گے اور سیدھے یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ ہماری غلطی تھی جو ہم یہاں واپس آگئے تھے۔ کل ہم اس غلطی کو نہیں دہرائیں گے۔ جب تک پوکی ہوشیار ہوگا تو ہم میلوں دور نکل چکے ہوں گے۔"
میگی کے چہرے پر امید کی ایک کرن سی چمکی۔ اسے لگا کہ اس جال کے بندھن ٹوٹنے ہی والے ہیں اور انہیں آزادی کا سانس نصیب ہونے والا ہے۔
اگلے روز جیک نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گاڑی کو ورکشاپ لے گیا۔ اسے ٹھیک ٹھاک کرانے کے بعد اس نے ٹنکی پیٹرول سے بھروالی۔ وہ جانتا تھا کہ اس شہر سے اور پوکی کے جال سے نکلنے کے لیے اسے بہت لمبی ڈرائیو کرنی ہوگی۔ اس لیے گاڑی کو اچھی حالت میں ہونا چاہیے اور پیٹرول بھی وافر مقدار میں موجود ہونا چاہیے۔
انہوں نے تقریباً ساڑھے دس بجے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ میگی کے دل سے خوف بالکل نکل گیا تھا۔ وہ یوں بے حس ہوگئی تھی جیسے اسے پتا ہی نہ ہو کہ وہ کیا کررہی ہے۔ بارہ بجے تک وہ چار لفافے اکٹھے کرچکے تھے۔ اب انہیں آخری لفافہ نکالنا تھا اور پھر وہ اس شہر سے دور، بہت دور جانے والے تھے۔ میگی گاڑی سے نکل کر ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھی۔ جیک پارکنگ کی جگہ نہ پا کر سڑک پر ایک لمبا چکر لگانے لگا تاکہ وقت گزارا جاسکے۔
ٹیلی فون بوتھ میں ایک لڑکی کھڑی باتیں کیے جارہی تھی اور ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔ میگی نے کچھ دیر انتظار کیا۔ لیکن اس کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ یہ آخری مہم تھی جو اسے سر کرنی تھی۔ چار لفافے جیک کے پاس تھے۔ یعنی بیس ہزار اور یہ آخری پانچ ہزار اکٹھے کرنے کے بعد ان کے پاس پچیس ہزار جمع ہوجائیں گے...... اور وہ اس خوفزدہ کرنے والی زندگی سے باہر نکل آئیں گے۔
اسی سوچ نے میگی کو اور بے تاب کردیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... جلدی سے بوتھ کا دروازہ کھولا۔ اس لڑکی کو ایک طرف ہٹایا اور سکوں کے بکس تلے ہاتھ مارا۔ لفافہ وہاں موجود تھا۔ اس نے لفافہ اکھاڑا اور دروازہ کھول کر تیز قدموں سے باہر آگئی۔
اسے معلوم تھا کہ جیک کو پارکنگ کی جگہ نہیں ملی۔ اس لیے اس نے نیلی بیوک کو سڑک پر تلاش کرنے کی کوشش کی...... اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سڑک پر لمحے بھر میں پیچھے آنے والی جیکوار جیک کی بیوک سے ٹکرائی...... بیوک کسی کھلونے کی طرح ہوا میں اچھلی اور لڑھکنیاں کھاتے ہوئے آگ کے گولے میں تبدیل ہوگئی۔
اس نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ پولیس گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سن رہی تھی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی...... پھر کسی راہ گیر نے اس کا شانہ ہلایا۔
"مس...... اٹھو...... تم راستے میں بیٹھی ہوئی ہو۔"
وہ چونک کر اٹھی اور اس نے اردگرد دیکھا۔ ٹریفک اسی طرح رواں دواں تھی۔ جلی ہوئی گاڑیوں کو وہاں سے ہٹالیا گیا تھا اور جیک بھی اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے...... اپنی زندگی کس طرح شروع کرے...... اس کے پاس تو کوئی رقم بھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے پرس کی زپ کھولی اور اس کا دل حلق میں آگیا...... آخری لفافہ جو اس نے اکھاڑا تھا۔ وہ اس کے پرس میں موجود تھا۔
"اوہ......" اس نے اطمینان کا سانس لیا تو گویا اس کے پاس پانچ ہزار ڈالرز موجود تھے۔
اس رقم سے وہ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرسکتی تھی۔ وہ اس شہر سے دور جاسکتی تھی جس کے ساتھ اس کی بے حد اذیت ناک یادیں وابستہ تھیں۔
وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے پرس کھول کر لفافے کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔ پھر آہستگی کے ساتھ اسے باہر نکالا اور اس کی ٹیپ اتار کر اسے کھولا، اس کے اندر کوئی رقم نہیں تھی۔ ایک کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ میگی نے کاغذ کھولا۔ اس پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا تھا۔
"تم جہنم میں جاؤ، جو کرنا ہے کرلو...... میں تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتا۔ پانچ ہزار تو کیا...... میں تمہیں ایک ڈالر بھی دینے کو تیار نہیں۔"

محفلِ شعر و سخن



❊ احمد خان توحیدی...... راولپنڈی
دل ہے ٹکڑے ٹکڑے ہونٹوں پہ ہے تبسم
ایک درس لے رہا ہوں پھلوں کی زندگی سے

❊ ڈاکٹر وسیم خالق گھیاں...... گجرات
ملتا تھا وہ مجھ سے پل پل کے فرق سے
پل پل کا فرق پھر سالوں میں آگیا
ہوا تھا یوں کہ آنکھ سے نکل پڑے آنسو
چہرہ جو کبھی اس کا خیالوں میں آگیا

❊ نعیم الحق ڈار...... گوجرانوالہ
اس دورِ ریا میں اے لوگو اس شخص سے بھی محتاط رہو
جو شخص وفا کرسکتا ہے وہ جانے کیا کرسکتا ہے

❊ ساگر تلور...... چشمہ بیراج، میانوالی
مرا یہ وہم کہ تم لوٹ کر نہیں آؤ گے
یہ وہم دل سے مٹالوں تو پھر چلے جانا

❊ عمران حیدر بلوچ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کس روز تیری جدائی کے ماتم نہیں ہوتے
یہ صدمے تیری فرقت کے کبھی کم نہیں ہوتے

❊ صوبیدار (ر) انوار بنگش...... بلیر کینٹ
میرے وطن کی آن پہ آنے نہ دے گا آنچ
کوئی تو ہو گا، صاحب کردار دیکھنا
تاریخ اپنے خون سے لکھیں گے اہلِ دل
پیدا ہوئے ہیں پھر وہی آثار دیکھنا

❊ ذیشان حیدر بلوچ...... کمالا تحصیل ساہیوال
جہاں بھی ہو چلے آؤ تمہیں یادیں بلاتی ہیں
تمہارے ساتھ گزری تھیں جو شامیں بلاتی ہیں

❊ چمن آرا خان...... چیچہ وطنی
زیست کا عنوان محمدؐ ہے
متاعِ دل و جان محمدؐ ہے
خدا کو کون جانتا تھا؟
خدا کی پہچان محمدؐ ہے

❊ رمضان پاشا...... گلشن اقبال، کراچی
یہ چاندنی بھی جن کو چھونے سے ڈرتی ہے
دنیا انہی پھولوں کو پیروں تلے مسلتی ہے

❊ ابرار وارث...... درآباد سندیلیانوالی
ترتیب وقت میں شاید وہ لمحہ بھی آئے فراز
کہ دستک کو تیرا ہاتھ اٹھے اور میرا در ہی نہ ہو

❊ سردار اللہ دتہ، ظفر اقبال وڑائچ...... جودھپور
میں گرنے سے سنبھل جاتا اگر تم تھام لیتے تو
میں منزل کو بہل پاتا اگر تم تھام لیتے تو
ادھوری خواہشوں کا پورا ہونا ایک فسانہ ہے
کوئی ارمان مچل جاتا اگر تم تھام لیتے تو

❊ راشدہ اینڈ زاہدہ...... کھاناں
لا تیرے پاؤں پہ مرہم لگادوں ساحر
میرے دل کو ٹھوکر مارنے سے تجھے چوٹ تو آئی ہوگی

❊ رانا حبیب الرحمٰن...... سینٹرل جیل، کوٹ لکھپت
آنکھوں میں تیری کچھ ارمان چھوڑ جائیں گے
زندگی میں تیری کچھ نشان چھوڑ جائیں گے
لے جائیں گے تو بس تیری اک یاد دنیا سے
تیرے لیے سارا جہان چھوڑ جائیں گے

❊ راجہ افتخار علی افتی...... چو آسیدن شاہ
ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
محبتیں کچھ نہیں کہتیں وفائیں مار دیتی ہیں

❊ طاہرہ یاسمین...... سرگودھا
تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوسکیں
تیری یاد شاخ گلاب ہے جو ہوا چلی تو مہک اٹھی

❊ حکیم سید محمد رضا شاہ...... ضلع میانوالی
نگاہِ قیس سے دیکھو ہمیشہ لیلیٰ کو ساقی
صنم جس کا بھی ہو بے مثال ہوتا ہے

❊ ابرار احمد...... جامشورو
ابن آدم ہوں خطاؤں سے مبرا تو نہیں
ہنگامہ سا کیوں برپا ہے، محبت ہی تو کی ہے

❊ محمد اشفاق سیال...... شورکوٹ سٹی
ہونٹوں پہ کبھی ان کے میرا نام ہی آئے
آئے تو سہی؟ برسرِ الزام ہی آئے
باقی نہ رہے ساکھ ادا دشتِ جنوں کی
دل میں اگر اندیشۂ انجام ہی آئے

❊ ہریرہ ابوبکر...... فرد کہ، ضلع سرگودھا
صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دکھ کہتا ہے کہ میں کوئی دریا بھی تو دیکھوں

❊ سونم علی خان...... چیچہ وطنی
منڈیر پہ اِک شمع جلا رکھی ہے
اور شرط ہواؤں سے لگا رکھی ہے

❊ تفسیر عباس بابر...... اوکاڑہ
اک دوجے سے الجھ رہے ہیں عہد وفا کا پاس اور میں
تیرے شہر میں بھٹک رہے ہیں تم سے ملن کی آس اور میں

❊ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی...... خوشاب
تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی
ہم کو تو یہ بھی کہنے کی فرصت نہیں ملی

❊ ڈاکٹر ایچ اے لطیف...... فقیروالی
کمال کا شخص تھا جس نے زندگی تباہ کردی محسن
راز کی بات ہے دل اس سے خفا اب بھی نہیں

❊ محمد یونس چودھری...... سلطان پورہ، لاہور
ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں مرے ہے
لیکن وہ مرے خواب، مرے خواب، مرے خواب

❊ مسز ضیاالقمر سلطانہ...... رتی ٹبی، ساہیوال
کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
سہنے والے کمال کرتے ہیں

❊ ریاض بٹ...... حسن ابدال
تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

❊ ماہتاب گل رانا...... راجن پور
آشنا بن کے پھیر لیں آنکھیں
اجنبی کاش اجنبی رہتا

❊ اختر شاہ عارف...... ڈھوک جمعہ، جہلم
اے خدا خوشی ہر پل ان کے پاس رکھنا
میرے اپنوں کو تو کبھی نہ احساس رکھنا
غم نہ آئیں ان کے پاس کبھی میرے مولا
تو نظرِ کرم ان پہ خاص رکھنا

❊ ایس ایس اے حیدر...... ساہیوال
کہا تھا میں نے بچوں سے غبارے لے کے آؤں گا
خبر کیا تھی کہ سوچوں میں شرارے لے کے آؤں گا

❊ مسز رباب احمد حسن عرضی خان...... قبولہ شریف
عقب میں گہرا سمندر ہے سامنے جنگل
کسی انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

❊ سعدیہ بخاری...... ضلع اٹک
قصے جو تھے کبھی ہو چکے
تم ہمیں کھو چکے ہم تمہیں کھو چکے

❊ محمد آصف ساجد...... چونیاں، ضلع قصور
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

❊ سید محی الدین اشفاق...... لیہ
اترے جو زندگی، تری گہرائیوں میں ہم
محفل میں رہ کے بھی رہے تنہائیوں میں ہم

❊ انیلہ رشید سیال...... خیر پور (میرس)
میری دعاؤں میں تیرا وجود رہتا ہے
اس سے بڑھ کر میرا اعتراف کیا ہوگا

❊ سعید عباسی...... بہاولپور
میرا دل تو دیکھ میں اب تک زندہ ہوں
تیری محبت کے سب روگ اٹھا کر بھی

❄ علی عمران......لاہور
دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
سکھا دی بے مروتی بھی تمہیں ظالم زمانے نے
کہ تم جو ہنر سیکھ لیتے ہو، مجھی پہ آزماتے ہو

❄ ذیشان منہاس......گلشن اقبال
میرے سجدوں کے تسلسل کو تو کیا جانے
سر جھکایا! تیری خوشی مانگی، ہاتھ اٹھایا تو تیری زندگی مانگی

❄ ماہا ایمان......حافظ آباد
ورق ورق پر تیری عبادت، تیرا افسانہ، تیری حکایت
کتابِ ہستی جہاں سے کھولی تیری محبت کا باب نکلا

❄ رضوان احمد......شیخوپورہ
شہر کے کچھ بے گھروں میں موم کے گھر بانٹ کر
راہنمائی دھوپ کی کرتا رہا وہ شام تک

❄ محمد قاسم......ضلع خوشاب
زمیں کے آستانوں سے، فلک کے چاند تاروں تک
کوئی اہلِ وفا ڈھونڈو اگر ہم بے وفا ہیں تو!

❄ عصمت اللہ......ضلع خوشاب
گفتار نہ تکرار نہ اظہار کا رشتہ
اس جانِ وفا سے ہے مرا، اعتبار کا رشتہ

❄ ارسلا افضل......روہڑی
روز ہی بساتا ہوں اک نگر امیدوں کا
روز دل میں گرتی ہیں خواہشوں کی دیواریں

❄ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
کس قدر شوق سے آنگن میں لگائے ہم نے
وہ شجر جو کبھی چھتنار نہیں ہو سکتے

❄ رحمان بلوچ......مکران
دادِ سخن سے بزم میں واقف نہیں ہوں میں
ویسے ہی واہ واہ کیے جا رہا ہوں میں

❄ فرح ناز......لاہور
دنیا بھی اک فریب ہے یہ جانتے ہوئے
دانستہ پھنس گیا ہوں میں خود اس کے جال میں

❄ ہمایوں اختر......فیصل آباد
غرق ہو کر رہ گئیں طوفاں میں ان کی کشتیاں
جو یہ سمجھے عافیت کچھ دامنِ ساحل میں ہے

❄ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
جسے بھی دیکھیے جائے پناہ ڈھونڈے ہے
یہ کیسی دھوپ سروں پر ہے سائباں کی طرح

❄ محمد عزیز......کراچی
مانا یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں
لوگوں کا مشغلہ تو ہے اخبار دیکھنا

❄ طاہرہ یاسمین......ضلع سرگودھا
دل میں بھی تو ہی تو ہے نظر میں بھی تو ہی تو
تو ہی بتا یہ تو ہے کہ تیرا خیال ہے

❄ عدنان صدیقی......ملتان
چند سکے بھی نہیں اب تو بشر کی قیمت
بڑھ گئی کتنی ترے شہر میں زر کی قیمت

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
دکھوں کی تیز تپتی دھوپ میں اک لفظ ٹھنڈک ماں
محبت کے سفر کی ابتدا وانتہا تک "ماں"

❄ مشفق الرحمان......پڈعیدن
محبت میں ضروری تو نہیں کہ گفتگو بھی ہو
محبت کرنے والے اک زبانِ خاص رکھتے ہیں

❄ رمشہ علی......شیخوپورہ
عجب طرفہ تماشا ہے محبت کرنے والوں کا
گھڑی بھر میں بھلاتے ہیں تو صدیوں یاد کرتے ہیں

❄ عبدالواسع......ماڈل کالونی، کراچی
کتنے طوفان گزرے ہیں ہمارے سر سے
کیا ابھی اور ہے اندیشۂ طوفاں باقی

کوپن
برائے شمارہ مئی 2012

محفلِ شعر و سخن

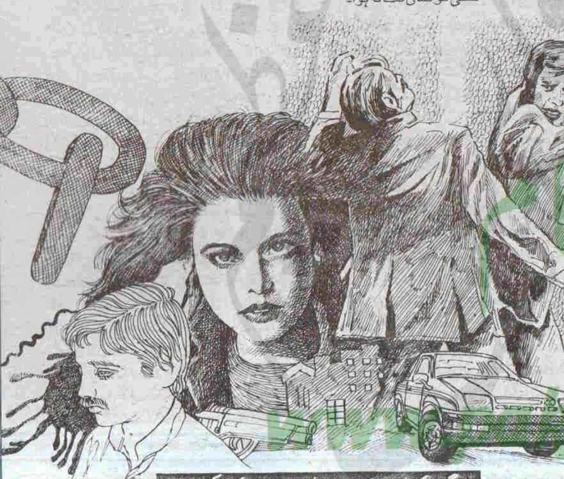
نام: ....

پتا: ....

چور سپاہی

ثمر عباس

دورِ حاضر میں واردات کے انداز میں بڑی جدت آگئی ہے... وہ بھی ایک دلچسپ صورتِ حال تھی جب چالاکی اس کی کلائی میں ہتھکڑی بن کر سمٹ آئی... ان دو میں سے کوئی ایک چور اور دوسرا مور تھا مگر روپ ایسا تھا کہ شناخت ممکن نہ تھی اور پھر یہی مشابہت اسے لے ڈوبی... جبکہ دوسرے اپنی کشتی تیرا گئے۔ یہی ان کے فن کا کمال تھا مگر کسی کو گمان تک نہ ہوا۔



گھڑی کی سوئیوں کے مطابق چلنے والے مجرموں کی انوکھی چال

وہ اپنی وین سے نیچے آیا اور بہ غور اس عالی شان عمارت کا جائزہ لیا۔ جس کے برآمدے میں داخلی دروازے کے سامنے دو عدد شیر بیٹھے تھے۔ یہ بہت اچھے ماربل سے تراشے ہوئے تھے اور یقیناً اس مکان کی طرح قدیم تھے۔ یہ شاید ایک صدی سے زیادہ پرانا اور خوب صورت دلا تھا۔

اس دو منزلہ مکان میں شاید دو درجن سے بھی زیادہ کمرے تھے۔ اس کے چاروں طرف شاندار قسم کا لان پھیلا ہوا تھا۔ ابھی وہ عمارت اور اس کے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر سے نمودار ہوئی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی خوب صورت اور اوپری طبقے کی عورت

تھی جس نے سادہ لیکن قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس نے برآمدے سے نکل کر متجسس نظروں سے وین کی طرف دیکھا جس پر ویگر کی میکر پرنٹ تھا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم یقیناً مارک ویگر ہو؟“

”یس میڈم۔“ اس نے اپنا ڈرائیونگ لائسنس نکال کر عورت کی طرف بڑھایا۔ اس پر اس کا نام مارک ویگر ہی لکھا تھا۔ ”مجھے مسز جیمس بیک ووڈ نے کال کی تھی۔“

”میں ہی مسز جیمس ہوں۔“ عورت نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ویسے میرا نام این ہے۔ تم چاہو تو مجھے اس نام سے بھی پکار سکتے ہو۔“

مارک نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی عمر شاید تیس اور پینتیس کے درمیان میں تھی۔ اس کی پی کیپ سے کسی قدر لمبے سفید بال جھانک رہے تھے اور ہونٹوں کے اوپر ہلکی سی مونچھیں تھیں۔ اپنے چھریرے جسم اور لڑکوں جیسے نقوش کی وجہ سے وہ زیادہ عمر کا نہیں لگتا تھا۔ این اسے اندر لائی۔ داخلی دروازے کے سامنے ایک طویل گیلری تھی جس میں دائیں بائیں کئی دروازے تھے لیکن این اسے گیلری سے گزار کر ایک نشست گاہ میں لائی جہاں کسی قدر بھاری جسم کا معمر شخص وہیل چیئر میں دھنسا بیٹھا تھا۔ این نے اس سے کہا۔ ”جیمس یہ مارک ویگر ہے تجوری ٹھیک کرنے آیا ہے۔“

”بیٹھو نوجوان۔“ جیمس نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔ اس کی عمر کم سے کم ساٹھ برس تھی اور مارک اس کے سامنے نوجوان ہی تھا۔ جیمس کے سامنے میز پر کاغذات اور لفافوں کا ایک ڈھیر تھا۔ وہ یقیناً اپنی ڈاک چیک کر رہا تھا۔ مارک اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ این نے اس کے لیے کافی نکالی اور اسے مگ تھما دیا۔ جیمس بدستور ڈاک دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر این سے کہا۔ ”بی این انشورنس کی طرف سے خط آیا ہے، تمہارا نیکلس مرمت ہو کر واپس آگیا ہے؟“

”ہاں کل ہی آیا ہے۔“ این نے جواب دیا۔ ”میں خط لکھنا بھول گئی تھی۔“

جیمس نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں ایسی چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ معاملہ ایک ملین ڈالرز کے نیکلس کا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو کمپنی انشورنس دینے سے انکار کر سکتی ہے۔ فوراً خط لکھو کہ نیکلس واپس آگیا ہے۔“

”میں لکھتی ہوں۔“

اب جیمس مارک کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم اپنے کام میں ماہر ہو؟“

”یقیناً جناب ورنہ آپ مجھے نہ بلاتے۔“ مارک نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں ذرا مصروف ہوں، این تمہیں تجوری دکھا دے گی۔“ جیمس نے کہا اور دوبارہ ڈاک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

این نے اسے اشارہ کیا اور دونوں نشست گاہ سے باہر آگئے۔ وہ جگہ جہاں تجوری رکھی تھی نشست گاہ سے کچھ دور مکان کے عقبی حصے میں تھی۔ یہ جگہ دفتر لگ رہی تھی اور بڑی سی میز کے پیچھے دیوار گیر تجوری تھی۔ یہ خاصی مہنگی اور جدید قسم کی تجوری تھی۔ دیواروں کے ساتھ لگی الماریوں میں کتابیں سجی تھیں۔ میز کے بائیں طرف دیوار کے ساتھ شیشے اور المونیم کی کھڑکی تھی جس پر باہر کی طرف سے اسی ڈیزائن کی فولادی گرل تھی جیسی مارک نے دوسری کھڑکیوں پر دیکھی تھی۔ یہ خاص قسم کی گرل تھی جو دیوار میں نصب نہیں ہوتی ہے بلکہ نہ کھلنے والے اسکرو کی مدد سے کھڑکی کے فریم میں فٹ تھی۔ یہ اسکروز چوکھٹ میں اس طرح لگے ہوئے تھے کہ ان کو کاٹ کر ہی کھولا جا سکتا تھا۔ مارک اس بڑی تجوری کی طرف متوجہ ہوا مگر این نے دوسری طرف اشارہ کیا۔ دیوار کے ساتھ لگی ایک چھوٹی تجوری رکھی تھی۔ یہ ڈولفن کمپنی کی بنی ہوئی ایک عام سی تجوری تھی۔ اسے نمبروں اور دو چابیوں کی مدد سے کھولا جاتا تھا۔ اس قسم کی تجوریاں درمیانی درجے کے تاجر یا امرا رکھتے تھے اور اس محل نما ولا میں اس کی موجودگی تعجب انگیز تھی مگر مارک تعجب کرنے کے لیے نہیں آیا۔

”کیا مسئلہ ہے اس میں؟“

”اس کا ایک تالا مسئلہ کر رہا ہے۔ چابی اٹک جاتی ہے اور بڑی مشکل سے کھلتا ہے۔“

”یہ اندر سے خالی ہے؟“

”ہاں اس میں کچھ نہیں ہے۔ تجوری کھلی ہوئی ہے۔“

”مجھے اس کی چابی دو مادام۔“ مارک نے کہا اور پھر وضاحت کی۔ ”جو تالا خراب ہے۔“

این نے اسے ایک چابی دی۔ اور تالے کی نشان دہی کی۔ مارک نے تالے میں چابی لگا کر دیکھی اور اسے کھولنے بند کرنے لگا۔ تالے میں یقیناً مسئلہ آگیا تھا۔ چابی اٹک رہی تھی۔ اس نے تجوری کا دروازہ کھول کر دیکھا اور این سے کہا۔ ”تالا کھول کر دیکھنا پڑے گا۔ ممکن ہے پورا تالا تبدیل ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرمت سے کام چل جائے۔“

”دیکھ لو لیکن کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔“ وہ بولی۔

مارک کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے وین سے اپنے اوزار لانے ہیں۔“

این اس کے ساتھ چل پڑی۔ راستے میں مارک نے پوچھا۔ ”تم دونوں اکیلے ہوتے ہو یہاں؟“

”ہاں... ہمارا بٹلر ملازمت چھوڑ کر چلا گیا ہے اور ابھی تک کوئی دوسرا اچھا بٹلر نہیں ملا ہے۔“ این نے کہا۔

”تم دونوں اتنے بڑے ولا میں رہتے ہو یہاں کوئی سیکورٹی سسٹم بھی نہیں ہے۔“

”ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔“ این بولی۔ لیکن اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ اپنی حفاظت کس طرح کر سکتے تھے۔ مارک نے وین سے اپنا ٹول بکس نکالا اور این کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ولا کی تمام کھڑکیوں پر مضبوط فولادی گرل تھی جسے کاٹنا یقیناً آسان کام نہیں تھا۔ سامنے کی طرف دروازہ صرف ایک تھا اور یہ بہت مضبوط تھا۔ یقیناً کسی کے لیے ولا میں گھسنا آسان کام نہیں تھا اور اگر کوئی گھس جائے تو اندر موجود تجوری نہیں کھول سکتا تھا۔ مگر ولا میں چھوٹی موٹی قیمتی اشیا کی کمی نہیں تھی۔ عام چوروں کے لیے یہاں بہت کچھ تھا۔ مارک نے دازاروں کی مدد سے تالا کھولنا شروع کیا۔ تالا اندر سے ویلڈ نہیں تھا بلکہ خاص قسم کے اسکروز کی مدد سے جڑا ہوا تھا۔ ان اسکرو کو خاص طریقے سے کھولنا پڑتا تھا۔ این ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں مارک نے تالا کھول لیا اور پھر اس کے پرزے دیکھنے لگا۔ جلد اس نے خرابی پکڑ لی۔ تالے کی ایک گراری ختم ہو رہی تھی۔ اس کی چوڑیاں گھسنے سے سلپ کرنے لگی تھیں جس سے چابی اٹکتی تھی۔ گراری مخصوص ساخت کی تھی اور بازار میں اس کا متبادل شاید ہی دستیاب ہوتا۔ اس نے مسز جیمس کو دکھائی۔

”یہ مسئلہ ہے اور شاید بازار میں اس کا متبادل بھی نہیں ملے گا۔ اب دو طریقے ہیں ایک میں تالا دے جاتا ہوں آپ ایسا ہی منگوا لیں اور میں دوبارہ آکر اسے جوڑ دوں گا۔“

این نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کام آج ہی ہونا ہے۔ دوسرا طریقہ کیا ہے؟“

”دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے پاس موجود نمونوں میں سے کسی سے ایسی ہی گراری تیار کر دوں۔“

”تمہارے پاس سامان ہے؟“

”ہاں اتنی بڑی وین اسی لیے تو لے کر پھرتا ہوں۔“ مارک نے فخر سے کہا۔ ”میرے پاس تمام سامان اور کام کی مشینیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم گراری یہیں بنانے کی کوشش کرو۔“ این نے کہا۔ ”تم کہاں کام کرو گے؟“

”ظاہر ہے یہیں تجوری کے پاس۔“ مارک نے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی کام کی مشینیں بھی لانا ہوں گی۔ یہاں کوئی پاور پوائنٹ ہے؟“

”ہاں موجود ہے۔“

مارک این کے ساتھ باہر گیا۔ اس نے وین سے مشینیں نکالیں اور انہیں ایک ٹرالی میں رکھ کر تجوری والے کمرے میں پہنچایا یہ خاصی بھاری اور نازک مشینیں تھیں جنہیں ہاتھ سے اٹھا کر لے جانا مشکل اور رسکی کام تھا۔ مارک اپنی مشینیں سیٹ کرنے لگا پھر اس نے پاور بورڈ لگایا اور اسے پوائنٹ سے جوڑ دیا۔ دوپہر کا وقت ہونے لگا تھا۔ این نے اس سے کہا۔ ”میں کھانا بنانے جا رہی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی بات کرنی ہو تو انٹر کام اٹھا کر زیرو دبا دینا۔“ اس نے میز پر رکھے انٹر کام کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے مادام۔“ مارک نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”اگر تم لنچ کرتے ہو تو میں تمہارے لیے بھی لنچ بنا لیتی ہوں؟“

مارک نے انکار کر دیا۔ ”نہیں شکریہ میں کام کے دوران کچھ نہیں کھاتا ہوں۔“

این نے اس کے پاس خراب تالے کی چابی بھی نہیں چھوڑی تھی۔ یعنی اس معاملے میں وہ پوری طرح محتاط تھی۔ مارک نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ابھی اسے چابی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے پاس موجود گراریوں کے بکس سے اس سے ملتی جلتی گراری نکالی جو تالے میں لگی تھی اور پھر اپنے پاس کٹنگ اور گھسائی کی مشینوں کی مدد سے اسے گراری کے مطابق بنانے لگا۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ گراری کی کسی بھی چوڑی میں ذرا سا بھی فرق کام خراب کر دیتا۔ وہ بہت احتیاط سے کام کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد این نے اسے کافی لا دی۔

”شکریہ مادام۔“ اس نے آنکھوں سے حفاظتی چشمہ اتارتے ہوئے اس سے کپ لیا۔ ”تم لوگ اچھے ہو۔“

”اس میں شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔“ این نے تجسس سے وہاں پھیلے سامان کو دیکھا۔ ایسا لگا جیسے اسے یہ پھیلاوا گراں گزر رہا ہو۔

”جب میں کام کر لوں گا تو یہ جگہ بالکل صاف کر دوں گا۔“ مارک نے اسے تسلی دی۔ ”تمہیں ذرا بھی زحمت نہیں ہو گی۔ کام کے دوران میں چیزیں ایسی ہی پھیلی رہتی ہیں۔“

مسز جیمس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ”کتنی دیر اور لگے گی؟“

"تقریباً دو گھنٹے کا کام اور ہے۔" مارک نے جواب دیا اور خالی کپ اسے تھما کر دوبارہ حفاظتی چشمہ آنکھوں پر چڑھا لیا۔ این کپ لے کر وہاں سے چلی گئی۔ اگلی بار وہ دو گھنٹے بعد ہی آئی تھی جب مارک کام مکمل کر کے تالے کو جوڑ کر اسے دوبارہ تجوری میں لگا رہا تھا۔ اس نے این سے چابی طلب کی اور چابی کو تالے میں بار بار گھما کر تسلی کرتا رہا کہ نئی گراری درست کام کر رہی ہے یا نہیں۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے تالے کو تجوری میں فٹ کر دیا۔ اپنا کام مکمل کر کے اس نے دوبارہ چابی سے متعدد بار تالے کو کھولا اور بند کیا۔ وہ ایک بار بھی نہیں اٹکا تھا۔

"اب یہ بہترین کام کر رہا ہے۔" مارک نے کہا۔ "تم چاہو تو چیک کر سکتی ہو۔ پھر بھی کوئی مسئلہ ہوا تو میں آ کر اسے بغیر کسی چارج کے ٹھیک کر دوں گا۔"

"اس کی گارنٹی کیا ہے؟"

"ویسے میں اپنے کام کی دو سال کی گارنٹی دیتا ہوں لیکن اس کی میں تین سال کی گارنٹی دوں گا۔ اگر لاک میں اسی گراری نے دوبارہ مسئلہ کیا تو میں اسے ٹھیک کرنے کا پابند ہوں گا۔"

مارک نے کپڑے سے ہاتھ صاف کیے اور گارنٹی کارڈ نکال کر اس پر تفصیل لکھ کر اور اپنے سائن کر کے این کے حوالے کر دیا۔ کارڈ پر رقم بھی لکھی تھی جو وہ وصول کرتا۔ این نے رقم دیکھی اور اپنے ہینڈ بیگ سے مطلوبہ رقم نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے پچیس ڈالرز اضافی دیے تھے۔ مارک نے واپس کرنے چاہے تو اس نے منع کر دیا۔

"نہیں یہ تمہاری ٹپ ہے۔"

"شکریہ مادام۔" اس نے رقم جیب میں رکھی اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ اس نے تمام مشینیں اور اوزار ٹرالی پر رکھے پھر جگہ کو صاف کیا۔ "دیکھ لو مادام اب یہاں کوئی کچرا نہیں ہے۔"

"تم نے اپنا کام اچھے انداز میں کیا ہے۔" این نے تعریفی انداز میں کہا اور اسے چھوڑنے باہر تک آئی۔ بٹلر نہ ہونے اور مسٹر جیمس کے معذور ہونے کی وجہ سے سارا کام مسز جیمس کو خود کرنا پڑ رہا تھا۔ گزشتہ دن مارک ویگر کو مسز جیمس بیک ووڈ نے کال کی تھی۔ مارک نے اسے آج کا وقت دیا تھا۔ وہ کام مکمل کر کے باہر نکلا تو شام چھا رہی تھی۔ امریکا کی شمالی ریاست ورمونٹ میں موسم سرما جلد آ جاتا ہے اور اکتوبر کے آخر تک وہاں دن خاصا چھوٹا ہو جاتا ہے۔ ابھی برف باری کا آغاز نہیں ہوا تھا برف عام طور سے نومبر کے پہلے ہفتے میں پڑتی تھی۔

مارک جیمس ولا سے نکلا اور ہائی وے کی طرف جانے والی سڑک پر ڈرائیو کرنے لگا۔ امرا کے لیے مخصوص یہ علاقہ خاموش اور سنسان تھا۔ سڑک کے دونوں طرف جنگل تھا جس میں کہیں کہیں پرانے اور نئے طرز کے ولاز اور پیلس بنے ہوئے تھے۔ سڑک پر خزاں میں جھڑ جانے والے پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہائی وے پر ایک جگہ وین روک کر مارک نے اس پر لگے اسٹیکر اور دوسرے نشانات صاف کیے اور پھر ایک ائر گن سے بعض مقامات پر کیا ہوا کچا رنگ صاف کیا۔ اب وین بالکل بدلی ہوئی حالت میں تھی۔ اسے دیکھ کر خود مسز جیمس بھی نہیں کہہ سکتی تھیں کہ یہ وہی وین ہے جس میں مارک ویگر نامی تالے بنانے والا آیا تھا۔ پھر اس نے اپنی پی کیپ اتاری اور اس میں لگے سفید بال بھی اس کے ساتھ ہی اتر گئے اب اس کے سر پر براؤن رنگ کے بہت چھوٹے بال تھے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر چپکی نقلی مونچھیں بھی اتاریں تو وین کی طرح اس کی شخصیت بھی بدل گئی۔ وین کے عقبی حصے سے اس نے دوسرا لباس نکالا اور اپنا ڈانگری والا لباس اتار کر اسے پہن لیا۔ آخر میں وہ موٹی جیکٹ پہن کر وین میں بیٹھا اور آگے روانہ ہو گیا۔ وہ خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا کام اچھے انداز میں کیا تھا اور اسے امید تھی آگے اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ کچھ دیر بعد اس نے وین ہائی وے کے ساتھ ایک موٹل میں ایک کمرے کے سامنے روکی اور اتر کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ٹی وی کی تیز آواز آ رہی تھی اس نے تیسری بار دستک دی تب کہیں جا کر دروازہ کھلا اور اس نے سامنے موجود لڑکی کو برہمی سے دیکھا۔ "تم سن کیوں نہیں رہی تھیں؟"

کسی قدر طویل قامت اور مضبوط جسم کی حامل لڑکی نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی اور وہ نشے میں لگ رہی تھی۔ اپنی جسامت سے قطع نظر اس میں نسوانیت کی کمی نہیں تھی اور اسے خوب صورت بھی کہا جا سکتا تھا۔ موسم کو نظر انداز کر کے اس نے خاصا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ ویسے کمرے کے اندر کا درجۂ حرارت معمول کے مطابق تھا۔ اس لیے اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا باہر درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے چار ڈگری اوپر ہے۔ مارک نے جیکٹ اتار کر ایک طرف ڈال دی۔ لڑکی نے پوچھا۔ "آرتھر کام ہو گیا؟"

"ہاں۔" آرتھر نے ڈبے سے بیئر کی بوتل نکالتے ہوئے جواب دیا یہ اس کا اصل نام تھا۔ "تم کیا کر رہی ہو؟"

"میں آرام کر رہی ہوں۔" وہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"تم پی رہی ہو جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کام پر جانا ہے۔" کہتے ہوئے آرتھر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ مخمور لہجے میں بولی۔ "تم فکر مت کرو میں کام کے وقت پوری طرح تیار ہوں گی۔"

آرتھر نے بیئر کی بوتل خالی کی اور ایک طرف رکھا ہوا پزا اٹھا لیا۔ وہ صبح صرف ناشتا کر کے گیا تھا۔ اس لیے اس کا بھوک سے برا حال تھا۔ پزا ختم کر کے وہ بستر پر لیٹا اور ذرا دیر میں خراٹے لینے لگا تھا۔ لڑکی نے اسے بدمزگی سے دیکھا حالانکہ وہ خاصی تیز آواز میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ آرتھر پر ٹی وی کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ سکون سے سوتا رہا۔ بارہ بجے لڑکی نے اسے اٹھا دیا۔ آرتھر نے اس کی طرف دیکھا۔ "جیڈ تم تیار ہو؟"

"ہاں۔" وہ مستعدی سے بولی۔ "تم ہاتھ لے لو اور پھر چلنے کی تیاری کرو۔"

جب تک آرتھر واش روم سے نہا کر آیا جیڈ تیار ہو چکی تھی۔ اس نے گھوم کر اسے اپنا سراپا دکھایا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"فائن۔" آرتھر نے لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے یہ ٹی وی بند کر دو ورنہ یہ بند ہوا تو یہاں موجود لوگ سمجھ جائیں گے کہ ہم کمرے میں نہیں ہیں۔"

"اسی لیے میں ٹی وی کھلا چھوڑ کر جاؤں گی۔" جیڈ بولی اور اپنے لباس کے اوپر ایک چادر سی لپیٹ لی۔ مقصد اپنا لباس چھپانا تھا۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ جیڈ وین کے عقبی حصے میں چلی گئی۔ آرتھر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور موٹل سے روانہ ہو گیا۔ کوئی بیس منٹ بعد وین جیمس ولا کے پاس رکی۔ یہاں جھاڑیاں اور درخت تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی قریب سے بھی وین دیکھ لیتا۔ آرتھر اتر کر عقبی حصے میں آیا۔ اس نے ایک بیگ اٹھایا اور جیڈ سے کہا۔ "ہوشیار رہنا۔"

"تم فکر مت کرو۔" وہ بولی۔ "کوئی مسئلہ ہوتے ہی میں اندر پہنچ جاؤں گی۔"

"گڈ گرل۔" آرتھر نے کہا اور وین کا دروازہ بند کر کے وہ جیمس ولا کی چار دیواری کی طرف بڑھا۔ اس نے دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہوتے ہی جیب سے ایک ہینڈ فری جیسا آلہ نکال کر کان سے لگا لیا۔ یہ نزدیکی فاصلے پر کام کرنے والا مختصر ترین پری سیٹ واکی ٹاکی تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہیلو میری آواز سن رہی ہو؟"

"ہاں سن رہی ہوں۔" جیڈ کی آواز آئی۔

آرتھر مطمئن ہو کر اندر کی طرف بڑھا اس کا رخ ولا

کے بائیں لان کی طرف تھا۔ تجوریوں والا کمرا اسی طرف واقع تھا۔ دو منٹ بعد آرتھر اس کی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا۔ یہاں تاریکی تھی۔ درحقیقت ولا کی نچلی منزل میں کہیں روشنی نظر نہیں آرہی تھی، صرف اوپری منزل میں کچھ کھڑکیاں روشن تھیں۔ یہ اطمینان کی بات تھی کہ نیچے کوئی نہیں تھا۔ کھڑکی زمین کی سطح سے کوئی چھ فٹ اونچی تھی۔ آرتھر نے پہلے زمین کا معائنہ کیا۔ یہ گھاس والی نرم زمین تھی۔ اس نے جیب سے ربر کے پتلے دستانے نکالے اور دونوں ہاتھوں پر پہن لیے پھر وہ دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے گرل کا نچلا حصہ پکڑا اور یوں زور لگانے لگا جیسے اسے کھڑکی سے نکال دینا چاہتا ہو اور پھر سچ مچ گرل کھڑکی سے نکل آئی اور ہلکی سی آواز کے ساتھ نرم زمین پر جا گری۔ یہ آواز یقیناً چند گز سے آگے نہیں سنائی دی ہوگی پھر زمین نے آواز کو جذب کر لیا تھا۔ اگرچہ اس میں خاصا دخل آرتھر کی مہارت کا بھی تھا، لیکن گرل کا اس طرح نکل آنا حیران کن تھا۔ اس نے بہت احتیاط سے گرل اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دی۔ یہاں تقریباً تاریکی تھی اس لیے جب تک کوئی غور سے نہ دیکھتا اسے گرل کی گم شدگی کا پتا نہیں چل سکتا۔

آرتھر نے کھڑکی کا شیشہ کھولا اور بے آواز اندر کود گیا اپنا بیگ اس نے پہلے ہی کھڑکی پر رکھ دیا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے ٹٹول کر کھڑکی کی چوکھٹ میں اٹکے ہوئے وہ چھوٹے اسکروز نکالے جن کے سرے برنٹ لگے ہوئے تھے اور ان کی مدد سے گرل کھڑکی پر فٹ تھی۔ آرتھر نے اپنے آلات کی مدد سے انہیں چند منٹ میں کاٹ دیا تھا، اسی وجہ سے گرل نہایت آسانی سے چوکھٹ سے الگ ہو گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ برابر کیا اور پھر ایک چھوٹی سی ٹارچ جلائی۔ اس نے سب سے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ چھوٹی تجوری بھی اسی طرح رکھی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے استعمال کیا گیا ہے یا نہیں۔ آرتھر نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ اس کے لیے نہیں آیا تھا۔

آرتھر بڑی اور جدید تجوری کی طرف بڑھا۔ اس نے تجوری کے پاس بیگ رکھا اور سب سے پہلے اس نے ایک ٹیسٹر نکال کر تجوری سے لگایا لیکن اس کی سرخ لائٹ نہیں جلی تھی۔ گویا تجوری میں کرنٹ نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے ٹارچ کی روشنی میں تجوری کا معائنہ کیا۔ یہ نمبروں سے کھلنے والی تجوری تھی یہ نمبر تجوری بند کرنے والا اپنی مرضی سے طے کر سکتا تھا کہ کتنے اور کتنی بار نمبر لگانے تھے۔ ایک بار تجوری جن نمبروں پر بند کی جاتی تھی، ان ہی نمبروں سے کھلتی تھی۔

ایسی تجوری کا لاک کھولنا نہایت مشکل کام تھا مگر آرتھر کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ کم سے کم آج تک اس کی نظروں سے ایسی کوئی تجوری نہیں گزری تھی جسے وہ کھول نہ سکے۔

اس نے اپنے بیگ سے اوزار نکالے اور نہایت اطمینان سے نمبر ملانے لگا۔ ایک اسٹیتھو اسکوپ اس کے کانوں سے لگا تھا اور وہ تالے والی جگہ پر اس کا ڈائل رکھ کر نمبر ملا رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ خاصی دیر بعد اندر سے کہیں ایک کلک کی آواز سنائی دی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کا ملایا ہوا نمبر لگ گیا ہے۔ لیکن یہ ایک نمبر بھی کئی بار کی کوشش کے بعد لگا تھا۔ وہ ہاتھ کے سائز سے بڑا چمکیلا ڈائل گھما رہا تھا۔ اسے اندر آئے ہوئے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور ابھی تک کامیابی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ جیڈ باہر خاموشی سے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک بار بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب آرتھر کو ضرورت پڑے گی تو وہ اسے کال کر لے گا۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ باہر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

جھکے جھکے اس کی کمر میں درد ہونے لگا تھا اور ماتھے پر سرد موسم میں بھی پسینا آگیا تھا۔ تجوری نہیں کھلی تھی لیکن اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ابھی تک کسی طرف سے مداخلت کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ مسٹر اور مسز جیمس یقیناً بے خبر سو رہے تھے اور انہیں اس کی آمد اور یہاں موجودگی کی قطعی خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر سستا لے۔ اس نے بیگ سے ایک چھوٹی بوتل نکالی۔ اس میں برانڈی تھی۔ اس نے چند گھونٹ لیے اور بوتل واپس رکھ دی۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ تجوری کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اسے حیرت تھی کہ اتنے بڑے ولا میں کوئی حفاظتی سسٹم نہیں تھا۔ وہ نہایت آرام سے یہاں گھس آیا تھا۔

مزید ایک گھنٹے کی محنت کے بعد وہ تھکن سے چور ہو گیا تو تجوری کھل گئی۔ آخری کلک کی آواز کے ساتھ ہی اس کا ڈائل خود بہ خود گھومنے لگا اور جیسے ہی اس نے ہینڈل دبایا تجوری کا بھاری بھرکم دروازہ بھی کھلنے لگا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”جیڈ میں کامیاب رہا ہوں۔“

اسی لمحے اسے عقب میں آہٹ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے کمرا روشن ہو گیا مگر اس سے پہلے ہی آرتھر نہایت پھرتی سے ہینڈسیٹ کان سے اتار کر اپنی جیکٹ میں ڈال چکا تھا اور روشنی ہوتے ہی وہ ساکت رہ گیا کیونکہ ایک آواز نے اسے خبردار کیا تھا۔ ”ہلنا مت... ورنہ مارے جاؤ گے۔“

آواز مسٹر جیمس کی تھی اور آرتھر کو یقین تھا، وہ صرف دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ اگر اس نے حرکت کی تو وہ سچ مچ اسے شوٹ کر دے گا۔ اس نے آہستگی سے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے۔ صدمے سے اس کا دل ڈوب رہا تھا جب وہ اتنی محنت کے بعد کامیاب ہو گیا تو عین موقع پر یہ آ گیا۔ پتا نہیں اس کی آمد اتفاقیہ تھی یا آرتھر کی کسی غلطی نے اسے متوجہ کیا تھا۔ مسٹر جیمس نے دوبارہ کہا۔ ”اب میری طرف گھوم جاؤ لیکن بہت آہستہ، تیزی مت دکھانا ورنہ میں گولی چلانے میں ذرا دیر نہیں کروں گا۔“

آرتھر اس کی طرف گھوما اور اسے حیرت کا دوسرا جھٹکا یہ دیکھ کر لگا کہ مسٹر جیمس اپنے پیروں پر کھڑا تھا اور پوری طرح چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ جب کہ بارہ گھنٹے پہلے آرتھر اسے وہیل چیئر پر دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ اڑتیس کا مہلک پستول تھا اور اس کے پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کے استعمال پر پوری طرح قادر ہے۔ مسٹر جیمس دروازے سے ذرا آگے آیا تو آرتھر نے اس کے عقب میں موجود مسز جیمس کو بھی دیکھ لیا۔ اس نے اس وقت پینٹ شرٹ اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی، جیسے کہیں سے آرہی ہو یا کہیں جانے کے لیے تیار ہو لیکن یہ کسی تقریب کا لباس نہیں تھا۔ وہ اس لباس میں خاصی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ مسٹر جیمس سوٹ میں تھا اور اس کے انداز سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بستر سے اٹھ کر آیا ہے۔

”تم نے مجھے پکڑ لیا اب تم پولیس کو بلاؤ گے۔“ آرتھر نے کسی قدر اونچی آواز میں کہا ظاہر ہے مقصد یہی تھا کہ بات جیڈ کے کانوں تک پہنچ جائے۔

”اس کی تلاشی لو۔“ مسٹر جیمس نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے این سے کہا۔ این محتاط انداز میں آگے آئی۔ اس نے مسٹر جیمس اور آرتھر کے درمیان میں آنے کی غلطی نہیں کی۔ اس نے گھوم کر عقب سے آرتھر کی تلاشی لی۔ اب اسے بے چینی ہونے لگی تھی۔ کیونکہ ان دونوں میاں بیوی کا انداز ایسا نہیں لگ رہا تھا جیسا چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے والوں کا ہوتا ہے۔ این نے اس کی تلاشی لی۔ اسے کسی ہتھیار کی تلاش تھی اس لیے اس نے اس چھوٹے سے ہیڈسیٹ کو قابل توجہ نہیں سمجھا جو آرتھر کی جیکٹ کی سامنے والی جیب میں تھا۔ این نے صرف ہاتھ پھیر کر دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

”اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”میں ہتھیار نہیں رکھتا اپنے پاس۔“ آرتھر نے انہیں آگاہ کیا۔ ”تم لوگوں کو میری آمد کا کیسے پتا چلا؟“

کہاں کا ارادہ ہے؟

ایک خاتون میکے گئی تو جاتے ہوئے گھر میں خاوند کی رہنمائی کے لیے جگہ جگہ مختلف ہدایات کی پرچیاں لکھ کر رکھ گئی۔ مثلاً چائے کے ڈبے میں رکھی ہوئی پرچی پر تحریر تھا کہ پیالیاں دھو کر رکھنا نہ بھولنا۔ ٹی وی پر رکھی ہوئی پرچی پر تحریر تھا۔ ٹی وی آن چھوڑ کر سونے نہ جانا لیکن سب سے دلچسپ پرچی کپڑوں کی الماری میں تھی۔ ایک خوبصورت سوٹ پر یہ پرچی چسپاں تھی۔ جس پر لکھا تھا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟ یہ مت سمجھنا کہ مجھے خبر نہیں ہوگی۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

آرتھر انہیں باتوں میں الجھا رہا تھا تاکہ وہ فوری پولیس کو اطلاع نہ کر دیں اور جیڈ کو اندر آ کر کارروائی کرنے کا موقع مل جائے۔ اس بار بھی جیمس نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا اور اسے حکم دیا۔ ”یہاں آؤ اس چھوٹی تجوری کے پاس۔“

آرتھر اس حکم کا مقصد نہیں سمجھا تھا لیکن اس نے تعمیل کی۔ وہ چھوٹی تجوری کے پاس آ گیا۔ مسٹر جیمس نے اپنی جیب سے ایک خود بہ خود لگ جانے والی مختصر لیکن بہت مضبوط ہتھکڑی نکالی اور آرتھر کی طرف اچھال دی۔ ”اب اسے تجوری سے باندھ کر اپنے ہاتھ میں ڈال لو۔“

”کیوں... تم پولیس کو بلا لو۔“ آرتھر نے جلدی سے کہا۔ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اسے ہتھکڑی سے باندھ دے اور پھر پولیس ہی آ کر اسے کھولے۔ اس کی بات سنتے ہی مسٹر جیمس نے خطرناک انداز میں پستول کو حرکت دی اور اس سے بھی زیادہ خطرناک انداز میں بولا۔

”اگر میرے دس گننے تک تم نے یہ کام نہیں کیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

مجبوراً آرتھر نے ہتھکڑی تجوری کے ہینڈل اور پھر اپنے ہاتھ میں ڈال لی۔ این نے آ کر ہتھکڑی چیک کی اور بولی۔ ”اس نے بند کر لی ہے۔“

”گڈ۔“ جیمس نے کہا۔ اس کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نظر آئی ورنہ وہ اب تک نہایت سنجیدہ تھا۔ ”مسٹر مارک...“

آرتھر چونکا اس کا خیال تھا کہ انہوں نے اسے پہچانا

نہیں ہے۔ لیکن وہ اسے پہچان چکے تھے۔ "تم نے مجھے پہچان لیا لیکن تمہیں پتا کیسے چلا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ کیونکہ یہاں کیمرے اور الارم جیسی کوئی چیز نہیں ہے؟"

"بہت آسانی سے۔" این نے جواب دیا۔ "ہم تمہارے منتظر تھے مسٹر مارک... ویسے کیا یہ تمہارا اصل نام ہے؟"

آرتھر کو پھر جھٹکا لگا۔ "منتظر تھے لیکن کیوں، کیا تمہیں پتا تھا کہ میں رات کو آؤں گا؟"

"ہاں ہمیں پتا تھا کہ تم رات کو لازمی آؤ گے اس بڑی تجوری کو کھولنے کے لیے، کیونکہ تم ایک چور ہو اور کوئی بھی تجوری توڑنا تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"تم جانتے تھے میرے بارے میں...؟" آرتھر مردہ لہجے میں بولا۔

"بالکل اور اسی لیے تمہیں ہائر کیا تھا؟" مسٹر جیمس نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں... مجھے کیوں ہائر کیا تھا۔ کیا تم چاہتے تھے کہ میں تمہارے ہاں چوری کروں؟"

"ہاں ہم چاہتے تھے کہ تم یہ سیف کھول دو۔" مسٹر جیمس نے جواب دیا۔ "تم ہماری توقعات پر پورے اترے۔"

آرتھر دم بہ خود رہ گیا۔ "تم چاہتے تھے کہ میں یہ تجوری کھول دوں لیکن کیوں؟"

"کیونکہ یہ تجوری ہماری نہیں ہے۔"

آرتھر ایک بار پھر دم بہ خود رہ گیا تھا اس نے بہ مشکل کہا۔ "یہ تجوری تمہاری نہیں ہے تو تم جیمس بیک ووڈ نہیں ہو؟"

"نہیں... اور نہ یہ مسز جیمس یا این ہے۔"

اب بات آرتھر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ "تم بھی چور ہو لیکن تم نے تجوری خود کھولنے کے بجائے مجھ سے کھلوائی؟"

مسٹر جیمس نے سر ہلایا۔ "ہاں مسٹر اور مسز جیمس سردیاں گزارنے جنوب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہ چار مہینے وہاں گزار کر آتے ہیں۔ ہم نے الارم اور دوسرے حفاظتی سسٹم ناکارہ بنا دیے تھے مگر یہ تجوری ہم سے نہیں کھل رہی تھی۔ اس لیے این نے یہ تجویز پیش کی۔ بڑی مشکل سے ہم نے تمہارے بارے میں پتا چلایا اور ہماری خوش قسمتی کہ تم نے یہ کام کر دکھایا۔"

"جب مسٹر اور مسز جیمس جاتے ہیں تو کیا ولا خالی پڑا رہتا ہے؟"

این نے بتایا۔ "نہیں اس دوران میں یہاں ولا میں صرف ایک بٹلر ہوتا ہے۔"

"وہ بٹلر کہاں ہے؟" آرتھر نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"وہ محفوظ ہے یہیں ایک جگہ موجود ہے۔" این نے اسے تسلی دی۔ "ہم تشدد کے خلاف ہیں۔"

"میں بھی تشدد کے خلاف ہوں۔" آرتھر نے کسمسا کر کہا۔ "لیکن تم لوگ مجھے یوں باندھ کر خود بھاگ جاؤ گے تو میں پولیس کے ہاتھ آ جاؤں گا۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" این نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ "جاتے ہوئے ہم تمہیں کچھ ایسا دے جائیں گے جس سے تم خود کو کھول سکو گے۔ اس دوران میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔" نقلی جیمس بیک ووڈ نے ایک بیگ این کی طرف اچھالا۔ "جلدی سے تجوری میں جو ہو وہ اس میں ڈال لو۔"

این نے کھلی تجوری کے اندر موجود رقم اور دوسری قیمتی اشیا جو ڈبوں اور چھوٹے بکسوں میں تھیں نکال کر اس بیگ میں ڈالنا شروع کر دیں۔ رقم تو زیادہ نہیں تھی شاید دو لاکھ ڈالرز تھے۔ مگر مسز جیمس کے زیورات خاصی تعداد میں تھے اور آرتھر کے خیال میں ان کی مالیت کم و بیش ایک ملین ڈالرز ضرور تھی۔ این نے انہیں ڈبوں سے نکال کر بیگ میں ڈال لیا۔ دس منٹ میں اس نے سارا کام نمٹا لیا تھا لیکن انہیں اب کسی کی مداخلت کا خطرہ نہیں تھا اس لیے وہ نہایت اطمینان سے تجوری سے نکلنے والے کاغذات کا معائنہ کر رہے تھے۔ آرتھر کے نقطۂ نظر سے یہ اچھی بات تھی۔ وہ منتظر تھا کہ کب جیڈ آتی ہے لیکن ایک خطرہ اور بھی تھا کہ کہیں پولیس نہ آ جائے۔ بے شک انہوں نے اب تک سب سنبھال رکھا تھا لیکن ممکن ہے مسٹر جیمس نے پولیس کو ہدایت کر رکھی ہو کہ وہ کچھ عرصے بعد ولا کا چکر لگاتی رہے اور دیکھے کہ یہاں کچھ گڑبڑ تو نہیں ہے۔ نقلی مسٹر اور مسز جیمس بہت خوش تھے۔ انہوں نے کاغذات اور دستاویزات کا معائنہ بھی کر لیا تھا اور اب جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ آرتھر فکر مند ہو گیا۔ اب تک جیڈ کو آ جانا چاہیے تھا۔ کہیں وہ بھی کسی مشکل میں تو نہیں پڑ گئی تھی۔

"گڈ بائی مسٹر مارک یا تم جو بھی ہو۔" این نے خوش دلی سے کہا۔ "اب ہم جاتے ہیں۔" اس نے ایک ہیئر پن آرتھر کی طرف اچھال دی۔ "یہ ہتھکڑی ذرا مشکل قسم کی ہے لیکن امید ہے تم کچھ دیر میں اسے کھول لو گے۔"

لیکن ابھی دروازے کی طرف بڑھے تھے کہ ایک بھاری جبڑوں اور گھنی مونچھوں والا لمبا تڑنگا پولیس آفیسر نمودار ہوا، اس نے پستول اٹھا رکھا تھا۔ "خبردار۔" اس نے گرج کر کہا۔ "اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔"

نقلی جیمس چونکہ مطمئن ہو کر پستول جیب میں رکھ چکا تھا۔ اس لیے وہ کچھ نہیں کر سکا سوائے ہاتھ اوپر اٹھانے کے۔ اس نے ایک نظر آرتھر کو دیکھا اور بولا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ میرا گھر ہے اور میں..."

"یہ جھوٹ بولتا ہے آفیسر یہ دونوں چور ہیں اور آدمی کے پاس پستول بھی ہے۔"

یہ سنتے ہی پولیس والا بہت چوکنا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے دروازے کی آڑ لی اور نقلی جیمس سے پستول نکال کر پھینکنے کو کہا۔ اس نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔ وہ دانت پیس رہا تھا آرتھر کی طرح وہ بھی اس وقت ناکام ہوئے جب کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ نقلی مسز جیمس نے بیگ نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔ اب پولیس والے نے آرتھر کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ کون ہے؟"

"یہ بھی چور ہے۔" نقلی جیمس نے جواب دیا۔ "تجوری اسی نے کھولی ہے۔"

"اور تم اس کی کامیابی پر ہاتھ صاف کر کے فرار ہو رہے تھے۔" پولیس آفیسر نے طنز کیا۔ "کھولو اسے۔"

ہتھکڑی کی چابی نقلی جیمس کے پاس تھی اس نے بادل ناخواستہ جیب سے چابی نکال کر آرتھر کی ہتھکڑی کھولی۔ وہ اپنے ہاتھ سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ "اب بولو۔" نقلی جیمس نے کہا۔ "تم نے ایک چور کو آزاد کرا دیا ہے۔"

پولیس آفیسر نے کہا۔ "پہلے میں اسے باہر کار میں بٹھا کر آتا ہوں اس کے بعد تمہیں لے جاؤں گا۔ اب تم دونوں تجوری کے ہینڈل کے درمیان سے ہتھکڑی گزار کر ایک ایک ہاتھ میں ڈال لو۔"

آرتھر کا خیال تھا کہ وہ پولیس آفیسر کی اس بات پر احتجاج کریں گے لیکن اس کے برخلاف ان کے چہروں پر اطمینان نظر آنے لگا۔ انہوں نے ہتھکڑی ہینڈل کے درمیان سے گزاری اس کا ایک حلقہ نقلی مسز جیمس اور دوسرا حلقہ نقلی جیمس نے اپنی کلائیوں میں پہن لیا لیکن پولیس آفیسر مطمئن نہیں تھا۔ اس نے خود آگے بڑھ کر چیک کیا کہ ہتھکڑی ٹھیک سے بند کی گئی ہے یا نہیں۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے آرتھر کو حکم دیا۔

"یہ بیگ اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

اس پر نقلی مسٹر اور مسز جیمس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا ظاہر ہے پولیس آفیسر مال مسروقہ وہیں تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ آرتھر نے بیگ اٹھایا اور پولیس آفیسر کے ساتھ چل پڑا۔ وہ جیمس ولا سے باہر آئے لیکن یہاں کوئی پولیس کار موجود نہیں تھی۔ وہ دونوں ہی تیز قدموں سے چلتے ہوئے ولا سے باہر گھنی جھاڑیوں میں موجود آرتھر کی وین تک پہنچے۔ پولیس آفیسر نے آرتھر سے کہا۔ "میں تھک گئی ہوں اتنا بھاری کاسٹیوم پہنے اور اس سے بھی زیادہ بھاری مونچھیں لگائے ہوئے۔"

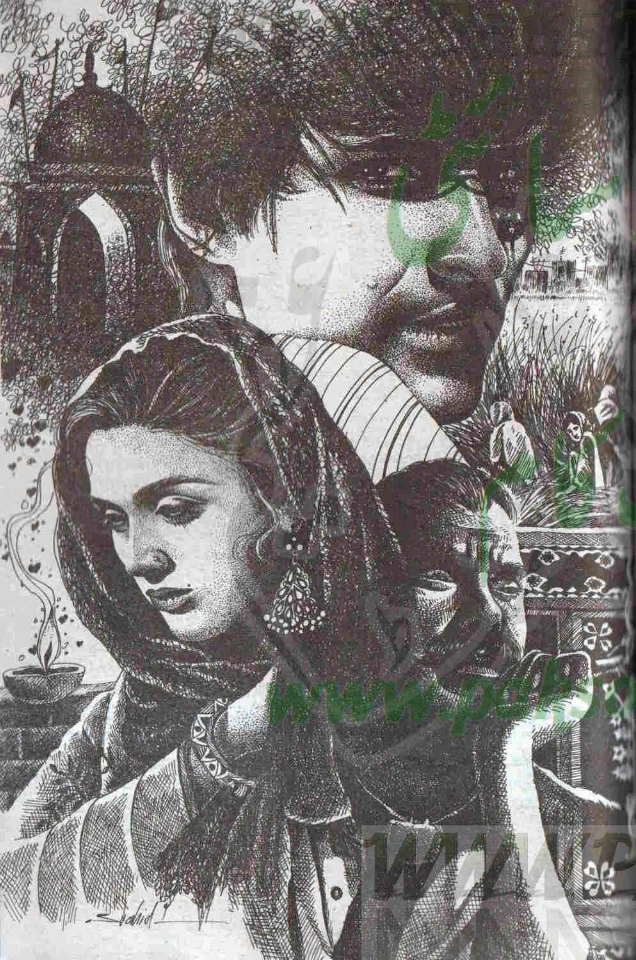
آرتھر نے اسے تسلی دی۔ "بس ڈیئر ہم یہاں سے نکل جائیں اس کے بعد تم اپنی اصل جون میں آ سکتی ہو۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ موٹل کے کمرے میں تھے جہاں پہنچتے ہی جیڈ نے مخصوص انداز میں سلی ہوئی پولیس کی وردی احتیاط سے اتاری۔ اس کے اندر ایسے پیڈز لگے تھے جن سے وہ خوب صورت عورت سے تیم تحیم مرد میں بدل جاتی تھی۔ گالوں کے اندر ربر پیڈ تھے جن سے اس کے چہرے کی ساخت بدل جاتی اور رہی سہی کسر مونچھیں اور اس کی صداکاری پوری کر دیتی تھی۔ دیکھنے والوں کو جیڈ ایک کرخت قسم کا روایتی پولیس آفیسر دکھائی دیتی تھی۔ جیڈ نے اپنے چار انچ کی ایڑی والے بھاری جوتے اتارے اور بستر پر گر گئی۔ "یہ کاسٹیوم بہت مشکل ہے۔"

اس دوران میں آرتھر بیگ سے رقم اور قیمتی زیورات نکال کر بستر پر رکھ رہا تھا۔ "لیکن دیکھو ذرا سی تکلیف برداشت کرنے کا صلہ کیا ملا ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارا یہ حربہ کبھی ناکام نہیں رہا۔ میں جب پکڑا گیا تم نے آ کر نہایت آسانی سے مجھے چھڑا لیا بھلا کسی پولیس آفیسر پر کون شک کر سکتا ہے کہ وہ چور کے ساتھ ملا ہوا ہے۔"

جیڈ نے بستر پر بکھری دولت کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔ "یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ان دونوں بے چاروں کا کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں وہ بھی آزاد ہو کر جا چکے ہوں گے۔" آرتھر نے کہا۔ "میں نے وہاں سے نکلتے ہوئے وہ پن ان کی طرف پھینک دی تھی جو وہ مجھے دے کر جا رہے تھے۔ بے شک وہ تجوری نہیں کھول سکتے مگر ہتھکڑی کا تالا تو کھول سکتے ہوں گے۔"





ناصر ملک

مسافر

قسط 2

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

بانس کی بنی ہوئی عام طرز کی سیڑھی میری نگاہوں کے عین سامنے، برآمدے کے دونوں ستونوں کے بیچ، ہوا میں معلق تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ نیچے کی جانب تیزی سے سرکتی ہوئی سطحِ زمین پر ٹک گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کچھ ہی دیر لگی تھی کہ چند لمحے پیشتر سنائی دینے والی مہیب آواز سیڑھی کے پختہ منڈیر سے رگڑ کھانے سے پیدا ہوئی تھی۔ مجھ پر تسلط جمانے والا خوف تحلیل ہوگیا مگر دھڑکن اب بھی تیز تھی۔ میں لپک کر برآمدے سے نکل کر صحن میں آیا۔ اوپر دیکھا تو ایک طویل سانس میرے حلق سے خارج ہوگئی۔ ڈاکٹر شاہ جی کھجور کی بنی ہوئی چٹائی میں اپنا بستر لپیٹے، بغل میں دابے سیڑھی کے ڈنڈوں پر سنبھل کر اترتا دکھائی دیا۔

مجھے دیکھ کر ایک ذرا مسکرایا، بولا۔ ”حیران ہوگئے ناں؟“

میں خاموش رہا۔ چند ہی لمحوں میں وہ زمین پر تھا۔ اُس نے لپٹا ہوا بستر میرے حوالے کیا۔ سیڑھی کو زمین پر اُتارا اور اُٹھا کر اسٹور میں جا رکھا۔ میں نے بستر اُس کے بیڈروم میں لے جا کر بان کی چارپائی پر رکھ دیا۔ وہ بھی کمرے میں آ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ رات کو چھت پر سوئے تھے؟“

”ہاں!“ اُس نے عام سے انداز میں کہا۔

”مگر کیوں؟“

اُس نے میری ’کیوں‘ کا جواب دینے کے بجائے بات بدل دی۔ ”کیا تم نماز پڑھ چکے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس نے کہا۔ ”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں بھی نماز پڑھ لوں۔ پھر دونوں واک کے لیے نکلتے ہیں۔ میں تمہیں راستے میں چھت پر سونے کی وجہ بتاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے کندھے اُچکا کر اُس کا بستر چارپائی پر کھول دیا۔ میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بستر کھلتے ہی مجھے چمکدار سیاہ رنگ کی رائفل دکھائی دی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ میں نے بارہا ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کی صفائی ستھرائی بھی کی تھی۔ مختصر سے سامان کی ترتیب کو بھی کئی مرتبہ بدلا تھا۔

میں چند لمحوں تک اُسے یوں خوفزدگی کے عالم میں دیکھتا رہا جیسے وہ آپوں آپ چل کر میرا سینہ چھلنی کر دے گی۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے بہ دست احتیاط اُسے اُٹھایا، ڈرتے ڈرتے معائنہ کیا اور پھر بستر پر رکھ دیا۔ بالکل ایسی ہی ری پیٹر گن میں نے امیر نواز کے پاس دیکھ رکھی تھی۔ تقریباً ڈھائی فٹ لمبی اس گن کی حشر سامانیاں بھی میں نے دیکھ رکھی تھیں۔ امیر نواز جب بھی اپنے شہر سے آنے والے دوستوں کے ہمراہ شکار کی غرض سے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر واقع بیلے میں جاتا، مجھے بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ وہاں مرغابی اور تلور کا شکار بہ کثرت ملتا تھا۔ اس کی نالیوں سے کیا نکلتا ہے؟ کارتوس اور گولی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ یہ سبق میں نے ملتان کالج کے ہوسٹل میں پڑھ لیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ بندوق کے پیچھے آگ اور سامنے موت کھڑی ہوتی ہے۔ اس بندوق کے پیچھے ڈاکٹر شاہ جی کا کندھا تھا۔ مقابل کون تھا؟ وریام خان یا حیدر خان؟ یا اُن کا کوئی وفادار ہرکارہ...... اس بارے میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی کے پاس یہ رائفل کہاں سے آئی تھی؟ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ڈنک مار رہا تھا۔ میں نے اُسے جتنا بے ضرر، بزدل مگر پڑھا لکھا شریف آدمی سمجھ رکھا تھا، وہ اتنا بھی ڈرپوک اور بے دست و پا نہیں تھا۔ اُسے یقیناً یہ اندازہ تھا کہ اُس نے وریام خان کے ساتھ بگاڑ کر اپنے لیے بے سکونی اور عدم تحفظ کا احساس خرید لیا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنی حفاظت کی غرض سے کوٹھی کی چھت پر سویا تھا۔ چونکہ کسی نامعلوم مصلحت کے تحت محکمۂ تعمیرات والوں نے کوٹھی کی چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں نہیں بنائی تھیں، اس لیے ڈاکٹر شاہ جی بانس کی بنی ہوئی سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھا، سیڑھی کو کھینچ کر اپنی تلاش میں اپنے پیچھے آنے والوں کا راستہ مسدود کیا اور بے فکری کی نیند سو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اُس کی چالاکی کو سراہا اور غیر ارادی طور پر رائفل سے نظریں چراتا ہوا کمرے کے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

برآمدے کے ایک گوشے میں ڈاکٹر شاہ جی جائے نماز بچھائے سجدہ گزیں دکھائی دیا۔ میں اُس کے فارغ ہونے تک بہ غور اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا مگر اُس کا جسم جوانوں کی طرح توانا اور مضبوط تھا۔ پچاس کے سن میں آنکھوں تلے جھریاں پڑ جاتی ہیں، ہاتھوں کی پشت اور گردن کی جلد ڈھلکنے لگتی ہے مگر اُس کے یہاں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر وہ سفید چمکدار بالوں کو خضاب سے رنگ لیتا تو بہ آسانی پینتیس کا دکھائی دے سکتا تھا مگر اُس نے کبھی جوان دکھائی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”آؤ! باہر چلتے ہیں۔“

”ناشتا؟“

”کر لیتے ہیں، پہلے چہل قدمی کر لیں۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔

ہم دونوں کوٹھی سے، پھر اسپتال سے نکل آئے۔ کھال عبور کر کے کھیتوں میں گھس گئے۔ چلتے ہوئے ہم کافی دور تک چلے گئے۔ ہمارے پائنچے اوس زدہ فصل نے گیلے کر دیے تھے۔ ہر روز کی طرح عجیب اور بے عنوان سی آسودگی مجھے اپنی روح میں اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دو ایکڑ کے فاصلے پر ناپختہ کھال کھیتوں میں سے گزرتا تھا۔ اُس کے گھاس بھرے بنے پر پانی میں پیر ڈال کر ڈاکٹر شاہ جی بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم نے میرا بستر چارپائی پر پھیلا دیا تھا؟“

”جی شاہ جی! پنیال (اوس) میں بھیگ گیا تھا۔ ذرا ہوا پھر گئی تو سوکھ جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر تم نے بستر میں رکھی ہوئی گن بھی دیکھ لی

ہوگی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے کریدتی نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر ازخود مطمئن ہو کر بولا۔ ”شہریار! تمہارے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں رات کو کوٹھی کی چھت پر سوتا ہوں۔ یہ احتیاط میں نے وریام خان اور سردار حیدر خان کی دھمکیوں کے پیش نظر برتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ محکمانہ طور پر میرا کچھ بگاڑ نہ پائے تو مجھ پر براہ راست حملہ آور ہو جائیں گے۔ یقین مانو! ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا، ماضی میں بھی قدم قدم پر ایسے کانٹے چننا پڑے ہیں۔ اسمبلی میں جانے والے وڈیروں نے دو چار یا بہت سے ایسے لوگ ضرور پال رکھے ہوتے ہیں جو اُن کی ایک جنبشِ ابرو پر خون کی ندیاں بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس نے کھال کے نیالے پانی سے ہاتھ منہ دھوئے، ہاتھوں کی مدد سے چہرہ پونچھا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ”قانون! قانون کیا ہے؟...... کتابیں کہتی ہیں کہ ہر انسان کو دوسرے سے محفوظ رکھنے اور اُس کے حقوق کی حفاظت کرنے کے اصول و ضوابط کا نام قانون ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ محض انسانوں کے سروں پر مسلط شیطانوں کو تحفظ دینے کے لیے اختراع کیا گیا بہکاوا ہے۔ لولی پاپ ہے جو منہ میں ڈال کر زبانیں بند کر دی جاتی ہیں۔ وہی تھانیدار جو سچائی اور انصاف کے نام پر ہر ماہ ہزاروں روپے سرکار سے اینٹھتا ہے، وہ انہی لوگوں کی عیاشیوں اور مظالم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ مجرموں کی گردنیں ناپنے کے بجائے مجرموں کے سامنے سر جھکا کر خاموش نگاہوں سے بھیک مانگتا ہے، راتب طلب کرتا ہے۔ اسے اللہ پر یقین نہیں ہے کہ وہ روٹی دے گا یا ہاتھ کھینچ لے گا۔ غریبوں کے لیے سورما بننے والا محض اُس وقتی نقل مکانی سے ڈرتا ہے جو سیاست دانوں اور وڈیروں کی حکم عدولی پر اُسے ملتی ہے۔“

وہ بولتے بولتے بہکنے لگا تھا، یوں جیسے اُس نے پی رکھی ہو۔ کہنے لگا۔ ”شہریار! سردار حیدر خان مجھے مروا سکتا ہے۔ اُسے کسی تھانیدار کا خوف نہیں ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ خون کبھی رائگاں نہیں جاتا، ہمیشہ خاموش نہیں رہتا مگر سچ یہ ہے کہ اس موئے قانون نے خون کو بھی گونگا کر دیا ہے۔ میرے مرنے کے بعد میرا خون کبھی بولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اس لیے میں نے اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔ کوٹھی کی عمارت کافی اونچی ہے۔ اول تو کوئی بھی میری تلاش میں چھت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوگا اور اگر کوئی اوپر آنے کی کوشش بھی کرے گا تو اُسے میری گن اپنا شکار بنا لے گی۔ دیکھ لینا! کوئی بندہ جب میرے ہاتھوں قتل ہوگا تو یہی خان لوگ اُسے پہچاننے سے بھی انکاری ہو جائیں گے اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے ہمدردی جتانے بیٹھ جائیں گے۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ قتل اور خون کی باتیں کتنے عام سے انداز میں کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں رات کو آپ کے پاس آ جایا کروں؟“

اُس نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ”تم بس یہ احتیاط کرو گے کہ اسپتال کے عملے سمیت کسی بھی فرد کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں چھت پر سوتا ہوں اور میرے پاس گن بھی ہے۔“

وہ اگر نہ بھی کہتا، تب بھی مجھے یہی کرنا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسپتال کا عملہ اُس کے جیسا نہیں تھا۔ کبھی اہل کار خانزادوں کی خوشامد کرتے تھے۔ بعید نہ تھا کہ وہ سردار حیدر خان کی خوشنودی کے لیے ڈاکٹر کے خلاف محاذ کھڑا کر لیتے اور اُس کے معمولات کی مکمل رپورٹ وہاں پہنچا دیتے۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ نے یہ گن کہاں سے لی؟“

”یہ گزشتہ دو سالوں سے میرے پاس ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اس سے پہلے میرے پاس سیمی آٹو میٹک رائفل تھی۔ اُس کا لائسنس ابھی تک میرے پاس ہے۔ رائفل کسی چور نے میرے کوارٹر سے چرا لی تھی۔ تب میں نے یہ گن مجبوراً باڑے سے منگوائی تھی۔“

”مجبوراً؟ میں سمجھا نہیں کہ آپ کو کیا مجبوری لاحق تھی؟“

”یہاں سے ایک نمبر مال نہیں ملتا۔ یہ ولایتی ہے۔ اچھے لوہے کی بنی ہے۔ اس کی نال جلد گرم نہیں ہوتی۔“ اُس نے بتایا۔

”شاہ جی! مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔“ میرے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

اُس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ چند ثانیوں تک مجھے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”زندگی کے چھننے کا ڈر؟“

”جی! کچھ بھی ہو سکتا ہے ناں!“

اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، تھوڑا دبایا، پھر بولا۔ ”ناں دوست! ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سانپ کو دیکھ کر دہشت سے سن ہو جانا اُسے ڈنک مارنے کا بھرپور موقع فراہم کرتا ہے۔ پستول کی نال کے سامنے ڈر کے مارے ساکت ہونے کا مطلب زندگی کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ دینا ہے۔ اوسان خطا نہ ہوں تو بھی سانپ ڈس نہیں

سکتا۔ دماغ جاگتا رہے تو کوئی تمہیں گولی نہیں مار سکے گا۔ تمہیں ایک کارآمد بات بتاتا ہوں۔ جب بس یا ویگن کا ایکسی ڈنٹ ہوتا ہے تو جاگنے والے مرجاتے ہیں یا شدید زخمی ہوجاتے ہیں جبکہ خوابیدہ مسافر شدید زخمی ہونے یا موت کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ جانتے ہو کیوں؟''

میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''اس لیے کہ سوئے ہوئے دہشت کے ابتدائی خطرناک حملے سے بچ جاتے ہیں اور ہارٹ اٹیک کا شکار نہیں ہوتے۔ جسم ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے اس لیے سیٹوں کے بیچ میں لڑھک کر زخم کھانے سے بچ جاتا ہے۔ سمجھے؟''

مجھے اُس کے فلسفے کی پوری طرح سمجھ تو نہیں آئی مگر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، وہ بولا۔ ''مرجانا بھی فطرت کا شاخسانہ ہے۔ کوئی بے موت زندگی نہیں رکھتا۔ سبھی کو مرنا ہے۔ تمہیں مجھے، دُنیا میں سانسیں لیتے ہوئے ہر وجود کو ایک نہ ایک دن مرجانا ہے۔ جب مرنا طے ہے تو پھر اس سے خوف کیوں محسوس ہو۔ زندگی کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھ کر گزارو، دُنیا کو انجوائے کرو اور اپنی مستقل مزاجی اور بے خوفی سے مقابل کو پریشان کیے رکھو...... یہی کامیابی کا راز ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ پڑھا لکھا آدمی دلیر نہیں ہوتا۔ آپ پڑھے لکھے ہیں، پھر بھی دلیر ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھ لیا۔

وہ مسکرایا، لمحاتی لذت کشیدگی کے بعد گویا ہوا۔ ''تم بھی تو دلیر ہو!''

''میں؟'' میں متحیر ہوا۔

''ہاں تم! وریام خان کے سامنے تم نے اپنا مؤقف پوری دلیری کے ساتھ پیش کیا۔ یہی بہادری کی ابتدا ہے۔ جوں جوں تمہارا ذہن بالغ ہوتا جائے گا، مضبوط ہوتا جائے گا۔ دست و گریباں ہونا یا کسی سے لڑنا بھڑنا، غنڈا گردی کرنا اور دھونس دھمکیاں جمانا، جیسا کہ تمہارا دوست خالد محمود کرتا ہے، دلیری نہیں کہلاتا۔ وہ دلیر نہیں، پرلے درجے کا بزدل انسان ہے۔ اُس نے ابھی تک اپنے اوپر لگی ہوئی کمین زادے کی چھاپ کو اُتارا نہیں۔ اُس کا جھکا ہوا سر ابھی تک نہیں اُٹھا اور یقیناً کبھی نہیں اُٹھے گا۔ تم نے اپنا مؤقف پیش کرنا سیکھ لیا ہے، اپنے مؤقف پر استدلال لانا اور پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ڈٹ جانا بھی سیکھ جاؤ گے۔ تب تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔''

عمومی طور پر دل کو اچھی لگنے والی باتیں اس وقت مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ چونکہ وہ بڑا افسر تھا، اُس کی پہنچ اوپر تک تھی، اس لیے وہ ایسی باتیں کرتا تھا۔ وہ اگر میری جگہ پر ہوتا، کھالے کے جیسا ہوتا تو شاید ابھی تک وہ بھی خانزادوں کے سامنے سر اُٹھا کر بات نہ کر پایا ہوتا۔ ہمیں جنم گھٹی میں خدمت اور ادب کا سبق گھول کر پڑھایا جاتا تھا۔ باپ سے تو تکار کرنا اُس ناخواندہ سوسائٹی میں روا تھا مگر سرداروں کے سامنے سر اُٹھا کر بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

وہ کافی دیر تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا اور اُجلی دھوپ فصلوں پر اپنی تاب نچھاور کرنے لگی تھی۔ اُسے ابھی تیار ہونا تھا، ناشتا کرنا تھا، اس لیے چونک کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ واپسی کے سفر میں وہ یکسر خاموش رہا اور میرے آگے آگے چلتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق گیلی گھاس کو فٹ بال کھیلنے کے سے انداز میں ٹھوکریں مارتا رہا۔

میں اُس کے لیے ناشتا تیار کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے رسان سے منع کر دیا۔ اسپتال کی مرکزی عمارت کے بیرونی برآمدے میں ڈسپنسر کی سائیکل، اسٹینڈ پر لگی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آج نسبتاً جلدی اسپتال پہنچ گیا تھا۔ وہ اسپتال کے پہلے کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ وہ ہر روز اپنی سائیکل کوارٹر سے نکال کر اسپتال کے برآمدے میں کھڑی کر دیتا تھا۔ دن میں اُسے یا عملے کے کسی آدمی کو باہر جانا پڑتا تو وہ سائیکل نکال لیتا تھا۔

دوپہر میں سردار حیات خان کی حویلی سے بلاوا آ گیا۔ حیات خان مہمان خانے کے خاص کمرے میں میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''شہرے! حیڈی بئی نہیں تھیندی یارا! پر دھیان رکھا کر، بڑا ہمیشہ بڑا ہی رہتا ہے۔ جسے خدا رتبہ دیتا ہے اس کی بڑائی کو ماننا ہی دانش مندی کہلاتا ہے۔''

میں نے بیٹھتے ہوئے شکایت کے انداز میں کہا۔ ''خان جی! میں نے کبھی آپ کی شان میں گستاخی تو نہیں کی۔''

''میں اپنی بات نہیں کرتا، سردار وریام خان کی بات کرتا ہوں۔ امیر نواز نے بتایا ہے کہ تم نے اُس کے سامنے اونچی آواز میں بات کی ہے۔ کوئی لحاظ کیے بغیر اُس کے منہ پر ہی بڑھ چڑھ کر جواب دیتے رہے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟''

میں نے چونک کر سردار حیات خان کو دیکھا۔ اُس کے لہجے میں تندی کی آمیزش نے آنِ واحد میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ اُس کے منہ میں وریام خان کی زبان رکھی جا چکی تھی۔

میں نے مؤدبانہ انداز میں صفائی پیش کی۔ ''خان جی! میں نے کوئی بے ادبی نہیں کی تھی مگر وریام خان نے میری ماں بہن ایک کر دی۔ گالیاں دیں، دھمکایا اور میرے چاچے کو بلا

کر بے عزت کیا۔ آپ میری دھاں (شکایت) سننے کے بجائے اُلٹا مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے خان جی؟''

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ چند لمحوں تک مجھے کڑی نگاہوں سے گھورتا رہا، پھر پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے کی مشرقی دیوار تک چلا گیا۔ وہاں رُک کر ایڑیوں کے بل گھوما اور مجھے مخاطب کر کے سرد لہجے میں بولا۔ ''شہرے! تم نے چار جماعتیں کیا پڑھ لیں بڑے چھوٹے کا فرق ہی بھول گئے۔ تم میرے رشتہ دار تو ہو مگر اُس جگہ پر نہیں جہاں میرا سوتر سردار وریام خان کھڑا ہے۔ اگر تمہیں میری حویلی میں آنے جانے کی اجازت ہے تو تمہاری پڑھائی کی وجہ سے نہیں، بلکہ رشتہ داری کی بدولت ہے۔ پر خان میرے سگے چاچے کا پتر ہے۔ خون کا رشتہ ہے اُس سے میرا......''

اُس کی باتیں اپنی زہریلی معنویت سمیت سیدھی میرے دل میں چبھتی جاتی تھیں۔ میں کبھی اس حویلی میں دستِ سوال پھیلا کر نہیں آیا تھا۔ مجھے ہمیشہ بلایا گیا تھا اور مجھ سے کوئی نہ کوئی کام ہی لیا گیا تھا۔ بغیر کسی معاوضے کے مجھ سے کام کروانا بھی اُس کے نزدیک مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ اگر میں رشتہ دار نہ ہوتا تو بہ قول اُس کے، مجھے حویلی میں داخل ہونے کی اجازت میسر نہ آتی اور نہ ہی مجھ سے بیگار لی جاتی۔

میں بھی اُس کے مقابل میں کھڑا ہوگیا۔ ''خان جی! آپ ہمارے مائی باپ ہیں، بھاگ وند ہیں، مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اپنے چچازاد بھائی کی وجہ سے گھر بلا کر بے عزت کریں۔ وریام خان بھی باپ کی جگہ پر تھا میرے لیے، تبھی گونگوں کی طرح کھڑا اُس کی گالیاں سنتا رہا۔ آپ بھی اپنے من کی موج، بھلے پوری کر لیں مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں کمین زادہ نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کا مزارعہ ہوں۔ خواہ دو تین ایکڑ سہی، اپنی زمین ہے، جسے کاشت کرتا ہوں اور کبھی ہاتھ پھیلا کر آپ کے سامنے نہیں آیا۔ ہاں! آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھ پر اپنی حویلی کے دروازے آج تک کھلے رکھے۔ جی چاہے تو آج ہی یہ دروازے مجھ پر بند کر دیجیے۔ مجھے پروا نہیں ہے۔''

وہ کسی کی بات، کسی کا مؤقف سننے کا فطری طور پر روادار نہیں تھا مگر میری بات کو، دخل دیے بغیر سن رہا تھا۔ یہ اچنبھے کی بات تھی۔

میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی گھل گئی۔ ''خان جی! میں نے وریام خان کی بے جا ناراضی محو کرنے کے لیے چھوٹے خان سے بات کی تھی۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میرا اپاہ (ازالہ) نہیں کیا جائے گا بلکہ مجھے مزید بے عزت کیا جائے گا۔ آپ نے مجھ سے وریام خان کی ناراضی کی وجہ تک دریافت نہیں کی، مجھے اُس سے یا آپ سے معافی مانگنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔ جاتے ہوئے کہتا ہوں کہ آپ اپنے رویے پر غور کیجیے گا۔ اگر خان آپ کا رشتہ دار ہے تو میں بھی رشتہ دار ہوں۔ کیا ہوا جو خدائی ونڈ (تقسیم) نے آپ کو جاگیردار بنا دیا اور مجھ سے میرے ماں باپ تک چھین لیے۔ جو دیتا ہے، وہ لے سکتا ہے اور جو لیتا ہے وہ دے بھی سکتا ہے۔''

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ بغیر اجازت طلب کیے خان کے خاص کمرے سے اخراج کا قصد کیا۔ اُس کی بھاری بھرکم آواز نے عین دروازے کی دہلیز پر میرے قدم روک دیے، وہ کہہ رہا تھا۔ ''شہرے! انج دیسیں تے ساری حیاتی بیٹھا روسیں!''

(اس طرح سے جاؤ گے تو تمام عمر پچھتاؤ گے)

میں اُس کی جانب پشت کر کے کھڑا تھا۔ عین اسی وقت مجھے اپنے سامنے، مہمان خانے کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا امیر نواز دکھائی دیا۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ''بابا نے تمہارا مسئلہ حل کر دیا ہے، جاؤ، موج کرو۔ تمہیں خان چاچا کچھ نہیں کہے گا۔''

میں نے اُسے دیکھا، پلٹ کر اُس کے باپ کو دیکھا۔ سردار حیات خان کے سرخ چہرے پر اپنے لیے نفرت اور حقارت کے واضح پرتو دیکھے۔ چند لمحوں تک میں ہونٹ کاٹتے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔

جب امیر نواز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں نے کہا۔ ''خان جی! ماں باپ نے اپنی انگلی چھڑا کر مجھے نور پور میں اپنے رشتہ داروں کی ٹھوکروں پر رکھ دیا تھا۔ چاچے چراغ کے علاوہ کسی نے مجھ یتیم کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ ہاں! تب آپ نے بھی حویلی کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ آج تک مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ میں نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی۔ صرف اس لیے کہ میرے پاس کالج کے داخلے کے لیے رقم نہیں تھی۔ کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی، جس سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس نے میرے ماں باپ کو دیکھا تک نہیں، اُسے میرے خاندانی پس منظر سے بھی سروکار نہیں، اُس نے مجھے کتابیں خرید کر دیں۔ ہر روز وقت نکالتا ہے اور میرے ساتھ مغز ماری کرتا ہے۔ آپ لوگوں نے میرے لیے کیا، کیا؟ کوئی ایک انعام...... کوئی ایک بخشش...... کوئی ایک دلاسا...... آپ لوگوں نے مجھے کچھ بھی

نہیں دیا۔ پھر آپ لوگوں کو مجھ پر حق بھی کیا حاصل ہے۔ خان جی! آپ رشتے میں میرے بھی چچا ہیں، باپ مان ہیں مگر مجھے جب بھی بھتیجا سمجھا گیا، میرے لبوں پر 'چاچا جی' کا لفظ آئے گا وگرنہ نہیں آئے گا۔"

میرے کندھے پر رکھے ہوئے امیر نواز کے ہاتھ میں بہ تدریج سختی پیدا ہوتی گئی مگر میں نے مطلق پروا نہیں کی۔ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹا اور امیر نواز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا۔ "امیر نواز! تمہارے بابا اور وریام خان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔ ان سے تو بخت خان ہمارے لیے اچھا ہے جو ہمارا فائدہ نہیں کرتا تو اُس نے کبھی ہمارا نقصان بھی نہیں کیا۔ یار ن خان بھلا ہے جو سال میں دو تین ماہ یہاں گزارنے کے لیے آتا ہے اور کسی کو منہ لگائے بغیر شہر چلا جاتا ہے۔"

"بکواس کیے جاتے ہو، بتاؤ تو، ہوا کیا ہے؟" امیر نواز کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"ہاں! میں بکواس کرتا ہوں۔ تم خان زادے ہو، تمہارے چہرے کے اتار چڑھاؤ مجھے سمجھا رہے ہیں کہ تم بھی اسی کلاس کے انسان ہو۔ اب تک تم نے جو یاری دوستی اور انسانوں میں برابری کی باتیں کی ہیں، وہ سب جھوٹی ہیں۔ تم خان ہو اور غریب پروری تمہارا بہروپ ہے۔ تم بھی اپنے باپ کی طرح میرے کاندھے پر شکار کا سامان لاد کر مجھ پر احسان کرتے رہے ہو۔ میرے ہاتھ میں بھینس کی رسی تھما کر وٹرنری اسپتال سے 'ٹیکا رکھوانے' بھیج دیتے تھے تو مجھ پر احسان ہی کیا کرتے تھے ناں۔"

میں اُس کے اشتعال کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس کے باپ کی دہاڑ نے اُس کی زبان کو نوک سے پکڑ لیا۔ سردار حیات خان زخمی شیر کی طرح دہاڑنے لگا، گرجنے برسنے لگا۔ اُس کی برانگیختگی کسی بھی طور سے وریام خان سے مختلف نہیں تھی۔ اُس نے ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا، یہ اپنا ہاتھ روک نہیں پایا۔ اُس نے عقب سے میرا کالر پکڑا اور جھٹکا دے کر میرا رُخ اپنی جانب موڑ لیا۔ میں ابھی سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ میرے دائیں گال پر پڑا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ حیات خان کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ اُسے ایک طمانچے پر صبر نہیں آیا تھا، دوسرا مارنا چاہتا تھا کہ امیر نواز نے مجھے پیچھے کی جانب کھینچ لیا۔ میں بیچ سے ہٹ گیا تو باپ بیٹا مقابل میں آ گئے۔ باوصف اس کے کہ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے، مجھے دونوں کے بیچ ہوتے والے مکالمے کی بہ خوبی سمجھ آ رہی تھی۔ بیٹا باپ کی دونوں بانہیں تھام کر کہہ رہا تھا۔ "بابا! ہوش کریں۔ آپ نے شہرے کو مار کر اچھا نہیں کیا۔"

"میں نے اچھا نہیں کیا؟ میں نے؟ ...... تم بھی اس کمینے کی طرف داری کر رہے ہو جس نے تمہارے چاچے کے آگے اپنی لمبی زبان کھولی، جس نے میرے مقام پر نگاہ نہیں کی، اپنے اور میرے رشتے کا خیال نہیں کیا، بلکہ یہ تک کہہ دیا کہ مجھ سے اور تمہارے چاچے خان سے بخت خان بہتر ہے...... ہیں؟ تم پرے ہٹ جاؤ۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس پر دہی ڈال کر کتے چھوڑوں گا۔" فرط اشتعال سے حیات خان لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"تو کیا ہوا بابا؟ بخت خان بھی تو میرا چاچا ہی ہے ناں! آپ غصہ تھوکیں اور اندر چلیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں ساری بات۔" امیر نواز نے غصے سے کانپتے بوڑھے وجود کو بانہوں میں بھرا اور دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ اُس نے دروازے میں ایک پل کو ٹھہر کر مجھے آنکھ سے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

میں سر جھکائے حویلی سے نکلا۔ کھالا اپنی دکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ اُس کی نگاہ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ویگن پر جمی ہوئی تھی۔ میں چند قدم بڑھ کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ پلٹا، حویلی پر نگاہ ڈالی، اپنے تپتے ہوئے رخسار کو سہلایا اور بے اختیار اپنی آنکھوں میں امڈ آنے والے اشکوں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرنے لگا۔ یہ تھپڑ کی تکلیف کے باعث نہیں بلکہ اُس تضحیک کے احساس کے مرہون تھے جو مجھے حیات خان کے روبہ رُو ملا تھا۔ نور پور کی ان حویلیوں میں ان گنت ہزیمت بھری داستانیں سرگرداں تھیں۔ بے شمار پگڑیاں اپنے کلف اور اُجالے یہاں کی خاک کے حوالے کر گئی تھیں۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر شاہ جی کی ایک بات چکرانے لگی جسے وہ بار بار مختلف انداز میں بیان کرتا تھا۔ "ان لوگوں کی خود ساختہ عزت کا تقاضا ہے کہ پوری دُنیا کے غریب لوگ بے عزت ہو کر ان کی دہلیزوں پر سجدہ ریز ہو جائیں۔"

وہ سچ کہتا تھا۔ میں نے کسی کا کچھ نہ بگاڑ کے سزا پالی تھی۔ وریام خان اور سردار حیات خان دونوں ایک جیسے ہی تھے۔ دونوں کے بیچ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں کچھ دیر کھڑا رہا، پلٹا اور کھالے کو اُسی انداز میں کھڑے دیکھا تو سست روی سے اُس کی طرف بڑھ گیا۔

میرے قریب پہنچنے پر وہ میری طرف متوجہ ہوا، بولا۔

"امیر نواز سے ملنے کے لیے آئے تھے؟"

میرے کچھ بولنے سے پہلے اُس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑ گئی۔ چونک کر مجھے بہ غور دیکھنے لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے رخسار پر ہاتھ رکھ لیا، وہ بولا۔ "تمہیں کس نے مارا ہے؟"

میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے ردِّعمل کو دیکھ کر خود پر اختیار نہیں رکھ سکا اور گلوگیر ہو گیا۔ "وہ حیات خان نے......"

"مگر کیوں؟" وہ تڑپ کر بولا۔

فرطِ غم سے میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔ اُس نے فوراً قدم بڑھائے، بہت قریب ہو کر میری آنکھیں پونچھیں اور کہا۔ "دل ناں ڈھا یار! تو کوئی بچہ ہے جو یوں رونے لگا ہے۔ مجھے بتا، کیا ہوا ہے؟ خان نے تمہیں کیوں مارا ہے؟"

میں نے اُسے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اُس نے کوئی جواب دیے بغیر میرا ہاتھ تھاما اور گھر میں لے گیا۔ کمرے میں بٹھا کر پانی کا گلاس بھر لایا۔ بلو کو چائے تیار کرنے کا حکم دے کر میرے پاس آن بیٹھا۔ میں اس دوران خاصا سنبھل چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میرا، ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانا ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ کیوں ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا۔ توقف کے بعد بولا۔ "شہرے! میرے جانی ویر! میری مانو تو نور پور سے چلے جاؤ۔ دُور، جہاں تمہیں تمہاری قسمت لے جائے، چلے جاؤ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہ کرنا۔ تم اب ان سرداروں کی آنکھوں میں چبھنے لگے ہو۔ رڑکنے لگے ہو۔ آنکھ کی رڑک یا چبھن کو کوئی بھی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتا۔ تمہاری پڑھائی تمہاری دشمن بن گئی ہے۔ حیات خان اور وریام خان کو اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہاری پڑھائی تمہیں غلامی سے نکل بھاگنے پر اکسانے لگی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی سے تمہاری تعلق داری اسی وجہ سے اُنہیں کھلنے لگی ہے۔ تم میری مانو! یہاں سے چلے جاؤ۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اور پروین؟"

"کسی قابل ہو جاؤ تو اُسے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ ابھی اُس کا خیال دل سے نکال دو۔" کھالے نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔"

"اُسے سمجھاؤ۔ وہ عقل مند ہے، سمجھانے سے فائدے کی بات سمجھ جائے گی۔"

"کہاں جاؤں؟"

"جہاں بھی سینگ سمائیں۔"

"نہیں کھالے! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اِدھر ہی رہوں گا اور خان زادوں کا مقابلہ کروں گا۔" میں نے اٹل انداز اختیار کیا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "کس بل بوتے پر؟"

"اللہ کی آس پر!"

اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، بولا۔ "نہیں میرے یار! اللہ نے ان لوگوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ ہم لوگ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر شاہ جی کی تقلید نہ کرو۔ وہ بڑا افسر ہے۔ سنا ہے کہ اُس کے پیچھے کسی بڑے آدمی کا ہاتھ بھی ہے اور ویسے بھی وہ 'کلم کارا' انسان ہے۔ اُس کے ساتھ محض اُس کی اپنی زندگی ہے۔ گھر بار کی فکر نہیں ہے۔ تمہارے پیچھے بھرا پُرا گھر ہے جو سرداروں کی دشمنی کی آگ کی پہلی لپٹ بھی سہہ نہیں سکتا۔"

میں نے بے چارگی سے اُسے دیکھا۔ "تو کیا ان کے قدموں میں جھک جاؤں؟"

"بے شک نہ جھکو مگر ان کے معاملات میں ٹانگیں نہ اڑاؤ۔"

"میں نے کب دخل دیا ہے ان کے کام کاج میں؟"

"اُن کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنا اور اختلاف کرنا بھی تو ان کی ناراضی کا سبب ہے۔"

"تو کیا زبان کو تالا لگا دوں؟"

"ہاں! اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو فوری طور پر نور پور سے بھاگ جاؤ اور کبھی پلٹ کر یہاں نہ آنا۔"

اُس کی سوئی بار بار اسی نقطے پر آن ٹھہرتی تھی۔ بلو چائے لائی، ساتھ ہی امیر نواز کے آنے کی خبر بھی لے آئی۔ وہ آج خلافِ معمول سنجیدگی کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کھالا متفکر دکھائی دینے لگا۔ اُٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا کہ امیر نواز صحن عبور کر کے کمرے کے دروازے تک آ گیا۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔

وہ چارپائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا شہرے!"

کھالے نے دوسری کرسی کھینچ لی۔

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ خان چاچا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

وہ اپنی پیشانی سہلانے لگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے سخت سست کہے گا مگر کافی دیر کے بعد، جب بلو تیسرا پیالہ

تھامے کمرے میں داخل ہوئی، بولا۔ ''ٹھہرے! ہر اُلجھے ہوئے معاملے کو کھینچا تانی اور جذباتی جھٹکوں سے سلجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ مانا کہ بابا اور چاچا خان روایتی وڈیروں جیسا سلوک کرتے ہیں، مگر تم یہ بھی تو مانو کہ تم نے بھی اَن پڑھوں اور غیر اخلاق یافتہ لوگوں والا رویہ اپنایا ہے۔ مشتعل آدمی کو پتھر کھینچ مارو گے تو جواباً گولی ہی آئے گی، کسی بھی طرح سے خیر سگالی کا پیغام نہیں آئے گا۔ کیوں کھالے؟''

کھالا سر جھکائے بیٹھا تھا، چونک پڑا۔ ''بالکل جی!''

امیر نواز کا شائستہ رویہ دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے ہمت پکڑ کر کہا۔ ''یار امیر نواز! میں نے کوئی غلطی کی ہو تو......''

اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''کیا تم اتنا سا جھوٹ نہیں بول سکتے تھے کہ 'ٹھیک ہے میں آئندہ اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں نہیں جایا کروں گا'۔ بعد میں چاچے خان کی نظر بچا کر جاتے رہتے۔ کیا وہ چوبیس گھنٹے پہرے داری کرتا ہے اسپتال کی؟ چھوڑ یار! تم بھی نرے جاہل ثابت ہوئے ہو۔''

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دانستہ خاموش رہا۔ کھالا اور امیر نواز باری باری اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایسے میں بلو چائے کے خالی پیالے اُٹھانے کے لیے آئی تو اُس نے دونوں کی نظریں بچا کر مجھے صحن میں آنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے مجھے کبھی ایسے بلایا نہیں تھا، اس لیے گھبرا سا گیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے بیت الخلا میں جانے کا بہانہ کیا اور کمرے سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ مشرقی دیوار کی جڑ میں چارپائی بچھائے خالدہ اور غفوراں پیٹی پر ڈالنے والی چادر کاڑھ رہی تھیں۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔ دونوں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھیں، سفید رنگ کی سوتی چادر ان کے گھٹنوں پر پھیلی ہوئی تھی جس پر سوئی دھاگے کی مدد سے وہ چارسُوتی کڑھائی کرنے میں مشغول تھیں۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

خالدہ نے اپنی چھوٹی بہن کو کن اَکھیوں سے دیکھا، قدرے نیچی آواز میں کہا۔ ''تم سے......''

وہ بات کرتے کرتے اچانک رُک گئی۔ میں نے اُس کی نظروں کے تعاقب میں حویلی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ماسی صفو لکڑیوں کا گٹھا سر پر اُٹھائے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ خالدہ نے جلدی سے کہا۔ ''میں شام کو تمہارے گھر آؤں گی، وہیں بتاؤں گی۔''

غفوراں اپنی ماں کو سنانے کے لیے چالاکی سے بلند آواز میں بولی۔ ''بھائی! یہ دیکھ تو...... کتنی پیاری بیل کاڑھی ہے باجی بلو نے!''

میں نے غیر ارادی طور پر اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر چادر کے پھیلے ہوئے حصے کو دیکھا۔ عام سی بیل تھی۔ ایسی چادریں نور پور کے ہر گھر کی سامان بھری پیٹیوں کے اوپر اور پڑچھتیوں پر سے لٹکتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ سفید رنگ کی سوتی چادر پر نیلے دھاگے کی کڑھائی کو ایک نظر دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس کا استعمال کیا ہے۔ میں نے روایتی الفاظ میں کڑھائی کی تعریف کی۔

ماسی صفو لکڑیوں کا گٹھا تنور کے قریب پھینک کر دوپٹے سے پسینا پونچھتی ہوئی وہیں آ گئی۔ اُسے تیسرے چوتھے دن یہ مشقت باقاعدگی سے کرنا پڑتی تھی۔ غفوراں کو مخاطب کرتے ہوئے پھولی ہوئی سانس میں بولی۔ ''چل نی پھوری! ٹھنڈا پانی نکال لا۔''

چونکہ سرداروں کے گھروں کے علاوہ کسی گھر میں فریج نہیں تھا، اس لیے پینے کے لیے نلکے کے ساتھ زور آزمائی کر کے ٹھنڈا پانی نکالا جاتا تھا۔ غفوراں جلدی سے چارپائی سے اُتری اور بڑی سی کٹوری اُٹھا کر نلکے کی طرف بھاگ گئی۔ میں نے رسمی طور پر ماسی کا حال دریافت کیا اور پھر کمرے میں آ گیا۔

دونوں ابھی اُسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر امیر نواز نے کہا۔ ''میں چلتا ہوں، کچھ نہ کچھ کرتا ہوں، مگر یہ دھیان رہے کہ آئندہ تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کرنی۔ بڑوں کا رویہ اپنی جگہ، بڑوں کا ادب کرنا ہم سب پر فرض ہے۔''

وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا تو کھالے نے بے ساختہ کہا۔ ''یار! یہ شخص بھی بڑا عجیب ہے۔''

میں نے تائید کی۔ ''ہاں! یہ تو ہے۔''

''کبھی کبھی شک گزرتا ہے کہ یہ سردار حیات خان کا سگا پتر نہیں، لے پالک ہے۔ دیکھا، کتنا تضاد ہے دونوں میں!''

''پڑھا لکھا ہے، تبھی مختلف ہے اپنے باپ اور چچا وریام خان سے۔'' میں نے کہا۔

''ان پڑھ تو وہ دونوں بھی نہیں ہیں۔'' کھالا بولا۔

''شاید اس عمر تک پہنچ کر یہ بھی اُن کے جیسا ہو جائے گا۔''

''ایسا لگتا تو نہیں۔ سانپ کو ڈنک مارنے کی عادت پیدا ہوتے ہی پڑ جاتی ہے۔''

ہمیں کمرے میں بیٹھے کافی دیر گزر گئی تھی۔ وقت کے گزرنے کا ہمیں مطلق احساس نہیں ہوا تھا۔ جب کھالے کے باپ نے اُسے مطلع کیا کہ ویگن کا ٹائم ہو گیا ہے تو ہم چونکے۔ کھالے نے صافہ جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور اپنی کھیڑی چپل کو صافی کی مدد سے چمکانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ باہر نکلا تو میں اُس کی تقلید میں اُس کے گھر سے نکل آیا۔

واپسی کے راستے میں میرے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔ خالدہ کبھی بھی بات کرتے ہوئے ٹھٹکی نہیں تھی۔ اُس کے اور میرے درمیان ایسا تعلق کبھی نہیں رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجک جاتی۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی کہ ماسی صفو کی غیر متوقع آمد کے سبب نہ کہہ پائی۔ میں تمام راستے اُسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ گھر میں سبھی اپنے اپنے معمولات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ میں کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

میرے لیے گاؤں کی فضا یک لخت ناساز ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ایک کر کے سبھی لوگ میرے دشمن بنتے جائیں گے اور آخر کار بخت خان کی طرح میں نور پور میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ کھالا درست کہتا تھا۔ مجھے شاہ جی کے ساتھ تعلق استوار کرنے اور پڑھائی کو جیسے تیسے جاری رکھنے کی سزا بڑے غیر محسوس انداز میں دی جا رہی تھی۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں تعلیم کے حصول کی خواہش نے ضد کی چولی اوڑھی اور میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے، تعلیم کا حصول جاری رکھوں گا۔ میرے گھر میں پیسا کم تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ چاچا چراغ نے کھیتوں کے جو کام میرے ذمے لگا رکھے تھے، پوری ذمے داری کے ساتھ اُنہیں سرانجام دینے کے بعد میرے پاس اتنا وقت ضرور ہوتا تھا کہ میں بہ آسانی پڑھ سکتا تھا۔

سہ پہر ڈھلنے کو آ گئی۔ مجھے ہلکا سا بخار ہو گیا۔ جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ پروین نے مجھے چائے پلائی، پیراسیٹا مول کی ایک گولی جسے نور پور میں عرفِ عام میں 'شیر مارکہ گولی' کہا جاتا تھا، کھلائی اور کھیس تان کر لیٹے رہنے کی تاکید کی۔ ہمارے گھروں میں یہ رواج بڑی مضبوط جڑ پکڑ چکا تھا کہ بخار زدہ انسان چائے کے ساتھ گولی حلق میں اُتار کر کھیس یا لحاف اچھی طرح لپیٹ کر سو جاتا تھا تاکہ خوب پسینا آئے اور بدن کا مسام مسام کھل جائے۔ چاچی کہتی تھی کہ پسینے کے ساتھ ساتھ بخار بھی جسم سے نکل جاتا ہے۔

جبکہ ڈاکٹر شاہ جی کہتا تھا کہ بخار میں نہانا چاہیے۔ جسم کے درجۂ حرارت کو ہمیشہ پانی ہی کم کرتا ہے۔ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے مگر نتیجہ ایک ہی تھا۔ پسینا بھی تو پانی ہی ہوتا ہے اور ٹمپریچر کو کم کر دیتا ہے۔ میں عمومی طور پر چاچی، پروین، فرزانہ اور شبانہ کے ہمراہ سہ پہر کو کھیتوں میں واقع اپنے ڈیرے پر جایا کرتا تھا۔ میں اور فرزانہ چارا کاٹتے، پروین اور چاچی بھانڑے (مویشیوں کا چھپر نما کمرا) کی صفائی کرتیں اور پھر ہم سب مل کر مویشیوں کو چارا ڈالتے۔ میں اپنے حصے کا کام ختم کر کے نور پور آ جاتا اور نہا دھو کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا جبکہ دوسرے لوگ مویشیوں کا دودھ دوہ کر گھر آیا کرتے تھے۔ مجھے بخار کی وجہ سے گھر میں چھوڑ کر سبھی ڈیرے پر چلے گئے۔

مجھ پر کسل مندی سوار تھی۔ گھر والوں کو گئے نصف گھنٹا ہو چکا تھا جب اچانک میرے کمرے کے دروازے پر شوخ سبز رنگ کا آنچل لہرایا۔ میں سمجھا کہ غزالہ آئی ہے، مگر جونہی میں نے غور سے دیکھا، گھبرا سا گیا۔ وہ غزالہ نہیں، خالدہ تھی۔ وہ صحن سے گزر کر آئی تھی، جان چکی تھی کہ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں، تبھی گھبرا کر بولی۔ ''باقی لوگ کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ڈیرے پر گئے ہیں۔ آؤ ناں، کھڑی کیوں ہو؟''

وہ میری چارپائی کے متوازی بچھی ہوئی چارپائی کی بانہہ پر ٹک گئی، بولی۔ ''صاحب جی! میں ایک بڑی ضروری بات کرنے کے لیے آئی ہوں۔''

میں بے ساختہ بولا۔ ''خیر تو ہے؟''

''نہیں...... خیر نہیں ہے۔'' وہ بولتے بولتے رُک سی گئی، پھر دروازے کے باہر جھانک کر بولی۔ ''مجھے صدف بی بی نے ایک رقعہ تم تک پہنچانے کے لیے دیا تھا، آج صبح۔ یہ بھی کہا تھا کہ فوری طور پر اس رقعے کا تم تک پہنچنا بے حد ضروری ہے۔''

میں چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھیس لڑھک گیا۔ میں فرطِ اشتیاق سے بولا۔ ''کہاں ہے وہ رقعہ؟''

اچانک اُس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ چند لمحے بڑی عجیب سرد گیس نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی، پھر بولی۔ ''صاحب جی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

میں متعجب ہوا۔ ''کیا مطلب؟ میں نے کیا، کیا ہے؟''

''تمہاری بات چیت صدف بی بی سے چل رہی ہے اور تم نے کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی۔ کتنے چالاک ہو تم!'' اُس کے لہجے کی مایوسیت قطعاً بے محل سی لگ رہی تھی۔

''میری بات چیت...... وہ بھی صدف بی بی سے؟ تمہارا

دماغ تو نہیں چل گیا؟“

”کیا کوئی لڑکی بغیر تعلق واسطے کے بھی رقعہ دیتی ہے؟“

”رقعہ ادھر کرو، دیکھوں تو کیا لکھا ہے؟“ میں نے جز بز ہو کر کہا۔

”وہ تو میں تمہیں دے ہی دوں گی مگر سچ سچ بتاؤ، کیا تمہیں بی بی بہت اچھی لگتی ہے؟“ وہ بجھارت پر بجھارت ڈال رہی تھی اور میں عجیب سی کیفیت میں ڈوبا اُسے دیکھ رہا تھا۔

”میں سچ کہتا ہوں کہ میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لاؤ، رقعہ مجھے دو۔“

اُس نے اک نگاہِ شکایت مجھ پر ڈالی اور گریبان میں چھپایا ہوا رُقعہ نکال کر میرے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دے دیا۔ بالکل ننھا سا کاغذ کا دستی تیار کیا ہوا لفافہ تھا، لفافے میں چھپا ہوا کوئی راز...... میں نے دھڑکتے دل سے گوند سے بند کیا لفافہ چاک کیا، رُقعہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ بڑے اختصار مگر زہر آلود کاملیت کے ساتھ لکھا تھا......

”ڈاکٹر منور علی شاہ پر آج رات خطرناک حملہ کیا جائے گا، اُسے بچاؤ۔“

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ میں نے بغیر کسی کو مخاطب کر کے لکھی گئی تحریر کو تین چار مرتبہ پڑھا۔ لکھنے والے کا نام بھی نہیں لکھا ہوا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ تحریر سردار وریام خان کی چھوٹی بیٹی صدف بی بی کی ہے کیونکہ میں اُس کی اسکول کی کاپیاں بارہا دیکھ چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے کئی سورج اچانک طلوع ہو گئے تھے۔ بلو مجھ سے مسلسل پوچھ رہی تھی کہ رقعے میں کیا لکھا ہوا ہے، وہ کہاں ملنے کا لکھتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں شاید ذہنی طور پر کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ صدف بی بی نے یہ رقعہ میرے لیے ہی بھیجا ہے؟“

”ہاں تو...... پہلے مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر جب اُس نے ’پروین کا بھائی ’شہرا‘ کہا تو میں تمہارے پاس آئی ہوں۔“

اُس نے رقعہ چاک نہیں کیا تھا۔ کر بھی لیتی تو ان پڑھ ہونے کی وجہ سے پڑھ لینے سے قاصر تھی۔ میری نظریں اُس کا طواف کرتے ہوئے بھٹک کر پھر ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر ٹھہر گئیں۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں واضح ارتعاش محسوس ہونے لگا۔

وہ محتاط نظروں سے میری کیفیت کو بھانپ رہی تھی، مایوس ہو کر بولی۔ ”تمہاری مرضی صاحب جی! میں تو یہ سمجھتی رہی ہوں کہ تم بس غزالہ کے ہو، تمہیں دیکھنا اور تمہارے بارے میں سوچنا گناہ ہے مگر تم تو اونچی اُڑانوں میں ہو۔“

مجھے فی الفور اُس کے جملے کا متن سمجھ نہیں آیا تھا۔ میں چارپائی سے اُتر آیا۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ میں نے رقعہ لپیٹ کر جیب میں ڈالا، دھڑکتے دل سے کہا۔ ”بلو! تم اس رقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ ہم سب کی شامت آ جائے گی۔“

وہ ایک قدم بڑھ کر میرے عین سامنے آ گئی، بولی۔ ”میں کملی تو نہیں ہوں، جانتی ہوں کہ میرے منہ سے نکلنے والا ایک جملہ بھرے نور پور میں آگ لگا دے گا۔ پر سچ کہتی ہوں، تم اس راہ پر نہ چلو۔ یہ تو موت کی راہ ہے۔ جو بھی چلے گا، جان گنوا بیٹھے گا۔ بڑے خان کو پتا چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔“

میں جلدی سے بولا۔ ”یہ وہ والا چکر نہیں ہے بلو! یہ اُس سے بھی بڑی قیامت والا سلسلہ ہے۔ تم جاؤ اور اگر صدف بی بی سے ملو تو کہہ دینا کہ رقعہ مجھ تک پہنچ گیا ہے۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے پہلو سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے میں تھم گئی۔ میری طرف منہ کیے بغیر بولی۔ ”صاحب جی! میں غزالہ کو بھی نہیں بتاؤں گی۔“

وہ غلط سمجھ رہی تھی مگر میں اُس کی غلط فہمی دور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ اگر پڑھی لکھی ہوتی تو شاید میں اُس کے ہاتھ میں خط تھمانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اب جانتا تھا کہ میں لاکھ قسمیں دوں، وہ ماننے پر تیار نہیں ہو گی کہ میرا صدف بی بی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وہ جیسے آئی تھی، ایسے ہی آنچل لہراتے ہوئے گھر سے نکل گئی۔ میں اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھ کر پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ یہ مسئلہ بہت گمبھیر صورت حال اختیار کر گیا تھا۔ رقعے میں تفصیل نہیں دی گئی تھی۔ یقیناً صدف بی بی کو تفصیل مہیا کرنے کی مہلت نہیں ملی ہو گی یا اُسے جس حد تک پتا چلا تھا اُس نے لکھ بھیجا تھا۔ اُس نے یہ کیا کم احسان کیا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی پر ٹوٹنے والی مصیبت کی خبر قبل از وقت دے دی تھی۔ میرے لیے تو یہ بھی حیرت ناک تھا کہ اُس نے اپنے باپ کے اس بے داغ منصوبے کا سراغ کیسے لگا لیا۔ امیر نواز کے بعد اُس کے کردار نے مجھ پر حیرت کا نیا جہان کھول دیا تھا۔ وریام خان جیسے وڈیرے کے گھر میں بھی تعلیم اپنا ہاتھ دکھا چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں صدف بی بی کو داد دی کہ ایک اچھے کام کے لیے اُس نے اپنی نیک نامی تک داؤ پر لگا دی تھی۔ اُس کا بھیجا ہوا خط کسی اور کے ہاتھ میں بھی لگ سکتا تھا۔ خالدہ حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے معاملے کو اتنا بگاڑ سکتی تھی کہ سلجھاوے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہتی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی کافی وقت تھا۔ غیر ارادی طور پر میں آنکھیں بند کر کے تصور میں آنے والی قیامت کی منظر کشی کرنے لگا۔ ڈاکٹر کی کوٹھی میں بڑی بڑی مونچھوں والے، صافوں میں چہرے چھپائے، جدید اور ڈراؤنی بندوقوں سے لیس بہت سارے غنڈے میری چشم تصور میں اُبھر آئے۔ اُنہوں نے ڈاکٹر شاہ جی کو کوٹھی کے صحن میں لا کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اُس کی چیخ و پکار پر کان دھرنے والا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اُسے ادھ موا کر کے، ٹانگیں اور بازو توڑ دیے اور جیسے دندناتے ہوئے آئے تھے، ویسے ہی نعرہ زنی کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ میں جوں جوں سوچتا جاتا، میرے روئیں روئیں میں دھواں بھرتا جاتا تھا۔

میں نے بہ عجلت غسل کیا۔ جسم کو توڑنے موڑنے والا بخار جاتا رہا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی پر پہنچا۔ اُسے حسب توقع ایک کتاب کے مطالعے میں غرق پایا۔ میں نے صدف بی بی کا حوالہ دیے بغیر تمام رام کہانی سے آگاہ کیا۔ معاملے کی نوعیت کو پوری سنگینی سے آشکار کرنے کے لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اُسے اپنی، سردار وریام خان اور سردار حیات خان سے یکے بعد دیگرے ہونے والی دونوں ملاقاتوں کے احوال اور منہ پر پڑنے والے طمانچے کے بارے میں آگاہ کر دوں۔

اُس نے میری باتوں اور اندیشوں کو بڑے انہماک سے سنا، پھر لبوں پر زہرخند مسکراہٹ سجا کر بولا۔ ”تم میری فکر نہ کرو، اپنے آپ کو ان وڈیروں کے شر سے بچانے کی کوشش کرو۔ تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے درپیش آنے والے حادثے کے بارے میں قبل از وقت بتا دیا۔ میں آنے والوں سے بہ خوبی نمٹ لوں گا۔“

”کیسے؟“ مجھے اُس کے لہجے کی مضبوطی نے متحیر کر دیا۔

”یہ میرا کام ہے، میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔“

”شاہ جی! میں بہت پریشان ہوں۔ آپ نہیں جانتے، خان زادے کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔“ میری آواز کا ارتعاش مخفی نہ رہ سکا۔

اُس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ”شہریار! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میرا بہت خیال رکھتے ہو مگر یہ بڑوں کے کھیل ہیں۔ بڑے ہی کھیل سکتے ہیں۔ چھوٹے حصہ لینے لگیں تو بڑوں کے بیچ مسلے کچلے جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ امیر نواز اپنے باپ کی طرح جاگیردار بننا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ مجھ پر کیے جانے والے وار کے بارے میں تمہیں وریام خان یا حیات خان کے گھر کے کسی فرد نے بتایا ہو گا۔ یہ کتنی اچھی شروعات ہیں کہ ظالموں کی گود میں پلنے والوں کے دلوں کی کایا پلٹی جا رہی ہے۔ یہ اعجاز صرف اور صرف تعلیم کا ہے جو نئی نسل نے حاصل کی ہے۔ ابھی اُن کی تربیت اُس لحاظ سے نہیں ہو پائی کہ وہ فرعونی قیود سے نکل کر انسانیت دوست بن جاتے مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والا وقت اس معاشرے کی مروجہ اکائیوں کی نوعیت کو بدل کر جنت نما بنا دے گا۔“

میں نے شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔ ”شاہ جی! آپ بھی کمال آدمی ہیں۔ ان باتوں کو سردست چھوڑیں اور اپنے بچاؤ کی فکر کریں۔ وقت لحظہ بہ لحظہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی تک یہ بھی طے نہیں کیا جا سکا کہ وریام خان کے لوگ کس انداز سے حملہ آور ہوں گے۔“

وہ میری بے چینی کو بھانپ کر ہنس پڑا۔ میں نے اپنے تعلق کے دورانیے میں پہلی مرتبہ اُسے ہنستا دیکھا تھا، ورنہ عمومی طور پر اُس کے لبوں کا موہوم سا کھنچاؤ اُس کی زہریلی سی مسکراہٹ عیاں کرتا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ اُس کی ہنسی بھی عام لوگوں کی ہنسی نہیں تھی بلکہ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نقرئی پیالے سے نیلگوں زہر چھلک پڑا ہو۔

کھلی کتاب میں لیٹر پیڈ رکھ کر بند کرتے ہوئے بولا۔ ”شہریار! تم نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا مگر یہ اندازہ ضرور کر سکتا ہوں کہ مجھ پر حملے کے منصوبے کا ماسٹر مائنڈ وریام خان نہیں، سردار حیدر خان ہو گا۔ کیونکہ وریام خان ابھی وہ چالاکیاں اور منصوبہ سازیاں نہیں سیکھ سکا جو اسمبلی میں پہنچنے اور اپنے بھائی بندوں سے بھی ملاقاتوں کے بعد حیدر خان سیکھ آیا ہے۔ وریام خان محض ڈنڈا ڈولی اور دھمکیوں کی بدمعاشی کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہو گی؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر یہ ضرور سوچا جا سکتا ہے کہ عام سے غنڈے مجھے مارنے پیٹنے کے لیے رات میں نہیں آئیں گے، کچھ اور ارادے لے کر آئیں گے۔ میں اُن کے لیے کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ تم فکر نہ کرو اور گھر جا کر سو جاؤ۔“

”مگر شاہ......“

”اگر مگر مت کرو دوست! جاؤ...... مجھے سوچنے دو، کچھ کرنے دو۔ میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم میرے لیے اتنے مخلصانہ جذبات اپنے سینے میں رکھتے ہو۔ میں بے کار انسان ہوں مگر احسان فراموش نہیں ہوں۔ زندگی وفا کرتی رہی تو کبھی نہ کبھی اس احسان کو چکانے کی کوشش کروں گا۔“

اُس نے نیم افسردہ لہجے میں کہا۔

میں خاموشی سے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ مجھے سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں اُس کی حفاظت کے لیے کیا کروں؟ اچانک میرے ذہن میں کھالے کا خیال آیا۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ چالاک اور فوری فیصلہ کرنے کی طاقت رکھنے والا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کے لیے دل ہی دل میں خدا سے سلامتی کی دعا مانگی اور اجازت لے کر اسپتال سے نکل آیا۔ اسپتال کے مین گیٹ کے عین سامنے یارن خان کی حویلی کا لکڑی کا بنا ہوا گیٹ تھا۔ لکڑیوں کی ماہرانہ بنت بڑی خوب صورت تھی۔ گیٹ کی اونچائی بہ مشکل چار ساڑھے چار فٹ تھی جس کی وجہ سے عمارت تک جاتی ہوئی دو تین سو فٹ لمبی شش پہلوی اینٹوں کی روش بہ آسانی دکھائی دیتی تھی۔ روش کے دونوں کناروں پر پھولوں کی خوب صورت کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔

حویلی کا بڑا دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا محراب دار دروازہ تھا۔ حویلی کو ایک نظر دیکھتے ہی مغلیہ دور کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یارن خان کی حویلی دو منزلہ تھی۔ سنبل کے بلند و بالا درختوں نے چاروں طرف سے حویلی کو چھپا رکھا تھا۔ بلاشبہ تین ایکڑ رقبے پر مشتمل یہ پُرشکوہ حویلی نور پور کی سب سے خوب صورت حویلی تھی۔ اس حویلی میں داخل ہونے کی اجازت سردار حیات خان اور وریام خان سمیت کسی بھی شخص کو حاصل نہیں تھی۔ چونکہ یارن خان یہاں نہیں رہتا تھا، اس لیے یہاں کسی کے آنے کا جواز بھی نہیں بنتا تھا۔ یارن خان کے دو نوکر یہاں رہائش پذیر تھے جو نہ صرف حویلی کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال کرتے تھے بلکہ حویلی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے جدید طرز کے باغ کی آبیاری بھی کرتے تھے۔

یارن خان نے دُنیا جہان کے خوب صورت پودے، ان گنت رنگوں کے گلاب اور پھول یہاں اکٹھے کر رکھے تھے۔ مور پنکھ، سرو، املتاس اور ڈیورانٹا جیسی قدرتی صناعیاں میں نے یہیں دیکھی تھیں۔ پودوں اور درختوں کی ایسی بھی ان گنت اقسام یہاں موجود تھیں جن کے مجھے یا کھالے کو نام تک نہیں آتے تھے۔

یارن خان کی حویلی کی جنوبی سمت میں شریف ارائیں کا گھر واقع تھا۔ گھر کے آگے ڈیرہ نما جگہ پر اُس نے آٹا پیسنے والی چکی لگا رکھی تھی جو پیٹر انجن پر چلتی تھی۔ ایک چھوٹی آرا مشین بھی نصب کر رکھی تھی جسے جمعے کے جمعے چلایا کرتا تھا۔ نور پور اور اطراف کے چارپائی ساز اور مستری لکڑی چرانے کے لیے اکٹھے ہو جایا کرتے تھے اور اُس کی روٹی روزی کا سامان کر دیتے۔ شریف ارائیں کا بے دانت پوپلا منہ ہر وقت ہلتا رہتا تھا۔ وہ ہکلاتا بھی تھا۔ طبعاً بڑا مزاح کار اور زندہ دل واقع ہوا تھا۔ جس محفل میں براجمان ہوتا، گل و گلزار کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ چکی کے اگلے صحن میں چارپائی بننے میں مصروف تھا۔ یہ اُس کی پارٹ ٹائم جاب تھی۔ عام استعمال کی چارپائیاں بننے کے ساتھ ساتھ وہ جہیز کی رنگین پائیوں والی چارپائیوں کو رنگ برنگے سوت سے بنتا تھا۔ اُسے اس کام میں اتنی مہارت حاصل تھی کہ اُس کی بنی ہوئی چارپائی کو دیکھنے والا انگشت بدنداں ہو جاتا تھا۔ میں چند ثانیوں کے لیے تھم گیا۔ اُسے چارپائی کے اردگرد مخصوص انداز میں چکراتے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

کھالا گھر میں نہیں تھا۔ میں اُس کے باپ کے پاس کچھ دیر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ دور کہیں ہارن بجا۔ بخشو لوہار نے فوراً کہا۔ ”شہرے پتر! تیرا یار آ گیا ہے۔ ویگن کا ہارن سنائی دے رہا ہے۔“

کھالے کی ویگن کا ہارن علاقے بھر میں مشہور تھا۔ ہر کان کے لیے شناسا تھا۔ چند منٹوں کے بعد سواریوں سے لدی پھندی ویگن دکھائی دی جو سڑک سے اُتر کر اپنی مخصوص جگہ پر جا رکی۔ میں نے کھالے کو ویگن سے نکلتے ہی پکڑ لیا۔

”میرے ساتھ چلو۔“

اُس نے شیدو کو پیشہ وارانہ ہدایات سے نوازا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں نوری چوک والی سڑک کے کنارے سب سے آخری دکان میں بنے ہوئے جُجی کے حمام میں آ بیٹھے۔ اس وقت جُجی عمومی طور پر دکان پر نہیں ملتا تھا۔ وہ سردار حیات خان کے ڈیرے پر مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف ہوتا تھا۔

کھالے نے پوچھا۔ ”ہاں بھئی شہزادے! کیا بات ہے؟ کوئی نیا مسئلہ؟“

میری زبان ٹیپ پلیئر کی طرح رواں ہو گئی۔ اُس نے مجھے بہت کریدا کہ میں اُسے مخبر کے بارے میں بتاؤں مگر میں ثابت قدمی سے صدف بی بی اور بلو کے ماجرے کو چھپانے میں کامیاب رہا۔

اُس نے کہا۔ ”شہرے! معاملہ خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رات کو ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی پر ڈاکوؤں کی صورت میں خان کے بندے حملہ آور ہوں گے۔ ہم سوائے ڈاکٹر شاہ جی کو خبردار کرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتے اور یہ کام تم کر ہی چکے ہو۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شاہ جی کو چاہیے کہ رات بھر کے لیے شہر چلا جائے مگر وہ بھی بہت ضدی ہے۔ اُس کی جگہ پر میں ہوتا تو میں سردار حیات خان کے ڈیرے پر رات گزارتا۔“ اُس نے کہا۔

”کیا مطلب؟ جو تکلیف دینا چاہتا ہو، اُسی کے پاس اپنے قدموں چلے جانا دانش مندی ہوتی ہے؟“

”ہاں! اُس کی برائی کا راستہ اس طرح بہ آسانی روکا جا سکتا ہے۔“ کھالے نے اپنی فہم کے مطابق بہترین رائے دی۔

”ان باتوں کو چھوڑو، یہ سوچو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”ہمیں مزے سے، کھیس تان کر سونا چاہیے۔“ اُس نے بے پروائی سے کہا۔

”ڈاکٹر شاہ جی کا معاملہ ہے، میں یوں دست بردار کیسے ہو سکتا ہوں؟“ مجھے غصہ آ گیا۔

”تو ٹھیک ہے، رات بھر جاگو، جیت شاہ کے مزار پر جا کر اللہ اللہ کرو اور دعائیں مانگو۔ سنا ہے، بے غرض دعائیں سیدھی عرش پر جاتی ہیں اور اثر ڈھونڈ لاتی ہیں۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔

میرا غصہ سوا ہو گیا۔ اُس پر سرد نگاہ ڈال کر میں اُٹھنا چاہتا تھا کہ اُس نے میری کلائی تھام لی، بولا۔ ”اتنا غصہ مت دکھاؤ، مجھے سوچنے دو۔“

”ہاں! تم نے ایٹم بم بنانے کا فارمولا سوچنا ہے ناں؟“ میرے لہجے میں استہزا کی آمیزش تھی۔

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”ہاہ! اگر یہ اتنا ہی آسان کام ہوتا تو تم خود کر لیتے، میرے پاس نہ آتے۔ آخر تم نے سائنس کے ساتھ چودہ جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔ اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ؛ ڈاکٹر شاہ کے پاس کوئی اسلحہ ہے؟“

”ہاں! اُس کے پاس بندوق ہے۔ بالکل ویسی، جیسی امیر نواز کے پاس ہے۔“ میں نے کہا۔

”ری پیٹر گن؟“ وہ حیرانی سے بولا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”مگر ایک گن کے ساتھ وہ کہاں تک مقابلہ کرے گا؟“

”حملہ آوروں کو جب پتا چلے گا کہ وہ نہتا نہیں ہے تو وہ دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔“ کھالے کی فراست قابلِ داد تھی۔

میں نے جُجی کے شوکیس میں رکھا ہوا آہنی نیرنا (ناخن تراش) اُٹھا لیا اور بنچ پر بیٹھ کر پیروں کے ناخن تراشنے لگا۔ میرا مقصد کھالے کو سوچنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ میری توقع

کے عین مطابق اُس کی شیطانی کھوپڑی نے حل ڈھونڈ لیا۔ مجھے متوجہ کر کے بولا۔ ''تمہاری دور بین کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہی جو میں نے جیت شاہ کے میلے سے خریدی تھی؟''

''وہی جو میں نے جیت شاہ کے میلے سے...... ارے واہ! کوئی ڈھیٹ ہو تو تمہارے جیسا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ دور بین جو میں نے میلے کے اسٹال سے چوری کر کے تمہیں دی تھی۔'' وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں جھینپ کر بولا۔ ''میں نے تو خریدی ہی تھی ناں۔ وہ گھر میں پڑی ہے۔ اُس کا کیا کرنا ہے؟''

وہ بولا۔ ''بتاتا ہوں، کچھ صبر تو کر لیا کرو۔ میں نے پلان بنالیا ہے۔ تم ایسا کرنا کہ کھانا کھانے کے بعد، عشا کے وقت، دور بین اور دو بھاری کھیس اُٹھا کر اسپتال کی عقبی سائڈ میں کھال پر آجانا۔ یہ خیال رکھنا کہ تمہیں آتے ہوئے کوئی نہ دیکھے اور اگر دیکھ بھی لے تو وہ کھیسوں پر توجہ نہ دے سکے۔ سمجھ گئے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر تمہارا پلان کیا ہے؟''

''اور کڑوے تیل کی مالش بھی کر رکھنا۔ رات کو مچھر بہت ہوتا ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے ایک ذرا مسکرا کر مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے فوری ترتیب دیے ہوئے منصوبے کے بارے میں قبل از وقت کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں جانا اور بجی کے حمام سے نکل آیا۔

میرے دل کو اطمینان ہو گیا تھا کہ شاہ جی کا پہرا دینے کے لیے مجھے اُس کا ساتھ میسر آگیا تھا۔ مجھے اُس کی چالاکی اور معاملہ فہمی کی صلاحیت پر بھروسا تھا۔ میں گھر پہنچا، کھانا کھایا اور اپنے سالخوردہ جستی ٹرنک کو کھول کر بیٹھ گیا۔ دور بین نکالی۔ یہ سگریٹ کی ڈبیا کے سائز کی اسٹین لیس اسٹیل کی جدید طرز کی دور بین تھی جو بہ آسانی جیب میں سما جاتی تھی۔ اس کے ایک کونے میں پش بٹن لگا ہوا تھا جسے دبانے سے اس کا دو عدسوں والا دہانہ 'کٹاک' کی زوردار آواز کے ساتھ کھل جاتا تھا۔ آئی لینز کے عین وسط میں گراری نما 'لینز مینجر' نصب تھا جسے گھما کر منظر کو زوم ان کیا جاسکتا تھا۔ میں نے دور بین کے لینز قمیص کے دامن سے صاف کیے اور اسے جیب میں ڈال لیا۔

عشا کی اذان مسجد کے اسپیکر سے نکل کر نور پور کی فضا میں گونج رہی تھی جب میں نے گھر سے نکلنے کا قصد کیا۔ کھیسوں کو گھر والوں کی نگاہ سے چھپا کر باہر لے جانا خاصا مشکل کام تھا مگر میں اس مشن میں کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔ ابتدائی شب کا اندھیرا ہر سو محیط تھا۔ نصف شب کے بعد چاند کا طلوع متوقع تھا۔ پختہ کھال کے کنارے چلتا ہوا اسپتال کے عقب میں آیا۔ کھالا دکھائی نہیں دیا۔ میں دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے سے شمالی جانب کچھ فاصلے پر دیوار کی جڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات کی تاریکی سے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ ویسے بھی نور پور کی گلیوں میں نصف شب تک بچپن کا کھیل ابھی تک چکراتا پھرتا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ آج میری کیفیت پہلے سے جدا تھی۔ دل بے اعتدال چال چل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔ میری نگاہیں چار دیواری کی نکڑ پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے کھالے کو نمودار ہونا تھا۔

مجھے، اچانک، جیت شاہ کا میلا یاد آگیا جو ہر سال باقاعدگی سے لگتا تھا۔ اطراف کے دیہاتوں اور قصبوں سے ہزاروں لوگ میلہ دیکھنے کے لیے وہاں آتے تھے۔ سرکس، موت کا کنواں، چڑیا گھر، جھولے اور ہیجڑوں کے ناچ گھر سج جاتے، لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ امڈ آتے اور کھلے میدان میں لگے ہوئے عارضی اسٹال خریداروں سے بھر جاتے۔ نئی نئی اشیا دیکھنے کو ملتیں۔

تین سال پہلے لگنے والے میلے میں، میں نے ایک اسٹال پر یہی دور بین، جو اس وقت میری بغلی جیب میں تھی، دیکھ لی تھی۔ دکان دار نے میری دلچسپی بھانپ لی۔ اُس نے بڑے مشاقانہ انداز میں دور بین میرے ہاتھ میں تھمائی، مجھے اُس کے فنکشنز سمجھائے اور آئی لینز میری آنکھ سے لگا دیے۔ میں نے کافی فاصلے پر نصب شدہ موت کے کنویں کا دعوتی پلیٹ فارم دیکھا۔ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے جس لڑکی کا ناچ میں بڑے شوق سے دیکھتا آرہا تھا، دور بین اُس کا پول کھولنے لگی تھی۔ وہ لڑکی نہیں، لڑکا تھا جو میک اپ کر کے لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے دور بین آنکھوں سے ہٹائی، آنکھیں مل کر اونچے پلیٹ فارم کو دیکھا پھر آپ ہی آپ شرمسار سا ہو گیا۔ مجھے دور بین اچھی لگی۔ دکاندار نے اُس کی قیمت دو سو روپے بتائی۔ میرے شوق پر اوس پڑ گئی۔ میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔

میں نے موت کے کنویں کے سامنے لگے ہوئے مجمع میں سے کھالے کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ بڑے انہماک سے ہیجڑوں کا ڈانس دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کے پہلو میں کہنی چبھوئی۔

''اُس لڑکی کو دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں یار! اُسی کو دیکھ رہا ہوں۔ یار کیا غضب کی ڈانسر ہے!'' اُس کی نظریں بہ دستور چوبی پلیٹ فارم پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''وہ لڑکی نہیں، لڑکا ہے۔''

''او نہیں یار! تمہیں بکریوں میں کھڑا اونٹ نظر نہیں آتا، وہ کیا نظر آئے گی۔'' کھالے نے مجھے ڈپٹ کر کہا۔

مجھے تاؤ آگیا۔ ''میں قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ لڑکا ہے۔ اُس نے خوب رگڑ کر شیو کر رکھی ہے۔''

''شوق سے قسم کھاؤ مگر وہ یقیناً لڑکی ہے۔''

میں بہ ضد رہا تو اُس نے قدرے غصے سے کہا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ لڑکی نہیں ہے؟''

''میں نے دور بین میں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کہاں ہے وہ دور بین؟'' وہ چونکا۔

میں نے اسٹال کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں پڑی ہے۔ دو سو کی دیتا ہے، کم نہیں کرتا۔''

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم لوگوں کے ہجوم سے باہر آگئے۔ چڑیا گھر کے پنجرے کے قریب کھڑے ہو کر میں نے اُسے کہا۔ ''میرے پاس دو سو روپے نہیں ہیں وگرنہ میں ضرور خرید لیتا۔''

اُن دنوں کھالا بے روزگار تھا۔ مخصوص انداز میں ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ''میں تجھے وہ والی دور بین لادوں؟''

میں خوشی سے بولا۔ ''لادو ناں!''

''کیا دو گے؟''

''پچاس روپے!'' میں نے جیب میں سے نوٹ نکال کر نمائش کی۔

وہ مان گیا۔ میں نے دور سے اشارہ کر کے اُسے دور بین کا محل وقوع سمجھایا۔ پھر اُس کی ہدایت کے مطابق ٹہلتا ہوا اسٹال پر چلا گیا۔ اسٹال پر گاہکوں کا رش تھا۔ میں نے عقبی حصے میں لٹکے ہوئے فٹ بال کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فٹ بال اُتارنے کے لیے عقبی حصے میں چلا گیا۔ اس کا ساتھی ایک چھوٹی سی کھلونا کشتی کے چلانے کا طریقہ گاہک کو بتا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے گاہکوں کے بیچ میں کھالے کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ دکاندار میری مطلوبہ فٹ بال لے آیا۔ میں اُسے ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ اُسے مصروف کرنے کے لیے پوچھنے لگا کہ اس کا بلیڈر کیسا ہے، والو اور نوزل کی پوزیشن کیا ہے، کیا یہ سیالکوٹ کا بنا ہوا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ عاجز آگیا، بولا۔ ''باؤ! لگتا ہے تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ادھر لاؤ فٹ بال اور چلتے بنو۔ جب پیسے ہوں جیب میں تو میلا دیکھنے آنا...... چل شاباش!''

میں نے غصہ بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور فٹ بال اُس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ارد گرد دیکھا، کھالا نظر نہ آیا۔ ریک پر نگاہ ڈالی، دور بین بھی نظر نہ آئی۔ میرے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ کھالا اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں تیر کی طرح میلے کے لیے مختص بے فصل کھیتوں پر مبنی میدان سے نکلا۔ خوشی تھی کہ سنبھالی نہیں جارہی تھی اور تاب انتظار بھی نہ تھی، اس لیے سیدھے راستے پر جانے کے بجائے فصل چیر کر آن کی آن میں افسر علی کے گھر کی نکڑ پر پہنچا۔ وہاں کھالا میرا منتظر تھا۔

میں نے بے تابی سے دور بین مانگی۔ وہ بولا۔ ''ناں سجن! پہلے اُہ نوٹ کڈھ جس دی شومنٹری کر ویندا ہائیں!'' (ناں دوست! وہ نوٹ نکالو جس کی نمائش کر رہے تھے)

میں نے اُس کا مطالبہ پورا کیا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دور بین نکال کر میرے پھیلے ہوئے مشتاق ہاتھ پر رکھ دی۔ میرے کمرے میں بیٹھ کر ہم دونوں نے اس کے استعمال پر دسترس حاصل کی تھی۔ بعد میں یہ دور بین کھالے کے بہت کام آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی چھت پر بیٹھ کر بہ آسانی شموں کو تاڑ لیتا تھا۔ اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہتا اور ملاقات ہونے پر اُسے حیران کرنے کے لیے بتاتا کہ وہ فلاں وقت کیا کر رہی تھی۔

ایسے ہی وقت میں کھالا نکڑ پر نمودار ہوا۔ مجھے دیکھ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آگیا، بولا۔ ''ہاں شہرے! تم مشن کے لیے تیار ہو ناں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں!''

''گھر والوں سے کیا بہانہ کیا؟''

''میں نے کہا ہے کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پڑھنے کے لیے جارہا ہوں۔ دیر ہونے کی صورت میں وہیں سو جاؤں گا۔'' میں نے بتایا۔

وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے اسپتال کی حدود میں داخل ہو گیا۔ میں اُس کی تقلید میں سنبھل کر چل رہا تھا۔ وہ اسپتال کی مرکزی عمارت کی مشرقی نکڑ تک گیا، رُک کر بولا۔ ''کیا اس دیوار پر چڑھ جاؤ گے؟''

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔ ''چڑھ تو جاؤں گا مگر کیوں؟''

اُس نے جواب دینے کے بجائے جوتے اُتارے، اُنہیں اپنی قمیص کے پلو سے باندھا اور بندر کی سی پھرتی سے

دیوار پر، کھڑکی میں لگی گرل اور نکڑ کی اینٹوں پر ہاتھ جما کر اوپر چڑھتا گیا۔ اس چودہ پندرہ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا مگر ہم دونوں اس کام میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ یارن خان کی حویلی میں بار بار داخلے کی کوششوں نے ہمیں دیواروں پر چڑھنے کے ہنر میں طاق کر دیا تھا۔

کھالا چھت پر پہنچ گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اوپر بلانے لگا۔ میں نے باری باری دونوں کھیس اُوپر پھینکے۔ اُس نے تھام لیے۔ جوتے اُتار کر خالصتاً کھالے کی تکنیک پر عمل پیرا ہوتے ہوئے قمیص کے اگلے پلو سے باندھے اور ہاتھوں پیروں کی انگلیاں گرل اور اینٹوں کے درمیانی خلا میں پھنسا دیں۔ چند منٹوں میں، میں بھی چھت پر کھڑا تھا۔ پختہ اینٹوں کی رگڑ سے میری انگلیاں چھل گئی تھیں اور پوروں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔

چھت پر پختہ اینٹوں کا فرش بنا ہوا تھا اور صاف ستھرا تھا۔ ہم ننگے پاؤں چلتے ہوئے مغربی منڈیر تک آ گئے۔ منڈیر چھت سے ڈیڑھ فٹ اونچی اور خاصی مضبوط تھی۔ یہاں سے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کی چھت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کھالے نے مجھے دیکھا، بولا۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ شاہ جی چھت پر سوتا ہے۔“

”میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے چھت پر سے اُترتے دیکھا تھا۔ ابھی شاید وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوگا۔ کچھ دیر بعد چھت پر آ جائے گا، دیکھنا۔“

کھالے نے ایک کھیس فرش پر بچھایا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جیب میں سے ایک پاکٹ سائز ریڈیو، ایک چوبی غلیل اور چند غلّے نکال کر کھیس پر ڈھیر کر دیے۔ دوسری جیب سے دو پٹاخے، سگریٹ کیس اور ماچس بھی نکال کر رکھ دی۔

میں نے اس دوران قریب پڑی ہوئی چند اینٹوں کو اُٹھایا اور کھیس کے نیچے رکھ کر سرہانے کی شکل دے دی۔ کھالے نے ریڈیو آن کیا۔ بغیر ٹیوننگ کیے ہی ملتان اسٹیشن کی نشریات ننھے سے اسپیکر سے پھوٹنے لگیں۔ اس ریڈیو پر صرف ملتان چلتا تھا۔ ٹیوننگ ناب گھومتی تھی مگر کام نہیں کرتی تھی۔

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا۔ ”پروگرام کیا ہے؟“

وہ معصومیت سے بولا۔ ”پہرا دینا ہے۔“

”یعنی تماشا دیکھنا ہے، اور بس؟“ مجھے حیرت ہوئی۔

”تو اور کیا ہم نے بندوں کو پھڑکانا ہے؟“ اُس نے کندھے اُچکائے۔

”تو پھر یہ کیوں اُٹھا لائے ہو؟“ میرا اشارہ غلیل کی طرف تھا۔ ”چڑوں کا شکار کھیلنا ہے؟“

”تو کیا اس سے غنڈوں کو مار بھگایا جا سکتا ہے؟“ وہ ہنسا۔

”تم سے بعید بھی تو نہیں ہے۔ اور ہاں! ان پٹاخوں کا کیا کردار ہے ہمارے مشن میں؟“

”یہ بھی دیکھ لو گے۔“ اُس نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔

”یہ تمہارے پاس کہاں سے آئے؟ نور پور میں تو کسی دکان پر نہیں ملتے۔“ میں نے پوچھا۔

”بہرام خان نے شادی کے موقع پر منگوائے تھے۔ میں نے دو چار اپنے پاس رکھ چھوڑے تھے۔“

میں نے جز بز ہو کر کہا۔ ”یار! کچھ بتاؤ تو سہی، کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”ڈاکٹر شاہ جی نیند پر قابو نہیں پا سکے گا، سو جائے گا۔ جب خطرہ محسوس ہوا تو اُسے ایسا چٹ کر غلّہ ماروں گا کہ نیند آن واحد میں اُڑن چھو ہو جائے گی۔ اُس کے پاس گن ہے۔ بیدار ہونے پر حملہ آوروں سے خود ہی نمٹ لے گا۔ ہم دونوں شاہ جی کے لیے یہی کر سکتے ہیں۔“ کھالے نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

مجھے غصہ آیا مگر خاموش رہا۔ اُسے تاؤ دلانا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسے وقت میں ڈاکٹر کی چھت پر نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ چونکہ ڈاکٹر کی کوٹھی کے صحن اور بیرونی دروازے پر بلب روشن تھے، اس لیے چھت کا منظر صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کھالے کو کہنی ماری، وہ بھی متوجہ ہو کر اِدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد، جب آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوئیں، شاہ جی نظر آیا۔ وہ بانس کی سیڑھی اوپر کھینچ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بستر بچھا کر دراز ہو گیا۔ منڈیر کے قریب لیٹنے کی وجہ سے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ فاصلہ اور اندھیرا حائل ہونے کی وجہ سے ہم یہ نہیں دیکھ پائے تھے کہ اُس نے اپنے دفاع کے لیے کیا انتظامات کیے تھے۔ میں نے اگر اُس کے بستر میں گن نہ دیکھ رکھی ہوتی تو ہمیں اُس کی موجودگی کا بھی علم نہ ہوتا۔

کھالے نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”یار! تمہارا ڈاکٹر تو پاگل پن کی حد تک بے خوف انسان ہے۔“

میں نے محض کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

”دیکھو یار شہرے! وہ اتنے مزے سے بستر میں لیٹ گیا ہے جیسے اُسے کوئی ڈر، کوئی اندیشہ لاحق نہ ہو۔ ایسی بھی کیا

بے نیازی!“ کھالے کے لہجے میں ہلکی سی برہمی تھی۔

”اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو خان اُس کا دشمن کیوں بنتا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اچھا! یہ بتاؤ، کوٹھی کا دروازہ اس وقت کھلا ہوگا؟“ کھالے نے اچانک پوچھا۔

”یقیناً...... کیونکہ میں نے آج تک کوٹھی کے دروازے کو کبھی بند نہیں دیکھا۔“

کھالے نے مجھ سے دوربین لی، آنکھوں پر لگائی اور گھٹنوں کے بل منڈیر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چھوٹے کوارٹروں کے اندر جھانکا۔ مشرقی منڈیر سے چمٹ کر کافی دیر تک تاکا جھانکی کرتا رہا پھر جھک کر چلتا ہوا فرش پر بچھے ہوئے کھیس پر آ گیا۔ ”شہرے! یہاں تو مچھر بھی بہت ہیں۔“

”خنکی میں تھوڑا اضافہ ہوا تو دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔“

ریڈیو پر فرمائشی گانوں کا پروگرام نشر ہونے لگا۔ کھالے نے مجھے ہاتھ اُٹھا کر خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کان لگا کر سرائیکی نغمے سننے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کی بے پروائی قطعاً مصنوعی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

میں نے دوسرا کھیس اوڑھ لیا۔ خاموشی مجھے کھلنے لگی تھی مگر بولنے پر کھالے نے پابندی عائد کر دی تھی۔ اچانک ڈاکٹر کی کوٹھی کی سمت واقع پہلے کوارٹر کے صحن کا بلب روشن ہو گیا۔ میں چونک کر منڈیر کے قریب سرکا۔ جھانک کر دیکھا۔ چونکہ کوارٹر کے صحن اور میرے بیچ کوارٹر کے کمرے حائل تھے، اس لیے مجھے آدھا صحن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک سایہ سامنے والی دیوار پر لہرایا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے ڈسپنسر دکھائی دیا جو نپے تلے انداز میں چلتا ہوا دیوار تک پہنچا۔ منڈیر پر ہاتھ رکھ کر فضا میں بلند ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کو دیکھتا رہا، پھر بائیں ہاتھ والی دیوار تک گیا۔ جھانک کر اسپتال کے مین گیٹ کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کیے برآمدے کی سمت بڑھا۔ پھر دیوار پر سایہ لہرایا اور صحن کی لائٹ بجھ گئی۔

کھالا ہاتھ کے اشارے سے مستفسر تھا۔ میں نے اُسے ڈسپنسر کی مشکوک سرگرمی کے بارے میں بتایا۔

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ڈسپنسر بھی آج رات کو کھیلی جانے والی گیم کا حصہ ہے۔“

مجھے اُس کی بات سے اتفاق تھا۔ بارہ بجے کے قریب یارن خان کی حویلی میں ایستادہ اونچے سنبلوں پر سے آدھے چاند نے جھانک کر ماحول کو خاصا روشن کر دیا۔ کھالے نے



بیوی: ”اوپر جاؤ اور اپنے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو میرا حکم نہ ماننے کے جرم میں مار مار کر اُدھ مُوا کر دو۔“

شوہر: ”ٹھیک ٹھیک ہے لیکن کہے کہ مجھے چند لمحوں کی مہلت تو دو تاکہ میں اس سے کچھ نفرت تو کر سکوں۔“

****

سرگوشی کی۔ ”شہرے! کیا اس ڈسپنسر کو ڈاکٹر کے چھت پر سونے کا علم ہے؟“

میں گھبرا سا گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اُسے پتا نہیں ہے۔“

”اگر اُسے علم ہے تو لازمی طور پر اُس نے خان کے آدمیوں کو بتا دیا ہوگا۔ معاملہ بگڑ جائے گا۔“ کھالے کے لہجے میں تشویش تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ غور کیا، سجھائی دیا کہ ہم نے ڈاکٹر شاہ جی کو چھت پر چڑھتے ہوئے اس لیے دیکھ لیا تھا کہ ہم اُس کی چھت سے قدرے بلند چھت پر چڑھے ہوئے تھے جبکہ ڈسپنسر کے کوارٹر میں کھڑے ہونے سے ڈاکٹر کی یہ حرکت دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ میں پُریقین انداز میں گویا ہوا۔ ”کھالے! مجھے یقین ہے کہ ڈسپنسر کو علم نہیں ہے۔“

اُس نے جواباً کچھ نہیں کہا بلکہ ریڈیو کی ناکارہ ٹیوننگ ناب کو گھمانے لگا۔ اس نے اندازہ کر رکھا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی پر حملہ کرنے والے ایک سے دو بجے تک کے دورانیے میں اسپتال میں داخل ہوں گے کیونکہ واردات کے لیے یہ مناسب ترین وقت گنا جاتا ہے۔ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ڈیڑھ کا عمل تھا جب یارن خان کی حویلی کے درختوں کے اوپر متحرک روشنی کے عکس دیکھ کر کھالا اُٹھ بیٹھا۔ چند لمحے جنوب کی طرف منہ اُٹھائے ساکت بیٹھا رہا، پھر سرگوشی میں بولا۔ ”شہرے! کھیل شروع ہو چکا ہے۔“

میں چونکا۔ ”کیسے؟“

”نوری چوک کی طرف سے آنے والی کوئی گاڑی نور پور کی حدود میں داخل ہو رہی ہے۔“ کھالے نے سنبل کے درختوں کے اوپر کی طرف انگلی لہرا کر کہا۔ ”یہ اُسی کی ہیڈ لائٹس ہیں۔ اب تم خاموش رہنا، کوئی سوال مت کرنا۔“

میں نے بہ طور احتیاط ڈسپنسر کے کوارٹر میں جھانکا۔ وہ بائیں ہاتھ والی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے

کیس پر پڑی دوربین اُٹھا کر آنکھوں سے لگائی تو مجھے وہ ٹارچ بھی دکھائی دی جو اُس نے پکڑ رکھی تھی۔ کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ فضا میں گونجی۔ کھالا بلی کی طرح منڈیر سے چپک گیا اور مجھے بھی نیچے کی طرف کھینچ لیا۔ میری حالت خاصی دگرگوں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میری رگ رگ میں بے چینی اور خوف بھر گیا ہو۔ حالانکہ میں زندگی میں پہلے بھی کئی مرتبہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ مگر میں اپنی زندگی کے اُس رخ کو ملتان کے کالج ہاسٹل میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میں جیسا نور پور سے گیا تھا، واپسی پر بالکل ویسا ہی تھا۔ آج بھی اگر کھالا میرا ساتھ نہ دیتا تو میں ایسی جرأت کا مظاہرہ نہیں کرسکتا تھا۔

انجن کی آواز قریب آ گئی۔ ہم نے دیکھا کہ بجھی ہیڈ لائٹس والی ہائی لیکس ویگن اسپتال کے گیٹ سے کچھ دوری پر آ کر رُک گئی تھی۔ اُس کے عقبی حصے میں سے تین آدمی نیچے اُترے۔ چاند چونکہ آدھا تھا، فاصلہ بھی زیادہ تھا، اس لیے اُن کی ہیئت کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈسپنسر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کو تین مرتبہ روشن کر کے 'او کے' کا سگنل دیا۔

کھالے نے سرگوشی کی۔ ''شہرے! جب میں کہوں، تم نے دونوں پٹاخوں کو آگ لگا کر پھینک دینا ہے۔ خیال رہے کہ ایک، کسی سرکاری کوارٹر میں جا کر گرے، دوسرا گلی کے پار کسی گھر کے صحن میں۔ او کے؟''

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اُس نے میرے کان میں کہا۔ ''لوگ جاگ جائیں گے، گھروں سے نکل آئیں گے اور حملہ آوروں کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔''

''اور ہم کیا کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''چپ چاپ تماشا دیکھیں گے۔ تم یہ خیال رکھنا کہ ڈسپنسر کے کوارٹر میں گولہ نہ پھینک دینا۔ وہ دشمنوں کا مورچہ ہے۔ سمجھے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہماری نظریں متواتر اسپتال کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ تینوں سائے جالی دار گیٹ تک آئے اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ عمومی طور پر اسپتال کا گیٹ رات کو بند کر دیا جاتا تھا مگر اُس شب کھلا ہوا تھا جو یقیناً ڈسپنسر کا ہی کام تھا۔ کھالے نے ہاتھ بڑھا کر غلیل اُٹھائی اور غلہ ڈال کر کھینچ مارا۔ اُس کا نشانہ واقعی کمال کا تھا۔ بچوں کے کھیلنے والی شیشے کی گولی اُڑتی ہوئی ڈاکٹر کی چھت پر گری۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سوئے ہوئے ڈاکٹر کو ہی لگی ہوگی یا اُس کے بہت قریب گری ہوگی۔ کھالے نے برق کی سی مستعدی سے دو تین غلّے ڈاکٹر کی چھت پر داغ دیے۔

اس وقت تک تینوں نووارد ہمارے سامنے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کی طرف جانے والی اینٹوں کی روش پر پہنچ چکے تھے۔ قریب ہونے پر واضح ہو گیا تھا کہ اُن تینوں میں، بیچ میں چلنے والا سایہ نسوانی تھا۔ تینوں بڑی مستعدی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر کی کوٹھی کے دروازے تک پہنچے۔ بلب کی روشنی میں تینوں کے خدوخال تو دکھائی نہیں دیتے تھے مگر اُن کے حلیے صاف نظر آ رہے تھے۔ عورت نے سبز دوپٹا اور نارنجی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جبکہ دونوں مرد سفید لباس میں تھے۔ دونوں لمبے تڑنگے اور جسیم تھے۔

ڈاکٹر کی چھت پر کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔ ہم دونوں نے اپنی پوری توجہ اُن تینوں کی حرکات پر مرکوز کر دی۔ ہم یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ نوواردوں کے ہمراہ عورت کا کیا کام تھا۔ عورت نے دروازے پر دستک دی۔ اُس کے دونوں ہمراہی دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے اور دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اسپتال کے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھا۔ گاڑی ریورس ہو رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ مکانوں کی اوٹ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

دستک کا جواب نہ پا کر اُس عورت نے دوسری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر بھی کوئی ردِعمل دکھائی نہیں دیا تو اُس نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا اور عورت اردگرد دیکھتے ہوئے اندر گھس گئی۔ میں سانس روکے، آنکھیں پھیلائے دیکھ رہا تھا۔ کھالے نے میرے کان میں کہا۔ ''میں سارے کھیل کو سمجھ گیا ہوں۔ یہ عورت مریضہ بن کر ڈاکٹر کے پاس آئی ہے۔''

میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا۔ کھالے نے پٹاخوں اور ماچس کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے احتیاط سے سرک کر مطلوبہ اشیا اُٹھا کر ہاتھ میں کر لیں۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہوئے ایک شخص نے ڈسپنسر کو ہاتھ لہرا کر کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ ڈسپنسر نے پھر گیٹ پر ٹارچ کی روشنی پھینکی جو جالی دار گیٹ میں سے گزر کر یارن خان کی حویلی کی دیوار پر پڑی۔ یک لخت سوئے ہوئے ماحول میں عجیب نوعیت کی افراتفری پیدا ہو گئی۔ دروازے کے پاس کھڑے ہوئے دونوں شخص گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگے۔ اندر سے عورت کے چیخنے کی آوازیں

بھی ماحول میں ہولناکی پیدا کرنے لگی۔ سردار حیات خان کی حویلی کے سامنے سڑک پر کھڑی ویگن کی ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں، چکراتے ہوئے ایمرجنسی بلب کی نیلی روشنی گھومنے لگی اور ہوٹر کی تیز آواز نے نور پور کے پرسکوت ماحول کو آناً فاناً تہس نہس کر دیا۔

ایسے میں کھالے نے میرے پہلو میں زور سے کہنی ماری۔ میں نے فی الفور دیا سلائی جلائی اور دونوں پٹاخوں کے فیتوں کو آگ لگا کر دونوں اطراف میں یکے بعد دیگرے پھینک دیا۔

اندھیرے میں ہائی لیکس ویگن دکھائی دینے والی گاڑی درحقیقت پولیس وین تھی جو تیز رفتاری سے اسپتال کے مین گیٹ تک آئی۔ ایک اہلکار برق رفتاری سے نیچے اُترا، گیٹ کھولا اور ہنگامی حالت میں اندر داخل ہوتی ویگن کے عقبی بمپر پر بہ مشکل چڑھ پایا۔ جونہی گاڑی روش پر مڑی، میرے پھینکے ہوئے دونوں پٹاخے پھٹ گئے۔ کان پھاڑ دینے والی آواز نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نور پور ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ بتیاں روشن ہو گئیں، گلیوں میں مرد دکھائی دینے لگے جو بھاگم بھاگ اسپتال کی طرف آ رہے تھے۔ گاڑی میں سے سات آٹھ پولیس والے اُترے اور گنیں سنبھالتے ہوئے، آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی میں گھس گئے۔ اسپتال کے کوارٹروں میں خوابیدہ رہائش پذیر جاگ کر باہر نکل آئے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ سمجھ میں آنے والے منظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈسپنسر دوڑ کر پولیس وین کے قریب ہو گیا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس دونوں افراد اور پولیس والوں کو کوٹھی میں گئے دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس دوران اسپتال کے گیٹ پر مجمع سا لگ گیا۔ نور پور کا شاید ہی کوئی مرد ہو جو وہاں موجود نہ ہو۔ مہیب شور بپا تھا، ہر آواز کانوں تک آ رہی تھی مگر اپنا مفہوم واضح نہیں کر پا رہی تھی۔

کھالے نے سرگوشی کی۔ ''اندر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے شہرے!''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کیا ہوا؟''

''یہ تو پتا نہیں کہ کیا ہوا، یہ اندازہ ہے کہ جو ہوا، بہت برا ہوا ہے۔'' کھالے نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر نیچے تو نہیں اُترا۔'' میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''ہاں! مگر اندر ہو کیا رہا ہے؟''

''میرا خیال ہے، ڈاکٹر کو تلاش کیا جا رہا ہے۔'' میں نے آسرا لیا۔

میں نے ناگاہ اسپتال کے مین گیٹ کی طرف دیکھا۔ لمبا تڑنگا بخت خان دکھائی دیا جو ایک سپاہی کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ان گنت افراد اسپتال میں گھس آئے۔ ہر کوئی پریشان تھا کہ نصف رات کو اسپتال میں ایسی کیا قیامت آ گئی کہ قریشی موڑ میں واقع تھانے سے پولیس کو اسلحہ تانے نور پور آنا پڑا تھا۔ بخت خان تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر کی کوٹھی کے سامنے کھڑی پولیس وین کی طرف بڑھا۔

ایسے میں کھالے نے مجھے کہا۔ ''چل بھئی شہرے! ہمارا کام ختم، ہم بھی نیچے اُتر کر تماشا دیکھیں۔''

میں گھبرایا ہوا تھا کیونکہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ہم جس نکڑ سے چھت پر چڑھے تھے، اُسی نکڑ سے گھسٹ کر نیچے اُتر آئے۔ ہمارا جملہ سامان اوپر ہی رہ گیا تھا جس کی سردست ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ہم چار دیواری کے ٹوٹے ہوئے حصے سے باہر نکلے اور چکر کاٹ کر اسپتال کے دروازے پر موجود ہجوم میں شامل ہو گئے۔ کسی نے ہماری آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

کھالے نے تعجب بھری آواز میں یکے بعد دیگرے وہاں موجود کئی لوگوں سے سوال کیا۔ ''یہاں کیا ہوا ہے؟ آپ لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہیں؟''

ظاہر ہے، کسی کے پاس اُس کے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ ہم دونوں گیٹ میں گھس کر اندر جانے لگے تو سپاہی نے ہمیں روک دیا۔ کھالے نے جلدی سے کہا۔ ''ہم بڑے خان کے ساتھ آئے ہیں۔''

اُس نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے پولیس کی نیلی ویگن کے پاس کھڑے بخت خان کے پاس پہنچے۔

وہ ایک وردی پوش سے مخاطب تھا۔ ''آخر کچھ پتا تو چلے کہ آپ نے یہاں کیوں ریڈ کیا ہے؟''

مخاطب کیے جانے والے نے اپنے عقب میں ڈاکٹر شاہ جی کے ادھ کھلے دروازے کی سمت دیکھا اور کہا۔ ''تھانیدار صاحب اندر گئے ہیں۔ ابھی باہر آ جائیں گے تو اُن سے پوچھ لیجیے گا۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں جی!''

بخت خان اندر جانا چاہتا تھا مگر اُس نے روک دیا۔ کہا۔ ''خان جی! تھانیدار صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔''

بخت خان ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''کیا مطلب؟ نور پور میرا

گاؤں ہے، مجھے کہیں بھی جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ پرے ہٹو!''

میرے عقب میں سردار حیات خان کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ''بخت خاناں! کھڑ تھی...... تھانیدار کنوں پچھ گھنسوں، آندا ای ہوسی!''

(بخت خان! ٹھہر جاؤ، تھانیدار سے پوچھ لیں گے، آتا ہی ہوگا)

بخت خان رُکنے والا نہیں تھا۔ اُسے دھکیل کر دروازے میں گھسنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس ایک قوی الجثہ شخص ایک نیم برہنہ عورت کو گھسیٹتا ہوا باہر نکلا۔ مجھے اور کھالے کو یقین تھا کہ نصف گھنٹا پیشتر کوٹھی میں گھسنے والی عورت یہی تھی۔

تھانیدار نے بے رحمی سے اُسے سیڑھیوں پر پٹخا، پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔ ''بتا! تیرا یار، وہ حرامی ڈاکٹر، کہاں چھپا ہے؟ بول! نہیں تو تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔''

وہ سر نیہوڑائے لب بستہ کھڑی تھی۔ وہ جب کوٹھی میں داخل ہوئی تھی تو ہم نے اُسے پورے لباس میں دیکھا تھا، اب وہ محض شلوار پہنے ہوئے تھی، قمیص اور دوپٹا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آن کی آن میں وریام خان یا حیدر خان کا پورا پلان میری سمجھ میں آ گیا۔ نفرت، کراہت اور غصے سے میرے ہونٹ بھنچ گئے اور جی چاہا کہ ابھی یہاں سے نکلوں اور جا کر خان کا منہ توڑ دوں۔ اتنی گری ہوئی حرکت...... میں نے زمین پر تھوک دیا۔

دو چار ٹھڈے پڑے تو وہ عورت چیخ پڑی۔ ''وہ دیوار پھاند کر بھاگ گیا ہے جی!''

اُس کے ایک ہی جملے نے نور پور کے تمام لوگوں پر ماجرا عیاں کر دیا۔ سب لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ایک اہلکار ایک بوتل اور دو ان دھلے شیشے کے گلاس اندر سے اُٹھا لایا۔ ''سر جی! یہ شراب برآمد ہوئی ہے۔ بیڈ روم سے!''

عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے والا وردی پوش استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''واہ! دونوں شراب و شباب کی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔''

عورت کا سر جھکا ہوا تھا۔ جم غفیر میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''اسی لیے تو موئے ڈاکٹر نے شادی نہیں کی۔''

''ہم بھی کہیں، آخر یہ یہاں ٹکا ہوا کیوں ہے، عید شب برات پر بھی اپنے گھر کیوں نہیں جاتا؟''

''اسے گولی مار دینی چاہیے، ہماری دھیاں بھیناں یہاں علاج کروانے آتی ہیں۔ کیا پتا تھا کہ یہ اتنا بے حیا اور بے غیرت ہے۔''

مجمع کا حجم پہلے سے کہیں بڑھ گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی فراست کے مطابق رائے پیش کر رہا تھا مگر ہر کسی کی رائے ڈاکٹر شاہ جی کے خلاف ہی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر کھالے کو دیکھا۔ وہ بھی متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اچانک مجھے بازو سے پکڑا، کھینچتے ہوئے بخت خان کے عقب تک لے گیا اور قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''شہرے! مجھے تو یہ ٹوپی ڈراما لگتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی بڈھا آدمی ہے، دو دیواریں پھاند کر اتنی جلدی نکل نہیں سکتا۔''

بخت خان کے کانوں میں کھالے کی آواز پڑ گئی۔ کھالے کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ چونک کر پلٹا، مجھے اور کھالے کو دیکھ کر بولا۔ ''تم لوگ کیا کہہ رہے ہو؟''

کھالے نے گھبرا کر کہا۔ ''کچھ نہیں خان جی! ہم تو بس ویسے......''

''سیدھی طرح بتاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' بخت خان بھڑک اُٹھا۔

کھالا بولا۔ ''میں شہرے سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی بڈھا آدمی ہے۔ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔''

''مگر یہ عورت اس کوٹھی سے گرفتار کی گئی ہے۔'' کھالے کی منشا کے مطابق بخت خان کے ذہن میں شک کا کیڑا رینگ گیا تھا۔ ایسے میں ہمارے اطراف میں شور بڑھ گیا۔ پولیس والے لوگوں کو پرے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔

سردار حیات خان نے ہم دونوں کو بخت خان سے محو گفتگو دیکھا تو جھٹ سے قریب آ گیا، بولا۔ ''کھالے! اوئے شہرے! جاؤ، امیر نواز کو بلا کر لاؤ۔''

بخت خان اُس کی چالاکی کو تاڑ گیا، بولا۔ ''نہیں خان! میں ان سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ تم کسی اور کو بھیج دو۔''

حیات خان نے مجھے کڑی نگاہوں سے گھورا۔ اُس کی آنکھوں سے عیاں پیغام کو میں نے دانستہ نظر انداز کیا۔ کھالا کہہ رہا تھا۔ ''خان جی! آپ اس عورت سے ڈاکٹر شاہ جی کی عمر، حلیہ اور دیگر ایسی باتیں پوچھیں جن سے واضح ہو جائے کہ اُس نے واقعی شاہ جی کو دیکھ رکھا ہے۔''

بخت خان نے قدم بڑھائے۔ کھالے نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور ہولے ہولے سے بخت خان کے عقب میں چلا گیا۔ بخت خان اپنی رعب دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''تھانیدار صاحب! ایک منٹ۔ اس عورت کو ویگن میں بٹھانے سے پہلے مجھے کچھ پوچھنے دیں۔''

''آپ نے کیا پوچھنا ہے خان جی؟'' تھانیدار نے چونک کر کہا۔

''آپ کے سامنے ہی پوچھوں گا۔ اے بی بی! بول، تو نے شاہ جی کو دیکھا ہے؟''

وہ خاموش رہی۔

بخت خان نے مزید سختی سے پوچھا۔ وہ سر اُٹھا کر بولی۔ ''یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے جی؟''

''پوچھنے والی ہے تو پوچھ رہا ہوں۔ بولو؟''

مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ بخت خان کو باز رکھنا نور پور میں کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

حیات خان نے کچھ کہنا چاہا تو بخت خان نے غصہ بھری نظر سے دیکھا، کہا۔ ''خان! کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤ، میں ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتا ہوں۔''

عورت گڑبڑا گئی۔ اُس نے شاہ جی کو نہیں دیکھا تھا۔ بخت خان نے پوچھا۔ ''بتا، ڈاکٹر شاہ کی ڈاڑھی کتنی لمبی ہے؟''

''وہ...... وہ جی اتنی......'' عورت ہکلا گئی۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بتلایا تھا کہ ڈاڑھی بالشت بھر لمبی تھی۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ بخت خان نے اوپر تلے دو چار سوال کیے۔ وہ کسی ایک بھی سوال کا درست جواب نہیں دے پائی۔

بخت خان دہاڑا۔ ''حرامزادی! یہ بتا، ڈاکٹر شاہ کی ایف ایکس کار کس رنگ کی ہے جس میں وہ تمہیں گزشتہ شام بٹھا کر یہاں لایا تھا؟''

''س...... سفید......'' وہ بری طرح نروس ہو گئی تھی۔

''اُس نے پینٹ کس رنگ کی پہن رکھی تھی؟''

''وہ...... وہ جی...... ک...... کالا سا رنگ تھا شاید!''

بخت خان آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے پوری قوت سے اُس کے منہ پر طمانچہ جڑا، غصیلی نگاہ تھانیدار پر ڈالی، بولا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں انسپکٹر صاحب؟''

''کیا مطلب؟'' وہ بخت خان کا سوال سمجھ نہیں پایا تھا۔

''یہ حرافہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی کی نہ تو بالشت بھر ڈاڑھی ہے، نہ وہ لمبا تڑنگا ہے، نہ وہ پینٹ شرٹ پہنتا ہے اور نہ ہی اُس کے پاس ایف ایکس کار ہے، وہ بھی سفید رنگ کی۔ اُس کے پاس تو ایک پرانی سی موٹر سائیکل ہے، پھٹ پھٹی...... وہ اس قماش کا آدمی ہی نہیں ہے۔ آپ سے تو میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے اتنا بڑا پلان بناتے ہوئے بنیادی جزئیات پر توجہ کیوں نہیں دی؟'' بخت خان کا لہجہ بڑا اکڑا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خان صاحب؟ میں نے کون سا پلان بنایا ہے جو آپ مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔'' تھانیدار کے لہجے میں از حد درشتی تھی۔

''یہ عورت کون ہے؟'' بخت خان نے براہ راست اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''میں اسے نہیں جانتا۔''

''یہ کس گاڑی پر سوار ہو کے نور پور آئی تھی؟''

''میں نہیں جانتا، میں تو اپنے ڈالے پر آیا ہوں۔ اس کی تفتیش کروں گا تو بول پڑے گی۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ چند لوگ میرے ساتھ تھانے آئیں، بیان لکھوانے ہیں۔'' تھانیدار نے بخت خان سے جان چھڑانے کی غرض سے نیم برہنہ عورت کو سرکاری ڈالے میں دھکیلتے ہوئے کہا۔

بخت خان نے اُس کی کلائی تھام لی۔ ''ناں تھانیدار صاحب! آپ تب تک یہاں سے نہیں جا سکتے، جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ڈاکٹر شاہ جی کے خلاف کس نے اتنی بے ہودہ پلاننگ کی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو کس نے رنگ رلیاں منانے والے جوڑے کے بارے میں مطلع کیا تھا؟''

تھانیدار ایک ذرا ٹھٹکا، چور نظروں سے سردار حیات خان کو دیکھا، بولا۔ ''ہمیں مخبر نے اطلاع دی تھی۔''

''مخبر کون ہے؟''

''یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔''

سردار حیات خان، اپنے عم زاد کو بازو سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اُسے کچھ سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اُس پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ تھانیدار، علاقے کا ان داتا تھا، جواب دہ ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ گفتگو اس مرحلے پر پہنچ گئی کہ اُس کے لہجے میں تندی شامل ہو گئی۔

تب بخت خان نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں بچہ نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں، نور پور میں کون کیا کر رہا ہے۔ مجھے کل شام میں ہی ڈاکٹر منور علی شاہ نے بتا دیا تھا کہ اُس پر شدید نوعیت کا حملہ ہونے والا ہے۔ تبھی میں نے سلیم شہزاد صاحب کو اپنے ہاں مدعو کر لیا تھا۔ اب بھی وہ میرے گھر میں محو استراحت ہیں۔ اوئے چل اوئے بشیریا! مہمان خانے میں سوئے ہوئے مہمان کو اُٹھا لا، دیکھتا ہوں، اس ڈرامے کا ڈائریکٹر اور رائٹر کون ہے؟''

تھانیدار ٹھٹک کر رُک گیا۔ ہراساں نظروں سے بخت خان کو دیکھنے لگا۔ چند ثانیوں میں ہی اُس نے محسوس کر لیا کہ بگڑا ہوا خان جھوٹ نہیں بول رہا، سچ کہہ رہا ہے اور جو دعویٰ

کررہا ہے، اُسے پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔
گڑبڑا کر بولا۔ ''کون سلیم شہزادہ صاحب؟''
اُس کے سراسیمگی آمیز انداز سے ہی عیاں تھا کہ وہ موصوف کو بہ خوبی جانتا تھا۔ بخت خان بہ دستور تن کر کھڑا رہا۔ اُس نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔
تھانیدار پھر بولا۔ ''کیا اپنے ایس پی صاحب کی بات کررہے ہیں آپ؟''
''ہوں! ابھی دیکھ ہی لو گے، کون سلیم شہزادا!'' بخت خان کی آواز زخمی سانپ کی پھنکار لیے ہوئے تھی۔
میں نے جھٹ سے سردار حیات خان کی طرف دیکھا۔ خنکی کے باوجود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پولیس والوں کی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ وہ اپنے ہی دام میں بری طرح پھنس چکے تھے۔ تھانیدار نے سب کو ویگن میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود برق رفتاری سے اگلی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی ڈالا اسٹارٹ کر دیا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ راہ فرار اختیار کررہا ہے۔
بخت خان بپھر گیا۔ اُس نے بہ آواز بلند کہا۔ ''نور پور والو! ان دھوکے بازوں کو گھیرے میں لے لو، یہ بھاگنے نہ پائیں۔ ایس پی صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔''
دیہاتیوں کے لیے خان کی شہ کافی تھی۔ اُنہوں نے آن واحد میں ڈالے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کھالے نے جھٹ سے دو اینٹیں ڈھونڈ نکالیں جنہیں ڈالے کے ٹائروں کے پیچھے خاص تکنیک کے ساتھ لگا دیا۔ ڈالہ آگے جا نہیں سکتا تھا کیونکہ اگلا بمپر دیوار سے بہ مشکل بالشت بھر کی دوری پر تھا۔
شور بپا تھا، کانوں پڑی آواز سنائی دیتی تھی، سجھائی نہیں دیتی تھی۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے، کے مصداق نور پور کے باشندوں کا قبلہ بدل گیا۔ شاہ جی کو بے حیا قرار دینے اور کوسنے والے اب پولیس کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر شاہ جی کو 'ولی' قرار دے رہے تھے۔ اُنہیں ہر وہ بھلائی یاد آگئی تھی جو شاہ جی نے کسی نہ کسی موقعے پر اُن سے روا رکھی تھی۔ میرے کانوں میں مختلف آوازیں ٹکرانے لگیں۔
''میں بھی کہوں، اللہ کا نیک بندہ، ایسا کام کر ہی نہیں سکتا۔''
''ڈاکٹر صاحب اور شراب؟ ناممکن۔''
''پنج وقتا نمازی زنا کر ہی نہیں سکتا۔''
''اگر اتنا ہی بھوکا ہوتا تو کب کی شادی کرچکا ہوتا۔''
انسپکٹر کی حالت دیدنی تھی۔ ڈالے سے اُتر آیا۔ لوگوں کو ہاتھ سے دھکیلتا ہوا بخت خان کے پاس آیا، رازدارانہ انداز میں کچھ کہنے لگا۔ بخت خان کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''مجھے پروا نہیں۔''
سردار حیات خان بھی بخت خان سے سر جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ تینوں کسی اختلاف کا شکار تھے۔ بخت خان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اُس کے چہرے کے تاثرات سے بہ آسانی عیاں ہورہا تھا کہ وہ دونوں سے متفق نہیں تھا۔ ایسے میں بخت خان کا نوکر، بشیر علی عرف بشیرا، بھاگتا ہوا تینوں کے قریب پہنچا، عادتاً بلند آواز میں بولا۔ ''خان جی! وہ آپ کو اور پولیس والوں کو وہیں بلارہے ہیں۔''
بخت خان نے تھانیدار سے کہا۔ ''ڈالہ یہیں کھڑا رہے، آپ میرے ساتھ میری حویلی تک چلیں۔ ملزمہ اور اپنے اہلکاروں کو بھی ساتھ لے لیں۔''
یک بارگی، انسپکٹر کا رنگ فق ہوگیا۔ کبھی اپنے ماتحت عملے پر نگاہ ڈالتا تو کبھی بخت خان کو مدد طلب نظروں سے دیکھتا۔ اونٹ پہاڑ تلے آنے سے گھبرا رہا تھا۔ بخت خان نے اُس پر غصیلی نگاہ ڈالی اور گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔
سردار حیات خان کی آواز گونجی۔ ''سوترا! چنگی نویں کریندا کھڑا!''
(عم زاد! تم اچھا نہیں کررہے)
بخت خان نے مڑ کر دیکھا نہ کوئی جواب دیا۔ سبھی اہل کاروں کو مجبوراً اُس کی تقلید کرنا پڑی۔ میں نے کھالے کو دیکھا۔ کم روشنی کے باوصف اُس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر خوشی رقصاں دیکھی۔ چند لمحوں کے بعد سبھی لوگ جلوس کی شکل میں اسپتال کے باہر سڑک پر تھے اور اپنے اپنے انداز سے اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے بخت خان کی حویلی کی طرف عازم سفر تھے۔
میں اور کھالا سب سے پیچھے رہ گئے۔ کھالے نے کہا۔ ''مزہ آگیا یار! سردار بخت خان نے تو دلیری کی حد کردی۔ وریام خان اور حیات خان اُسے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آج اُس نے سب کو نتھ ڈال کر ثابت کردیا ہے کہ وہ ان سے بڑا خان ہے۔''
میں نے کہا۔ ''اپنے ڈاکٹر شاہ جی کا بخت خان سے کیا تعلق ہے؟ میں نے تو آج تک دونوں کو کہیں ملتے نہیں دیکھا۔''
''بس دیکھتے جاؤ، کیا ہورہا ہے، وقت آنے پر سب پتا چل جائے گا۔'' کھالے نے...... بے پروائی سے کہا۔ ''لگتا ہے، تھانیدار کی وردی اُتر جائے گی۔''
''اللہ کرے!'' میرے دل سے دعا نکلی۔
جب جلوس کے پیش رو بخت خان کی حویلی کے گیٹ پر

پہنچے، ہم حیات خان کی حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

کھالے نے کہا۔ ''یار! آگے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں کسی نے حویلی میں داخل تو ہونے نہیں دینا، پھر خوا مخواہ ٹانگیں کیوں مارتے رہیں۔ چلو یار! اپنی 'لال پری' کے بونٹ پر بیٹھ کر گپ مارتے ہیں۔'' وہ اپنی ویگن کو لال پری بھی کہہ لیا کرتا تھا۔

میں سمجھ گیا۔ اُسے اسما کی یاد ستانے لگی تھی۔ وہ جب بھی 'گپ مارنے' کی بات کرتا، مجھے باور ہو جاتا تھا کہ اُس کی زبانِ عشق پر کھجلی ہونے لگی ہے۔ بہت عرصے تک شموں اُس کی گپوں کا طرہ تھی، پھر اسما کو یہ سعادت نصیب ہو گئی تھی۔

کھالے کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ خان کی حویلی کے باہر کچھ دیر تک لوگوں کی بھیڑ چھائی رہی، پھر ہولے ہولے چھٹ گئی۔ مہمان خانے میں داخلے کی اجازت کسی کو نہ ملی تھی۔ نصف گھنٹے میں نور پور، جو ہنگامی حالات کے سبب ہڑبڑا کر جاگ پڑا تھا، پُرسکون ہو گیا۔ فصلوں پر اوس پڑنے لگی تھی، ہنگامہ خیزی پر بھی اوس پڑ گئی۔ میں اسما کا تذکرہ بہ زبانِ عشق سن رہا تھا مگر سوچ ڈاکٹر شاہ جی کے بارے میں رہا تھا۔ اچانک، غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ ''یار کھالے! ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھو، اتنے شور و غوغا کے باوجود کیسے دم سادھے چھت پر لیٹا رہا۔ اُس نے محاذ کو سامنے آئے بغیر فتح کر لیا۔''

اُس نے بھر کر زوردار دھپ میری کمر پر رسید کی۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل زمین پر آن گرا۔ چکنی مٹی کی دھول نے میرا منہ سر ایک کر دیا۔ بہ دقت تمام اُٹھا، قمیص کے پلو سے منہ صاف کیا، چند گالیوں سے کھالے کو سرفراز کیا اور پھدک کر بونٹ پر بیٹھ گیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

وہ تپ کر بولا۔ ''اتنی خوب صورت گفتگو کے بیچ ڈاکٹر کہاں سے آن ٹپکا۔ میں اپنی جانِ جاناں کے تذکرے میں ٹانگ اڑانے والے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہوں۔''

''اوئے کھالے! تم نے یہ 'جانِ جاناں' کہاں سے سن لیا؟''

وہ کھسیا کر بولا۔ ''ایک فلم کا ڈائیلاگ سنا تھا، یاد رہ گیا۔ اچھا! اب بک بک نہ کرو، غور سے سنو۔''

میں طوعاً و کرہاً خاموش ہو گیا۔ وہ پھر اپنی رو میں بہکنے لگا۔ اب گاہے بہ گاہے جائزہ لینے لگا تھا کہ میں اُس کی بات توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں یا پہلے کی طرح ڈاکٹر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کافی دیر گزر گئی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ بند کمرے میں ہونے والے مذاکرات طوالت پکڑ چکے ہیں مگر اس ڈر سے خاموش رہا کہ اُس کا ہاتھ پھر نہ چل پڑے۔ میرا جسم لوہار زادے کی آہنی ضرب کا متحمل نہیں تھا۔ جب نور پور کے جنوبی کونے میں واقع مسجد کے اسپیکر سے مؤذن کی صدا اُبھری تو انسپکٹر، اُس کے ماتحت عملے اور سردار حیات خان کی صورتیں دکھائی دیں۔ حیات خان اپنی حویلی میں گھس گیا جبکہ پولیس والے اُس بازاری عورت کے ہمراہ اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں نے تھانیدار کے ہم قدم چلتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھ لیا تھا۔ کھالے کو متوجہ کیا تو اُس کا ردِعمل بھی میرے جیسا ہی تھا۔ کھالے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ ڈاکٹر کہاں سے ٹپک پڑا؟''

''یار! یہ بندہ ہے یا چھلاوہ!''

''تم نے اسے چھت سے اُترتے دیکھا تھا؟'' کھالے نے تشکیک آمیز نظروں سے مجھے گھورا۔

''کمال کرتے ہو تم بھی۔ ہم دونوں اکٹھے ہی تو تھے۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

تھانیدار اور ڈاکٹر کے نقشِ قدم پر چلتی ہوئی جھوٹی عورت کے بدن پر ایک گھریلو قسم کی سفید چادر لپٹی ہوئی تھی جس نے اُس کے بالائی بدن کی برہنگی کو چھپا لیا تھا۔ چند منٹوں کے بعد پولیس کا ڈالہ تیز رفتاری کے ساتھ نور پور سے نکل گیا۔ نصف شب کو شروع ہونے والا اپنی نوعیت کا عجیب ہنگامہ علی الصباح کے ملگجے اندھیرے میں سرد ہو گیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ کھالے نے طویل سانس سینے میں اُتاری، بولا۔ ''بند کمرے میں چاند چڑھا دیا گیا کاکا بلو!''

''کیا مطلب؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''یہی کہ خان زادوں نے آپس میں مفاہمت کر لی۔ ڈاکٹر شاہ جی کا معاملہ گول سمجھو۔'' کھالے نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''کیا ڈاکٹر خاموش ہو جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''تو کیا وہ مرغے کی طرح ٹوکرے پر چڑھ کر بانگیں دے گا؟'' کھالے نے منہ بنا کر کہا۔ ''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہمیں اور ڈسپنسر کو ڈاج دینے کے لیے ڈاکٹر شاہ جی چھت پر چڑھا اور پھر بڑی صفائی سے اُتر بھی گیا۔ وہ بخت خان کے مہمان خانے میں ایس پی کے ساتھ موجود تھا۔ بخت خان بڑا گھنا نکلا شہرے!''

''پھر بھی ڈاکٹر شاہ جی کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔''

میں نے 'زیادتی' لفظ پر بالخصوص زور دے کر کہا۔

''زیادتی ہوئی نہیں، کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے، اب ڈاکٹر شاہ جی پولیس والوں پر یا سرداروں پر کیس کرنے سے تو رہا۔ اُس کی جان چھوٹ گئی، یہی بڑی بات ہے۔''

کھالا محفل برخاست کرنے کا اعلان کرتے ہوئے بونٹ سے اُتر گیا۔ میں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس جانا چاہتا تھا مگر کھالے نے سختی سے منع کر دیا۔ اُس نے سمجھایا کہ مجھے اب جا کر سو جانا چاہیے کیونکہ اگلے دن مجھے حیات خان اور وریام خان کی پیشی بھگتنا تھی۔ میں حیرت سے سوال کناں ہوا۔ ''کیا وہ مجھے بلائیں گے؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری اچھی خاصی درگت بنائیں گے۔''

''پر میں نے کیا، کیا ہے؟''

''تم نے اور تمہارے یار خالد محمود عرف کھالے اُستاد نے بخت خان کے کان میں کانا پھوسی کی تھی۔ یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔'' کھالے نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر تمہیں بھی بلایا جائے گا۔ ہے ناں؟''

''ہاں مگر میں منت سماجت کر کے اپنی جان چھڑا لوں گا۔ میرا کیا ہے، جھوٹی سچی قسمیں اُٹھا سکتا ہوں۔ تم انقلابی فلاسفر بن کر اکڑ جاتے ہو، خان جو ہوئے۔ کیا ہوا جو گھر میں کھانے کو دانہ پھکا نہیں ہے۔ خاندانی اکڑ دکھاتے ہو، کبھی مارے جاتے ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے، مجھے ایک زوردار انعامی دھپ رسید کر کے اپنے گھر کی چار دیواری پھلانگ گیا۔ میں نے تازہ صبح کی مست ہوا پھیپھڑوں میں اُتاری اور تھکن زدہ انداز میں اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ مجھے بھی کھالے کی طرح گھر کی دیوار پھلانگنا تھی کیونکہ باہر والا دروازہ یقینی طور پر بند ملنا تھا۔ دستک دینے پر جیسیوں سوالات کا سامنا کرنا تھا جن سے بچنے کی ایک یہی صورت تھی کہ چوروں کی طرح گھر میں گھس کر اپنے بستر تک رسائی حاصل کر لی جائے۔

بستر پر گرتے ہی نیند نے آن دبوچا۔ جاگا تو پورا جسم دُکھ رہا تھا۔ فوری طور پر مجھے احساس ہو گیا کہ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ سبھی معمول کے کام کاج کو نمٹانے کے لیے کھیتوں کا رُخ کر چکے تھے۔ دھوپ سر پر آ گئی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا، تین ٹانگوں والے چوبی میز پر دھری ہوئی چنگیر اُٹھا کر اپنے سامنے چارپائی پر رکھی اور ناشتا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ پروین میرے لیے ناشتے کا خصوصی اہتمام کرتی تھی۔ دیسی گھی میں تلے دو بھاری بھرکم پراٹھے، مکھن سے بھری ہوئی کٹوری، شکر کا پیالہ، توے پر تڑکا ہوا نمک مرچ والا دیسی مرغی کا انڈا اور پکی لسی کا لبالب جگ...... میں عمومی طور پر ناشتے کے جملہ لوازمات چٹ کر جاتا تھا۔ بسا اوقات دوپہر کا کھانا نہیں ملتا تھا، مگر مجھے اُس کی احتیاج نہیں رہتی تھی۔

میں نے کاغذ قلم سنبھالا۔ کھالے کے احسان کا بدلہ چکانے کی فوری ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسما کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔ میرا حاصل مطالعہ خوب تھا۔ عشقیہ خط لکھتے ہوئے میں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور اپنی تمام تر علمیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا مضمون باندھا، جذبات کی ایسی منظر کشی کی کہ جب اپنے لکھے ہوئے کو پڑھا تو بے ساختہ اش اش کر اُٹھا۔ چونکہ داد دینے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے 'واہ بھئی شہرے خان! جیو ہزار سال' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنا کندھا تھپتھپایا اور خط کو چوم لیا۔ رومانوی خطوط نویسی میں برسوں کا تجربہ بھی تحریر میں شامل تھا۔ غزالہ کو میں نے ان گنت خط لکھے تھے۔ وہ بھی کسی نہ کسی رسالے سے 'نقل مار کر' مجھے جواب سے نوازتی تھی۔ یوں یہ سلسلہ ملاقاتوں کے متوازی چلتا رہتا تھا۔

غزالہ عموماً اسکول کی کھلی لکیروں والی کاپی کے دھاگے والے دو ورق پھاڑ کر نیلے مارکر کے ساتھ لکھتی تھی۔ مارکر کی نب خاصی موٹی تھی جس کی وجہ سے لفظوں کی جسامت غیر معمولی بڑی ہو جاتی تھی۔ چاروں صفحوں پر محبت کا متن پھیلا ہوتا تھا۔ دو صفحات بے محل مگر رومانی اشعار کے لیے مختص ہوا کرتے تھے۔ اگر میں غزالہ کے اُن تمام خطوں کو اکٹھا کرتا، ان میں دیے گئے مفہوم کا بہ نظرِ احتیاط موازنہ کرتا تو دو تین ہی پیغام سامنے آتے تھے کہ 'میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی' یا 'جب تک تمہیں دیکھ نہ لوں دل کو چین نہیں آتا' اور 'اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں مر جاؤں گی'...... ہاں! البتہ ہر خط میں مرنے کا طریقہ مختلف ہوتا تھا۔ کبھی تو وہ ریل گاڑی کے نیچے آنے کی بات کرتی، کبھی کنویں میں چھلانگ لگانے کا عزم ظاہر کرتی تو کبھی گلے میں رسی باندھ کر شہتیر کے ساتھ لٹکنے کا عندیہ دیتی۔

اسی طرح اگر وہ میرے خطوں کا احتساب کرتی تو ایک ہی عزم شکلیں بدلتا ہوا طشت از بام ہونے لگتا کہ میں اُس کے بغیر ادھورا ہوں، وہ نہ ملی تو کسی کے ساتھ بھی شادی نہیں کروں گا، وغیرہ وغیرہ۔ نور پور میں موجود وہ تمام عاشق، جن سے میں روشناس تھا، ایسے ہی اعادوں پر اپنے عشق کی آبیاری کیا کرتے تھے۔

صحن میں آہٹ سنائی دی۔ میرے بدن میں برقی رو

دوڑ گئی۔ اس وقت سوائے غزالہ کے گھر میں کسی کی آمد متوقع نہیں تھی۔ میں نے فی الفور اسما کو لکھا جانے والا خط چھپالیا۔ خالی ورق پر سرنامہ لکھا۔ ’جان سے پیاری غزالہ!‘...... اور قلم دانتوں میں دبا لیا۔ آنکھیں کھلے دروازے پر جم گئیں۔ غزالہ نے جھانکا۔ بدلی سے چاند نکلا، میں نے دیکھا اور مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ وہ جھوم کر سامنے آ گئی، دہلیز کو تھام کر کھڑی ہوگئی، بولی۔ ’’کیا لکھ رہے ہو؟‘‘

’’میں خط لکھنے لگا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کس کو؟‘‘

’’تمہیں کیوں بتاؤں؟‘‘

وہ لہرا کر اندر داخل ہوئی۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر پڑھنے لگی، شرم سے لال ہوگئی۔ اکیلے بیٹھ کر پڑھنے کی عادی تھی، روبرو پڑھنا خاصا مشکل تھا۔ لجائی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ’’تم نے میرا نام لکھا، میں خود چل کر آ گئی، ہے ناں مزے کی بات!‘‘

’’کبھی قسمت کے پنّے پر تمہارا نام لکھ کر دیکھوں گا، ہمیشہ کے لیے آتی ہو یا نہیں؟‘‘ میں نے چھیڑا۔

اُس کے گال تمتما اُٹھے۔

میں نے کاغذ اور قلم سرہانے رکھ دیے۔ اُس کی کلائی تھام لی۔ کانچ کی دو تین چوڑیاں ٹوٹ گئیں، وہ بولی۔ ’’ہائے اللہ! اتنی پیاری چوڑیاں تھیں، توڑ دیں تم نے۔‘‘

’’میں نے ہی لا کر دی تھیں، اور لے آؤں گا۔‘‘ میں نے ایک اور ونگ بھی توڑ دی۔ اُس نے کہا۔ ’’چھوڑو مجھے! میں تمہیں ’پیار نکال کر‘ دکھاتی ہوں۔‘‘

میں نے وینی چھوڑ دی۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں میں سے ایک نسبتاً بڑا ٹکڑا اُٹھایا، چوم کر آنکھوں سے لگایا اور آنکھیں موند کر زیرِ لب کچھ پڑھا۔ پھر چوڑی کو دونوں انگوٹھوں کی داب سے توڑ دیا۔ کئی ننھے ننھے ٹکڑے اُس کی جھولی میں جا گرے۔ اُس نے اُن ٹکڑوں کو اکٹھا کیا، بولی۔ ’’دیکھ شہرے! میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں!‘‘

میں اُس کی معصوم سی شکل اور تاثرات کے بے ساختہ اُتار چڑھاؤ کو وارفتگی سے دیکھے جا رہا تھا، پوچھا۔ ’’تم نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا بھی ہے، بتاؤ، کیا تھا؟‘‘

اُس نے منہ پھیر لیا۔ میں بہ ضد ہوا مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے اُس کے چہرے کا رُخ اپنی جانب موڑ کر اپنا سوال دہرایا۔ وہ آنکھیں جھکا کر، شرمیلے سے انداز میں گنگنانے کے سے انداز میں بولی۔ ’’اج کج سوہنی ونگ ڈس سچ سچ...... میڈا میڈے ماہیے نال پیار کتنا!‘‘

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

وہ جھینپ کر بولی۔ ’’اب میں تمہارا پیار نکال کر دیکھتی ہوں۔‘‘

اُس نے اپنے عمل کو دُہرایا۔ اتفاق سے کوئی کنکر نہیں جھڑا۔ اُس نے اپنی انگلی اور انگوٹھے کی اگلی پوروں کو دیکھا۔ ٹکڑا دکھائی نہیں دیا۔ منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ ’’تم تو مجھ سے پیار کرتے ہی نہیں ہو۔ دیکھو، چوڑیاں تو جھوٹ نہیں بولتیں ناں!‘‘

چوڑیاں واقعتاً جھوٹ نہیں بولتیں۔ جس کلائی سے بندھی ہوتی ہیں، کرچی کرچی ہو کر بھی اُسی کی خیر مانگتی ہیں۔ نور پور کی لڑکیوں کا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ جہاں بھی دو چار اکٹھی ہوئیں، چوڑیاں توڑ کر اپنے پسندیدہ لوگوں کے جذبات کی دُنیا میں جھانکنے لگتیں۔ چوڑی کے ننھے ٹکڑوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو دل خوش ہو جاتا، مسکرا کر سکھیوں کو بتانے لگتیں۔ چوڑی نے ٹھینگا دکھایا تو دل مسوس کر رہ گیا اور آنکھیں جھک گئیں۔ میرے پاس بیٹھی غزالہ کے چہرے پر بھی قوسِ قزح رقصاں تھی۔ کبھی تو مسکرا دیتی، کبھی افسردہ ہو جاتی۔

میں نے آہستگی سے اُس کا دوپٹا سر سے سرکایا، سیدھی مانگ والی زلفوں کو چھیڑا اور کہا۔ ’’غزالہ! تمہیں میری محبت پر بھروسا نہیں ہے جو اپنی چوڑیوں سے پوچھنے بیٹھ جاتی ہو۔‘‘

اُس نے شرما کر مجھے دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے اُس کے اُبھرے گالوں والے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی، پھر چونک کر کھڑی ہوگئی۔ بے ساختگی سے گویا ہوئی۔ ’’تم مجھے ہاتھ نہ لگایا کرو۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’کیوں؟‘‘

’’مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔‘‘ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے اُس کے چہرے کو یک لخت پکڑ کر دیکھا تو بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ میری محبت پاش نظروں کا سامنا نہ کر پائی اور پلٹ کر دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ اُس کے پیچھے جانا فضول تھا کیونکہ میرے کمرے سے نکلنے تک وہ یقیناً حویلی کا دروازہ عبور کر چکی ہوتی۔

میرے اندیشے بے محل ثابت ہوئے۔ مجھے وریام خان یا سردار حیات خان نے شام تک طلب نہیں کیا تھا۔ البتہ شام ڈھلتے ہی، جب میں کھانا کھا کر ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہا تھا، بخت خان کا نوکر بشیرا دستک کناں ہوگیا۔ چاچے چراغ نے اُس سے آمد کی غرض و غایت دریافت کی، پھر مجھے آواز دے کر دروازے پر بلا لیا۔ میں بشیرے کے ساتھ سردار بخت خان کے ڈیرے پر گیا۔ بخت

خان کو مہمان خانے کے آگے بنے ہوئے چھوٹے سے لان میں بے چینی سے ٹہلتے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں بولا، ’’نوجوان! کیا حال ہے تمہارا؟‘‘

میں نے ادب سے سلام کیا، خیریت بتا کر خیریت دریافت کی۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ لان میں بچھی لوہے کی بنی ہوئی سرخ رنگ کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’میرا خیال ہے، یہاں، کھلی فضا میں بیٹھنا مناسب ہوگا۔ چائے پانی؟‘‘

میں نے انکار کیا۔ ہم دونوں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اُس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’شہرے پتر! مجھے خوشی ہے کہ تم پڑھ لکھ گئے ہو اور آگے بھی پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے یہ جان کر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے بھائی وریام خان کے سامنے دلیری کے ساتھ حق سچی بات کر دی۔ زندگی کا یہ قرینہ علم ہی انسان کو سونپتا ہے۔ جھوٹے کو جھوٹا اور سچے کو سچا کہنے کا حوصلہ علم دیتا ہے اور تم نے اس کی لاج رکھی۔ ڈاکٹر شاہ بہت اچھا انسان ہے۔ مخلص اور ایماندار ہے۔ تم نے اور تمہارے دوست خالد نے اُسے خبردار کیا، اُسے خطرے کی پیشگی اطلاع دی، یہ بہت بڑا کام تھا۔‘‘

میں پوری توجہ سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے طلب کرنے کی وجہ کیا رہی ہوگی۔

وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا۔ ’’حیات خان اور بھائی خان سے میری اسی وجہ سے بنتی نہیں ہے کہ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں، لوگوں کو آپس میں لڑاتے ہیں اور پھر پرہیاں (پنچایت) میں سرپنچ بنے بیٹھ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ مجھے شروع سے ایسی نمبرداری یا ڈیرے داری اچھی نہیں لگتی تھی۔ لوگوں کو شاید ایسے ہی وڈیروں کی ضرورت تھی، اس لیے مجھے بدتمیز اور بداخلاق جان کر مجھ سے دور ہٹتے چلے گئے۔ میں نے بھی اُن کے اس قلبی فیصلے کو قبول کر لیا۔‘‘

’’جی!‘‘ میں نے ہولے سے کہا۔

’’شہرے پتر! مجھے خوشی ہوئی کہ نور پور میں تمہارے جیسے نوجوان سر اُبھارنے لگے ہیں۔ اس وڈیرہ شاہی کے خلاف تمہارے ہم خیال کون کون لڑکے ہیں؟‘‘

میرے دل میں شبہ جاگزیں ہوا۔ کہیں وہ اس بہانے مجھ سے میرے گروپ کے بارے میں معلومات لینے کا طالب نہ ہو، میں نے جلدی سے کہا۔ ’’میرے ساتھ کوئی بھی نہیں۔ کھالا میرا یار ہے۔ میرے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اور بس!‘‘

اُس کے لبوں پر میں نے پہلی مسکراہٹ ابھرتی دیکھی، بولا۔ ’’ڈرو مت! میں تمہارے گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔‘‘

میں نے فوراً موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ’’خان جی! ڈاکٹر شاہ جی کس وقت آپ کے پاس آئے تھے؟‘‘

’’کوئی دس کا عمل ہوگا۔‘‘ وہ بولا۔

’’پھر آپ نے اُسے یہیں روک لیا؟‘‘

’’ہاں! اُس کی ضد پر میں نے سلیم شہزاد کو بھی بلا لیا تھا۔‘‘ اُس نے ازخود بتایا۔ ’’سلیم شہزاد کا بیٹا شاہد سلیم میرے بیٹے ظفریاب خان کے ساتھ لفٹین بن رہا ہے (سیکنڈ لیفٹیننٹ کا کورس کر رہا ہے) اسی تعلق کے باعث ہمارے دونوں گھرانوں کا، کافی عرصے سے، ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا معمول بنا ہوا ہے۔‘‘

میں نے ہمت کی، پوچھا۔ ’’خان جی! پھر کیا فیصلہ ہوا تھا؟‘‘

میرا اشارہ بند کمرے میں چڑھائے جانے والے چاند کی طرف تھا۔

’’حیات خان، انسپکٹر اور اُس کے عملے نے ڈاکٹر شاہ سے معافی مانگی اور اپنی زیادتی کا اعتراف کیا۔ آئندہ اُس کے خلاف کوئی حرکت نہ کرنے کا تحریری وعدہ کیا اور بس......‘‘ اُس نے غیر ملکی برانڈ کی سفید فلٹر والی سگریٹ نکالی، گیس والے سنہرے لائٹر سے شعلہ دکھایا اور بڑی نفاست سے کش لینے لگا۔ میں اُس کی شخصی جاذبیت سے پہلے بھی مرعوب تھا، اب اور زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔

اُس نے دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ’’شہرے! مجھے ڈاکٹر شاہ نے بتایا تھا کہ تم اُس سے بہت محبت کرتے ہو۔ اُس نے تو یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم اور تمہارا ساتھی، خالد عرف کھالا، اُس کی پہرے داری کے نقطۂ نظر سے اسپتال کی چھت پر چڑھے ہوئے تھے۔ ویری نائس ینگ مین!‘‘

اُس کی کھلم کھلا گفتگو سے میرے دل و دماغ پر مسلط خوف بہ تدریج کم ہوگیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہمارا گروپ صرف تین لڑکوں پر مشتمل ہے۔ امیر نواز، خالد اور میں۔ ہم تینوں ہی ڈاکٹر شاہ کے ایک طرح کے مرید تھے۔ وہ ہماری گاہے بہ گاہے برین واشنگ کرتا رہتا تھا۔ وہ امیر نواز کے بارے میں جان کر سخت متعجب ہوا۔

پھر اچانک اُس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ ’’شہرے پتر! یہ بتاؤ، تمہیں کس نے پیشگی خبردار کیا تھا کہ ڈاکٹر شاہ پر گزشتہ رات حملہ ہونے والا ہے؟‘‘

اُس نے اتنی بے ساختگی سے مجھ پر سوال داغا تھا کہ بعید نہ تھا کہ میں سچ اُگل دیتا۔ میں گڑبڑا گیا مگر فوراً سنبھل کر بولا۔ ''خان جی! یہ سوال مت کریں۔ مجبور کریں گے تو میں جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑا لوں گا۔''

''یعنی تم بتانا نہیں چاہتے ہو؟'' اُس نے کریدا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کندھے اُچکا کر بولا۔ ''خیر! کوئی بات نہیں۔ میں اصل بات کی طرف لوٹتا ہوں۔''

کچھ دیر سوچ کے استغراق میں رہا، سگریٹ کے لمبے کش سینے میں اُتارتا رہا، پھر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمہارا گروپ ڈاکٹر شاہ کے ساتھ اسی طرح منتھی رہے۔ اپنے آپ کو حیات خان اور وریام خان کے عتاب سے بچا کر رکھتے ہوئے نور پور کے لوگوں کے شعور کو اُجاگر کرو۔ اُنہیں اپنی معمول کی گفتگو میں باور کراؤ کہ یہ لوگ اُن کے مسائل کا حل پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے شاطرانہ انداز میں مسائل پیدا کرتے ہیں تاکہ لوگ دست سوال دراز کر کے اُن کے تلوے چاٹیں۔ اُنہیں ان داتا تسلیم کریں۔ میری بات غور سے سن رہے ہوں ناں؟''

''جی!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں تمہیں ایک اور ٹاسک دیتا ہوں۔ سائیں جیت شاہ کے مزار پر جایا کرو۔ جیت شاہ کا گدی نشین، سائیں دل جیت شاہ، کیا کرتا ہے، اُس کا طریقۂ واردات کیا ہے، کھوج نکالو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ فراڈیا ہے۔ اُسے بے نقاب کرتے ہوئے کوشش کرنا کہ یہ خان لوگ تمہارے آڑے نہ آئیں اور اگر کہیں، بالفرض، متصادم ہوتے ہیں تو کسی جھجک کے بغیر تم میرے پاس پہنچ جانا۔ میں اُن کا توڑ کر دیا کروں گا۔ تم میری بات پوری طرح سمجھ چکے ہو ناں؟''

اُس کا لفظ لفظ میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ میں اپنے تئیں شرمسار بھی تھا کہ میں نے آج تک اُس کے بارے میں جو رائے اپنے دماغ میں پال رکھی تھی، وہ سراسر غلط تھی۔ اُس کے دل میں نور پور کے غریبوں کے لیے نفرت نہیں تھی، بلکہ ایک طرح کی مایوسی کی شدید نوعیت تھی جو لوگوں کے عدم تعاون کے سبب اُس کے رگ و پے میں اُتر گئی تھی۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اجازت طلب کی۔

وہ میری کمر میں اپنا بازو حمائل کیے لان کے ننھے سے چوبی دروازے تک آیا، تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ ''شہرے پتر! تم بہت اچھے انسان ہو۔ تمہارا جب بھی جی چاہے، میرے پاس آ جایا کرو۔ اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو آ کر اپنی بہن، ملکہ، کو پڑھا جایا کرو۔ وہ پڑھائی میں خاصی کمزور واقع ہوئی ہے۔''

میں مصافحہ کر کے حویلی سے نکل آیا۔ نور پور کی گلیوں میں اندھیرا اپھیل چکا تھا۔ ابھی گلی کے چوک میں ہی پہنچا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ اندھیرے میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ چونکہ انہی گلیوں میں بھاگتے دوڑتے بچپن اور لڑکپن گزرا تھا، اس لیے ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں تھا۔ اپنی گلی میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ میرے کانوں میں کھالے کی آواز پڑی۔ وہ حیات خان کی حویلی کے سامنے سڑک پر کھڑا مجھے بلا رہا تھا۔ میں اُس کے پاس چلا آیا۔

وہ بولا۔ ''چھت پر سے اپنا سامان تو اُٹھا لائیں...... ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی نہیں، رات تھوڑی اور ڈھل جائے، تب چھت پر چڑھیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں چلتے ہیں۔ گپ شپ میں کچھ وقت گزر جائے گا۔''

ہم دونوں شاہ جی کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہ ابھی تک اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مٹی کے تیل والی لالٹین روشن تھی جس کی پیلاہٹ زدہ کرنیں اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

ہمیں دیکھ کر خوش ہوا۔ دفتری طرز کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر بیٹھو! تم دونوں کو اکٹھا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔''

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گزشتہ شب کی ہولناکی زیر بحث آئی۔ پھر میں ڈاکٹر شاہ جی کی فرمائش پر چائے تیار کرنے کے لیے کچن میں آ گیا۔ کیتلی میں کھولتا ہوا پانی، میرے ذہن میں کھولتا ہوا لاوہ...... دونوں یکساں تھے۔ میں چوکی پر بیٹھا بے اختیار ڈاکٹر شاہ جی کو بھول کر بخت خان کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

سردار بخت خان، سردار وریام خان کا چھوٹا بھائی تھا۔ فراخ پیشانی، گوری رنگت اور باریک مونچھیں اُس کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھیں۔ قدآور مگر اسمارٹ جسم کا مالک تھا۔ اُلٹے رُخ پر سیٹ کیے ہوئے بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی مگر وہ کلف لگانے کا عادی نہیں تھا۔ اُسے وراثت میں نور پور میں گیارہ مربع اراضی جبکہ مظفر گڑھ کی ایک نواحی بستی میں ایک مربع اراضی میسر آئی تھی۔ اُس نے اپنی جائداد میں محض ایک پیٹرول پمپ کا اضافہ کیا تھا جبکہ اُس کے بھائی وریام خان نے گزشتہ سالوں میں بہت کچھ بنا لیا تھا۔ وہ اب تیس مربعوں کے قریب زرعی اراضی کا مالک تھا جبکہ سننے میں آیا تھا کہ اُس نے ملتان میں ایک بہت بڑا پرنٹنگ پریس بھی لگا رکھا تھا۔

سردار بخت خان قیمتی پوشاک پہننے اور سجے سنورے رہنے کا رسیا تھا۔ وہ نور پور کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا انسان تھا۔ اُس نے لاہور میں رہ کر جرنلزم میں ایم اے کیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اُس نے ایک اخبار بھی نکالا تھا جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر سال بھر کے بعد بند کر دیا گیا۔ پُرکشش شخصیت کا مالک ہونے کے سبب اُس پر لڑکیاں تتلیوں کی طرح منڈلاتی رہتی تھیں مگر سنا تھا کہ وہ بڑے مضبوط کردار کا مالک ثابت ہوا تھا۔ مگر ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر جب لاہور کے کسی اسپتال میں ایڈمٹ ہوا تو اُس کے مضبوط ارادوں کی دیوار دھڑام سے گر گئی۔ زرینہ، اسپتال کی خوب رُو نرس، اُس کے زخموں کو بھرتی رہی مگر دل میں چرکے لگاتی رہی۔ بدن سدھر گیا، دل اختیار سے باہر ہو گیا۔ جب اُس نے اپنی حویلی میں زرینہ سے شادی کرنے کا اعلان کیا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ خاندانی روایات اس بے جوڑ شادی کی متحمل نہیں تھی۔ لاہور کے اسپتال میں کام کرنے والی نرس، جس کے آگے کا پتا تھا نہ پیچھے کی خبر، کیسے سردار خاندان کی بہو بن سکتی تھی۔ خان کے باپ اور بھائی نے حشر بپا کر دیا مگر وہ اپنی ہٹ پر پوری استقامت سے ڈٹا رہا۔

نور پور کے بڑے بتایا کرتے تھے کہ اُس نے ہار نہیں مانی تھی اور زرینہ سے شادی کرنے کی غرض سے گھر کو خیر باد دیا گیا تھا۔ لاہور جاتے ہی اُس نے زرینہ کے ساتھ کورٹ میرج کر لی۔ باپ نے نوکر کے ہاتھ پیغام بھیج دیا کہ وہ آئندہ کبھی نور پور میں قدم نہ رکھے ورنہ اُس کی اور اُس کی بیوی کی ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باپ کی زندگی میں کبھی نور پور میں نہیں آیا تھا۔

وہیں، لاہور میں، کسی اخبار میں ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا رہا، گزر بسر کرتا رہا۔ اُس کے خون میں بھی سردار خاندان کے جرثومے متحرک تھے، اس لیے اُس نے شادی کے فوراً بعد ہی زرینہ سے جاب چھڑوا دی تھی۔ اُسے باپ کے مرنے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اُسے مہینا بھر کے بعد پتا چلا تھا۔ غصہ ضبط کر کے نور پور پہنچا۔ آتے ہی اُس نے خاندان بھر کے بڑوں کو اکٹھا کیا۔ اپنے بڑے بھائی وریام خان اور بہنوں کی خوب بے عزتی کی اور ڈنڈے کے زور پر جائداد میں سے اپنا نصف حصہ الگ کر لیا۔ وریام خان نے اُسے ٹالنے اور نور پور سے نکالنے کی بہت کوشش کی مگر اُس نے کوئی پیش نہیں چلنے دی۔

اپنی جائداد کا انتظام سنبھالتے ہی اُس نے یہ خوب

صورت حویلی تعمیر کرائی تھی۔ سنا تھا کہ وہ حویلی کا نقشہ لاہور کے کسی بڑے نقشہ نویس سے بنوا کر لایا تھا۔ حویلی تعمیر ہو گئی تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی نور پور میں لے آیا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ نور پور والوں نے جب اُس کی بیوی کو دیکھا تو دانتوں میں انگلیاں کاٹ لیں۔ وہ بہت خوب صورت اور وضع دار عورت تھی۔ اُس نے آتے ہی بستی کی تمام عورتوں کو اپنے حسن سلوک اور ہاتھ کی سخاوت سے گرویدہ کر لیا مگر بخت خان اپنے آپ کو اس ماحول میں پوری طرح ایڈجسٹ نہیں کر سکا تھا۔ اُس کے خیالات کو رد کر دیا گیا۔ اُس کی سوچ کو احمقانہ اور ناقابل عمل قرار دیتے ہوئے پیٹھ پیچھے تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ سنتا رہا، اپنی سی کرتا رہا پھر ہار مان کر اپنی تصوراتی دنیا میں سمٹ گیا۔ اُس کا ڈیرہ غیر آباد ہوتے ہوتے آخر کار ویران ہو گیا مگر اُس نے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔

بڑی بیٹی عائشہ، ملتان کے زنانہ کالج میں زیر تعلیم تھی۔ اُس سے چھوٹا بیٹا ظفریاب خان آرمی میں چلا گیا تھا۔ اُس نے نین و نقوش اور عادات اپنے باپ کی چُرا رکھی تھیں۔ چھوٹی بیٹی، ملکہ، کو ابھی گھر میں ہی پڑھایا جا رہا تھا۔ چھوٹا بیٹا، سکندر بخت ملتان کے کسی بورڈنگ ہاؤس میں تھا۔ وہ بھی خاصا کم گو واقع ہوا تھا۔ سردار بخت خان کا گھرانا نور پور کے بڑے گھرانوں میں سے ایک ہونے کے باوجود جدا سا لگتا تھا۔ اُن کا رہن سہن، عادات و اطوار اور خال و خد کی نفاست کسی طور پر بھی نور پور سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ طویل عرصہ تک لاہور کی اخباری دُنیا سے منسلک رہنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ خاصے لمبے تھے۔ سردار حیدر خان علاقے کا بے تاج بادشاہ ہونے کے باوجود اُس سے دب کر رہتا تھا اور اُس کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتا تھا۔

چائے تیار ہو چکی تھی۔ میں تین پیالوں میں بھر کر کمرے میں آ گیا۔ زیادہ پکنے کی وجہ سے چائے کی رنگت قدرے گہری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے گھونٹ بھرا، حیرت سے بولا۔ ”ذائقہ خاصا بدلا ہوا ہے۔“

کھالے نے لقمہ دیا۔ ”پورا گاؤں ہی بدلا ہوا ہے شاہ جی!“

گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا کہ اُسے کیسے اسپتال کی چھت پر ہماری موجودگی کی خبر ہوئی تھی۔ اُس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کھالا ضروری کام نمٹانے کا کہہ کر کوٹھی سے نکل گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چھت پر پڑا ہوا سامان اُٹھانے کے لیے نکلا تھا۔ کچھ دیر کے بعد لوٹا تو اُس کی بغل میں کھیس دبے ہوئے تھے۔ باقی سامان یقینی طور پر اُس کی جہازی سائز کی جیبوں میں چھپا ہوا تھا۔

ڈاکٹر کی مستفسر نگاہوں کو مطمئن کرنے کے لیے بولا۔ ”شہرے! یہ کھیس اپنے گھر لے جانا، ماں نے دیے ہیں۔ مہمانوں کے لیے مانگ کر لائی تھی۔“

ڈاکٹر مطمئن ہو گیا۔ مہمانوں کی آمد پر نور پور میں عمومی طور پر سامان مستعار لیا جاتا تھا جو ضرورت پوری ہو جانے پر لوٹا دیا جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو اپنی اور بخت خان کی ملاقات کے بارے میں بتلایا۔ ڈاکٹر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد بولا۔ ”اُس کی ہدایات پر عمل نہ کرو، اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ اُس کے سامنے کوئی ٹارگٹ نہیں، وہ جو حاصل کر سکتا تھا، کر چکا۔ تم ابھی اپنی عملی زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہو۔ ابھی سے رکاوٹوں کے ساتھ اُلجھنے لگو گے تو سفر رُک جائے گا۔ منزل دور ہوتی چلی جائے گی۔ سائیں جگ جیت شاہ کیا کرتا تھا، اُس کا جانشیں سائیں دل جیت کیا کرتا پھرتا ہے، تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ جب تعلیمی مراحل بہ خوبی سرانجام پا جائیں، روزگار کا مضبوط سہارا حاصل ہو جائے، تب ایسے امور پر توجہ دینا۔ دل جیت فرد واحد نہیں، حیدر خان اکیلا نہیں بلکہ یہ ایک چین کی کڑیاں ہیں۔ برائی کی چین...... ان گنت کڑیوں سے مل کر بنی ہے۔ کس کس سے سر ٹکراؤ گے؟“

ڈاکٹر کے لہجے میں مایوسی کا عنصر غالب تھا۔ میں نے استعجاب آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”یہ دل جیت شاہ والا قصہ کیا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا رہا ہوں کہ وہ بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے، دم کرتا ہے تو بیماری جاتی رہتی ہے، پھونک مارتا ہے تو مشکلات حل ہو جاتی ہیں مگر اب سجھائی دیتا ہے کہ یہ چکر اور طرح کا ہے۔“

شاہ جی نے سر جھکا لیا۔ وہ بتانا چاہتا تھا مگر کوئی مصلحت آڑے آ رہی تھی۔ کھالے نے مجھے اشارہ کیا کہ میں زیادہ نہ کریدوں۔ کھالے نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ بازاری عورت جو آپ کو بدنام کرنے کے لیے لائی گئی تھی، اُس نے آپ کو کوٹھی میں موجود نہ پا کر شور کیوں مچایا تھا؟ اُسے تو چاہیے تھا کہ وہ خاموشی سے کوٹھی سے نکل جاتی اور واردات کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرتی۔“

شاہ جی کے لبوں پر زہرخند مسکراہٹ تیر گئی، بولا۔ ”ہر چالاک آدمی سے کہیں نہ کہیں غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ کوئی نہ

کوئی سقم رہ جاتا ہے۔ میں نے بھی اس پہلو پر بہت غور کیا ہے۔ یہاں کی سچویشن اور سردار بخت خان کی حویلی میں ہونے والے مذاکرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ڈسپنسر کو میری یہاں موجودگی کا مکمل یقین تھا۔ اُس نے بیرونی افراد کو سگنل دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ وہ عورت چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بتا رہی ہوگی کہ میں اندر موجود نہیں ہوں مگر وہ سمجھ نہیں پائے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت بنتی دکھائی نہیں دیتی۔“

ہم دونوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اُس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ باتوں میں بہت دیر گزر گئی تھی مگر ابھی تک بجلی نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں نے شاہ جی سے اجازت لی اور کوٹھی سے نکل آئے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے ہماری موجودگی میں ہی اسٹور کا رُخ کر لیا تھا۔ ہمیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ اسٹور سے سیڑھی نکال کر چھت پر چڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ابھی آسمان پر چھائے ہوئے سنگین بادل پوری طرح چھٹے نہیں تھے۔

کھالے کی ویگن کے بونٹ پر بیٹھ کر میں نے بتایا۔ ”کھالے! میں نے تمہاری جل پری کے لیے بڑی محنت سے خط لکھا ہے۔“

وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”ادھر لاؤ، کہاں ہے وہ خط؟“

میں نے جیب سے خط نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے فرطِ مسرت سے چوم لیا، بولا۔ ”تم ادھر ہی بیٹھو، میں لالٹین کی روشنی میں اسے پڑھ کر آتا ہوں۔“

میں گھر جانا چاہتا تھا مگر اُس نے جانے نہ دیا۔ بھاگتے ہوئے گھر میں گھس گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد اُس کی واپسی ہوئی۔ دیوانوں کی طرح مجھے چومنے لگا۔ میں نے بہ دقت جان چھڑائی۔

وہ بہت خوش تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”یار شہرے! تم نے تو کمال کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُس نے یہ خط ایک مرتبہ پڑھ لیا تو ’کھالا، کھالا‘ کرتی گلیوں میں دوڑتی پھرے گی۔“

میں نے مصنوعی تعجب سے کہا۔ ”کیا مطلب؟ میں نے خط لکھا ہے، دھتورے کی پڑیا تو نہیں بنائی۔“

”یہ دھتورے کی پُڑیا سے کم نہیں ہے کاکا بلو! تم نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔“ خوشی سے اُس کی باچھیں کانوں سے لگ رہی تھیں۔ خط کی خوشی میں وہ بالکل بھول گیا تھا کہ ابھی اس سے بھی کہیں مشکل مرحلہ، اسما تک خط پہنچانا، باقی تھا۔

”تم یہ خط اُس تک کیسے پہنچاؤ گے؟“

وہ ایک ذرا ٹھٹکا، پھر ہاتھ نچا کر بولا۔ ”یہ کوئی مشکل کام ہے......“

پھر اچانک گھبرا سا گیا، اپنی تردید کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”کام مشکل تو ہے، مگر خیر سلّا...... لکھا گیا ہے تو ’خیری سلامتی‘ ماہی تک پہنچ بھی جائے گا۔“

”کیسے؟“ میں نے ضد کی۔

اُس نے چٹکی بجائی، بولا۔ ”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”یہ نہ ہو کہ حیدر خان تم پر وحشی کتے چھوڑ دے۔“

”پروا نہیں!“

اگلی صبح وہ مجھے اپنے ساتھ قریشی موڑ پر لے گیا۔ ویگن میرے حوالے کر کے ملتان سدھار گیا۔ آج اُس نے اپنے بناؤ کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ میں اُس کا میک اپ دیکھ کر بہ دقت اپنی ہنسی روکے ہوئے تھا۔ تیل سے چپڑے ہوئے گہرے سیاہ گھنگھریالے بال، سیدھی مانگ، سرمہ بھری سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، سفید کلف لگا لٹھے کا سوٹ اور فیس پاؤڈر سے لتھڑی ہوئی سیاہ گردن...... وہ اپنے چہرے پر بھی فیس پاؤڈر لگایا کرتا تھا۔ عمومی طور پر میں اُسے دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ جب تم پاؤڈر لگاتے ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کالے بکرے نے آٹے کے کنستر میں منہ مارا ہو۔ میں نے اُسے چھیڑنا سردست مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ میری ایک استہزائیہ ہنسی اُسے پریشان اور احساس کمتری کا شکار کر سکتی تھی۔ اس لیے بہ امر مجبوری اُس کے مضحکہ خیز بناؤ کی جھوٹی تعریف کی۔

وہ قدرے شرما کر بولا۔ ”میں اتنا بدصورت بھی نہیں ہوں، بس خود کو بنائے سنوارے رکھنے کا عادی نہیں ہوں۔“

میں اُس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر جی کھول کر ہنسا۔ پھر اُسے ملتان والی بس پر سوار کر کے ویگن کے اڈے پر آ گیا۔ شیدو چائے کا بڑا سا پیالہ تھامے میرا منتظر تھا۔ ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ”اج اُستاد دی ہٹی نہیں تھیندی!“

میں نے اُس کے سر پر چپت لگائی اور کھالے کے حق میں دعائیں مانگتے ہوئے چائے نوش کرنے لگا۔ مجھے یقین کی حد تک اُمید تھی کہ وہ اسما کو خط تھمانے کی جرأت نہیں کر پائے گا اور طنطنے سے جانے والا بے نیل مرام لوٹے گا۔ اپنی عادت کے مطابق اسما کو خط نہ دے پانے کے کئی مضبوط مگر جھوٹے جواز تراش کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ شکست کو تسلیم کرنا اُس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ بسا اوقات اُس کی اسی خو کی وجہ سے ہم دونوں کے بیچ زوردار لڑائی ہو جایا

کرتی تھی۔ کئی دنوں تک بات چیت کا سلسلہ موقوف رہتا پھر گزارانہ ہو پانے کی وجہ سے آپوں آپ ہی صلح ہو جاتی تھی۔

میں نے ویگن کا پھیرا لگایا۔ ڈھلتی دوپہر میں جب میں ہوٹل کے بڑے ہماچے پر محو استراحت تھا اور شیدو میرے پاس بیٹھا نوٹ سیدھے کر رہا تھا، کھالا بس سے اُتر کر تیر کی طرح ہوٹل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی چال بدلی ہوئی تھی۔ لمبی بانہہ مار کر چلتے ہوئے کھالے کو دیکھتے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ میدان مار آیا ہے۔ میرے تمام تر اندازے خاک میں مل گئے تھے۔ قریب آنے پر میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا رہا کھالے اُستاد؟“

اُس نے اپنی دو نمبر نوروزی چپل اُتارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”دم تو لینے دو یار۔ چل اوئے شیدو! ٹھنڈے ٹھار پانی کا جگ بھر لا اور ہوٹل والے کو پاؤ دودھ پتی کا آرڈر دے آ۔ فٹافٹ کر، گولی کی طرح جا۔“

میں اُس کے ہیجان انگیز چہرے اور پُر جوش کیفیت کو ملاحظہ کرتے ہوئے بے حد متجسس ہو گیا۔ وہ میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میرے زانو پر زوردار دھپ رسید کرتے ہوئے بولا۔ ”شہرے خان! تیڈے یار فتح پا گھدی اے۔ رب دی سوں، رب کولوں کجھ ہور منگا ہوندا تاں شیت اج اوہ وی لبھ ویندا!“

(شہرے خان! تمہارے یار نے فتح پالی ہے۔ اللہ کی قسم، اللہ سے کچھ اور مانگا ہوتا تو وہ بھی مل جاتا)

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا۔ ”تفصیل سے بتاؤ ناں!“

اُس نے پانی کا گلاس حلق سے اُتارا، رسمی انداز میں اردگرد دیکھا، بولا۔ ”آج تو یوں لگتا ہے......“

”جیسے پوری دُنیا خط میں لپٹ گئی ہو اور خط تمہارے ہاتھ میں گلاب کا پھول بن گیا ہو۔“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

اُس نے اک نگاہ شکایت مجھے دیکھا، بولا۔ ”بکواس نہ کرو۔ میں اگر تھوڑا سا بھی لیٹ ہوتا تو اُس نے میرے ہاتھ نہیں آنا تھا۔ آج اُسے معمول سے پہلے چھٹی ہو گئی تھی۔ میں ابھی کھڑا ہو کر اپنے حلیے کا جائزہ لے رہا تھا......“

”یعنی اپنے حسن کو ملاحظہ کر رہے تھے؟“

اب کی بار اُس کی برداشت جواب دے گئی۔ میری ران پر پوری قوت سے دھپ رسید کرتے ہوئے بولا۔ ”انسانوں کی طرح میری بات سن ورنہ تجھے گولی مار دوں گا اور پھر لاش کے سینے پر مونگ دلتے ہوئے پوری عشق کہانی بیان کروں گا۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اچھا یار! لڑتے کیوں ہو۔ اب جی کھول کر اپنے دل کا غبار خاطر نکال کر میرے سامنے رکھ دو۔“

ایسے میں ہوٹل والا چھنک اور چائے کے تین کپ ہماچے پر رکھ گیا۔ شیدو نے جلدی سے چائے ڈالی اور مہک دار چائے کے لبالب کپ ہمارے سامنے رکھ دیے۔ کھالے نے اُسے چلتا کیا۔ چائے کا زوردار گھونٹ بھرا اور بولا۔ ”شہرے! میں ابھی کھڑا ہی تھا کہ اُس کی کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ پتا ہے، کیا ہوا، میں بغیر کچھ سوچے سمجھے کار کے سامنے آ گیا......“

”اور ایک عاشق اپنے ہی خون میں نہا گیا۔ انا للہ وانا......“ میں نے جلدی سے لقمہ دیا تو وہ بپھر گیا۔ خیر گزری کہ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا ورنہ وہ تھپڑ مارنے سے گریز نہیں کرتا۔

دانت پیس کر بولا۔ ”یار! انسانوں کی طرح میری بات سنو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں کار کے سامنے آ گیا، ڈرائیور نے بریک لگائے اور گیٹ کھول کر مجھے بے نقط سنانے لگا مگر میں اُسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا جسے دیکھنے کے لیے اتنا سفر کر کے وہاں پہنچا تھا۔ اُسے پتا چل گیا کہ میں اُس کی وجہ سے کار کے سامنے آیا ہوں۔ وہ گیٹ کھول کر باہر آئی۔ میرے پاس آ کر بولی۔ ”گاڑی کے سامنے کیوں آئے ہو؟“

اُس نے پھر چائے کے گھونٹ کا مزہ کشید کیا، بولا۔ ”شہرے! پتا ہے، پھر کیا ہوا؟“

”ہاں ہاں! مجھے پتا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”کیا پتا ہے؟“ وہ گھور کر بولا۔

”یہی کہ تم نے فی الفور کہا کہ اللہ کے نام پر مجھ نابینے کو روپیہ دو روپے دو...... بھاگ سلامت!“

”میں بھی نرا پاگل کا بچہ ہوں۔ جانتا بھی ہوں کہ تمہیں کچھ علم نہیں ہے، پھر پوچھ بیٹھتا ہوں۔“ اُس کا چہرہ فرط غیظ سے متغیر ہونے لگا تھا۔ چائے کا لمبا گھونٹ شکم میں اُتارا اور سنبھل کر بولا۔ ”میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ میں آپ کو دیکھنے کے لیے گاڑی کے آگے آیا ہوں...... اُس نے بڑے غصے سے مجھے دیکھا۔ میں ڈر کر بھاگنے ہی لگا تھا کہ وہ اچانک مسکرا دی۔ بولی 'دیکھ لیا، اب گاڑی کے سامنے سے ہٹو'...... میں نہیں ہٹا بلکہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر خط نکالا اور اُس کے سامنے کر دیا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے خط لے لیا، پوچھا 'اس میں کیا ہے؟'...... میں نے کہا کہ 'دیکھ

لیجیے گا' اور جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور...... چلی گئی۔“ کھالے نے بڑے انداز سے رام کہانی مکالموں سمیت کہہ سنائی۔

”اُس نے تمہیں واقعی کچھ نہیں کہا؟“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں یار! رب دی سوں، سچ کہہ رہا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا مگر اُس نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ جاتے ہوئے اُس کی نگاہیں مسلسل مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔“

”یعنی وہ دُنیا کے خوب صورت جوان کو دیدے پھاڑ کر دیکھ رہی تھی؟“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

”بکواس مت کرو، میں جانتا ہوں کہ تم جل بھن گئے ہو یہ سن کر کہ میں بی بی تک خط پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“ اُس نے تپ کر کہا۔

”میں نہیں مانتا۔ تلاشی دو، خط تمہارے پاس موجود ہوگا۔“ میں نے اُس کی برہمی کی پروا نہیں کی۔ میرا اشک بجا تھا۔

”بڑے بے ایمان ہو تم بھی!“ اُس نے غصہ بھری نگاہ سے مجھے دیکھا، پھر اپنی سبھی جیبیں اُلٹ دیں۔ خط اُس کے پاس نہیں تھا۔ مجھے یقین دلانے کے لیے اُس نے ان گنت قسمیں کھائیں۔ آخرکار میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اُس نے گریبان کے بٹن کھولے، کالر کو گردن کی عقبی سمت دھکیلا اور چھاتی پھلا کر بولا۔ ”آج تیرا یار جشن منائے گا، پوری بوتل چڑھائے گا اور تمہیں جھوم کر دکھائے گا۔“

میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے، کہا۔ ”میں ایسے جشن پر لعنت بھیجتا ہوں۔ ایک یہی بُری عادت ہے تم میں...... ہونہہ!“

اُس نے میرے چہرے سے ہویدا ناپسندیدگی کے تاثرات کی کوئی پروا نہ کی اور اپنی ترنگ میں لہراتا رہا۔ میں نے زیادہ ضد نہیں کی کیونکہ اُس پر میری نصیحتوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے قوی یقین تھا کہ وہ قریشی موڑ کی ایک مضافاتی بستی میں واقع ہومیو ڈاکٹر عبدالحمید کے کلینک پر جائے گا اور جب ویگن کا آخری پھیرا لے کر نور پور میں داخل ہوگا تو اُس کی ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے بنے ہوئے عارضی ٹول بکس میں گھٹیا قسم کی شراب کی بوتل موجود ہوگی۔

ڈاکٹر حمید علاج معالجے کی آڑ میں یہی کام کرتا تھا۔ آدھے لیٹر کی پلاسٹک کی بوتل میں الکحل بھر کر بیچتا تھا۔ الکحل میں ملاوٹ بھی کرتا تھا۔ مے نوشوں کی سوسائٹی میں اس شراب کو 'کپی' کا نام دیا جاتا تھا۔ کھالا جب بھی بہت زیادہ خوش ہوتا، معمول سے کہیں زیادہ رنجیدہ ہوتا یا کسی نوعیت کی بھی ٹینشن میں مبتلا ہوتا، کپی سے دل بہلانے بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے بارہا اُس کے موج میلے کے اوقات میں اُسے دیکھا تھا۔ بالکل 'آؤٹ' نہیں ہوتا تھا۔ بس سرخی مائل متورم آنکھوں اور چہرے کی ہلکی تمازت سے پتا چلتا تھا کہ اُس نے شغل کر رکھا ہے۔ مجھے اس بلائے جان کی بو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ جب اُس نے پی رکھی ہوتی تھی، تب میں اپنے اور اُس کے درمیان کئی فٹ کا فاصلہ حائل رکھتا تھا۔ اُس نے کبھی مجھے پینے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی تو میں اُس کا سر پھوڑ دیتا، بوتل انڈیل دیتا مگر شراب کو منہ سے نہ لگاتا۔

آج، اُس نے بڑی اہم کامیابی حاصل کر لی تھی اور ناممکن تھا کہ شغل نہ کرتا۔ دودھ پتی کا ایک دور اور چلا۔ سواریاں ویگن کے گرد اکٹھی ہو چکی تھیں اور شیدو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر، ہارن بجا کر کھالے کو متوجہ کرنے لگا تھا۔ کھالے نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور خود ویگن کے پائیدان پر کھڑا ہو گیا۔

گھر پہنچتے ہی میں اپنے معمول کے کاموں میں اُلجھ گیا۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں گیا۔ ٹی وی پر اپنے پسندیدہ سیریل کی قسط دیکھی، احوال کا تبادلہ کیا اور دس بجے کے قریب گھر کے لیے روانہ ہوا۔ شریف چکی والے کے گھر سے نکل کر گھر کی طرف بھاگتی ہوئی خالدہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ رُک کر میرے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔

میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ شریف کی بیٹی کو کڑھائی کے ڈیزائن دینے آئی تھی۔ چھدے ہوئے بیل بوٹوں والے بٹر پیپر، جنہیں 'ڈیزائن' کا نام دیا جاتا تھا، نور پور کے گھروں میں محو گردش رہا کرتے تھے۔ ان باریک کاغذوں کو کپڑے کی مطلوبہ جگہ پر رکھا جاتا تھا اور اوپر پانی میں گھلے ہوئے نیل سے لتھڑی روئی پھیر دی جاتی تھی۔ نیل، بٹر پیپر کے سوراخوں میں سے گزر کر کپڑے پر پھول بوٹے بنا دیتا تھا جس پر لڑکیاں سوئی دھاگے سے کشیدہ کاری کرتی تھیں۔

وہ چند قدم میرے برابر چلی، پھر تھم گئی، بولی۔ ”تم نے بی بی کے خط کا جواب لکھا ہے؟“

مجھے توقع تھی کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گی۔ میں نے انکار کیا، بولی۔ ”اُس نے ابھی تک مانگا نہیں ہے۔ مانگے تو کیا جواب دوں؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ نہیں مانگے گی۔“

”کیوں؟“ وہ متعجب ہوئی۔

"یہ بات تمہاری چھوٹی سی کھوپڑی میں نہیں سمائے گی۔"

"اے واہ!" وہ مچلی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم اور وہ ......"

"کیا وہ؟" میں چونکا۔

جواباً اُس نے میرے سینے کے برابر اپنے ہاتھوں کی دونوں شہادت انگلیوں کو سوئے آسمان۔ بلند کر کے جوڑا، شرارت سے مسکرائی اور آنکھیں بند کر کے بولی۔ "بڑے بھولے بنتے ہو صاحب جی!"

میں نے اُس کی چوٹی پکڑ لی۔ جھٹکا دیا، کہا۔ "تم نری بے وقوف ہو۔ میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں نے اُسے پیچھے کی طرف ہولے سے دھکیلا تھا، وہ ٹہنی کی طرح لچک کھا کر آگے کی طرف بڑھی اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر مجھ سے آن ٹکرائی۔ وہ اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھ سے ٹکرائی تھی، کئی بار اُس نے ہاتھا پائی کی تھی، مگر اُس کے لمس میں اُس گھڑی کوئی نئی تپش تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹی بلکہ میرے سینے پر سر ٹکا کر میرے وجود سے چپک گئی۔ میں نے اُسے پیچھے ہٹانا چاہا مگر یوں لگا جیسے میرے بازوؤں میں سکت نہ رہی ہو۔ چند ساعتیں نادیدہ تمازت کے بل پر پھیل کر لمبے دورانیے کی شکل اختیار کر گئیں۔ پھر اچانک مجھے ہوش آ گیا اور میں نے اُسے پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑائی، سنبھلی پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظر میں عجیب وارفتگی پنہاں تھی کہ میں تاب نہ لاتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔ "بلو! ایسا نہ کیا کرو، تم اب بچی نہیں رہی ہو۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُس کا انگ انگ بول اُٹھا۔ "یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ میں اب بچی نہیں رہی۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگ گئی۔ سڑک اور اُس کے گھر کے دروازے کے بیچ میں کھلی جگہ حائل تھی جہاں کھالا اپنی ویگن کھڑی کرتا تھا۔ دو کنال کا قطعہ اراضی اُس نے پلک جھپکتے میں عبور کیا اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ مبادا کہ کوئی دیکھ رہا ہو مگر کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ میں نے عافیت کی سانس لی۔

سڑک سے گھر تک کا راستہ بہت طویل ہو گیا۔ پہلی بار پکی سڑک نے میرے پیروں تلے ریت کھسکا دی تھی۔ برق تھی جو بدن کو آن کی آن میں جلا کر بھسم کر گئی تھی؛ ترنگ تھی جو سنبھلنے سے پیشتر بھر کر جود وروں میں سرایت کر گئی تھی شباب آگہی تھی جو آنکھ سے دل کا فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر گئی تھی۔ چارپائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتے ہوئے میں یک سر بھول بیٹھا تھا کہ بلو کے علاوہ بھی نور پور میں کوئی لڑکی رہتی تھی۔ غزالہ کون تھی، اسما کہاں تھی کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ آنکھ کھولتا تھا، بند کرتا تھا یا کروٹ بدلتا تھا، خالدہ عرف بلو نظر آتی تھی۔ میں گھبرا گیا کہ وہ اتنی اہم تو میری زندگی میں کبھی نہیں رہی تھی۔

غزالہ کم و بیش ہر روز ہی مجھے ملتی تھی۔ مجھے دکھائی دیتی تھی، چھونے کی اجازت دیتی تھی مگر اُس کا لمس اضطراب گیں نہیں تھا۔ خالدہ کا جسم بھی میرے لیے ناشناسا نہیں تھا۔ وہ اپنے بچپن سے ہی میرے ساتھ دھینگا مشتی کرتی آ رہی تھی۔ چند دن قبل تک اُس کا بدن بولتا نہیں تھا، صدف بی بی کے خط کے ساتھ ہی بولنے لگا تھا۔ میں نے سوچا، کوئی تغیر ایسا ذہن پر نہیں کھلا جو گزشتہ چند دنوں میں بلو کے جسم میں رونما پذیر ہوا ہو۔ میں نے بے اختیار سر کو سرہانے پر دائیں بائیں پٹخا۔ اچانک مجھے سمجھ آئی کہ میرے ہاتھ لگانے سے غزالہ کو 'کچھ کچھ' کیوں ہونے لگتا تھا۔

شب ڈھلتے ڈھلتے سرد ہو گئی۔ میں قمیص اور کھیس کے بغیر چارپائی پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ سرہانے رکھی ہوئی ننھی سی ٹارچ کو روشن کر کے دیوار گیر کلاک میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بجنے کو آ گیا تھا مگر نیند تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بے کراں سکوت نور پور کی فضا میں طاری تھا۔ کوئی کتا، کوئی بینڈا یا کوئی ذی نفس جاگ نہیں رہا تھا، ماسوائے میرے۔ کھالا کہا کرتا تھا کہ چور، کتا اور عاشق رات بھر جاگتے ہیں۔ میں جاگ رہا تھا۔ یقیناً میں چور یا کتا نہیں تھا۔ پہلے کبھی اتنی دیر گئے تک بیدار بھی نہیں رہا تھا۔

شاید دو کا عمل تھا، جب مجھے اپنی گلی میں سے گزرنے والی کار کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں چونک کر سوچنے لگا کہ اس وقت کون یہاں سے گزر سکتا تھا۔ کار کے انجن کی گھرگھراہٹ سے پتا چلتا تھا کہ کار میں بیٹھ کر آنے والا بخت خان کی حویلی کی طرف سے نور پور کے پختہ کھال کی طرف گیا ہے۔ میرے گھر سے کھال تک کے بیچ دو گھر واقع تھے۔ میرے متصل گھر میں بدر دین جبکہ آخری گھر افسر علی کا تھا۔ پختہ کھال اُس کے گھر کی مشرقی دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتا تھا۔ کھال کے پرے کوئی گھر واقع نہیں تھا۔ گلی کی سیدھ میں کچی سڑک موجود تھی جو فصلوں کے بیچ دو چار موڑ کاٹتی ہوئی بخت خان اور دریام خان کے ڈیروں تک جاتی تھی۔ کھال کے متوازی پکی سڑک جنوبی سمت میں واقع سائیں کے دربار تک جاتی تھی۔ کار سوار یا تو کسی خان کے ڈیرے پر جا سکتا تھا

یا مزار تک۔ رات کے اس سمے دونوں جگہوں پر کسی کی آمد میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

میں نے کار کی آواز پر کان دھرے۔ مجھے یوں لگا جیسے کار پلی سے اُترتے ہی دائیں ہاتھ مڑی ہو۔ میری بڑبڑاہٹ مجھے اجنبی سی لگی۔ "یا خدا! اس وقت دربار پر کوئی کیا کرنے آیا ہے؟"

مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں قمیص اور جوتے پہن کر کمرے سے نکل آیا۔ دبے پاؤں صحن سے گزر کر گھر کے عقبی حصے میں آیا۔ گھر کی جنوبی دیوار میں چھوٹی سی دروازہ نما کھڑکی نصب تھی جسے بہ وقت ضرورت باہر جانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ کھڑکی خاصی پرانی تھی۔ چٹخنی بھی سالخوردہ اور زنگ آلود تھی۔ تیز ہوا یا ہاتھ کے معمولی سے دھکے سے کھل جاتی تھی اس لیے چاچی نے اُس میں لوہے کی سلاخ پھنسا رکھی تھی۔ میں نے سلاخ نکالی، کھڑکی کھولی اور باہر نکل آیا۔ معمول سے قدرے زیادہ تیز اور خنک ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں چند لمحوں تک کھڑکی کے سامنے بنے ہوئے مٹی کے ڈھلوانی تھڑے پر کھڑا رہا۔ میرے سامنے دیسی کیکر کا گھنا اور خودرو جھنڈ تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر بڑا سا گندے پانی کا جوہڑ واقع تھا جس میں نہ صرف بارشی پانی جمع رہتا تھا بلکہ گھروں کے استعمال شدہ پانی کی نکاسی بھی اس میں کی جاتی تھی۔

میرے گھر کی عقبی کھڑکی کے عین سامنے، ڈراؤنے جھنڈ اور بدبودار جوہڑ کے درمیان ایک پگڈنڈی پار جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ مسجد کی طرف، جیت شاہ کے مزار پر یا گاؤں سے باہر اپنی زمین پر جانے کے لیے ہم یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ یہی پگڈنڈی میرے گھر کے مغربی سمت میں رہائش پذیر ہمسائے لعل خان کا گھرانا اور خالہ کبریٰ کے بھی زیر استعمال تھی۔ یہیں، دیسی کیکر اور جھاڑ جھنکار پر مشتمل جھنڈ کے شمالی کونے میں، میں نے بڑی محنت سے ایک مورچہ بنا رکھا تھا جہاں کبھی کبھار میں اور غزالہ مل بیٹھتے تھے اور دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ مورچہ بلا ضرورت ہی بنایا گیا تھا کیونکہ مجھے اور غزالہ کو درحقیقت کسی بھی نوعیت کی تنہائی کی ضرورت درپیش نہیں تھی۔ گھنے جھنڈ کے بیچ میں کسی اور کلہاڑی کی مدد سے میں نے کئی دنوں میں یہ ننھا سا جزیرہ بنایا تھا۔ میرے نزدیک یہ جگہ نور پور کی سب سے محفوظ اور پوشیدہ جگہ تھی۔

لوگوں نے بارہا اس جھنڈ کے آس پاس خطرناک اور زہریلے سانپ دیکھے تھے۔ نیولے اور گوہ بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اس لیے اس جھنڈ کو خطرناک قرار دے دیا گیا تھا اور کوئی بھی اس میں گھسنے کی کوشش کرتا تھا نہ ہی یہاں سے درخت کاٹے جاتے تھے۔ سائیں دل جیت شاہ نے بھی لوگوں کو جھنڈ میں داخل ہونے اور یہاں سے بالن وغیرہ کاٹنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا، جن میں عورتوں کی تعداد غالب تھی کہ یہاں بلائیں، چڑیلیں اور جنات رہائش پذیر ہیں۔ میں اور کھالا ان گنت مرتبہ اس جنگل کا شمالی جانب والا آدھا حصہ کنگال چکے تھے۔ ہمیں ایسی کوئی بھی شے دکھائی نہیں دی تھی جس کی سمجھ نہ آتی ہو اس لیے مجھے کبھی بھی یہاں سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ البتہ میں جھنڈ کے جنوبی آدھے حصے میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا۔ احتراز کی وجہ کوئی خوف نہیں بلکہ اس کا غیر معمولی گھنا پن تھا۔

میں پگڈنڈی پر سنبھل کر چلتے چلتے جھنڈ کے آخری سرے تک چلا گیا۔ یہاں پگڈنڈی دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ دائیں ہاتھ والا راستہ مسجد کی طرف جاتا تھا جبکہ بائیں ہاتھ والی پگڈنڈی جنگل کے کنارے کنارے سائیں جیت شاہ کے مزار تک چلی جاتی تھی۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مزار کی طرف چل پڑا۔ شاید کار کا انجن بند ہو گیا تھا، اس لیے ماحول قطعی طور پر بے آواز ہو گیا تھا۔ میں چند منٹوں میں مزار کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ یہاں دیوار کی اونچائی محض پانچ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ میں نے دیوار پر ہاتھ ٹکا کر اندر جھانکا۔ فوری طور پر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میری نظر کے سامنے وسیع و عریض صحن خالی پڑا تھا۔ بائیں ہاتھ پر سائیں جگ جیت شاہ کی قبر پر تعمیر کیا گیا بلند و بالا گنبد دار مقبرہ تھا جس پر ان گنت کبوتروں اور فاختاؤں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ تمام دن یہاں 'غٹرغوں، گھوں گھوں' کی مانوس صدائیں برآمد ہوتی تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ، کچھ دوری پر، سائیں کے تخت نشیں دل جیت شاہ کی رہائش گاہ، بڑا سا مہمان خانہ اور وہ بڑا سا ہال واقع تھا جہاں وہ سارا دن مسند نشیں ہوتا اور اپنے ارادت مندوں کو تعویذ دیتا، دم کرتا اور نذرانے وصول کرتا تھا۔ کھالا اور میں بارہا ہال میں بیٹھ کر اُس کی دل نشیں باتیں سن چکے تھے۔ وہ بہت نیک اور خدا ترس آدمی تھا۔ لوگوں کے بہ قول، اُس کی دعا سیدھی عرش پر جاتی تھی اور بجلی کی سی رفتار سے مراد لاتی تھی۔ اُس کے تعویذ اور دم کا شہرہ بھی چار دانگ پھیلا ہوا تھا۔

بغیر چھت والی کار پارکنگ، ہال کے مغرب میں واقع تھی اس لیے مجھے کار یا کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے ناگاہ خیال آیا کہ کوئی مریض لایا گیا ہوگا، میں بلا وجہ

متجسس ہو کر رات کے اس پہر میں یہاں چلا آیا ہوں۔

میں لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری نگاہ ہال کے ملحقہ سائیں جیت شاہ کے خاص حجرے کے روشن دان سے چھن کر آتی روشنی پر پڑی۔ کوئی وہاں موجود تھا کیونکہ اس وقت شاہ سائیں کو اپنی رہائش گاہ میں محو استراحت ہونا چاہیے تھا۔ اُس کی عدم موجودگی میں مہمان خانے اور حجرے میں روشنی کا کوئی کام نہیں تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ جنوبی سمت میں چل دیا۔ عمارت کا چکر کاٹ کر پارکنگ کے عین عقب میں آ گیا جہاں چہار دیواری کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے باہر کو نکلے ہوئے ڈی پی سی پر پاؤں ٹکائے اور اندر جھانکا۔ سفید رنگ کی چھیاسی ماڈل کی کار دکھائی دی۔ اسے میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ پہلی نظر میں ہی پتا چل گیا تھا کہ کار کسی کے ذاتی استعمال کی ہے، بہ طور ٹیکسی اسے استعمال نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ کرایہ پر چلائی جانے والی کاروں کے ڈرائیور بڑے من موجی واقع ہوتے تھے۔ وہ پچھلے بمپر اور سائلنسر کے ساتھ رنگ برنگے کپڑے کی پھمن دار جھنڈیاں باندھ رکھتے تھے اور اسے اپنے پیشے کے فرائض میں شمار کرتے تھے۔ ونڈ اسکرین، فرنٹ گلاس اور چاروں مڈ میٹس پر چمک پٹی (ری فلیکٹڈ ٹیپ) کے ساتھ اپنا نام، کار کا 'نک نیم' اور اپنے قلبی احساسات سے میل کھاتا ہوا کوئی 'یونیورسل جملہ' لکھوانا بھی ڈرائیوروں کی پیشہ وارانہ عادات کا حصہ تھا۔ دور سے دیکھنے پر ہی پتا چل جاتا تھا کہ یہ کار بہ طور ٹیکسی استعمال کی جاتی ہے۔

کار میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ جو بھی آیا تھا، وہ جیت شاہ کے حجرے میں پہنچ گیا تھا۔ پارکنگ میں جیت شاہ کی سرخ رنگ کی کار بھی موجود تھی جو اُس کی موجودگی کی خبر دیتی تھی۔ یہ بھی چھیاسی ماڈل کی کرولا کار تھی۔ اس کا بونٹ سیاہ رنگ کا تھا۔ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کھالے نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس کار کا مین ایکسی ڈنٹ ہوا تھا اور اس کا بونٹ اس حد تک خراب ہو گیا تھا کہ ڈینٹر نے بجائے مرمت کرنے کے، لاہور سے نیا منگوا کر ڈال دیا تھا۔ منگوائے جانے والے سیاہ بونٹ پر سفید میچنگ کلر کیا جانا ضروری تھا جو کسی نامعلوم وجہ سے نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس لیے گاڑی کا یہ ڈیزائن جن گیا تھا اور پھر یوں یہ کار علاقے بھر میں دل جیت شاہ کے نام سے موسوم ہو کر معروف ہو گئی تھی۔ پیسے کی کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود شاہ سائیں نے اس پر ابھی تک رنگ کا فوارا نہیں پھروایا تھا۔

میں پنجوں کے بل اُٹھ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ بغیر آواز پیدا کیے پارکنگ میں اتر گیا۔ فرش پر پختہ اینٹوں کا چورا ڈالا ہوا تھا جس کی وجہ سے فرش کا رنگ سرخی مائل زرد تھا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ بارش کے بعد مٹی پیروں کے ساتھ چپکتی نہیں تھی۔ مزار کے صحن کا فرش پکا تھا۔ میں نے کار کی نمبر پلیٹ پر نگاہ ماری۔ نمبر بڑا عجیب سا تھا: ٹرپل تھری......، ایسے نمبر یاد رکھنے کی کوشش کے بغیر ہی ازبر ہو جاتے ہیں۔ سائیں جی کی سرخ کار کے آگے سے گزر کر میں ہال کی کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر جھانکا، بہت تھوڑی روشنی کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ تمام کی تمام صفیں خالی پڑی ہیں۔ شاہ سائیں کی چبوترا نما مسند بھی خالی پڑی تھی۔ دائیں کونے میں خاص حجرے کے ادھ کھلے دروازے سے دودھیا روشنی برآمد ہو رہی تھی۔ اسی روشنی کی وجہ سے ہال کے اندر کا دھندلا سا منظر مجھے دکھائی دیا تھا۔

کمرے میں کوئی موجود تھا، یہ تو طے ہو گیا مگر کون؟ یہ اندازہ نہیں تھا۔ میں بڑے انہماک سے کھڑکی کے اندر جھانک رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں پھر کار کے انجن کی گھر گھراتی آواز پڑی۔ میں چونک گیا۔ جلدی سے پارکنگ کے جنوب مشرقی کونے میں گیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ فصلوں کے اوپر روشنی تیر رہی تھی۔ کوئی کار یا جیپ میری گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے سوچنے میں کوئی وقت ضائع کیے بغیر دیوار پھاند کر خود کو محفوظ کر لیا۔ چند لمحوں کے بعد دیوار کے اوپر رقص کرتی ہوئی روشنی نے مجھے سمجھا دیا کہ کوئی اور گاڑی دربار کی چار دیواری میں داخل ہو گئی ہے۔ گاڑی کے انجن کے بند ہونے، دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی مخصوص آوازوں کی مدد سے میں نے اندازہ لگایا کہ آنے والے گاڑی سے اُتر کر ہال میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا تو میں نے چار دیواری کے اوپر سے جھانکا۔

سوائے سفید رنگ کی ایک پوٹھوہار جیپ کے اضافے کے، کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ جیپ ٹرپل تھری نمبروں والی کار کے متوازی کھڑی کی گئی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس وقت شاہ جی کے ہاں کون لوگ آئے تھے اور اُنہیں کون سی احتیاج رات کے اس پہر میں یہاں کھینچ لائی تھی۔ میں پھر دیوار پر چڑھا۔ اندر کودنا ہی چاہتا تھا کہ پھر فصلوں کی سبز زمین پر روشنی تھرکنے لگی۔ میں دیوار سے اُترا اور چپک کر کھڑا ہو گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک اور گاڑی دربار کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ چونکہ میں جہاں کھڑا تھا، وہیں پر کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑنا ناگزیر تھی، اس لیے

میں فوراً نیچے ہو گیا۔ جب کار کا انجن بند ہوا، میں نے سر اوپر اُٹھا کر دیکھا۔ دو آدمی سفید رنگ کی چھہتر ماڈل کی کرولا کار کے اگلے دروازے کھول کر باہر نکل رہے تھے۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ دروازوں کو صرف بند کیا گیا، مقفل نہیں، پھر آگے پیچھے چلتے ہوئے دونوں نو وارد ہال میں گھس گئے۔ ان میں سے ایک قدرے پستہ قامت جبکہ دوسرا عام قد و قامت کا شخص تھا۔ پستہ قامت شخص کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اُن کے انداز و اطوار سے عیاں تھا کہ وہ نہ صرف اس علاقے سے بخوبی آگاہ تھے بلکہ مزار کی حدود میں بھی کئی مرتبہ آنے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

ایک کار کی آمد تو حادثاتی طور پر بھی ممکن تھی مگر ایک ہی وقت میں، جب سارا نور پور خوابیدہ تھا، تین گاڑیوں کا یہاں آنا اچنبھے کی بات تھی۔ کچھ ایسا ضرور تھا جس کی پردہ داری کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر اور انتظار کیا، مبادا کہ کسی اور گاڑی کو آنا ہو، پھر تسلی ہونے پر میں حرکت میں آ گیا۔ جوتے اُتارے، دیوار پھاندی اور آواز پیدا کیے بغیر خاص حجرے کی بیرونی کھڑکی کا قصد کیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چور نہیں تھا مگر چوروں کی طرح قدم اُٹھا رہا تھا۔

ہال کی نکڑ پر کچھ دیر ٹھہرا، سن گن لینے کی کوشش کی اور محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر میری مطلوبہ کھڑکی ایستادہ تھی جو یقینی طور پر بند تھی۔ کیونکہ، اگر کھلی ہوتی تو روشنی ضرور جھلکتی۔ بلی کی سی چال چلتے ہوئے میں کھڑکی تک پہنچا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ ماسوائے مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کے، کچھ سنائی نہ دیا۔ کھڑکی کے طاق پوری طرح بند تھے اور اندر بیٹھے ہوئے افراد بھی نسبتاً دھیمی آواز میں محو گفتگو تھے۔ میں نے اپنی قوت سماعت پر ذہن کو مرتکز کیا، پھر بھی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حجرے کے ہال میں کھلنے والے دروازے تک جانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

میں مایوس ہو کر پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ ناگاہ میری نگاہ چار دیواری کے اُس حصے پر پڑی جہاں میں کچھ دیر پہلے کھڑا ہو کر صحن میں جھانک رہا تھا۔ جنگل کی جانب واقع اس دیوار کے سامنے پگڈنڈی واقع تھی جس پر چل کر میں پارکنگ کے عقبی حصے تک پہنچا تھا۔ وہاں مجھے دیوار کے اوپر اُبھرا ہوا انسانی سر دکھائی دیا تھا جو فوراً غائب ہو گیا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسے ہی وقت میں حجرے سے ایسی آوازیں برآمد ہونے لگیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ محفل برخاست ہو رہی ہے۔

یہ بہت برا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے کھڑکی سے کان لگائے کھڑا دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ محفل کے برخاست ہوتے ہی میں بھاگ کر جنگل کی طرف والی دیوار پھلانگ جاؤں گا۔ اب پریشان ہو گیا تھا کہ اُدھر کوئی موجود تھا جو میری یا میری طرح سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیوں اور ناوقت کی نقل و حرکت کو مانیٹر کر رہا تھا۔

میں تیزی سے چلتا ہوا ہال کی نکڑ کراس کر گیا۔ میں نے دیوار کے ساتھ چپک کر ہال کی کھڑکی میں جھانکا۔ پانچ چھ بندے ایک وفد کی صورت میں چلتے ہوئے ہال کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ میرے دیکھ لیے جانے کا شدید خطرہ تھا۔ میں جھک کر آگے کی طرف دوڑا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں دیوار تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ ہال کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی شاہ سائیں کی کار کے ڈرائیور گیٹ کے ساتھ چپک کر بیٹھنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ میں نے دیر نہیں کی اور چھپ گیا۔ میں کسی کو دیکھ سکتا تھا نہ کوئی مجھے چھپا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

اچانک خوف کی سرد لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اگر شاہ سائیں بھی مہمانوں کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی گاڑی کی طرف آ جائے تو کیا ہوگا؟ اس صورت میں میری پوشیدگی کا راز افشا ہو جائے گا اور مجھے پکڑ کر 'چور' بنا دیا جائے گا۔ میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے تھوڑا اوپر اُٹھ کر دیکھا۔ کار کے شیشوں کی وجہ سے سوائے اپنے چہرے کے، کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مجبوراً پھر دبک گیا۔

خیر گزری کہ شاہ سائیں یا تو باہر آیا ہی نہیں تھا یا جانے والوں کو الوداع کہہ کر واپس چلا گیا۔ چند منٹوں میں میدان صاف ہو گیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ تینوں گاڑیاں گیٹ عبور کر گئی ہیں تو کار کی اوٹ سے نکل آیا۔ تب یاد آیا کہ میں برہنہ پا تھا اور میرے جوتے کھڑکی کے قریب دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ اگر کسی کا دھیان اس طرف چلا جاتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا اور میری تلاش کا عمل شروع ہو جاتا۔ میں جلدی سے اپنے جوتے پہن کر دیوار کے اُس پار کود گیا۔

دھیان بٹ چکا تھا۔ جیت شاہ کے پاس رات کے پچھلے پہر میں چوروں کی طرح آنے والے کون تھے؟ میری طرح اُس کی جاسوسی کرنے والا کون تھا؟ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا توقع کر رہا تھا کہ جونہی میں نکڑ کا موڑ مڑوں گا، وہ شخص مجھے نظر آ جائے گا۔ میں نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا اور نکڑ پر جا کر رُک گیا۔ دیوار کے ساتھ چپک کر دوسری جانب جھانکا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ چلا گیا تھا یا کہیں چھپ گیا

تھا۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا جنگل کی طرف بڑھا۔

جونہی میں جوہڑ کے کنارے پر پہنچا، مجھے بے اختیار رُکنا پڑا۔ بڑے کیکر کے تنے کی اوٹ میں کوئی میرا منتظر تھا۔ نہایت کم روشنی کے باوجود مجھے اُس کا سفید لباس اور غیر معمولی بلند قامت دکھائی دے گئی۔

وہ آدھا چھپا ہوا تھا، آدھا عیاں تھا۔ میں نے ہولے سے پکارا۔ ''اے! کون ہو تم؟''

مجھے اپنی آواز میں لرزش کا احساس ہوا۔

وہ اچانک سامنے آ گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''خان جی! آپ؟''

وہ بخت خان تھا۔ میری حیرت بجا تھی کیونکہ اُس جیسے وضع دار اور نوابانہ مزاج رکھنے والے آدمی کا ایسی جگہ پر پایا جانا، چوروں کی طرح تاکا جھانکی کرنا بڑا معیوب اور غیر متوقع عمل تھا۔

''ینگ مین! تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''وہ جی...... مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا، تھوڑا گھوم پھر لوں تو تھک کر سو جاؤں گا۔ اِدھر آیا تو کاروں کی بے موقع آمد نے تجسس پیدا کر دیا اور میں دربار میں، یہ دیکھنے کے لیے کہ اس وقت کون آیا ہے، چلا آیا۔ مگر آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں خان جی؟'' میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہی سوال داغ دیا۔

''میں تو اکثر رات کو یہاں آتا رہتا ہوں۔'' وہ مسجد کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر سست قدموں سے چل پڑا۔ میں نے بھی مجبوراً ساتھ دیا۔ وہ رُک کر، اپنی پہلو والی جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگانے لگا۔ کش لگا کر بولا۔ ''تم نے کیا دیکھا؟''

''سفید کلر کی دو کاریں اور ایک جیپ۔''

''کاروں کے نمبر یاد ہیں؟''

''جی۔ ایک کا نمبر ٹرپل تھری تھا جبکہ جیپ کا بائیس پندرہ تھا۔ تیسری کار کا نمبر پڑھا نہیں جا سکا۔ عجیب ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں نمبر لکھے ہوئے تھے۔'' میں نے تفصیلاً بتایا۔

''لوگوں کو دیکھا؟'' اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی خان جی...... بس ایک جھلک دیکھ پایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کتنے تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ پانچ...... یا شاید چھ تھے۔''

''کسی کا چہرہ دیکھا؟'' اُس نے کریدا۔

''جی! ایک شخص کی محض ایک جھلک دیکھی تھی۔ باقی لوگوں کو اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ پایا۔''

''جسے دیکھا، اُس کا حلیہ بتاؤ۔''

میں نے بلاکم و کاست بتا دیا، وہ بولا۔ ''کیا دوبارہ دیکھ کر پہچان لو گے؟''

میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''ہاں! اُسے تو میں ضرور پہچان لوں گا۔''

''کیا کبھی پہلے بھی اس طرف رات کو نکلے ہو؟''

''نہیں خان جی! آج پہلی مرتبہ اِدھر آیا ہوں۔ یہ کون لوگ تھے؟''

''میں انہیں جانتا نہیں ہوں مگر یہ جانتا ہوں کہ یہ لوگ ہر بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات کو یہاں باقاعدگی سے آتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''یہ یہاں کیا کرنے آتے ہیں؟'' میرا تجسس جاگ اُٹھا۔

''یہی دیکھنے کے لیے تو میں یہاں آتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔

میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مسجد اور اپنے پرانے متروکہ گھر تک آ گیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ گھروں کے آگے تھڑوں پر پالتو کتے لم لیٹ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک آدھ نے سر اُٹھا کر ہمیں دیکھا اور پہچان کر نظرانداز کر دیا۔

''آئندہ اِدھر نکلو تو اپنے ساتھ کھالے کو بھی لے آنا۔ وہ تم سے زیادہ چالاک اور ہوشیار بندہ ہے۔ اگلے بدھ کی رات کو یہ فیصلہ کریں گے کہ آنے والوں کے مقاصد کو کیسے طشت ازبام کرنا ہے۔ بہرحال! یہ طے ہے کہ سائیں جیت شاہ اور اس کے ملاقاتیوں کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ یہاں کوئی بڑے پیمانے پر غلط کام ہو رہا ہے۔ تعویذوں والا ڈراما تو محض پردہ ہے۔ پس پردہ جو کچھ بھی ہے، بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔'' بخت خان نے کہا اور میرے شانے پر تھپکی دی۔

میں اُس کا اشارہ سمجھ گیا اور پلٹ کر جوہڑ والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ میرا رُخ اپنے گھر کی جانب تھا۔

اگلے دن میں کھالے سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ میرے پاس مزے کی خبر تھی۔ شام کو جب فراغت ملی تو میں اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنی نگرانی میں شیدو سے ویگن کی صفائی کروا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''مسات! آج میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں نہیں جاؤں گا۔''

'مسات' سرائیکی میں خالہ زاد کو کہتے ہیں۔ جب بھی کھالا ترنگ میں ہوتا، مجھے مسات یا سوتر (چچا زاد) کہہ کر پکارتا تھا۔

مجھے اچنبھا ہوا۔ ”کیوں مگر؟“

”گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔“ اُس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

”تمہیں دیکھنے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یار!“ اُس نے بتایا۔

میں اُس کا بازو پکڑ کر، کھینچ کر اُس کے باپ کی دکان کے باہر پڑی جھلنگا سی چارپائی پر آ گیا، پوچھا ”اگر وہ تمہیں پسند کر کے ’ہاں‘ کر دیتے ہیں تو اسما کا کیا بنے گا؟“

وہ عجیب احمقانہ انداز میں ہنس دیا۔

میں نے غصہ بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“

اُس کا سر جھک گیا۔ چہرے پر یکبارگی یاس اور نااُمیدی نے ڈیرا ڈال دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”اسما کا کیا بننا ہے؟ اُس کے ساتھ میری شادی زندگی میں تو کیا، اگلے جہان میں بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر پوری دُنیا کے مرد باجماعت خودکشی کر جائیں اور تمہارا یار ’کھالا‘ تن تنہا مرد رہ جائے تو وہ تب بھی میرے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔“

وہ شکست خوردہ آواز میں میری کہی ہوئی باتیں دہرا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ ”تو پھر ملتان کے پھیرے کیا ہوئے؟ وہ خط کیا ہوا جو تم نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کے حوالے کیا تھا؟“

اُس کے جواب نے مجھے دم بہ خود کر دیا۔ ”وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں دل کے کہے میں آ جاتا ہوں ورنہ میں جانتا ہوں کہ اُس کا اور میرا میل قسمت میں نہیں ہے۔ میں اور میرا عشق تو اندھا ہو سکتا ہے مگر لیکھ کی آنکھیں اندھی نہیں ہو سکتیں۔“

”اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ، اُس کی طرف سے کوئی ردِعمل دیکھنے میں آیا؟“

”اسما کی طرف سے؟“

”ہاں!“

”نہیں۔ دل سارا دن ڈرتا رہا کہ اچانک دو چار بندے آئیں گے اور مجھے اُٹھا کر کہیں ویرانے میں لے جائیں گے، قتل شتل کر کے پھینک دیں گے مگر کوئی ایسا واقعہ تمہارے خوش نصیب یار کے ساتھ پیش نہیں آیا۔“ اُس نے کہا۔ وہ عادت کے مطابق فی الفور مایوسی کے حصار سے نکل آیا تھا۔

”میرے پاس بڑی چونکا دینے والی خبر ہے کھالے! سنو گے تو ہوش اُڑ جائیں گے۔“

”شموں کے بارے میں؟“ اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”لعنت ہے تمہاری گندی سوچ پر۔“ میں نے بھڑک کر کہا۔ ”میں رات کو سائیں جیت شاہ کے مزار پر گیا تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو بجے کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا......“

میں نے رات کی مکمل کارگزاری من و عن بیان کر دی۔

وہ گہری سوچ میں غرقاں ہو گیا۔

میں نے ٹھوکا دیا۔ ”ابے گدھے کی دُم! زبان تالو کے ساتھ چپک گئی کیا؟“

”شہرے! مجھے تو کوئی لمبا چکر لگتا ہے۔“ اُس کی آواز بہ وقت تمام برآمد ہوئی۔ ”خان نے اُس دن اشارہ بھی کیا تھا اس معاملے کی طرف مگر ہم نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ خود بھی ٹوہ لگا رہا ہے تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ سائیں جی بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم آئندہ رات کو مزار کی طرف نہیں جاؤ گے۔ سمجھے؟“

میں نے کہا۔ ”مگر خان جی نے کہا ہے کہ بدھ کی رات کو تمہیں بھی ساتھ لے کر وہاں پہنچوں۔“

”گولی مارو خان کو۔“ اُس نے جھنجلا کر کہا۔ ”وہ بڑا آدمی ہے، اُس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ مارے تو ہم جائیں گے جن کا نہ کوئی آگے ہے نہ کوئی پیچھے۔ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑائیں گے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ ناں بابا ناں! مجھے تو ایسے کارناموں سے دور ہی رکھو۔“

اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر مجھے ڈرانے کی بھرپور کوشش کی مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے کہا۔ ”نہیں یار! دیکھنا تو چاہیے کہ ہمارے گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔ بخت خان ہمارے ساتھ ہو گا، پھر ہمیں ڈرنے کی ضرورت کیا ہے۔“

وہ نہیں مانا مگر مجھے یقین تھا کہ میں اُسے قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ہم ابھی کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتے تھے مگر اُس کے باپ نے اپنی زوردار آواز میں اُسے گھر بلا لیا۔ کھالا مجھ سے ہاتھ ملا کر جھینپتا ہوا اسپتال چلا گیا اور میں اُٹھ کر اسپتال کی طرف چل پڑا۔ یہ رپورٹ ڈاکٹر شاہ جی کے گوش گزار کرنا بھی میرے نزدیک بے حد ضروری تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میری کہانی کو بڑے انہماک سے سنا۔ پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ مزار پر یا تو منشیات کا وسیع پیمانے پر دھندا ہو رہا ہے یا ناجائز اسلحے کا چکر ہے۔ کوئی اور چکر بھی ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے اُن لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ دیکھا؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کوئی جملہ کانوں میں پڑا؟“

”نہیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ہمیں ابھی اس موضوع پر بہت سی باتیں کرنا تھیں مگر دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ میں دروازے پر آیا۔ باہر زیناں کے باپ ماسٹر ولی محمد کو کھڑے پایا۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”خیر تو ہے اُستاد جی؟“

وہ بولا۔ ”ہاں پتر! خیر ہی ہے۔ ویسے ہی، جی چاہا تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے چلا آیا۔ اندر موجود ہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُسے لے کر ڈاکٹر شاہ جی کے کمرے میں آ گیا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر میں چائے بنا لایا۔ ہم تینوں نے چائے پی لی تو ماسٹر جی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے کچھ کہنے کے لیے آیا ہوں۔“

ڈاکٹر شاہ جی نے کہا۔ ”جی ضرور...... حکم کیجیے۔“

ماسٹر جی نے میری طرف دیکھا، پھر ہولے سے کہا، ”آپ شہریار پتر کی بات سن لیں، میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں اُستاد جی! مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ آپ بات کریں، میں چلتا ہوں۔“

وہ تخلیہ چاہتا تھا اور مروت کے مارے مجھے یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں۔ میں برتن کچن میں رکھ کر کوٹھی سے نکل آیا۔ ابھی سیڑھیاں اُترا ہی تھا کہ فطری تجسس نے آن دبوچا۔ ماسٹر جی ایسی کون سی بات کرنے آئے تھے جس کے لیے تنہائی ضروری تھی؟ میں بے اختیار روش سے اُتر کر لان میں آ گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر شاہ جی کے کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر ہونے والی گفتگو کا لفظ لفظ بہ آسانی سنائی دے رہا تھا۔ میں دیوار کی جڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ حسنِ اتفاق تھا کہ یہ جگہ اسپتال میں ہر آنے جانے والے کی نظروں سے پوشیدہ تھی کیونکہ کوٹھی کے اس حصے کو لان کے پودوں نے چھپا رکھا تھا۔

ٹی وی سے پھوٹتی ہوئی آوازوں کے بیچ سے ڈاکٹر شاہ جی کی آواز سنائی دی۔ ”ماسٹر صاحب! آپ جو کہنا چاہتے ہیں، کھل کر کہیں۔ میں پوری توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید ماسٹر جی الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا۔ ”زیناں کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“

”وہ تو اب بالکل ٹھیک ہے۔ اُس نے لاٹھی بھی چھوڑ دی ہے۔ آسانی کے ساتھ گھر کے کام کاج کر لیتی ہے۔“ ماسٹر جی نے کہا۔

”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟“

”میں کچھ ذاتی نوعیت کی باتیں آپ کے ساتھ شیئر کرنے آیا ہوں۔“ ماسٹر ولی محمد شاید ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ ڈاکٹر شاہ جی سے دل کی بات کہے یا خاموشی سے اُٹھ جائے۔

ڈاکٹر شاہ جی نے اُٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ بات سننے میں جو تھوڑی سی مشکل پیش آ رہی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ ماسٹر جی نے مدعا بیان کرنے کے لیے اپنے خاندانی پس منظر کو اجاگر کرتی لمبی تمہید باندھی، پھر کہا۔ ”میں ان دنوں اپنی بیٹیوں کے لیے پریشان ہوں۔ میری برادری میں بچوں کو پڑھانے کا رواج ہے تو سہی مگر کم کم۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی کا رشتہ کسی پڑھے لکھے اور باشعور انسان کے ساتھ ہو جائے۔ میں نے اپنے ایک شاگرد جو ان دنوں کوٹ ادو والے گرڈ اسٹیشن میں الیکٹریشن ہے، کے ساتھ زیناں بیٹی کی منگنی اسی وجہ سے کر دی تھی۔ اُس کی تنخواہ کم ہے مگر میں نے پروا نہیں کی، یہ سوچا کہ وہ پڑھا لکھا اور باشعور تو ہے۔ برادری والوں کی کڑوی باتیں بھی اس وجہ سے برداشت کر لیں۔“

میری طرح ڈاکٹر شاہ جی بھی اُس کا مدعا بھانپ نہیں پایا تھا۔ قدرے استعجاب سے سوال کناں ہوا۔ ”تو پھر اب مسئلہ کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”اب اشفاق نے منگنی توڑنے کا پیغام بھیج دیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ زیناں کو بج لگ گیا ہے۔ ’بج‘ سمجھتے ہیں ناں ڈاکٹر صاحب آپ؟“ اُس نے ڈاکٹر صاحب کا جواب لیے بغیر اپنا بیان جاری رکھا۔ ”ہماری زبان میں عیب کو ’بج‘ کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کا نقص زندگی بھر نہیں جاتا۔ کیا وہ ٹھیک کہتا ہے ڈاکٹر صاحب؟“

”اوہ نو!“ ڈاکٹر شاہ جی کی افسوس بھری آواز سنائی دی۔ ”اسے کسی نے مس گائیڈ کیا ہے۔ اگر مہرا ٹوٹ جائے، کریک ہو جائے یا اپنی جگہ سے کھسک جائے تو مشکلات پیش آتی ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کیا کریں ماسٹر جی کہ آپ کی بیٹی کی ریڑھ کی ہڈی بالکل محفوظ رہی ہے۔ اُمید ہے کہ اُس کی زندگی میں کوئی پرابلم کری ایٹ (Create) نہیں ہو گی۔“

”میں تو آپ کی بات پر یقین رکھتا ہوں مگر وہ نہیں مانتا۔“

”اسے میرے پاس لے آئیں۔ میں اُسے سمجھانے کی

کوشش کروں گا۔ پڑھا لکھا ہے، امید ہے کہ میری بات سمجھ جائے گا۔“

”وہ مجھ سے ملنے اور میری بات سننے کا روادار تک نہیں رہا ڈاکٹر صاحب! میں اُسے کیسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں؟“ ماسٹر جی کے لہجے سے دُکھ اور بے بسی عیاں تھی۔

”تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اُس کے پاس جاؤں اور اُسے زیناں کی بیماری کے بارے میں بریفنگ دوں؟“ ڈاکٹر شاہ جی کی آواز آئی۔

اچانک میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ میں تڑپ کر اُٹھا اور اپنی دائیں ران کے اندرونی حصے کو ہاتھ کے ساتھ رگڑنے لگا پھر شلوار کو جھٹکنے لگا۔ کوئی چیونٹا یا کیڑا مکوڑا اپنی سلطنت میں میری دخل اندازی کے سبب برانگیختہ ہو کر میری ٹانگ پر چڑھ گیا تھا جس نے گھٹنے سے کچھ اوپر ران پر اس زور سے کاٹا تھا کہ درد کی کٹیلی لہر میرے پورے بدن میں پھر گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔

شکر ہوا کہ میری سسکی اور شلوار جھٹکنے سے پیدا ہونے والی آواز اندر بیٹھے ہوؤں تک نہیں پہنچی تھی یا پہنچی تھی تو اُنہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ لان میں کالے رنگ کے موٹے چیونٹوں کی راجدھانی قائم تھی۔ میں نے کئی مرتبہ کیڑے مار پاؤڈر چھڑکا تھا مگر وہ چند دنوں کے غیاب کے بعد پھر دندنانے لگتے تھے۔

وہ یقیناً کوئی صحت مند چیونٹا ہی تھا کیونکہ کچھ ہی دیر میں درد اُڑن چھو ہو گیا تھا۔ اگر کاٹنے والا کیڑا زہریلا ہوتا تو چبھن اور درد میں کمی واقع نہ ہوتی۔ تنہائی میں ہونے والی گفتگو کے کئی قیمتی ڈائیلاگ اس ایمرجنسی کی نذر ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی توجہ دوبارہ مرکوز کی۔

ماسٹر جی کہہ رہے تھے۔ ”......نہیں جی! میں نے اشفاق کے فیصلے کو قبول کر لیا ہے۔ دیکھیں ناں جی! میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا نازک بھی ہوتا ہے۔ اچھا ہوا کہ اُس کی فطرت رخصتی سے پہلے ہی میرے سامنے آ گئی۔“

”پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟“ ڈاکٹر شاہ جی نے پوچھا۔

میں حیران ہوا کہ شاہ جی اتنی دیر تک بے سروپا بات چیت کی بھول بھلیوں میں چکرانے کے باوجود ابھی تک نرمی سے محوِ کلام تھا۔ یہ نرمی اُس کی فطرت کا خاصہ نہیں تھی۔ شاید ماسٹر جی کی عمر کا لحاظ کیے ہوئے تھا۔

”میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب! کہ زیناں جیسی حساس لڑکی کو اشفاق کے پلے باندھنا کسی بھی طور سے مناسب نہیں ہے۔ آپ کئی مرتبہ زیناں سے مل چکے ہیں، وہ آپ کے زیر علاج رہی ہے، آپ ہی بتائیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں۔ آپ کا کہا بجا ہے مگر ایک چھوٹی سی غلط فہمی ہے سامنے آنے والے ردِعمل کو جذباتی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔“

”آپ بتائیں، آپ نے زیناں بیٹی کو کیسا پایا؟“ ماسٹر جی نے سوال کیا۔

”وہ بہت اچھی اور فرمانبردار بچی ہے۔ باشعور ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس نے بڑی دلیری کے ساتھ اپنے ساتھ درپیش آنے والے عارضے کو فیس کیا ہے۔ یہ خوبی خواتین میں ناپید ہے۔ مگر ماسٹر جی! میں آپ کی اس طویل گفتگو سے کوئی بھی نتیجہ اخذ نہیں کر پایا۔ آپ میرے پاس کیوں تشریف لائے ہیں؟“

میری توقع کے عین مطابق ڈاکٹر شاہ جی اپنی فطرت کی طرف لوٹنے لگا تھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے زیناں نے بتایا تھا کہ آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری برادری اور ملنے جلنے والوں نے یہ باتیں پھیلانا شروع کر دی ہیں کہ میری بیٹی شادی کے قابل نہیں رہی۔ ریڑھ کی ہڈی کا نقص مرتے دم تک بندے کی چوک (دامن) نہیں چھوڑتا۔ مگر آپ چونکہ ڈاکٹر ہیں، آپ نے اُس کا علاج کیا ہے اور جانتے ہیں کہ لوگوں کی یہ باتیں بے سروپا ہیں۔ میں آپ کے پاس درخواست لے کر آیا ہوں کہ آپ میری شودھی (بے چاری) بیٹی کا ہاتھ تھام لیں۔“ ماسٹر جی کی آواز آخری الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی بھرا گئی۔ اُس نے جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا اور بلاشبہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے کسی بھی لڑکی کا باپ شرم سے آدھا مر جاتا ہے۔ مجبوری نے اُسے بھی ندامت بھری دہلیز پر لا جھکایا تھا۔

میرے کانوں میں ڈاکٹر شاہ جی کی استعجاب بھری بلند آواز پڑی۔ ”واٹ؟ ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ماسٹر صاحب؟“

جواباً ایک کٹھن خاموشی چھا گئی۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی حالتِ زار کی خبر نہیں تھی کہ ماسٹر جی کا آخری جملہ سن کر اُس پر کیا بیتی۔ ہاں البتہ جو مجھ پر گزر رہی تھی، وہ بڑی دردناک اور غیر متوقع تھی۔

معاشرتی ناہمواریوں سے مزین دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

”کیا یہ عقلمندی تھی میری!“ خاکستری بالوں والی باوقار عورت نے پوچھا جو اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

میری جونسن کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تم کون سی عقلمندی کی بات کر رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”یہی کہ اپنے کیش بکس کو یہاں باہر لانا اور اسے ایک گروسری ڈیلیوری مین کے سامنے اس طرح کھول کے رکھ دینا۔“ ہیزل فنچ نے کہا۔

”اوہ! میں ایک ایماندار چہرے کو ہمیشہ پہچان لیتی ہوں اور اس شخص کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک نہایت ایماندار شخص ہے۔ مجھے چہرہ شناسی کبھی دھوکا نہیں دیتی۔“ میری جونسن نے جواب دیا۔

”ویل، پھر بھی......“ یہ کہہ کر ہیزل کمرے میں موجود تیسری عورت کی جانب گھوم گئی۔ ”زینی، کیا تم نے میری کو چوری کی ان حالیہ وارداتوں کے بارے میں نہیں بتایا جو اس علاقے میں ہوئی ہیں؟“

زینی جیکب نے اپنے ڈائی کیے ہوئے سرخ گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی۔ ”یقیناً بتایا ہے۔ قدرتی طور پر میں اس بات کو سمجھتی ہوں کہ وہ اپنے اس چھوٹے اور کیوٹ سے مکان میں تنہا رہنے کو پسند کرتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایک اپارٹمنٹ کمپلیکس زیادہ محفوظ جگہ ہے۔ ایسی ہی کوئی جگہ



جیسی کہ تمہاری رہائش ہے۔ کم از کم اس جگہ تمہاری اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مشترکہ دیواریں تو ہوتی ہیں۔“

”اور دن رات ان کا شور و غل برداشت کرتے رہو۔“ میری نے کہا۔ ”میں ایک ساٹھ سالہ بیوہ ضرور ہوں لیکن میں اپنی حفاظت بہ خوبی کر سکتی ہوں۔“ اس کے لہجے سے حوصلے کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ہم سب ساٹھ سالہ بیوائیں ہیں۔“ زینی جیکب نے کہا۔ ”اسی لیے تو میں اور ہیزل فکرمند ہیں۔ برینٹ ووڈ برگلر کی شکار تمام عورتیں ہماری ہی عمروں کی تھیں۔“

”برینٹ ووڈ برگلر؟“ میری مسکرا دی۔ ”کیا بے وقوفانہ سا نام ہے۔“

ہیزل کی تیوریوں پر بل آ گئے۔ ”یہ نام مضحکہ خیز ضرور لگتا ہے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ نقدی، زیورات اور دیگر بہ آسانی لے جانے والی قیمتی اشیا چراتا ہے اور اسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔“

”ویل، کم از کم وہ ایک پرامن چور ہے اور کسی پر تشدد نہیں کرتا اور مجھے شبہ ہے کہ وہ ڈیلیوری مین ہی حقیقت میں وہ چور تو نہیں۔“

اپنے اپارٹمنٹ واپس پہنچ کر ہیزل نے اپنے دروازے کی کنڈی گھماتے ہوئے اندر سے تالا لگا دیا۔ ”آج کل احتیاط بہت ضروری ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ کیا پتا کوئی اندر گھس آئے جبکہ کسی کو کسی کے آنے کی توقع ہی نہ ہو۔

وہ تیزی سے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ اس نے کھڑکیوں کے پردے گرا دیے اور اپنی سنگار میز کی سب سے نچلی دراز باہر نکال لی۔ پھر اس نے دراز کی خالی جگہ میں ہاتھ ڈال کر خفیہ خانے کو تلاش کیا اور اس میں رکھا ہوا اپنا خفیہ خزانہ باہر نکال لیا۔

یہ جوئیلری سے بھرا ہوا ایک وزنی بیگ تھا جس میں گزشتہ پانچ وارداتوں میں چرایا ہوا مال پوشیدہ تھا۔

”کاش میں تم میں سے چند عمدہ نمونوں کو فروخت کر سکتی۔“ ہیزل نے حسرت سے کہا۔ ”لیکن مجھ میں حوصلہ نہیں، کم از کم میں مقامی کسی بھی مارکیٹ میں تمہیں فروخت نہیں کر سکتی۔ نہیں، مجھے تم سب کو اس ریاست سے باہر لے جانا ہوگا اور اسی لیے مجھے میری جونسن کے کیش بکس کی ضرورت ہے جس میں نقدی بھری ہوئی ہے۔ بہ طور ویٹرس اپنی حقیر آمدنی سے میں اپنے پسندیدہ عمدہ ملبوسات اور کھانے پینے کے اخراجات پورے نہیں کر سکتی چہ جائیکہ سیر و تفریح کے اخراجات۔“

ہیزل کی انگلیاں ان زیورات کو باری باری ٹٹول رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگی کہ یہ برا ہوا، میری جونسن زینی جیکب کی دوست ہے لیکن وہ اس معاملے میں اس سے کوئی رعایت نہیں کر سکتی تھی۔

غلطی میری جونسن کی تھی۔ اسے یوں کھلے عام اپنی جمع شدہ بھاری نقدی کی نمائش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کسی کو اپنی ذات میں اس حد تک مگن اور اپنے بارے میں اتنا پراعتماد ہرگز نہیں ہونا چاہیے اور میری جونسن کو میری عرفیت کا مذاق بھی ہرگز نہیں اڑانا چاہیے تھا، ہیزل نے سوچا۔ بہ طور ”دی برینٹ ووڈ برگلر“ شہرت حاصل کرنا اسے بے حد پسند آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کا آنجہانی پیارا شوہر زندہ ہوتا تو اسے بھی یہ نام بے حد پسند آتا۔

اس سے قبل جب وہ دونوں میاں بیوی وارداتیں کیا کرتے تھے تو ان کی شہرت ”ہاٹ ہینڈڈ ہیزل“ اور ”ایزی ان ایڈورڈ“ کے ناموں سے تھی۔ پھر ایڈورڈ مر گیا تھا اور اسے تنہا وارداتیں کرنا پڑی تھیں۔ لیکن ایک ماہ کے اندر ہی وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اور اسے جیل جانا پڑا تھا۔ البتہ رہائی کے کچھ عرصے بعد اس کے پاس نہ صرف پیسا باقی رہا تھا بلکہ اپنی پرانی زندگی کی ولولہ انگیزی کی کمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”ایک اور واردات!“ ہیزل بڑبڑائی۔ ”پھر میں تعطیلات منانے نکل جاؤں گی اور ان چھوٹے قیمتی نمونوں کے عوض ڈھیر سارے ڈالرز حاصل کر لوں گی۔“

اس نے تمام جوئیلری واپس بیگ میں رکھ دی اور بیگ کو دوبارہ دراز کی خالی جگہ میں بنے ہوئے خفیہ خانے میں رکھ دیا۔ پھر دراز دوبارہ سنگار میز میں اس کی مقررہ جگہ پر کھسکا دی۔

کل شب ریسٹورنٹ میں اس کی چھٹی تھی جہاں وہ بہ طور ویٹرس کام کرتی تھی۔ میری جونسن اور زینی جیکب کسی میوزیکل شو میں مدعو تھیں اور ان کا وہاں شرکت کرنے کا پروگرام یقینی تھا۔ وہ یہ بات ہیزل کو بتا چکی تھیں۔

یس، ہیزل نے کہا۔ کل شب، دی برینٹ ووڈ برگلر، ایک بار پھر ضرب لگائے گا۔

اگلے روز صبح دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ ایک روشن اور چمکدار دن تھا۔

ہیزل نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور پھر صبح کی چہل قدمی کرنے نکل گئی۔

”ارے ہیزل! ہمیں جس فرد سے صبح کی واک پر ملنے کی توقع تھی وہ تم ہی ہو۔“ زینی جیکب نے اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا۔ میری جونسن اس کے عین پیچھے چلی آ رہی تھی۔

”ہاں۔“ میری جونسن نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آج دوپہر زینی کو اپنے یہاں لنچ پر بلوایا ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی اس لنچ میں شریک ہو۔“

”اوہ!“ ہیزل فوراً سوچ میں پڑ گئی۔

وہ شرکت سے معذرت کر لے یا...... نہیں، اسے کسی طور معذرت نہیں کرنی چاہیے۔ میری جونسن کی رہائش گاہ پر لنچ کرنے سے اسے اپنے ٹارگٹ کا جائزہ لینے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔

”کیوں نہیں، میری!“ اس نے جواب دیا۔ ”تھینک یو، میں ضرور آؤں گی۔“

ان کی یہ گیٹ ٹوگیدر بے حد شاندار رہی، وہ تینوں گپیں لڑاتی اور مختصر باتیں کرتی رہیں۔ اس دوران ہیزل نے ایک بار پھر مکان کے داخلی دروازے پر لگے ہوئے سستے سے تالے کا جائزہ لے لیا۔

”تمہیں گھمانے والی کنڈی بھی لگانی چاہیے تھی، میری۔“ ہیزل نے دل ہی دل میں کہا اور خود بہ خود مسکرانے لگی اور پھر جب ہیزل کو باتھ روم میں جانے کی خواہش ہوئی تو اسے مکان میں داخل ہونے کا ایک اور بہتر راستہ دکھائی دے گیا۔ میری جونسن کے فالتو بیڈروم کی کھڑکی فرش سے صرف دو فٹ اونچی تھی اور اس کے مقابل جو مکان تھا وہ خالی پڑا تھا۔

”پرفیکٹ!“ ہیزل نے کہا۔ پھر وہ چپکے سے اس بیڈروم میں چلی گئی۔ اس نے کمرے کی بیرونی کھڑکی کی چٹخنی نیچے گرا دی اور پھر چند سیکنڈز ہی میں باہر نکل آئی۔ اب وہ

رات کو داخلی دروازے کے بجائے اس کھڑکی کے راستے بہ آسانی اندر داخل ہو سکتی تھی۔ اس طرح داخلی دروازے کا تالا توڑنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اس کا کام نہایت آسان ہو گیا تھا۔

پھر ایک گھنٹے بعد جب وہ میری جونسن کے مکان سے روانہ ہوئی تو اسے رات کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔

ہیزل پونے آٹھ بجنے کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ پھر ٹھیک پونے آٹھ بجے اس نے میری جونسن کے گھر کا نمبر ملایا۔ گو اسے یقین تھا کہ وہ اس وقت گھر سے نکل چکی ہوگی اور موسیقی کے پروگرام میں شرکت کا لطف اٹھا رہی ہوگی لیکن اس کے باوجود بھی ہیزل نے اپنا اطمینان ضروری سمجھا۔

دوسری جانب سے جب رابطہ جواب دینے والی مشین سے ہوا تو ہیزل کو گھر خالی ہونے کا اطمینان ہو گیا۔ اس نے فون بند کر دیا۔

کنسرٹ کا آغاز ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس وقت تک اندھیرا چھا جانا لازمی تھا۔

ٹھیک آٹھ بجتے ہی ہیزل، میری جونسن کے مکان کی جانب روانہ ہو گئی۔ وہ چند ہی منٹ میں اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ وہ گھوم کر اس چھوٹے سے مکان کی سائڈ میں چلی گئی۔ میری جونسن کے اضافی بیڈروم کی کھڑکی اسی سمت کھلتی تھی۔

اس نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر کھڑکی کے پٹ کو دھکا دیا تو وہ آسانی سے کھل گئی۔ وہ کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو گئی۔ اس سے پیشتر وہ اطراف کا جائزہ لے چکی تھی اور یہ اطمینان کر چکی تھی کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے۔

اب اسے وہ کیش بکس تلاش کرنا تھا جس میں میری جونسن نے ڈھیروں رقم رکھی ہوئی تھی۔ ہیزل نے اپنی فلیش لائٹ روشن کر دی اور ہال سے گزرتے ہوئے ماسٹر بیڈروم میں داخل ہو گئی۔ اس روز میری جونسن گروسری ڈیلیوری مین کے سامنے اپنا کیش بکس لینے کے لیے اسی کمرے میں گئی تھی، لہٰذا وہ کیش بکس لازمی اسی کمرے میں موجود ہونا چاہیے۔

اتنے میں اس کی نگاہ میری کے جوئیلری بکس پر پڑی جو سنگار میز کے اوپر ہی رکھا ہوا تھا۔ ہیزل نے جوئیلری بکس کی اشیا کو تکیے کے غلاف میں الٹ لیا اور پھر سنگار میز کی درازیں کھولنا شروع کر دیں۔

اسے دوسری دراز میں کیش بکس نظر آ گیا جو چند زیر جاموں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

''احمق کہیں کی!'' اس نے دل ہی دل میں میری جونسن کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس نے کیش بکس کو کسی محفوظ جگہ چھپانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

ہیزل کو تلاشی لینے کی زحمت اٹھانی ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ جس چیز کی تلاش میں یہاں آئی تھی وہ اس کے ہاتھ لگ چکی تھی۔

ہیزل نے کیش بکس کا ڈھکنا ایک جھٹکے سے کھول دیا تو اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

خالی بکس اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

تب اچانک کسی نے کمرے کا بلب روشن کر دیا۔

ہیزل تیزی سے دروازے کی سمت گھوم گئی۔

وہاں میری جونسن اور زینی جیکب کھڑی ہوئی تھیں۔ زینی کے چہرے پر قدرے اداسی چھائی ہوئی تھی جبکہ میری کا انداز فاتحانہ تھا۔

اور میری کے ہاتھ میں ایک ریوالور دبا ہوا تھا۔

''جب میں نے بیڈروم کی کھڑکی کی چٹخنی گری ہوئی دیکھی تو میں سمجھ گئی تھی کہ تم آج رات ضرور کوشش کرو گی، ہیزل۔'' میری جونسن نے کہا۔ ''یا تم اب بھی خود کو، ہارٹ بینڈڈ ہیزل، کہلوانا پسند کرو گی؟''

''یہ کیسے ہوا......؟''

''اوہ، تم جاننا چاہتی ہو؟'' میری جونسن نے کہا۔ ''تمہیں شاید علم نہیں کہ میں اور زینی کبھی پارٹنر ہوا کرتے تھے۔ زینی البتہ ریٹائر ہو چکی ہے اور میری ریٹائرمنٹ اس سال کے آخر میں ہوگی۔ اس لیے میں بہ دستور ڈیٹیکٹو سارجنٹ میری جونسن ہوں۔ اب تم ہاتھ اوپر اٹھا لو اور خود کو پولیس کی حراست میں سمجھو۔''

یہ کہہ کر میری جونسن آگے بڑھی اور اس نے ہیزل کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔

انوکھی محبت

تنویر ریاض

ایک محبت اور... ہزاروں رنگ... کوئی دور رہ کر دعا دیتا ہے کوئی آسیب کے مانند چمٹ کر جان لے لیتا ہے... کہیں محبت آنسو بن کر بہتی ہے تو کہیں لہو بن کر آنکھوں میں اتر آتی ہے۔ جانے اس کی محبت کیسی تھی جو پاس آکر خوش رہ سکا نہ دور ہو کر مطمئن ہو سکا۔

غلط فہمی اور بے کلی کا شکار ایک عاشق کا سرد انتقام



ہر قتل کا کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ کوئی بلا وجہ ہی کسی کی جان نہیں لیتا لیکن جس قتل کی کہانی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں وہ اس لحاظ سے بہت عجیب ہے کہ یہ قتل دن دہاڑے ہوا۔ قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس نے اقبال جرم بھی کیا لیکن پولیس سر توڑ کوشش کے باوجود یہ جاننے میں ناکام رہی کہ اس نے یہ قتل کیوں کیا؟ مقتول سے اس کی کیا دشمنی تھی۔ ویسے تو اسے مجرم ثابت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا لیکن پولیس کو قتل کی وجہ جانے بغیر اس کا چالان تیار کرنے میں دشواری ہو رہی تھی اور عدالت میں نامکمل چالان پیش کرنے کا مطلب مقدمے کو کمزور کرنا تھا۔ کوئی بھی ہوشیار وکیل اس نکتے کو ملزم کے حق میں استعمال

کر کے بڑی سے بڑی رعایت حاصل کر سکتا تھا۔

ملزم کا پورا نام جیم مورلی، عمر 37 سال، شادی شدہ اور پیشے کے اعتبار سے بینکر تھا۔ 16 مارچ کی شام چار بجے وہ ایک بار کے دروازے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہے۔ وہ بار بار بے چینی سے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتا اور پھر اس کی نظریں سڑک کا جائزہ لینے لگتیں۔ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا۔ ایک سلیٹی رنگ کی کار بار کے سامنے آ کر رکی اور اس میں سے جو لیو فونٹانا نامی وکیل باہر نکلا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنی کار کا دروازہ بند کیا اور بار کی طرف بڑھنے لگا۔ مورلی نے اس کی کار کا نمبر غور سے پڑھا اور دوسرے ہی لمحے اپنی جیب سے اعشاریہ بتیس کا ریوالور باہر نکال لیا پھر اس نے ایک لفظ کہے بغیر فونٹانا پر فائر کھول دیا اور ایک ساتھ پانچ گولیاں اس کی گردن اور سینے میں اتار دیں۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ مقتول کو اپنا دفاع کرنے کی بالکل مہلت نہیں ملی۔

فائر کی آواز سنتے ہی بار میں بیٹھے ہوئے لوگ باہر کی طرف دوڑے۔ ان میں سے کچھ نے زمین پر گرے ہوئے فونٹانا کو ابتدائی طبی امداد دینے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ وہ موقعے پر ہی دم توڑ چکا تھا۔ دوسرے لوگ مورلی کی طرف لپکے اور اسے قابو کر کے نہتا کر دیا۔ مورلی نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور اپنے آپ کو خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا۔

بار کے مالک نے فوراً ہی فون کر کے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی اور چند منٹوں میں ہی ایک پیٹرول کار جائے واردات پر پہنچ گئی۔ مورلی کو ہومی سائڈ والوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جہاں اس نے ابتدائی تفتیش کے دوران بتایا کہ وہ مسٹر فونٹانا کو نہیں جانتا اور نہ ہی اسے ان کے بارے میں کچھ علم ہے۔ وہ مقتول سے کبھی نہیں ملا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے ایک ایسے اجنبی شخص کو کیوں قتل کیا جس نے اسے اشتعال دلایا اور نہ ہی اس کی جانب متوجہ ہوا۔ مورلی کا جواب انتہائی حد تک ناقابل یقین اور حیران کن تھا۔ اس نے کہا کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ بس اسے دیکھتے ہی اس کے دل میں اسے گولی مارنے کی خواہش جاگی جس پر وہ قابو نہ پاسکا اور اس نے بے اختیار فائر کر دیا۔ مورلی کے اس بیان پر کوئی بھی یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ کسی اجنبی شخص کو بلا کسی سبب محض اپنے دل میں اٹھنے والی ایک بچگانا خواہش کے تحت قتل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے کرید کرید کر سوالات کیے گئے لیکن ہر بار اس نے یہی جواب دیا۔

ابتدائی تفتیش تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی۔ اس دوران ملزم بالکل پرسکون اور خاموش نظر آیا۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات وتاثرات سے عاری تھا۔ اس نے تمام سوالات کے جواب انتہائی نرمی اور تحمل سے دیے اور کسی تیز وتند سوال پر بھی مشتعل نہیں ہوا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود پولیس افسران اس سے کوئی ایسی بات معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جو اس پراسرار اور ناقابل یقین جرم کی وجہ سمجھی جاتی۔

پولیس نے اپنے ذرائع سے جو معلومات حاصل کیں۔ ان سے قاتل کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ مقتول سے اس کا کوئی ذاتی، پیشہ وارانہ یا تجارتی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے ان دونوں کے بیچ کسی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بیان کی تصدیق کے بعد یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ کہیں ملزم کا ذہنی توازن تو خراب نہیں یا وہ کسی نفسیاتی یا ذہنی بیماری میں مبتلا ہے لیکن جب اس کا نفسیاتی معائنہ کروایا گیا تو نفسیاتی معالج نے تصدیق کر دی کہ وہ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے بالکل صحت مند ہے۔ وہ جس بینک میں کام کرتا تھا، وہاں کی انتظامیہ نے بھی یہی بتایا کہ ملزم اپنے کام میں انتہائی ذہین، مستعد اور ہوشیار تھا۔ اس کا بینک میں کبھی کسی سے جھگڑا نہیں ہوا بلکہ وہ انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھتا اور بھیڑ کے دوران بھی گاہکوں سے بہت اچھی طرح پیش آتا۔ اس کی کارکردگی کا ریکارڈ انتہائی شاندار تھا اور اس نے بہت کم وقت میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔

پولیس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، یہ کوئی کہانی نہیں تھی کہ ایک بہت ہی خوش شکل، اسمارٹ اور ذہین سراغ رساں محیرالعقل کارنامے سرانجام دے کر مشکل سے مشکل کیس کو حل کر کے پولیس کو نیچا دکھاتا ہے جبکہ حقیقی زندگی میں ایسا کوئی معجزہ رونما نہیں ہوتا۔ اگر پولیس اپنے تمام تر ذرائع استعمال کرنے کے باوجود کسی سراغ تک نہیں پہنچ پاتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شرلاک ہومز ٹائپ سراغ رساں اپنے حجرے سے برآمد ہو کر اس گتھی کو سلجھا دے گا۔

اس حقیقت کے باوجود یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہر کیس میں صورت حال ایک جیسی نہیں ہوتی اور میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کیس میں کم از کم ایک آدمی ایسا ہے جس کے پاس پولیس سے زیادہ معلومات تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس جرم کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اسے وہ وجہ بھی معلوم تھی جسے مورلی چھپا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مورلی کا بیان اس حد تک درست ہے کہ وہ پہلے سے مقتول کو نہیں جانتا تھا

لیکن اس کا یہ کہنا سچ نہیں ہے کہ اس کے پاس مقتول کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسی وجہ سے وہ مقتول کو جان گیا تھا۔ اس شخص کو تو یہ بات بھی معلوم ہے کہ مقتول بالکل بے گناہ تھا جبکہ مورلی کی نظر میں وہ مجرم تھا اور اسے اس کے جرم کی سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ وہ شخص اس قتل کے محرک اور اس کے پس منظر کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ مورلی کو پوری بات معلوم نہیں تھی اور اس نے محض غلط فہمی کی بنیاد پر مسٹر فونٹانا کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اتنے وثوق سے یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں تو آپ کا تجسس دور کرنے کے لیے بتائے دیتا ہوں کہ میں ہی وہ شخص ہوں۔

اس انکشاف کے بعد ہر ایک کے ذہن میں پہلا سوال یہی آئے گا کہ اگر میں اس قتل کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں تو اب تک خاموش کیوں رہا اور میں نے اس معمے کو حل کرنے میں پولیس کی مدد کیوں نہیں کی۔ اس کی وجہ بالکل سیدھی سی ہے اور وہ یہ کہ مجھ سے کسی نے اس بارے میں پوچھا ہی نہیں اور نہ ہی کسی نے مجھے بلایا۔ پولیس کی تفتیش یا عدالتی کارروائی کے دوران کسی نے میری گواہی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لیے کہ اس کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا تب تک میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور ویسے بھی میں جائے واردات سے میلوں دور کسی دوسرے شہر میں تھا اور اب میں وہیں ہوں۔ البتہ اس واقعے کی اطلاع مجھے اخبارات اور ٹیلی وژن سے ہوئی۔ گو کہ میرا اس واقعے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اس کہانی کا ایک کردار میں بھی ہوں۔

میں اس کا اصل نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں اس کا فرضی نام سونیا رکھ لیتا ہوں۔ سونیا سے ملاقات بس کے سفر کے دوران ہوئی۔ وہ انتہائی پرکشش عورت تھی۔ اس کے حسن کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا رنگ گندمی، سیاہ بال، بڑی بڑی پرکشش آنکھیں، متناسب جسم اور چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ۔ مجھ جیسے دل پھینک آدمی کے ہوش اڑا دینے کے لیے یہ خوبیاں کافی تھیں۔ اس کے بولنے کا انداز بھی بڑا دلکش تھا۔ میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ ان دنوں گوریلا آرٹ کی پریکٹس کر رہا تھا اور اپنے قد، جسم اور خوش مزاجی سے ناقابل تسخیر قلعوں کو فتح کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بار بھی جیت میرا مقدر بنے گی اور وہ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکے گی۔

واہ جی واہ

باپ نے بیٹے کی تلاشی لی؟ جیب سے سگریٹ چرس، کترینہ کی تصویر اور گرلز کے موبائل نمبر برآمد ہوئے۔

باپ نے بیٹے کو بہت مارا اور کہا "کب سے کر رہے ہو یہ سب؟" بیٹے نے روتے ہوئے کہا۔ "بابا میں نے آپ کی جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔"

ایم افضال انصاری، ڈنگہ شہر

میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ جدوجہد دشوار تو تھی لیکن طویل نہیں۔ مجھے اسے اپنی طرف مائل کرنے میں دو تین ہفتے لگ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد کسی دوسرے محاذ کا رخ کروں گا۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ میں وہ پنچھی ہوں جو کسی ایک ڈالی پر نہیں بیٹھتا بلکہ وقفے وقفے سے اپنا ٹھکانا بدلتا رہتا ہے لیکن سونیا کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دنوں کی ملاقاتوں کے بعد ہی میں یہ محسوس کرنے لگا کہ مجھے اس سے سچی محبت ہوگئی ہے، ہم اپنی سہولت کے مطابق باقاعدگی سے ملنے لگے۔ وہ دوپہر میں فارغ ہوتی تھی۔ ہم نے ملنے کے لیے ایک محفوظ جگہ کا انتخاب کیا۔ میں اس علاقے کا نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ بہت سی باتوں کا ظاہر نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

وہ مکان ایک بوڑھی عورت کی ملکیت تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے لہٰذا گڑھے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔ اگر وہ عورت ہمیں ملنے کے مواقع فراہم کر رہی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی پیشہ ور نائیکہ تھی بلکہ شاید اس کی ضرورتوں نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ میں اس سہولت کے عوض اسے معقول معاوضہ دے رہا تھا۔

میں اس مکان کے بارے میں بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ کونے پر واقع ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کا مرکزی دروازہ پرہجوم سڑک پر کھلتا تھا لیکن بغلی گلی میں ایک اور دروازہ تھا جو ہر وقت آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ میں جس واقعے کا ذکر کرنے والا ہوں۔ اسے سمجھنے کے لیے اس دروازے کے محل وقوع کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ایک ایسی ہی دوپہر کا ذکر ہے۔ ہم دونوں ابھی اپنے کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے۔ اس کمرے کی کھڑکیاں سامنے والی سڑک پر کھلتی تھیں۔ اچانک سونیا کی نظر کھڑکی پر گئی

اوراس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''میرا شوہر!'' وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہوجائے گی۔ ''وہ دروازے کی گھنٹی بجارہا ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر میرا چہرہ بھی زرد پڑ گیا ہوگا لیکن آئینہ دیکھنے کے لیے وقت نہیں تھا، البتہ مجھے اپنے ہاتھ اور پیر ٹھنڈے ہوتے محسوس ہوئے۔ میں نے گھبرانے کے بجائے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا کہ اس صورت حال سے کیسے نکلا جائے۔ میں نے کبھی ہیرو ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن ان خطرناک لمحات میں مجھے اپنے سے زیادہ سونیا کی فکر تھی۔ میں اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا۔

وہ بے جان گڑیا کی طرح میری بانہوں میں جھول گئی۔ میں نے مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑی، دروازہ کھولا اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اس طویل راہداری کی طرف لے گیا جو بغلی دروازے کی طرف جارہی تھی۔ سڑک بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی اور اس کے دوسرے کنارے پر تقریباً تیس فٹ کے فاصلے پر ایک سرمئی رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ایک آدمی سامنے والے مکان سے نکل کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا پھر اس نے ڈرائیور کی طرف والا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے سونیا سے کہا۔

''جلدی کرو۔ اس گاڑی والے سے کہنا کہ وہ تمہیں لفٹ دیدے۔ بے شک کوئی بہانہ بنا دینا مثلاً یہ کہ تمہاری طبیعت خراب ہے اور وہ تمہیں کسی فارمیسی تک لے جائے۔ جلدی کرو۔ کوئی بھی کہانی گھڑ لینا۔''

''اور تم؟'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''میری فکر مت کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

''لیکن......''

''مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تمہارا شوہر مجھے نہیں جانتا لیکن اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا تو بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ جلدی کرو۔ وہ کار اسٹارٹ کر رہا ہے۔''

اس نے کار کی جانب دوڑ لگا دی۔ میں دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ بات کی پھر گھومتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی اور پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گئی۔ عین اسی وقت اس کا شوہر بغلی دروازے کی طرف آگیا۔ بہ ظاہر وہ غیر مسلح نظر آرہا تھا۔ اس نے میری جانب ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں۔ البتہ اس کی نگاہیں سرمئی کار پر جمی ہوئی تھیں جو آہستہ آہستہ دور ہوتی جارہی تھی۔ اگر وہ مسلح ہوتا تو یقیناً فائر کر دیتا۔

اس نے کار کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا لیکن جب اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کار تک نہیں پہنچ سکتا تو اس نے جیب سے کاغذ قلم نکالا اور کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کار کا نمبر نوٹ کر رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے سونیا کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی اس نے مجھے فون کیا۔ میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا۔ میں نے جب بھی اس سے نمبر مانگا تو وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی اور ہمیشہ یہی کہا کہ تمہیں میرے نمبر کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود ہی تم سے بات کر لیتی ہوں۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں میں کوئی بے احتیاطی نہ کر بیٹھوں اور اس طرح اس کے شوہر کو ہماری ملاقاتوں کا علم نہ ہوجائے۔

مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ شاید مجھے یہ بات کبھی معلوم نہ ہوتی لیکن جب مورلی نے قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا اور میڈیا پر اس کے بارے میں کہانیاں سامنے آنے لگیں تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ سونیا کا شوہر ہے۔ اخبارات میں ان دونوں کی تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں لیکن کوئی رپورٹر یہ کھوج نہ لگا سکا کہ سونیا کی موت طبعی تھی یا کسی حادثے کے سبب اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ مورلی کو ہماری خفیہ ملاقاتوں کا علم کیسے ہوا۔ لگتا ہے کہ اسے سونیا پر شک ہو گیا تھا اور وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس مکان تک پہنچ گیا تھا۔ اگر سونیا بروقت اسے نہ دیکھ لیتی تو اس کے ساتھ ساتھ میں بھی مورلی کی نظروں میں آجاتا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی اور سونیا کو لے کر فوراً ہی بغلی دروازے سے باہر نکل گیا۔ جب مورلی وہاں پہنچا تو سونیا کار میں بیٹھ رہی تھی۔ اس لیے وہ یہی سمجھا کہ سونیا اس کار والے کے ساتھ کہیں جارہی ہے۔ اس نے نمبر پلیٹ کی مدد سے کار کے اصل مالک کا سراغ لگایا جو مسٹر فونٹانا تھے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ سونیا نے فونٹانا کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے تھے چنانچہ اس نے کلائنٹ بن کر مسٹر فونٹانا کو فون کیا اور ان سے کسی اہم مسئلے پر بات کرنے کے لیے بار میں آنے کی دعوت دی اور جب وہ وہاں پہنچے تو کچھ کہے سنے بغیر ان پر فائر کھول دیا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کبھی قتل کی وجہ نہیں بتائے گا کیونکہ اسے سونیا سے بہت محبت تھی اور وہ اسے مرنے کے بعد رسوا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس دنیا میں صرف میں ہی ایک ایسا شخص ہوں جو اس راز سے واقف ہوں لیکن میں بھی اپنی زبان بند رکھوں گا کیونکہ مجھے بھی سونیا سے بے حد محبت تھی۔

حضرت داوٗد علیہ السلام

رضوان ساجد

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ کی اپنے بندوں سے محبت دنیاوی ممتا سے ستر گنا زیادہ ہے تب ہی وہ ان کی رہنمائی کے لیے گاہے بگاہے نبیوں کو مبعوث کرتا رہا ہے... جب جب انسان نے اندھیروں کی طرف سفر شروع کیا تب تب اپنا نور اس نے دنیا میں بھیجا۔ بنی اسرائیل... ایک ایسی قوم جس پر اللہ نے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کر دی مگر... افسوس کہ یہ قوم لالچ، طمع اور گمراہی سے خود کو نہ بچا سکی۔ ایسے میں ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور یہ وہ نبی ہیں جنہیں اللہ نے بادشاہت اور نبوت ایک ساتھ عطا کی... نہ صرف یہ بلکہ ان پر پرندوں کی زبان کو بھی آسان کر دیا اور آپ علیہ السلام کے سامنے پتھروں کو بھی زبان عطا کر دی۔ سبحان اللہ... تو کون ہے جو سبق حاصل کرے۔

مخالف حالات اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا احوال

جالوت نے اب وتیرہ بنا لیا تھا کہ وہ دن میں دو مرتبہ وادی میں اترتا تھا اور اسرائیلیوں کو للکارتا تھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے مقابلے کو جاتا۔ اب تو لوگ طالوت کو طعنے دینے لگے تھے کہ جالوت کے مقابلے پر اسے جانا چاہیے لیکن وہ بھی کترا رہا تھا۔

جالوت نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ چالیس دن تک دعوت مبارزت دے گا، اس کے بعد پہاڑ پر چڑھ جائے گا اور طالوت کی بادشاہت کا خاتمہ کر دے گا۔



اس اعلان کے بعد طالوت کو یقین ہو گیا کہ اسے جس نئے بادشاہ کی نوید سنائی گئی تھی وہ کوئی اور نہیں یہی جالوت ہے لیکن یہ بات اس کی فہم سے دور تھی کہ ایک فلسطینی، اسرائیل کا بادشاہ کیسے بن سکتا ہے۔ اسے اسرائیلیوں کی قسمت پر افسوس ہونے لگا کہ ان پر فلسطینی غالب آجائیں گے۔

ادھر وہ یہ سوچ رہا تھا دوسری جانب خدا کی مشیت کچھ اور سوچ رہی تھی۔

پہلوان جالوت ہر روز وادی میں اترتا تھا۔ اسرائیلیوں کو للکارتا اور واپس چلا جاتا تھا۔

پورے اسرائیل میں شور مچ گیا تھا۔ ہر زبان پر جالوت کا نام تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام بھی اس کی شہرت سن رہے تھے۔ انہیں بھی شوق ہو رہا تھا کہ وہ اس پہلوان کو دیکھیں بلکہ یہ جذبہ بھی کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ اس پہلوان سے مقابلہ کریں۔ وہ جب ریچھ جیسے موذی کو مار سکتے ہیں۔ بھیڑوں کی طرف لپکنے والے شیر سے پنجہ کشی کر سکتے ہیں تو جالوت کیا چیز ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ حضرت ایشا کو بتائے بغیر اس علاقے میں نہیں جا سکتے تھے جہاں دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ اس کا انتظام بھی خدا نے کر دیا۔ طالوت کی فوجوں میں غذا کی قلت ہو گئی تھی۔ حضرت ایشا کے سات بیٹے فوج میں تھے۔ انہیں فکر ہوگی کہ بیٹوں کو کھانا پہنچایا جائے۔ اس کام کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کے علاوہ اور کوئی ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنے پاس بلایا اور حکم دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائیوں کو کھانا پہنچائیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈھول پیٹنے کی آواز آئی۔ بادشاہ طالوت کی طرف سے اعلان کیا جا رہا تھا کہ ”جو کوئی جالوت سے مقابلہ کر کے اسے قتل کرے گا۔ بادشاہ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرے گا اور اپنی آدھی دولت اسے دے گا۔“

اس اعلان کو سن کر حضرت ایشا اور بھی پریشان ہو گئے۔

”داؤد، اب تو لشکر میں تیرا جانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے بھائیوں میں سے کوئی بادشاہ کی بیٹی سے شادی کے لالچ میں جالوت کے سامنے چلا جائے اور مارا جائے۔ تو کل صبح صبح رخصت ہو جانا۔ بھائیوں کو کھانا پہنچانا اور میرا یہ پیغام دینا کہ جالوت کے سامنے جانے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ جس طرح اور بہت سے جوان جنگ سے واپس آگئے ہیں تم بھی واپس آجاؤ۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے وہ رات بڑی بے قراری سے گزاری اور صبح ہوتے ہی لشکر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لشکر کے نام پر چند سو افراد ہیں جو طالوت کے ساتھ ہیں۔ ان کے بھائیوں نے بتایا کہ دشمن کے پاس ایک آدمی ہے جالوت، اس کے خوف سے تمام لوگ بھاگ گئے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھائیوں کو پیغام پہنچایا کہ وہ جالوت سے ہرگز مقابلہ نہ کریں۔ پھر خود ہی اس کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ان کے بھائیوں نے جالوت کے قد و قامت کا اس انداز میں ذکر کیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اسے دیکھنے کا اشتیاق ہونے لگا۔

”الباب، کیا میں اسے کسی طرح دیکھ سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں...... وہ ہر روز باہر نکلتا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں نکلے گا۔ دیکھ لینا۔“

یہی ہوا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے جالوت کی للکار سنی۔ ”بے غیرت اسرائیلیو! تم میں کوئی مرد ہے تو میرے سامنے آئے۔ کیا کسی ماں نے کوئی مرد نہیں جنا۔ تم تو وہ قوم ہو خدا نے بھی جسے چھوڑ دیا ہے ورنہ وہ تمہاری ضرور مدد کرتا۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو دیکھا لیکن بالکل بھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے بھائیوں کو برا بھلا کہنے لگے کہ ان میں سے کوئی مقابلے کو کیوں نہیں جاتا۔

”وہ بنی اسرائیل کو گالیاں دے رہا ہے۔ تمہیں طعنہ دے رہا ہے کہ تمہیں خدا نے چھوڑ دیا ہے۔ اسے کیا حق ہے کہ بنی اسرائیل کو برا کہے۔ تم میں سے کوئی اسے قتل کیوں نہیں کر دیتا؟“

”تم اس کو دیکھ رہے ہو، کسی کو اپنی جان سے جانا ہے۔“ الباب نے کہا۔

”غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”تم اپنی غیرت اپنے پاس رکھو اور سیدھے گھر جاؤ۔“

”تم مجھے اس سے لڑنے کی اجازت دو۔ میں اس سے لڑوں گا۔“

”کیا ہاتھوں سے مارو گے اسے۔ تم سے کہہ دیا سیدھے گھر جاؤ۔“

ان کی باتیں دوسرے لوگ بھی سن رہے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سے بھی یہی کہا کہ وہ لڑنا چاہتے ہیں۔ ہر

طرف یہ خبر پھیل گئی۔ طالوت تک بھی بات پہنچ گئی اور اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بلا لیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام جب اس کے دربار میں گئے تھے، کم عمر لڑکے تھے۔ اب جوان ہو چکے تھے، طالوت انہیں دیکھ کر پہچان بھی نہیں سکا البتہ اسے تعجب ضرور ہو رہا تھا۔

”تم جالوت سے کیوں لڑنا چاہتے ہو؟“

”وہ ہمارے خدا کو برا کہہ رہا ہے۔“

”تم تو فوج میں بھی نہیں ہو۔ اتنے بڑے پہلوان سے کیسے لڑو گے؟“

”مجھے اپنے خدا پر بھروسا ہے۔“

”جنگ ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔“

”میرے پاس میری غلیل ہے۔“

طالوت کو ہنسی آگئی۔ ”وہ پہاڑ جیسا آدمی تمہاری غلیل سے کیسے مر سکتا ہے؟“

”میں نے اسی غلیل سے ریچھ اور شیر کو ڈھیر کر دیا تھا۔“

”میں نہیں چاہتا کہ تم اس کے ہاتھوں ہلاک ہو۔“

”خود بھی مقابلہ نہیں کرتے، کسی اور کو بھی لڑنے نہیں دیتے۔ کیا یہ چاہتے ہو کہ بنی اسرائیل غلام بن جائیں۔“

”تم اگر مرنا ہی چاہتے ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔“

طالوت نے حکم دیا کہ وہ زرہ بکتر پہن لیں اور تلوار دی کہ اس تلوار سے اس کا مقابلہ کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے زرہ پہن تو لی لیکن اس کے بوجھ سے ان کا چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

”میں اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے زرہ بکتر اتار دی۔ ”تلوار مجھے چلانا ہی نہیں آتی اس لیے یہ تلوار بھی اپنے پاس رکھ لیں۔ میں صرف لاٹھی لے کر اس کے سامنے جاؤں گا۔“

طالوت اس عجیب و غریب مجاہد کو دیکھ رہا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا تھیلا کندھے پر ڈالا، لاٹھی ہاتھ میں لی اور جالوت سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اب ان کے بھائیوں کی ہمت نہیں تھی کہ انہیں روکتے البتہ افسوس ضرور کر رہے تھے کہ ان کا بھائی ان کے ہاتھوں سے گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام پہاڑ سے نیچے اتر رہے تھے کہ آواز آئی۔ ”مجھے اٹھا لو۔“ حضرت داؤد علیہ السلام نے چونک کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ آواز پھر آئی۔ ”مجھے اٹھا لو۔“ یہ آواز ایک پتھر سے آرہی تھی۔ انہوں نے یہ پتھر اٹھایا اور اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ چند قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک پتھر نے پھر پکارا۔ ”مجھے ساتھ لے چلو۔“ انہوں نے اس پتھر کو بھی اٹھا لیا۔ اسی طرح پانچ پتھروں سے آواز آئی اور انہوں نے پانچوں کو اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔

ان پتھروں کو اٹھاتے ہی انہیں اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔ پتھر باتیں کر رہے تھے اس لیے انہیں یقین ہو گیا کہ رب الافواج ان کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ ”اب جالوت کو میں نہیں میرا خدا مارے گا جو میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ ہاتھ میرے ہوں گے، طاقت خدا کی ہوگی۔“

وہ اپنی لاٹھی گھماتے ہوئے وادی میں داخل ہوئے۔ کسی نے جالوت کو خبر کی کہ بنی اسرائیل نے تجھ سے مقابلے کے لیے کسی کو بھیجا ہے۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح آیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھ کر اپنی جگہ رک گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا اس سے بھی طاقتور کوئی اس کے مقابلے کے لیے آیا ہوگا لیکن اس کے سامنے درمیانہ قد کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ وہ اور قریب آیا تو یوں لگ رہا تھا جیسے بکری کے سامنے پہاڑ آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے حضرت داؤد علیہ السلام کا قد ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آدھے زمین کے اندر ہیں۔

یہ مذاق ہی تو تھا کہ جالوت جیسے جنگجو سپاہی کے مقابلے پر ہتھیاروں کے بغیر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اپنی اس توہین پر وہ ایسا غضب ناک ہوا اور اپنے دیوتاؤں کے نام سے حضرت داؤد علیہ السلام پر جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ”تو نے مجھے سمجھا کیا ہے جو لاٹھی لے کر کتے بھگانے چلا آیا۔ میں تجھے اس بدتمیزی کا ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔ تو نہیں دیکھ سکے گا مگر تیرا گوشت جنگلی درندے کھا رہے ہوں گے۔“

”تو اس لاٹھی پر مت جانا۔ یہ خدا کی لاٹھی ہے۔ جنگ ہتھیاروں سے نہیں جیتی جاتی۔ فتح اس کی ہوتی ہے خدا جس کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں تجھے قتل کروں گا اور تیرا سر کاٹ کر طالوت کے پاس لے کر جاؤں گا۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کی زبانی یہ کلمات سن کر جالوت نے کئی زوردار قہقہے لگائے۔ بس یہی قہقہے اس کی موت کا سبب بن گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دیکھا کہ جب وہ قہقہہ لگاتا ہے تو "خود" (پیتل کی ٹوپی جو وہ سر پر پہنے ہوئے تھا) ذرا سا ہٹ جاتا ہے اور اس کی پیشانی ننگی ہو جاتی ہے۔ انہوں نے تھیلے سے ایک پتھر نکالا اور غلیل میں رکھ لیا۔ پھر کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جالوت قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔ بس یہی وقت تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے نشانہ لیا اور اس کی ننگی پیشانی پر داغ دیا۔ پتھر میں کچھ ایسی طاقت تھی کہ پیشانی میں گھستا چلا گیا۔ دیوقامت جالوت دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ خبر نہیں وہ بے ہوش ہوا تھا یا مر گیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس کی چھاتی پر سوار ہوئے اور اسی کی تلوار سے اس کا سر کاٹ لیا۔

طالوت کا سپہ سالار انبیر پہاڑی پر سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ سپاہیوں کو لے کر نیچے اترا۔ ادھر جالوت کے مرتے ہی فلسطینیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ طالوت کا لشکر نیچے اتر چکا تھا۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے فلسطینیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

فوج قتل عام میں لگی ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کا سر ہاتھ میں لیا اور طالوت کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

شام تک میدان خالی تھا۔ دشمن کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ طالوت اپنے لشکر کو لے کر جلوس کی شکل میں یروشلم کی طرف پلٹا۔ اتنی دیر میں یروشلم کے لوگوں کو فتح کی نوید مل چکی تھی۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ داؤدؑ نامی ایک نوجوان نے جالوت کو قتل کر دیا ہے۔ لڑکیاں ہاتھوں میں دف سنبھالے ناچتی ہوئی شہر سے باہر نکل آئیں۔ وہ دف بجا رہی تھیں اور ناچ رہی تھیں۔ ان کی نظر جب حضرت داؤد علیہ السلام پر پڑی تو ان کے ہونٹوں پر ایک گیت آ گیا۔ "ساؤل (طالوت) نے تو ہزاروں کو مگر داؤد علیہ السلام نے لاکھوں کو مارا۔"

طالوت کو یہ گیت سخت ناپسند ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنی جلدی لوگ مجھے بھول گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کون سا بڑا کارنامہ انجام دے دیا۔ میں نے اتنی جنگیں لڑیں اور لڑکیاں کہہ رہی ہیں میں نے ہزاروں کو مارا۔ اس نے اتفاق سے ایک کو مار لیا تھا یہ کہہ رہی ہیں اس نے لاکھوں کو مارا۔ میں بوڑھا ہونے لگا ہوں اس لیے یہ لڑکیاں اس نوجوان پر فریفتہ ہو رہی ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو وہ سب کے دل موہ لے گا اور ایک دن میرے تخت و تاج پر بھی قابض ہو جائے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے خیال آیا۔ کہیں یہی تو وہ نہیں ہے جس کی طرف شموئیلؑ نے اشارہ کیا تھا۔ اگر یہ وہی ہے تو بھی میں تاج و تخت اس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اس نے اپنے سپہ سالار انبیر کو بلایا۔

"کیا تو جانتا ہے داؤدؑ کون ہے؟"

"حضور یہ وہی چرواہا ہے جو آپ کے سامنے بربط بجایا کرتا تھا۔"

"اف میرے خدا! میں نے اسے پہچانا تک نہیں۔" طالوت نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کیا خدا اس کی مدد نہیں کر رہا ہے؟ اس نے جالوت جیسے گرانڈیل کو مار دیا۔ اب میری آنکھوں پر پردے پڑ گئے کہ میں اسے پہچان نہیں سکا۔"

"حضور، وہ معمولی حیثیت کا بربط نواز آپ کو کیا یاد رہتا۔"

"مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حضرت شموئیل علیہ السلام مجھ سے جھگڑے کے بعد بیت لحم گئے تھے۔ انہوں نے یقیناً وہاں کسی کو مسح کیا ہے اور بادشاہت کی خوش خبری سنائی ہے۔ یہ شخص بھی بیت لحم کا رہنے والا ہے کہیں اسی کو تو مسح نہیں کیا تھا؟"

"اس میں کون سی مشکل بات ہے۔" انبیر نے کہا۔ "ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے بھائی فوج میں ہیں۔ آپ کے ملازم ہیں۔ انہیں بلا کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

ان کے بھائیوں کو بلایا گیا۔ حضرت ایشا نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ مسح والی بات کسی کو معلوم نہ ہو چنانچہ انہوں نے بادشاہ کے سامنے یہ اقرار تو کیا کہ حضرت شموئیل علیہ السلام بیت لحم آئے تھے لیکن یہ بھی کہا کہ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام جنگل میں تھے۔ ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

بادشاہ وقتی طور پر مطمئن ہو گیا لیکن برابر غور کرتا رہا۔ جالوت کو تو وہی مار سکتا تھا خداوند اور حضرت شموئیل علیہ السلام جس کے ساتھ ہوں، یقیناً داؤدؑ ہی وہ شخص ہے جس کو حضرت شموئیل علیہ السلام نے مسح کیا ہوگا۔

وہ اس مسئلے پر اتنی دیر سوچتا رہا کہ اس پر انتشار اور بے کیفی کا دورہ پڑ گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس وقت تک محل ہی میں تھے۔ طالوت کے خادموں نے انہیں بلایا کہ بادشاہ کا علاج کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے بربط بجانا شروع کیا۔ آج نہ معلوم کیا تھا کہ بادشاہ کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اسی عالم وحشت میں اپنے قریب رکھا ہوا بھالا اٹھایا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف کھینچ مارا۔ اگر حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا نے بچا نہ لیا ہوتا اور وہ درمیان سے ہٹ نہ گئے ہوتے تو یہ بھالا ان کے بدن کے آر پار ہو گیا ہوتا۔

حضرت داؤد علیہ السلام ایک طرف کو ہٹے اور بھالا دیوار میں پیوست ہو گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام ذرا بھی نہ گھبرائے، اسی طرح بربط بجاتے رہے۔ یہاں تک کہ طالوت بے ہوش ہو گیا۔ طالوت کے بیٹے جوناتھن نے حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا کہ اب وہ یہاں سے ہٹ جائیں۔

بادشاہ کو ہوش آیا تو اس کے بیٹے جوناتھن اور سپہ سالار انبیر نے بادشاہ کو سمجھایا اور یاد دلایا کہ اس نے داؤدؑ کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔

"داؤدؑ تو وہ ہے جس نے آپ کی خاطر جالوت کو قتل کیا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جو جالوت کو قتل کرے گا آپ اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دیں گے اور اب آپ داؤدؑ کی جان کے درپے ہیں۔"

طالوت پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، البتہ یہ پچھتاوا ضرور ہوا کہ اس نے یہ حرکت خود کیوں کی۔ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ داؤدؑ قتل بھی ہو جائے اور مجھ پر الزام بھی نہ آئے۔ اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ہزار سپاہیوں کا سردار بنا دیا۔ مطلب یہ تھا کہ کسی جنگ میں انہیں جان بوجھ کر قتل کرا دیا جائے لیکن وہی مثل ہوئی کہ کفن کی دکان کھولی تو لوگوں نے مرنا چھوڑ دیا۔ جالوت کی موت کے بعد ایسا خوف طاری ہو گیا تھا کہ کوئی قوم اسرائیلیوں پر حملہ آور نہیں ہو رہی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام، طالوت بادشاہ کی خدمت گزاری میں کوشاں تھے۔ بنی اسرائیل میں ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ طالوت کو حیرت تو اس وقت ہوئی جب اس کی چھوٹی بیٹی میکل انہیں پسند کرنے لگی۔ اس نے جوناتھن اور انبیر کو اپنے ساتھ ملا لیا اور بادشاہ پر زور ڈالا کہ وہ اس کی شادی داؤدؑ سے کر دے، حالانکہ وہ اپنے وعدے سے پھر چکا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ جو جالوت کو قتل کرے گا وہ اس کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی میرب کی شادی کر دے گا۔ اس نے میرب کی شادی کسی اور سے کر دی۔ سب نے زور دیا کہ وہ اپنا عہد پورا کرے اور میکل کی شادی حضرت داؤد علیہ السلام سے کر دے۔ وہ پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیتا رہا اور پھر یہ سوچ کر تیار ہو گیا کہ جب وہ محل میں رہے گا اور یہ سمجھ لے گا کہ میں اس سے خوش ہوں تو وہ احتیاط چھوڑ دے گا اور اسے قتل کرانے میں آسانی ہو جائے گی۔

اب حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ کے داماد بن گئے تھے۔ ان سے محبت کرنے والوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ لوگ اس لیے بھی ان کی عزت کرنے لگے کہ وہ بادشاہ کے داماد ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے حسن اخلاق نے بھی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اب بادشاہ ان کی طرف سے اور بھی خائف ہو گیا۔ ہر وقت حضرت داؤد علیہ السلام کے قتل کے منصوبے سوچتے رہنے سے اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔ وہ ان کے خلاف جو بھی منصوبہ تیار کرتا حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی پہلے سے خبر ہو جاتی اور وہ بچ نکلتے۔ اس کا شک اپنے بیٹے جوناتھن پر تھا کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو پہلے سے خبردار کر دیتا ہے۔ اب حضرت داؤد علیہ السلام کے ہمدردوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا اور وہ تھی میکل۔

ایک روز وہ گھبرائی ہوئی حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئی۔ "میں آپ کی فرقت گوارا نہیں کر سکتی لیکن محل میں آپ کے قتل کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں شاہی کارندے آئیں گے اور آپ کو زبردستی یہاں سے لے جائیں گے، آپ ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جائیں۔"

"اگر میرے قتل کا منصوبہ تیار ہو ہی چکا ہے تو محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہوگا۔ میں نکلوں گا کیسے؟"

"اس محل کا ایک خفیہ راستہ بھی ہے جس کا مجھے پہلے سے علم ہے۔ میں تمہیں رات کے اندھیرے میں نکال دوں گی۔"

"اور تم؟"

"میں ابھی آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ آپ جہاں بھی جائیں جوناتھن سے رابطہ رکھیے گا۔ وہ آپ کا ہمدرد ہے۔ خدا نے آپ کی محبت اس کے دل میں ڈال دی ہے۔ آپ جب چاہیں گے وہ مجھے آپ کے پاس لے آئے گا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام محل سے نکلے اور اتوب شہر پہنچے۔ یہاں ایک کاہن رہتا تھا اس سے ملاقات کی۔ اس کاہن نے کچھ روٹیاں اور ایک تلوار حضرت داؤد علیہ السلام کو دی۔ یہاں سے وہ حضرت شموئیل علیہ السلام کے پاس رامہ گئے۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کو جب معلوم ہوا کہ وہ طالوت کے خوف سے بھاگ کر آئے ہیں تو انہیں خدشہ ہوا کہ طالوت ضرور ان کے

تعاقب میں آئے گا۔ ان دونوں حضرات نے رامہ چھوڑ دیا اور شہر نیوت میں آ گئے۔ یہاں زاہد اور عبادت گزاروں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کو اپنے درمیان دیکھ کر ان زہاد کو ایسی خوشی ہوئی کہ سب کے سب سجدے میں گر گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام یہاں رہنے لگے۔ اب ان کے شب و روز عبادت میں گزر رہے تھے۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کے انتقال کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو بنی اسرائیل کا نبی ہونا تھا لہٰذا یہ تربیت اور صحبت ضروری تھی جو اس قیام میں ہو رہی تھی کیونکہ حضرت شموئیل علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے۔

طالوت یہ دیکھ کر بے قابو ہو گیا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس نے ادھر ادھر آدمی دوڑا دیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا پتا چلائیں اور پھر خود بھی تین ہزار سپاہی لے کر نکل گیا۔

طالوت اس وقت جھاؤ کے ایک درخت کے نیچے اپنا بھالا اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے خادم اس کے اردگرد کھڑے تھے۔

ایک خادم یہ خبر لایا تھا کہ اس نے ایشا کے بیٹے کو توب میں اخیطوب کے بیٹے اخیملک کو کاہن کے پاس آتے دیکھا تھا۔ یہ سنتے ہی طالوت غضب میں آ گیا۔ جسے میں نے نکال دیا لوگ اسے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اس نے اس کاہن کو اور اس کے پورے گھرانے کو اپنے پاس بلا لیا۔

''تو نے میرے خلاف کیوں سازش کی ہے کہ تو نے داؤد کو روٹی اور تلوار دی۔''

''بادشاہ سلامت تیرے سب خادموں میں حضرت داؤد علیہ السلام سب سے زیادہ امانت دار ہے تو کیوں اس کے قتل کے درپے ہے؟''

''جب تجھے معلوم تھا کہ وہ میرے پاس سے بھاگا ہوا ہے تو کیوں تو نے مجھے خبر نہیں کی؟''

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تو اس کے قتل کا گناہ اپنے سر لے۔''

''تو اور تیرے باپ کا گھرانا ضرور مار ڈالا جائے گا۔''

توب میں جتنے کاہن تھے ان سب کو بھی بادشاہ نے اپنے پاس بلوا لیا۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو تلوار کی دھار پر رکھ لو۔ یہ کل پچاسی آدمی تھے جو اس روز طالوت کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ کاہن کا ایک بیٹا ابی یاتر بچ نکلا اور نیوت جا کر حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اس قتل عام کے بعد طالوت نے نیوت کا رخ کیا۔ وہ اس جگہ پہنچ بھی گیا جہاں عبادت گزار جمع تھے لیکن وہاں پہنچ کر اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ خدا نے اس کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈالے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو گرفتار کیے بغیر ہی چلا آیا۔

خطرہ ٹل گیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو یقین ہو گیا تھا کہ طالوت ان کا دشمن بن گیا ہے، وہ ان کا پیچھا کرتا رہے گا اور انہیں ہلاک کر کے چھوڑے گا۔ خدا نے اس وقت تو مجھے بچا لیا ہے لیکن آئندہ کیا ہو گا۔ وہ خدا کا ممسوح ہے خدا نے اسے برگزیدہ کیا ہے اس لیے نہ تو میں اسے قتل کروں گا نہ اس کے خلاف جنگ کروں گا اور وہ مجھے قتل کرنے سے باز نہیں رہے گا اس لیے مجھ پر لازم ہے کہ میں کسی ایسی جگہ چھپ جاؤں جہاں وہ مجھے ڈھونڈ نہ سکے۔ پھر وہ یا تو تھک ہار کے بیٹھ جائے یا ہلاک ہو جائے۔ وہ اتنی بات نہیں سمجھتا کہ خدا کا عہد بھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ اس کی بادشاہت میرے حصے میں آئی ہے۔ وہ تو مجھے مل کر رہے گی۔

حضرت داؤد نے نیوت سے جانے کا ارادہ کیا تو بہت سے عبادت گزار ان کے ساتھ ہو گئے۔ طالوت کاہنوں کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ان عبادت گزاروں کو حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس پناہ مل سکتی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام ان لوگوں کو لے کر بیابان کی طرف نکل گئے اور دشت زیف کے ایک غار میں قیام کر کے رشد و ہدایت کا سلسلہ دراز کر دیا۔ لوگوں میں ان کی مقبولیت اتنی تھی کہ جسے معلوم ہوتا وہ دشت زیف میں آ کر ان سے ملاقات کرتا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو گھر بار چھوڑ کر ان کے پاس رہنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد چھ سو تک پہنچ گئی۔ یہی لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کا لشکر تھے اور یہی ان کی پاکیزہ جماعت، جو ان کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتی۔ ان پہاڑوں میں آپ کا بربط گونجتا رہتا۔ آپ خدا کے اوصاف بیان کرتے، اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتے اور جب ان نغموں کو سریلی آواز میں گاتے تو پہاڑ جھومنے لگتے۔ کہاں کہاں سے پرندے آ کر جمع ہو جاتے اور آپ کی تلاوت سنتے۔

''ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔ بے شک وہ بہت رجوع کرنے والے تھے۔ ہم نے پہاڑوں کو ان کے تابع کر دیا تھا کہ صبح شام ان کے ساتھ اللہ پاک کا ذکر کرتے تھے اور پرندوں کو بھی جو جمع رہتے تھے۔ سب ان کے

زیر فرماں تھے۔" (ص 17 تا 19)

انہی نغموں کا مجموعہ "زبور" کہلاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لیے اصل اور اساس "توریت" تھی لیکن حالات وواقعات اور زمانے کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا کی جانب سے زبور عطا ہوئی جو توریت کے قوانین واصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رشد وہدایت کے لیے بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے شریعت موسوی کو از سر نو زندہ کیا۔ اسرائیلیوں کو راہ ہدایت دکھائی اور وحی سے مستفیض ہو کر تشنہ کامان معرفت الٰہی کو سیراب کیا۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن عطا کیا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن وانس حتیٰ کہ طیور و وحوش تک وجد میں آ جاتے۔ اس لیے آج تک لحن داؤدی ضرب المثل ہے۔

لغت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب دراصل توریت کی تکمیل کے لیے نازل ہوئی اس لیے اسی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

+++

طالوت نے یروشلم سے تین کوس کے فاصلے پر جبعہ کو اپنا فوجی قلعہ بنایا تھا۔ وہ اس وقت یہاں موجود تھا کہ دشت زیف کے کچھ لوگ اس کے پاس آئے۔ یہ لوگ حضرت داؤد علیہ السلام سے مخالفت رکھتے تھے، انہوں نے مخبری کی۔ "داؤد (علیہ السلام) کوہ حلیلہ کے بن کے قلعوں میں دشت کے جنوب کی طرف چھپا ہوا ہے۔ اگر بادشاہ اسے تلاش کرے تو اسے حوالے کرنا ہمارا ذمہ ہے۔"

طالوت یہ خبر سنتے ہی دشت زیف کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا نے بتا دیا اور وہ ہوشیار ہو کر چٹان سے اتر آئے اور "معون" کے بیابان میں رہنے لگے۔ ان کے آدمی برابر کہہ رہے تھے کہ ہم طالوت کا مقابلہ کریں گے لیکن آپؑ یہی کہتے رہے کہ جسے خدا نے برگزیدہ کیا ہے میں اس سے مقابلہ نہیں کروں گا اس کا فعل اپنی جگہ لیکن میں اسے قتل نہیں کروں گا۔

اسی وقت ایک قاصد نے آ کر طالوت کو بتایا کہ فلسطینیوں نے ملک پر حملہ کیا ہے۔ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے آدمیوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو گھیر لیا تھا لیکن خدا نے مدد کی کہ یہ خبر آ گئی۔ طالوت ان کا پیچھا چھوڑ کر دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام سجدے میں گر گئے۔ خدا نے انہیں پھر بچا لیا تھا۔

جب طالوت فلسطینیوں کا پیچھا کر کے لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد علیہ السلام "عین جدی" کے بیابان میں ہیں۔ بحیرہ مردار کے مغرب میں یہ ایک نخلستان تھا۔

طالوت تین ہزار آدمیوں کو لے کر تلاش میں نکلا۔ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اس طرح ڈھونڈتا پھر رہا تھا جیسے پہاڑی بکرے گھاس ڈھونڈتے ہیں۔ ایک چٹان سے دوسری چٹان۔ وہ نخلستان آ گیا تھا لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کا کہیں پتا نہ تھا، خدا نے اسے چھپا لیا تھا۔ ایک جگہ چار سو فٹ کی بلندی سے آبشار نیچے گر رہا تھا۔ طالوت خود بھی تھک گیا تھا، اس کے سپاہی بھی پیاسے تھے۔ اس آبشار سے انہوں نے پیاس بجھائی اور تھکن اتارنے کے لیے کسی غار کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگے۔ کچھ فاصلے پر سلیٹی رنگ کی پہاڑیاں تھیں۔ ادھر بڑھے تو ایک غار نظر آیا۔ وہ اس غار میں چلے گئے اور پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔

خدا کی شان دیکھیے کہ یہ وہی غار تھا جس کے اندرونی حصے میں حضرت داؤد علیہ السلام اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود تھے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ طالوت انہیں تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سب پر نیند غالب کر دی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک ساتھی نے سرگوشی میں کہا۔ "طالوت کا کام تمام کرنے کے لیے یہ نہایت عمدہ موقع ہے۔ یقیناً یہ وہی دن ہے جس کے بارے میں خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ میں تیرے دشمن کو تیرے ہاتھ میں کر دوں گا اور جو تیرا جی چاہے تو کرنا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا۔ "تم اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر وہ اس طرف گئے جہاں طالوت اور اس کے ساتھی بے خبر سو رہے تھے۔ بے شک! یہ ایسی نیند تھی کہ خدا نے انہیں سلایا تھا۔ کسی کا امتحان مقصود تھا۔

خدا نے ان سب کو ایسا غافل کر دیا تھا کہ کسی کی آنکھ نہ کھل سکی اور حضرت داؤد علیہ السلام، طالوت کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی۔ ان کے سپاہی گردنیں اٹھائے انہیں تک رہے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کے آقا کی تلوار چلتی ہے اور کب طالوت کی گردن الگ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنی تلوار بھی سنبھالے ہوئے تھے کہ اگر طالوت کے

ساتھی جاگ گئے تو وہ بھی مقابلے کے لیے دوڑ پڑیں گے لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا آقا طالوت کو سوتا چھوڑ کر واپس آ رہا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے لوگوں میں پہنچے تو ان کی مٹھی میں بالشت بھر کپڑے کا ایک ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ یہ طالوت کے کرتے کا دامن تھا جو انہوں نے اپنی تلوار سے کاٹ لیا تھا۔

"آپ نے اسے ہاتھ سے جانے دیا۔" ساتھیوں نے آپؑ سے کہا۔ "اس وقت وہ آپؑ کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ساتھی بھی سو رہے تھے۔"

"خدا نہ کرے میں اپنے مالک سے جو خداوند کا ممسوح ہے ایسا سلوک کروں کہ اس پر ہاتھ اٹھاؤں۔ مجھے تو یہ جسارت بھی اچھی نہیں لگی کہ میں نے اس کے کرتے کا دامن کاٹ لیا۔"

ان کے ساتھیوں نے بہت کہا کہ وہ انہیں طالوت پر حملہ کرنے کی اجازت دیں لیکن انہوں نے منع کر دیا۔

اتنی دیر میں طالوت کی نیند اس کی بیداری میں بدل گئی۔ انہوں نے دیکھا وہ غار سے باہر جا رہا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بھی غار سے نکلے۔

طالوت نے ایک آواز سنی۔ "میرے مالک میرے بادشاہ۔" اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے غار میں سو گیا تھا۔ اس نے میری جان بخش دی، کمال ہے۔ اتنی دیر میں حضرت داؤد علیہ السلام قریب آ گئے تھے۔ اللہ نے ایسا رعب ان پر طاری کر دیا تھا کہ طالوت کے ساتھی جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔

"حضور آپ کیوں ان کی باتوں پر دھیان دیتے ہیں جو کہتے ہیں میں آپ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ خدا نے اس غار میں آپ کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ میں چاہتا تو آپ کو قتل کر سکتا تھا لیکن میں خداوند کے ممسوح کو کیوں ہاتھ لگاؤں۔"

"تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں تیرے غار میں تھا اور تیری دسترس میں تھا؟" طالوت نے کہا۔

"آپ کے کرتے کا یہ دامن گواہ ہے جو میں نے کاٹ لیا تھا۔"

طالوت نے گھبرا کر اپنے دامن کی طرف دیکھا اور اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک سی گئی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز پھر گونجی۔ "خدا ہی میرے اور تیرے درمیان انصاف کرے اور تجھ سے میرا انتقام لے پر میرا ہاتھ تجھ پر نہیں اٹھے گا۔"

اس حسن سلوک نے طالوت کو جذباتی کر دیا۔ وہ رونے لگا۔ آنسوؤں کے درمیان اس نے کہا۔ "تو یقیناً مجھ سے زیادہ صادق ہے۔ تو نے بدی کا بدلہ نیکی سے دیا۔ خدا تعالیٰ نے مجھے تیرے ہاتھ میں کر دیا تھا۔ اب میں جان گیا ہوں کہ تو یقیناً بادشاہ ہوگا۔ اسرائیل کی سلطنت تیرے ہاتھ پر قائم ہوگی۔ اب تو خداوند کی قسم کھا کہ میرے بعد میری نسل کو ہلاک نہیں کرے گا اور میرے باپ کے گھرانے میں سے میرے نام کو مٹا نہیں ڈالے گا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام نے قسم کھائی۔

طالوت اپنے ساتھیوں سمیت سرمئی پہاڑوں کی طرف گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

کسی کو یہ پوچھنے کی جرأت نہیں تھی کہ جب غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں تو وہ طالوت کے ساتھ واپس کیوں نہیں چلے گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ طالوت ایک دن پھر ان کے آقا کی جان کے درپے ہوگا۔ اس کی باتیں بھروسے کے لائق نہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو اب بادشاہت حاصل کرنے کے لیے طالوت کی موت کا انتظار کرنا تھا۔ ایک ایسی موت جو ان کے ہاتھ سے لائی ہوئی نہ ہو۔ اس تمام عرصے میں انہیں اپنی جان کی بھی حفاظت کرنی تھی اور رشد وہدایت کا فریضہ بھی انجام دینا تھا۔

ان کا اندازہ جلد ہی درست ثابت ہوا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر سنا کہ طالوت سرگرمی سے ان کی تلاش کر رہا ہے اور انہیں قتل کرنے کے درپے ہے۔ ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ وہ ایک غار سے دوسرے غار میں چھپتے پھر رہے تھے۔ ان کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو طالوت کے قتل کی اجازت بھی نہیں دے رہے تھے اور اب اپنا بچاؤ بھی مشکل ہو گیا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے طالوت سے بچنے کے لیے یہ جگہ بھی چھوڑ دی اور فاران کے بیابان میں آ گئے۔ ان کے ساتھ چھ سو مرد، ان کی بیویاں اور بچے بھی تھے۔ ان سب کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں رقم کی ضرورت پڑتی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اس علاقے کے لوگوں سے ایک معاہدہ کیا کہ وہ اوران کے آدمی، علاقے کے لوگوں کے مال اسباب کو لٹیروں سے بچاتے رہیں گے۔ اس خدمت کے صلے میں وہ انہیں ''تحفظ خرچ'' دیں گے۔

معون میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام نابال تھا۔ وہ کرمل گاؤں کے قریب اپنی بھیڑوں کی اون کترر ہا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے آدمی بھیج کر اس سے تحفظ خرچ طلب کیا۔ نابال نے خرچ دینے سے انکار کیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے نہایت گستاخانہ الفاظ ادا کیے۔

''داؤد کون ہے اور ایشا (لیسی) کا بیٹا کون ہے۔ ان دنوں بہت سے نوکر ایسے ہیں جو اپنے آقا کے پاس سے بھاگ آئے ہیں، تو کیا میں اپنی دولت انہیں دے دوں جنہیں میں نہیں جانتا۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کے ملازموں نے یہ باتیں حضرت داؤد علیہ السلام کو بتادیں۔ آپ کو سخت صدمہ پہنچا کہ میں نابال کے مال کی ناحق حفاظت کرتا رہا اور اس نے یہ صلہ دیا۔ آپؑ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ تلواریں باندھ لیں۔ خود بھی مسلح ہوگئے کہ جائیں اور نابال کو قتل کردیں۔

نابال کی بیوی خوبصورت بھی تھی اور عقل مند بھی۔ خدا کی پرستار تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتی تھی۔ وہ گدھے پر سوار ہوئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی نظر حضرت داؤد علیہ السلام پر جیسے ہی پڑی وہ اوندھے منہ سجدے میں گرگئی۔ کچھ دیر بعد اٹھی تو حضرت داؤد علیہ السلام سے مخاطب ہوئی۔

''تو اس خبیث نابال کی پروامت کر۔ وہ اپنے نام کی طرح حماقت سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے تیرے خادموں کو نہیں دیکھا تھا ورنہ ان کی خدمت کرتی۔ میں تیری منت کرتی ہوں کہ اپنے ہاتھ سے اپنا انتقام لینے سے باز رہ۔''

ابیجیل نے بڑی حکمت سے حضرت داؤد علیہ السلام کو قیمتی تحائف پیش کیے اوران کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

جب غصہ اتر گیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا۔

''خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے تجھے آج کے دن مجھ سے ملنے کو بھیجا اور تیری عقل مندی مبارک۔ تو خود بھی مبارک ہو جس نے مجھ کو آج کے دن خوں ریزی اور اپنے ہاتھوں اپنا انتقام لینے سے باز رکھا۔ اب خدا ہی انصاف کرنے والا ہے۔''

خدا نے انصاف کیا کہ نابال نے ایک سچے نبی سے گستاخی کی تھی۔ ابھی دس دن نہیں گزرے تھے کہ نابال کا اچانک انتقال ہوگیا۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام نے سنا تو ابیجیل پر افسوس ہوا کہ ان کی وجہ سے ابیجیل کا خاوند مرا۔ انہوں نے ازالے کے طور پر پیغام بھیجا اور اس سے شادی کرلی۔ میکل کو جو حضرت داؤد علیہ السلام کی بیوی تھی، طالوت نے کسی اور سے بیاہ دیا تھا۔

اب حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا کا حکم پہنچا کہ وہ فلسطینیوں کی سرزمین میں چلے جائیں۔ پہلی نظر میں یہ حکم انہیں عجیب سا لگا کیونکہ فلسطینی ہمیشہ سے اسرائیلیوں کے دشمن تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا تھا اور اب انہیں دشمن کی زمین پر بھیجا جارہا تھا جبکہ ان کے ساتھ صرف چھ سو آدمی تھے اور سب کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے لیکن انہیں خدا کی ذات پر مکمل یقین تھا۔ وہ فلسطینیوں کی طرف بے خوف وخطر روانہ ہوگئے۔ اس حکم کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ طالوت نے ان کی تلاش ترک کردی۔ وقتی طور پر ان کی جان بچ گئی۔ ابھی اور کیا فوائد ہونے والے تھے، یہ خدائی راز تھے جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

حضرت شموئل علیہ السلام کا بھی انتقال ہوگیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی مناسب سمجھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان سے نکل جائیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام فلسطینیوں کے شہر ''جات'' میں اکیس بادشاہ سے ملے اور پناہ کی درخواست کے ساتھ اپنی خدمات پیش کردیں۔

''اپنی ساری طاقت سے آپ کی خدمت کرنا میرے لیے باعث سعادت ہوگا۔''

یہ سن کر بادشاہ خوش ہوگیا۔ دشمن کی فوج کا مایہ ناز جوان اپنی خدمات اسے پیش کررہا تھا۔ اسے یہ بھی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے چلے آنے سے اسرائیلیوں کی کمر ٹوٹ گئی ہوگی۔ اب انہیں زیر کرنا آسان ہوجائے گا۔ اگر میں نے اسے پناہ نہ دی تو وہ واپس چلا جائے گا۔

(باقی آئندہ)

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت

میری آنکھ کھلی تو میں کچھ دیر لیٹا ہوا بچوں اور جینا کا شور سنتا رہا۔ بچے اسکول جانے کی تیاری کررہے تھے۔ میں اٹھ کر واش روم گیا اور آدھ گھنٹے بعد تیار ہوکر نیچے پہنچا تو بچے اسکول جانے کے لیے تیار تھے۔ چھوٹی ماریا دوڑ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئی اور میں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ ''کیسی ہے میری جان؟''

''فائن پاپا۔'' اس نے جوابی پیار کیا۔

میں نے رائن کا سر سہلایا اوران کے بستے اٹھا کر باہر

''ادھوری خواہشوں، حسرت ویاس کی تصویر'' ایک مسیحا کا غم

خواب بسر

مریم کے خان

''زندگی کسی کی ہو، بسر کوئی اور کرے'' ایسا تو اکثر محبت میں ہی سنا ہے مگر... یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ وہ جو ایک مستند اور بے حد کامیاب معالج تھا، جانے کیسی نفسیاتی گرہ کا شکار تھا... اور ایک روز جب یہ گرہ کھلی تو حقیقت کی اذیت نے ساری دھند کو صاف کرڈالا... پھر ایسا منظر واضح ہوا، جس کا اسے گمان تک نہ تھا۔ کہاں عرش، کہاں فرش... بس یہی خواب تھا اور یہی حقیقت۔



آیا جہاں اسکول بس آچکی تھی۔ انہیں بس میں رخصت کر کے اندر آیا تو جینا ناشتا لگا چکی تھی۔ ناشتے کے دوران میں اس نے مجھے یاد دلایا۔ ”بریٹ! آج جلدی آنا... لو آرہی ہے۔“

”مجھے یاد ہے ڈیئر۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ لو جس کا پورا نام لولیٹا ہے، میری واحد سالی ہے۔ وہ فلوریڈا کے ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے میں اپنا ریستوران چلا رہی تھی۔ جب بھی وہ میامی آتی تو اور ایک دن کے لیے ہمارے گھر ٹھہرتی تھی۔ میں نے جینا سے پوچھا۔ ”کیا لولیٹا کو کہیں باہر لے جانا ہے؟ اگر ایسا ارادہ ہے تو میں کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کے لیے میز بک کرا لوں؟“

”نہیں، اس بار میں نے گھر میں ہی رہنے کا سوچا ہے۔ میں اپنی بہن سے دل بھر کر باتیں کروں گی۔“

”یہ تو اچھا رہے گا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ اگر جینا اپنی بہن سے بات کرتی تو اس کا مطلب، میں سکون سے این بی اے فرسٹ لیگ کا فائنل دیکھ سکتا تھا۔ جینا سمجھ گئی تھی اس نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے باسکٹ بال جنون کی حد تک پسند ہے۔ ناشتا کر کے میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرا دفتر میامی کے ساحل کے ساتھ ایک اونچی اور جدید عمارت کے بارھویں فلور پر تھا اور یہاں سے میامی کے نیلگوں سمندر کا خوب صورت منظر بہت صاف نظر آتا تھا۔ مجھے یہ دفتر مہنگا تو پڑا لیکن اس کی وجہ سے میں نے کمایا بھی خوب تھا۔ میں دفتر میں داخل ہوا تو سامیرا آچکی تھی۔ وہ ایک دلکش لبنانی نژاد امریکی لڑکی تھی' اس کا باپ کسی زمانے میں امریکا آگیا تھا۔

”ہیلو سامی... کیا ہو رہا ہے؟“

”ہائے بریٹ۔“ وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے پرنٹر سے نکلنے والا کاغذ مجھے تھما دیا۔ ”آج تمہارے یہ اپائنٹمنٹ ہیں اور پہلا فرد اب سے دس منٹ بعد آنے والا ہے۔“

”اوکے! تب تک تم مجھے ایک کپ کافی لادو۔“ میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔ کوٹ اتار کر جب تک میں نے فہرست دیکھی، سامی کافی لے آئی۔ اس نے کپ میز پر رکھا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ چند منٹ بعد وہ اپنے بال درست کرتی ہوئی کمرے سے نکلی تو میں کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فہرست کے مطابق مجھے آج چھ افراد سے ملاقات کرنا تھی۔ تین لنچ سے پہلے اور تین لنچ کے بعد۔ مجھے امید تھی کہ میں شام چھ بجے تک فارغ ہو جاؤں گا۔ میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں۔ میری پریکٹس اتنی اچھی چل رہی تھی کہ علاج کے لیے رجوع کرنے والے ہر تین میں سے ایک فرد کو انکار کرنا پڑتا تھا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ میں روزانہ چھ سات افراد کو اپائنٹ منٹ دیتا ہوں جن کو میں سات آٹھ گھنٹے میں آسانی سے نمٹا لیتا ہوں۔ آج بھی چھ افراد کا اپائنٹ منٹ تھا۔

جب تک میں نے کافی ختم کی، پہلا فرد آگیا۔ پہلا گیا تو دوسرا اور پھر تیسرا آگیا۔ سامیرا وقت اس طرح طے رکھتی کہ ایک فرد کے جاتے ہی دوسرا آجاتا۔ البتہ کسی دن اپائنٹ منٹ کم ہوتے تو وہ ان میں اس طرح سے مناسب وقفہ کر دیتی کہ دوسرے فرد کے آنے سے پہلے مجھے کچھ دیر آرام کا موقع مل جاتا۔ تمام افراد کی کیس ہسٹری میرے کمپیوٹر میں موجود ہوتی اور میں اس کے آنے سے پہلے ایک نظر اس ہسٹری کو دیکھ لیتا تھا۔ ویسے مجھے اس کی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ میری یادداشت بہت اچھی تھی اور تمام باتیں کسی کمپیوٹر کی طرح میرے ذہن میں فیڈ رہتی ہیں۔

تیسرے فرد کے جاتے ہی میں لنچ کے لیے اٹھ گیا۔ سامیرا لنچ نہیں کرتی، اس لیے وہ اس ایک گھنٹے کے دوران میں آرام کر لیتی اور اپنی پسند کا میوزک سنتی رہتی۔ میامی سے کچھ دور ایک چھوٹے سے قصبے میں ساحل کے ساتھ اس کا کاٹیج تھا اور وہ صرف کاٹیج میں رہنے کی خاطر روزانہ پون گھنٹے کی ڈرائیو کر کے دفتر آتی اور جاتی۔ بہ قول اس کے یہ کاٹیج زمین پر اس کی جنت ہے۔ میں لنچ کر کے آیا تو وہ ہیڈ فون لگائے میوزک سن رہی تھی۔ میز پر ٹانگیں رکھے وہ خاصے قاتلانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ کچھ دیر اس کے پاس رک جاؤں لیکن مجھے یاد آیا، ابھی مزید تین افراد کو بھگتانا ہے۔ مہینے میں ایک بار میں کسی طرح موقع نکال کر اس کے کاٹیج کی سیر بھی کر آتا لیکن اس چھوٹی سی ملاقات سے تشنگی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے۔ سامیرا اور میرا تعلق افیئر سے زیادہ ایک ضرورت تھا۔ وہ بہت دلکش لڑکی تھی اور میں اس کے لیے ایک مناسب مرد تھا۔ اسے کہیں اور بھٹکنا نہیں پڑتا تھا۔

ابھی میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ لنچ کے بعد پہلا اپائنٹ منٹ آگیا اور جب آخری فرد بھی رخصت ہوا تو پانچ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ یعنی میں اپنے اندازے سے جلدی فارغ ہو گیا تھا۔ کرسی پر آرام کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آج دفتر میں ہی سامیرا کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزار لیا جائے۔ ابھی میرے پاس پون گھنٹا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا، انٹر کام نے بزر دی۔ میں نے بٹن دبایا۔ ”یس۔“

سامیرا نے کہا۔ ”سر! ایک خاتون آئی ہے اور وہ مصر ہے کہ آپ سے ابھی ملاقات ضروری ہے۔“

میں نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ ”تم نے بتایا نہیں کہ میں اپائنٹ منٹ کے بغیر کسی سے نہیں ملتا۔“

”بتایا ہے لیکن مس شیلا کارٹر کا کہنا ہے کہ ایمرجنسی ہے۔“

میرے شعبے میں ایمرجنسی کا مطلب تھا کہ انسان کی ذہنی حالت اتنی خراب ہے کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے یا وہ خود کو ختم کر لینا چاہتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ شاید یہ خاتون بھی کچھ ایسی ہی ایمرجنسی کے ساتھ آئی ہے۔ میں نے سوچا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، اسے کارڈ بنا دو اور آئندہ کے لیے اپائنٹ منٹ طے کر کے آنے کے بارے میں بھی بتا دینا۔“

میں اپنے کلائنٹ سے پہلی ملاقات کی فیس دو سو ڈالرز لیتا ہوں اور اس کے بعد ان کے ہر اپائنٹ منٹ پر دو سو ڈالرز فی گھنٹا چارج کرتا ہوں۔ میرے پاس وقت ہے اور کوئی فرد آگیا تو اسے دیکھ لینا میرے لیے سود مند ہے۔ دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک لڑکی نما عورت اندر آئی۔ لڑکی نما عورت اس لیے کہا کہ چہرے اور جسم سے وہ لڑکی ہی تھی۔ اس کی عمر شاید بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے عورتوں جیسا کسی قدر بھاری اور آرائشی لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں موتیوں سے سجا ایک خوب صورت پرس تھا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ موتی اصلی ہیں' س کا تعلق ہائی کلاس سے لگ رہا تھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ اسے یوں بغیر اپائنٹ منٹ کے آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”مجھے بریٹ جارڈن کہتے ہیں۔“

”شیلا کارٹر۔“ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر! مجھے تمہاری مدد کی اشد ضرورت ہے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی یا خودکشی کر لوں گی۔“

”میں تمہاری مدد کے لیے ہی یہاں بیٹھا ہوں۔“ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”مجھے ڈاکٹر مت کہو...... تم مجھے بریٹ کہہ سکتی ہو۔“

”شکریہ بریٹ۔“ اس نے اپنے پرس سے سگریٹ نکالی۔ ”کیا میں سگریٹ پی سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے کہا اور دراز سے لائٹر نکال کر اس سے سگریٹ جلایا۔ اس نے ایک گہرا کش لیا اور کسی قدر پر سکون نظر آنے لگی۔ ”تھینک یو بریٹ۔“

”تم اچانک یہاں آئی ہو، اس کا مطلب ہے تم پہلے سے میرے بارے میں جانتی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میری ایک واقف کار تمہارے پاس آتی رہی ہے اور اسی نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔“

”اس سے پہلے تم کسی اور ماہرِ نفسیات کے پاس گئیں؟“

اس نے ایک اور گہرا کش لیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں... کیونکہ مجھے لگ رہا ہے کہ میں کسی ماہرِ نفسیات کو بھی اپنا مسئلہ بتاؤں گی تو وہ یقین نہیں کرے گا۔“

مجھے اس کی بات سن کر تعجب نہیں ہوا کیونکہ اکثر نفسیاتی مریض سمجھتے ہیں کہ انہیں جو مسئلہ لاحق ہے، وہ ماہرِ نفسیات کی سمجھ میں نہیں آئے گا اور وہ اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ بہت سارے لوگ شدید نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہونے کے باوجود اسی وجہ سے ماہرِ نفسیات کے پاس جانے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے یا پھر وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ حالانکہ معمولی علاج سے ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس نے سگریٹ ختم کر کے فوراً ہی دوسری سلگا لی تھی۔ اس کی شفاف انگلیاں اور گلابی ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ چین اسموکر نہیں ہے اور اس وقت شدید اضطرابی کیفیت کی وجہ سے مسلسل سگریٹ پی رہی تھی۔

”ٹھیک ہے... لیکن پھر تم نے یہ یقین کیسے کر لیا کہ میں تمہاری بات سمجھ لوں گا؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ لیکن نہیں، وہ میرے پیچھے شیشے کی دیوار کے پاس نظر آنے والا منظر دیکھ رہی تھی۔ ”میرے پاس تمہارے سوا اور کوئی نام نہیں تھا۔ میری واقف کار نے تمہاری بہت تعریف کی ہے اور میں اسی کے اصرار پر تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”گویا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں گا؟“ میں نے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”سچی بات ہے...... بالکل بھی نہیں۔“

میں نے اپنی دراز سے ایک گولی نکال کر پانی کے گلاس کے ساتھ اس کی طرف بڑھا دی۔ ”یہ لے لو۔“

اس نے گولی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کس چیز کی گولی ہے؟“

”تمہارے اعصاب اس وقت بہت ہیجان میں ہیں۔ یہ گولی تمہیں پر سکون ہونے میں مدد دے گی۔ فکر مت کرو، یہ کسی قسم کے نشے یا مضرِ صحت چیز سے پاک ہے۔ صرف دو منٹ میں تم خود کو پر سکون محسوس کرنے لگو گی۔“

اس نے کسی قدر ہچکچا کر گولی لے لی اور پانی کی مدد سے حلق سے اتار لی۔ اس دوران میں وہ دوسرا سگریٹ بھی

ختم کر چکی تھی لیکن اس نے تیسرا سگریٹ سلگانے کی کوشش نہیں کی۔ چند منٹ بعد اس نے کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں خود کو اب پر سکون محسوس کر رہی ہوں۔“

میں خوش دلی سے ہنسا۔ ”اس کا مطلب ہے؟ میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟“

”شاید۔“ اس کے انداز میں اب بھی بے یقینی تھی۔

”تم اپنا یہ کوٹ اور پرس رکھ دو۔“ میں نے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اٹھ کر کوٹ اسٹینڈ پر ٹانگ دیا۔ نیچے اس نے مختصر سا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا جس میں اس کا متناسب جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ میرے کہنے پر وہ کاؤچ پر آ گئی۔ نیم دراز پوزیشن میں لیٹ کر اس نے میری طرف دیکھا۔

”کیا تم مجھے ہپناٹائز کرو گے؟“

میں نے کرسی اس کے پاس کر لی اور مسکرایا۔ ”نہیں... یہ تکنیک میں بہت کم اور اپنے کلائنٹ کی مرضی سے استعمال کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، مجھے اس سے خوف آتا ہے۔“

میں نے نوٹ پیڈ اور پین سنبھالا۔ ”اب تم اپنا مسئلہ بتاؤ۔“

وہ کچھ دیر ساکت لیٹی رہی پھر اس نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ ”میں دُہری زندگی گزارتی ہوں۔“

”کیا تمہاری مراد دہری شخصیت سے ہے؟“

”نہیں... میں دو الگ الگ زندگیاں گزارتی ہوں۔“

”ایک ہی وقت میں یا الگ الگ وقت میں؟“

”الگ الگ وقت میں۔“

”ٹھیک ہے، ابھی تم ایک وقت میں ہو۔ دوسرا وقت کب شروع ہوتا ہے؟“

”جب میں سو جاتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں سوتی ہوں اور دوسری طرف جاگ جاتی ہوں۔“

”دوسری طرف جاگ جاتی ہو؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس بات کی وضاحت کرو گی؟“

”جیسے تم صبح جاگتے ہو تو اپنی دنیا میں ہوتے ہو۔ لیکن جب رات کو سوتے ہو گے تو نیند میں چلے جاتے ہو گے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ میں جیسے ہی سوتی ہوں، اپنی دوسری شخصیت میں جاگ جاتی ہوں۔“

میں نے نوٹ پیڈ پر لکھا...... ”خواب“ اور اس سے پوچھا۔ ”کیا تم اسے خواب کی طرح محسوس کرتی ہو؟“

”نہیں، وہ بالکل حقیقت میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ جیتا جاگتا اور بھرپور ہوتا ہے۔ میں اسے خواب تسلیم نہیں کر سکتی۔“

”لیکن بعض خواب اتنے بھرپور ہوتے ہیں کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ لوگ ان خوابوں کے زیر اثر اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کر جاتے ہیں۔ لوگ خودکشی کر لیتے ہیں یا کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔“

”پھر بھی وہ خواب ہوتے ہیں لیکن میں جو دیکھتی ہوں، وہ خواب نہیں ہے۔ وہ ایک حقیقی اور بھرپور زندگی ہے...... بالکل اس زندگی کی طرح۔“

”خوابوں پر حد سے زیادہ یقین رکھنے والی۔“ میں نے پیڈ پر لکھا۔ ”اوکے! یہ طے کر لیا ہے کہ تم سونے کے بعد ایک دوسری زندگی میں بیدار ہوتی ہو جو اسی زندگی کی طرح اصلی اور بھرپور محسوس ہوتی ہے۔“

”محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ حقیقی زندگی ہی ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

”فی الحال تم مان لو کہ ہم فرض کر رہے ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اس طرح ہمیں بات آگے بڑھانے میں آسانی رہے گی۔ اگر تم پہلے سے ایک طے شدہ سوچ رکھو گی تو بات آگے نہیں بڑھے گی۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، میں فرض کر لیتی ہوں۔“

”گڈ... اب ہم اسے آغاز سے لیتے ہیں۔ پہلی بار تم نے کب محسوس کیا کہ سونے کے بعد تم ایک اور زندگی میں بیدار ہوتی ہو؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”یہ پرانی بات ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں نے کب اس بات کو درست طور پر جانا۔“

”پھر بھی کتنی پرانی بات ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ میں چودہ سال کی عمر سے یہ بات محسوس کر رہی ہوں لیکن درست طور پر دو ڈھائی سال پہلے جانا ہے۔“

”آغاز جوانی سے محسوس کیا۔“ میں نے پیڈ پر لکھا اور بولا۔ ”کوئی خاص واقعہ جس کے بعد تم نے اس بات کو واضح طور پر محسوس کیا؟“

”میں سمجھی نہیں۔“

”تمہارے ساتھ کوئی ایسا جسمانی یا نفسیاتی سانحہ یا واقعہ پیش آیا ہو جس نے تمہیں شاک دیا ہو۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”ہاں تقریباً تین سال پہلے ایک واقعہ پیش تو آیا تھا لیکن میں نہیں سمجھتی کہ

وہ اس معاملے میں کوئی کردار رکھتا ہے۔“

”تم واقعہ سناؤ، ہو سکتا ہے کوئی کردار نکل آئے۔“

”سمندر میں تیراکی کے دوران ایک غیر متوقع لہر مجھے بہا کر لے گئی اور میں شاید ڈوب ہی گئی تھی، اگر لائف گارڈ مجھے بروقت نہ نکالتا۔ میرے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا اور مجھے مصنوعی تنفس دے کر بچا لیا گیا تھا۔“

”تقریباً موت کا تجربہ۔“ میں نے نوٹ بک پر لکھا اور اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا اس واقعے کے بعد تم نے اپنی دوسری زندگی کو واضح طور پر محسوس کیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔“

”تم نے کہا تم دو ڈھائی سال سے اس دُہری زندگی کو بہت واضح طور پر محسوس کر رہی ہو؟“

”ہاں لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ایسا تیراکی کے دوران پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے؟ اب تم بتاؤ گی کہ تم نے کس طرح یہ سب محسوس کرنا شروع کیا؟ یعنی تم نے خواب میں خود کو دوسری زندگی میں پایا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ پہلی بار میں نے کب اس بات کو محسوس کیا مگر مجھے یہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ یہ کوئی نارمل بات نہیں ہے۔ خواب تو ہر انسان دیکھتا ہے اور یہ خواب ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان میں تسلسل اور حقائق کم ہوتے ہیں۔ خواہشات اور احساسات زیادہ ہوتے ہیں۔ میں اس وقت شاید چودہ سال کی تھی جب میں نے پہلی بار خود کو ایک مختلف زندگی میں دیکھا۔ وہ... وہ بہت عجیب زندگی تھی۔“ وہ چپ ہو گئی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے اس وقت سوچا بھی نہیں تھا، مجھے معلوم تھا کہ کال گرل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میرا تعلق ایک کیتھولک گھرانے سے ہے اور مجھے ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ عورت کا ایک سے زیادہ مردوں سے تعلق ہونا اچھی بات نہیں ہے۔“

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ”جب میں نے پہلی بار خود کو اس روپ میں دیکھا تو میں اسے بھیانک خواب ہی سمجھی۔ مگر ساتھ ہی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ خواب اتنے بھرپور بھی ہو سکتے ہیں۔ میں جو دیکھتی تھی، وہ بہت حقیقی لگتا تھا۔ میں دیکھتی کہ میں ایک گندی سی جگہ ہوں۔ یہ گھٹی ہوئی اور تاریک عمارت ہے۔ وہاں بدبو اور بیماری کا احساس ہے۔ میں اس گندی جگہ پر ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتی ہوں۔ میرا طرز زندگی بہت گھٹیا ہے۔ اتنا گھٹیا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہاں آس پاس ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ گندے اور گھٹن سے بھرپور کمرے۔ ان میں میری جیسی کال گرلز رہتی ہیں۔ زیادہ تر بڑی عمر کی تھیں ان میں میری ماں بھی تھی اور کچھ میری طرح کم عمر تھیں۔ لیکن وہ سب ایک ہی کام کرتی تھیں۔ جب میں نے پہلی بار یہ سب دیکھا تو جاگنے کے بعد کافی دیر دہشت زدہ رہی۔ وہ سب اتنا حقیقی تھا کہ جاگنے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے یقین نہیں آیا کہ میری اصل زندگی یہ ہے اور وہ سب میں نے سوتے میں دیکھا تھا۔ میں نے جاگنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

”اس کے بعد کئی دن تک میں نے کچھ نہیں دیکھا لیکن پھر مجھے دوبارہ وہی سب دکھائی دیا اور اس بار بھی میں کسی مرد کے ساتھ تھی۔“ اس نے بولتے ہوئے رک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم سوچ سکتے ہو کہ جب ایک کنواری لڑکی اس قسم کا خواب دیکھے تو اس پر کیا گزرتی ہے؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں، میں تصور کر سکتا ہوں۔ تم نے یقیناً بہت برا محسوس کیا ہو گا۔“

”بہت برے سے بھی زیادہ۔“ وہ بولی۔ ”دوسری بار دیکھنے پر میں سارا دن سکتے کی کیفیت میں رہی۔ ماما اور پاپا پریشان ہو گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلا لیا اور اس نے ذہنی شاک تشخیص کر کے مجھے ٹرنکولائزر دے دی۔ وہ میرا مسئلہ نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ میں نے سب سے پہلے اسے بتانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے برے خواب کا نتیجہ سمجھ رہا تھا اور اس نے پاپا سے کہا کہ مجھے ایسی چیزوں سے دور رکھا جائے جو مجھے جنسی تحریک دے رہی ہوں۔“

ماما پاپا حیران تھے کیونکہ ہمارے گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں ایک کیتھولک اسکول میں پڑھتی تھی جہاں ایسی باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ شاید میں کہیں اور سے یہ تحریک لے رہی ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے میرے باہر آنے جانے پر پابندی لگا دی اور میں رات کے وقت کہیں اکیلے نہیں جا سکتی تھی۔ ماما کا خیال تھا کہ کوئی لڑکی یا لڑکا دوست مجھے ایسی تحریک دے رہا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرے سارے دوست بہت اچھے اور سلجھی ہوئی ذہنیت رکھتے تھے۔“

”احساسات کو یقین کی حد تک محسوس کرنا۔“ میں نے پیڈ پر لکھا اور اس سے پوچھا۔ ”خوابوں کا سلسلہ تسلسل سے جاری رہا تھا؟“

‘‘بڑی حد تک... یوں سمجھ لو کہ جب میں کوئی خاص بات دیکھتی تھی تو وہ مجھے یاد رہتی۔’’

‘‘خاص بات سے کیا مراد ہے؟’’ میں نے نرمی سے پوچھا۔ ‘‘کسی مرد سے ملاقات؟’’

اس نے سرخ چہرے کے ساتھ سر ہلایا۔ ‘‘ہاں، ایسا ہی ہوتا تھا لیکن ہر رات نہیں....... اس وجہ سے میں سونے سے ڈرنے لگی۔ اس وقت میں اسکول میں تھی۔ تین سال بعد میں نے ہائی اسکول پاس کر لیا اور کالج میں چلی گئی۔ اس وقت میری عمر سترہ برس تھی۔’’

‘‘ابھی تمہاری عمر کیا ہے؟’’

‘‘بائیس برس۔’’ اس نے جواب دیا۔

‘‘گویا یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ کالج میں تمہاری ملاقات کسی ایسے فرد سے ہوئی جسے تم لائف پارٹنر کی حیثیت سے پسند کر سکو؟’’

اس نے کسی قدر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ‘‘بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ میش کارٹر سے میری ملاقات کالج میں تعلیم کے دوران ہوئی تھی۔’’

‘‘میش کارٹر کا تعلق کسی دولت مند خاندان سے ہے؟’’

اس نے سر ہلایا۔ ‘‘ہاں، وہ جدی پشتی رئیس ہے لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟’’

‘‘تمہارے لباس اور حلیے سے۔’’ میں مسکرایا۔ ‘‘تم کسی دولت مند آدمی کی بیوی نظر آتی ہو۔ اس کا مطلب ہے، تم دونوں نے کالج کی تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کر لی؟’’

‘‘ہاں، میں نے گریجویشن کیا اور میش نے ایم فل مکمل کیا تھا۔ کیونکہ کارٹر فیملی ایک بایو پروڈکٹ کی کمپنی چلا رہی ہے اس لیے میش نے بایو کیمسٹری کا انتخاب کیا۔’’

‘‘تیراکی کے دوران ڈوبنے والا واقعہ شادی سے پہلے پیش آیا یا اس کے بعد؟’’

‘‘شادی سے پہلے۔’’ وہ بولی۔ ‘‘لیکن میں میش کے ساتھ ہی تھی۔ ہم ویک اینڈ منانے گئے تھے۔’’

‘‘میش سے شادی پر تمہارے گھر والوں کی طرف سے کوئی اعتراض سامنے آیا؟’’

‘‘نہیں... ماما اور پاپا دونوں اس شادی سے بہت خوش تھے۔ اب بھی ہیں۔’’

‘‘کالج کے دنوں میں تمہیں خواب کم آتے تھے؟’’

‘‘کم تو نہیں آتے تھے...’’ وہ بولتے ہوئے رکی۔ ‘‘یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں نے ان پر توجہ دینا کم کر دی تھی۔’’

‘‘گویا خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘کالج کے بعد تم یقیناً ایک میچور لڑکی بن گئی ہوگی، اس وقت تمہیں احساس ہوا کہ تم جو دیکھتی ہو، وہ کوئی خواب نہیں بلکہ تمہاری زندگی کا دوسرا رخ ہے؟’’

‘‘بالکل... اسکول لائف میں اتنی میچور نہیں تھی۔ وہاں کا ماحول بھی گھٹا ہوا تھا جس میں ایسا سوچنے کو بھی برا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کالج کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ شاید یہ دوسرا سال تھا جب میں نے جانا کہ میں جو دیکھتی ہوں، وہ خواب نہیں ہے۔ تم نے ٹھیک کہا، یہ میری زندگی کا دوسرا رخ ہے۔’’

‘‘یہ تم نے تیراکی کے دوران میں پیش آنے والے حادثے کے بعد جانا؟’’

اس نے کسی قدر برہمی سے میری طرف دیکھا۔ ‘‘آخر تم اس حادثے کا بار بار ذکر کیوں کر رہے ہو؟’’

‘‘کیونکہ اس کے بعد ہی تم نے یہ ادراک کیا ہے۔ تم اس بات کو تسلیم نہیں کر رہی ہو لیکن میرے خیال میں ایسا ہی ہے۔’’ میں نے نرمی سے کہا۔ ‘‘خیر، اب میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔’’

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ‘‘یہ احساس بہت خوف ناک تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے اور میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ خود کو ہر رات ایک کال گرل کے روپ میں دیکھنا اور وہ بھی مختلف مردوں کے ساتھ بہت خوف ناک بات ہے۔’’

‘‘جب تم سونے کے بعد اپنی دوسری زندگی میں جاگتی ہو تو کیا تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم ایک الگ زندگی میں ہو اور اس کے علاوہ تمہاری دوسری زندگی بھی ہے؟’’

اس نے سر ہلایا۔ ‘‘بالکل اسی طرح احساس ہوتا ہے جیسے ابھی مجھے معلوم ہے کہ میری ایک زندگی اور بھی ہے جو اس زندگی سے بالکل مختلف اور گندی ہے۔’’

‘‘اس زندگی میں تمہاری عمر اتنی ہی ہے؟’’

‘‘بالکل...... تاریخ پیدائش اور وقت تک وہی ہے۔’’

‘‘شہر کون سا ہے؟’’

‘‘میامی سٹی۔’’ اس نے جواب دیا۔

‘‘جگہ کون سی ہے؟’’

اس سوال پر وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ‘‘میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میامی سٹی ہے۔ باقی جگہ، اسٹریٹ اور دوسری باتوں کا مجھے بالکل علم نہیں ہے۔’’

‘‘تم باہر نکلتی ہو؟’’

‘‘ہاں لیکن مجھے یاد نہیں رہتا کہ میں کہاں کہاں گئی اور وہ کون سے علاقے ہیں۔’’

‘‘وقت کیا ہوتا ہے؟’’

‘‘وہی وقت جس پر میری آنکھ لگتی ہے اور پھر میں دوسری زندگی میں جاگتی ہوں۔’’ اس نے جواب دیا۔ ‘‘وہاں میرا کام رات کو شروع ہوتا ہے۔’’

‘‘تم بیمار بھی ہوتی ہو...... جب ایسی کوئی بات ہو تو دوسری زندگی میں بھی بیمار ہوتی ہو؟’’

اس نے غور کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ‘‘نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ کئی بار میں یہاں بیمار ہوئی اور جب دوسری طرف جاگی تو مجھے کچھ نہیں تھا، ایک بار تو میرے پاؤں پر چوٹ آئی تھی۔ مگر جب دوسری زندگی میں جاگی تو میرے پاؤں پر چوٹ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔’’

‘‘اچھا ایسا ہوتا ہے کہ تم اس زندگی میں سوتی ہو اور کسی وجہ سے اچانک تمہاری آنکھ کھل جاتی ہو؟’’

‘‘بارہا ایسا بھی ہوا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں خود کو اس زندگی میں پاتی ہوں۔’’

‘‘اس لیے کہ وہاں تم سوتی نہیں ہو؟’’

میرے سوال پر شیلا کارٹر نے غور کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ‘‘نہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ میں وہاں سوتی ہوں اور کسی وجہ سے جاگ جاؤں تو میں خود کو یہاں پاتی ہوں۔’’

‘‘جیسا کہ انسان خواب سے جاگنے کے بعد خود کو حقیقی دنیا میں پاتا ہے؟’’

‘‘لیکن وہ بھی حقیقی دنیا ہے۔’’ اس نے احتجاج کیا۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کی۔ ‘‘اچھا، اس دوسری زندگی میں جاگنے کے لیے ضروری ہے کہ تم یہاں سو جاؤ۔ کیا ایسا ہوتا ہے کہ تم وہاں سو جاؤ اور خود کو اس زندگی میں بیدار دیکھو؟’’

‘‘نہیں لیکن...’’

‘‘ایسا ہوتا ہے کہ تم جب دوسری زندگی میں جاتی ہو، بستر پر بیدار ہوتی ہو یا خود کو کہیں بھی پاتی ہو...... جیسے کسی کام میں مصروف دیکھتی ہو یا کسی کے ساتھ پاتی ہو؟’’

اس سوال پر اس کا رنگ پھر سرخ ہوا لیکن اس نے سر ہلایا۔ ‘‘ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت کم میں نے وہاں خود کو بستر پر بیدار ہوتے دیکھا ہے۔’’

‘‘لیکن اس زندگی میں تم ہمیشہ بستر پر بیدار ہوتی ہو جیسے سوتی ہو خود کو ویسا ہی پاتی ہو؟’’

‘‘ہاں، ایسا ہی ہے۔’’ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

‘‘خوب! کیا تمہاری اس دُہری زندگی کا تمہارے ازدواجی معاملات پر اثر پڑ رہا ہے؟’’

اس نے گہری سانس لی۔ ‘‘بہت زیادہ اور بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ میں نے میش کو شادی سے پہلے اپنے ان خوابوں کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس صورت حال سے سمجھوتا نہیں کر پا رہا ہے۔’’

‘‘تم نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم اپنی دوسری زندگی کو بھی حقیقی سمجھتی ہو؟’’

‘‘نہیں، شکر ہے میں نے اسے یہ بات کبھی نہیں بتائی۔ درحقیقت میں نے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی ہے ماما پاپا کو بھی نہیں... تم پہلے فرد ہو جسے میں نے یہ سب بتایا ہے۔ تم خود سوچو اگر میں میش کو بتا دوں کہ میں خوابوں میں گزرنے والی کال گرل کی زندگی کو حقیقت سمجھتی ہوں تو اس کا ردعمل کیا ہو سکتا ہے۔’’

میں نے پیڈ اور پین رکھ دیے۔ ‘‘مسز کارٹر! تم کیا چاہتی ہو؟’’

‘‘میں... میں اس اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں شاید کال گرل والی زندگی میں خودکشی کر لیتی لیکن میری ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے لگا اگر میں نے خودکشی کی تو اس زندگی میں بھی مر جاؤں گی۔’’

‘‘خودکشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔’’

‘‘پلیز! مجھے اس دُہری زندگی سے نجات دلاؤ۔’’

‘‘تم اسے حقیقت سمجھتی ہو اور حقیقت سے نجات ممکن نہیں ہے۔’’ میں نے کہا تو وہ مایوس ہو گئی۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

‘‘کیا میں کسی طرح بھی اس اذیت سے نجات حاصل نہیں کر سکتی؟’’

‘‘کر سکتی ہو لیکن اس کے لیے تمہیں سب سے پہلے خود کو یقین دلانا ہوگا کہ تم اصل میں خواب دیکھتی ہو اور خواب میں ہی دوسری زندگی گزارتی ہو...... اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔’’

‘‘مگر وہ زندگی بالکل حقیقی لگتی ہے۔’’ اس نے بے یقینی سے کہا۔

‘‘حقیقی لگتی ہے لیکن ہے نہیں... میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں۔’’

‘‘وہ کیسے؟’’

‘‘ایک تو یہ کہ تم ہمیشہ یہاں سونے کے بعد وہاں بیدار ہوتی ہو لیکن یہاں بیدار ہونے کے لیے تمہیں وہاں سونا نہیں پڑتا۔ دوسرے تمہیں وہاں کا کچھ یاد نہیں ہے لیکن اس زندگی کی ایک ایک چیز تمہیں یاد ہے۔ اپنے گھر کا پتا، شہر کی مختلف جگہوں کے نام۔ وہاں تم یہ نہیں جانتیں کہ زندگی کیسے گزار رہی

ہو، مثلاً تم رقم کہاں رکھتی ہو، سامان کس اسٹور سے آتا ہے۔ اگر تمہیں کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو وہ کہاں سے ملے گی اور یہ کہ اس زندگی میں لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم ان سب کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو گی...... یا جانتی ہو؟'' میرے لہجے میں چیلنج آ گیا۔

اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے ان میں سے کوئی بات یاد نہیں ہے۔''

''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم جو کچھ دیکھتی ہو، وہ سوائے ایک طاقت ور خواب کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ کوئی خواب ہے۔'' اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ ''یہ بالکل حقیقت کی طرح محسوس ہوتا ہے۔''

''اچھا، اگر میں تمہیں اختیار دوں کہ تم دونوں زندگیوں میں سے کسے زیادہ حقیقی سمجھتی ہو تو تم کسے منتخب کرو گی؟''

وہ ہچکچائی پھر اس نے جواب دیا۔ ''اس زندگی کو۔''

''یعنی تمہارے ذہن میں ہے کہ یہی تمہاری حقیقی زندگی ہے اور جو تم سونے کے بعد دیکھتی یا محسوس کرتی ہو، اس کا تمہاری حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے؟'' میں نے زور دے کر کہا۔

''اچھا اگر ایسا ہے تو تم ان خوابوں کو کیا کہو گے؟ وہ مجھے حقیقت سے اتنے قریب کیوں محسوس ہوتے ہیں؟''

''اگر تم انہیں خواب مانتی ہو تو اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ان خوابوں سے نجات حاصل کر لو۔''

''سچ؟'' اس نے شک سے کہا۔

''بالکل سچ... یہ ممکن ہے لیکن پہلے تم خود کو تیار کرو کہ یہ خواب ہیں۔ اس کے بعد تم دیکھو گی کہ ان سے کتنی آسانی سے نجات مل سکتی ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے، اگر تم کہتے ہو تو میں مان لوں گی کہ یہ خواب ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے تب تم کیا وضاحت پیش کرتے ہو، میں یہ خواب کیوں دیکھتی ہوں؟''

''میں تمہارے سامنے کچھ مفروضات پیش کرتا ہوں۔ تمہارا تعلق ایک پوش کیتھولک گھرانے سے ہے جہاں مذہب کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

اس نے سر ہلایا، منہ سے کچھ نہیں بولی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اسی وجہ سے تمہیں ایک کیتھولک اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں ماحول سخت گیر اور پھیکا تھا۔ یہ ماحول تمہیں پسند نہیں تھا؟''

اس بار بھی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تمہیں اور دوسری لڑکیوں کو وہاں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ پاکیزہ زندگی گزاریں اور مردوں سے غیر اخلاقی تعلقات سے گریز کریں۔''

''یہ بات سب جانتے ہیں، ان باتوں کا ان خوابوں سے کیا تعلق ہے؟''

''ہے...... دیکھو، انسان کو کسی کام پر مجبور کیا جائے تو وہ اس کے خلاف ہو جاتا ہے اور بچوں میں یہ جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خواب تمہاری طرف سے مخالفانہ ردِعمل تھا۔ تمہیں اسکول اور گھر میں جو سکھایا جاتا تھا، تم اس کے برعکس کرنا چاہتی تھیں اور کر نہیں پاتی تھیں اس لیے تم نے یہ خواب دیکھنا شروع کر دیے۔''

''اتنے بھیانک خواب۔'' شیلا کارٹر لرز گئی۔

''یہ بات تم شعوری طور پر سوچتی ہو لیکن لاشعور نے بغاوت کی اور اس نے من پسند زندگی منتخب کر کے تمہیں خواب کی صورت میں دکھانی شروع کر دی۔''

شیلا کارٹر کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے اسکول اور گھر والوں کی طرف سے پاکیزگی کا لیکچر پسند نہیں تھا لیکن میں خواب میں بھی اتنی گندی جگہ رہنے کا سوچ نہیں سکتی۔ تم نہیں جانتے، وہاں کتنی گندگی اور بو ہوتی ہے۔''

''یہ تمہارے ماحول کا ردِعمل تھا۔ تم ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہو لیکن کسی کیتھولک اسکول میں پڑھنے والی لڑکیاں بہت غریب پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا ماحول وہی ہے جو تم خواب میں دیکھتی ہو۔ یہ تمہارا ضمیر ہے جو تمہیں احساس دلاتا ہے کہ اس دنیا میں بہت سارے لوگ کس طرح برے حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ ایک حقیقی دنیا ہے اور ایک ضمیر کی دنیا ہوتی ہے۔ اگر ایک انسان کو اس دنیا میں بہت زیادہ مل جاتا ہے تو ضمیر کی دنیا میں اسے محرومیاں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بہت غریب انسان خوابوں میں خود کو دولت مند اور پرآسائش زندگی میں دیکھتا ہے۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ شیلا کارٹر کی مزاحمت کمزور ہو رہی ہے اور وہ میری باتوں کو قبول کر رہی تھی۔ میں دلائل اور نرمی کے ساتھ اس سے بات کرتا رہا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ خاصی حد تک قائل نظر آنے لگی۔ اچانک اس نے چونک کر کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو تم بار بار تیراکی کے دوران پیش آنے والے حادثے پر کیوں زور دے رہے تھے؟''

''کیونکہ ایسے حادثات جس میں انسان موت کا سامنا کرتا ہے، اس کے اندرونی احساسات کو بہت تیز کر دیتے

ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ لاشعور انسان کو ڈرا کر اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسے زیادہ آسانی سے اپنی مرضی پر چلا سکتا ہے۔ اس حادثے کے بعد تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ لاشعور حاوی ہوا اور وہ جو خواب دکھاتا رہا اب تمہیں زیادہ حقیقی محسوس ہونے لگے۔''

''کیا میں ان خوابوں سے نجات حاصل کر سکوں گی؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''کیوں نہیں... آج ہماری پہلی میٹنگ ہے اور تم نے یقیناً خود کو بہتر محسوس کیا ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم ایک ہفتے بعد میرے پاس آنا۔ میں تمہیں کچھ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں، اس دوران میں تم وہ استعمال کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم کہیں زیادہ بہتر محسوس کرو گی۔'' میں نے اسے کاغذ پر دواؤں کے نام لکھ کر دیے۔ اس نے پرچہ تھام کر تجسس سے کہا۔

''مسٹر بریٹ! تم نے شروع میں مجھے کون سی دوا دی تھی؟''

اس کے سوال پر میں ہنسا۔ ''وہ... وہ کوئی دوا نہیں ہے، سادہ میٹھی گولی ہے۔'' میں نے میز پر رکھی ڈبیا سے نکال کر ایک اسے دی اور خود بھی کھائی۔ ''اس کا کوئی حقیقی اثر نہیں ہے۔ تم نے اسے کھانے کے بعد جو سکون محسوس کیا، وہ نفسیاتی تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بہت ساری چیزیں حقیقی نہیں ہوتیں بلکہ انسان ان کو صرف محسوس کرتا ہے۔''

وہ بھی ہنسنے لگی۔ ''میری دوست تمہاری صحیح تعریف کر رہی تھی۔ تم واقعی بہت ذہین اور اچھے ماہر نفسیات ہو۔''

شیلا کارٹر جب اٹھی تو سوا چھ بج چکے تھے اور مجھے سات بجے تک لازمی گھر پہنچنا تھا۔ سامیرا سے دفتر میں میٹنگ کا پروگرام تو ادھورا رہ گیا تھا لیکن مجھے ایک نئی کلائنٹ مل گئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس کے مکمل علاج تک میں اس سے خاصی فیس وصول کر سکوں گا۔ میں اور سامیرا ساتھ ساتھ دفتر سے نکلے اور اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں ذرا تاخیر سے گھر پہنچا لیکن مجھے امید تھی کہ جینا اتنی تاخیر کو زیادہ اہمیت نہیں دے گی۔ ویسے بھی اسے اپنی بہن کے آنے کی زیادہ خوشی تھی۔ لو آ چکی تھی۔ اس سے مل کر اور کچھ دیر گپ شپ کر کے میں اوپر آیا۔ نہا کر کپڑے تبدیل کیے اور پھر لاؤنج میں آ گیا جہاں باسکٹ بال چیمپئن شپ کا فائنل شروع ہونے والا تھا۔ بچے اپنے کھلونوں کے ساتھ مگن تھے جبکہ لو اور جینا کچن میں مصروف گفتگو تھیں۔ جب تک کھانا بنا، میچ ختم ہو گیا تھا اور میری فیورٹ میامی چارجر نے چیمپئن شپ جیت لی تھی۔ خوش گوار ماحول میں کھانے کے بعد لو اور جینا چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئیں کیونکہ میں تھکن محسوس کر رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اب سو جانا چاہیے۔ کل ایک مصروف دن تھا۔ میرے کل سات اپائنٹ منٹ تھے اور مجھے لازمی دفتر میں دیر ہو جاتی۔ اس لیے اگر میں جلدی سو جاتا تو اگلے دن تازہ دم اٹھتا اور دیر تک کام کر سکتا تھا۔

بچوں کو ان کے کمرے میں لٹا کر اور پیار کر کے میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ برش کرتے ہوئے مجھے شیلا کارٹر کا خیال آیا۔ وہ بے چاری واقعی ایک مشکل میں پھنس گئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی کہ اس نے مجھ سے رابطہ کر لیا اور مجھے امید تھی کہ میں اسے اس مشکل سے نکال لوں گا... کیونکہ میں اس بارے میں جانتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ ایک آدمی کی دو دنیائیں ہوتی ہیں، ایک حقیقی دنیا اور ایک ضمیر کی دنیا... جہاں انسان حقیقی دنیا کے الٹ زندگی گزارتا ہے۔ میں اس بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا لیکن ایک بار میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس کائنات کو بنانے اور چلانے والی ہستی انصاف پسند ہے، تب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ ایک انسان حقیقی دنیا میں مشکل میں ہوتا ہے تو دوسری دنیا جسے خوابوں کی یا ضمیر کی دنیا کہہ سکتے ہیں، وہاں وہ اچھی زندگی گزارتا ہے اور جو شخص حقیقی دنیا میں اچھی زندگی گزارتا ہے، وہ وہاں خراب زندگی گزارتا ہے۔ تمام ہی انسانوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے لیکن وہ اسے درست طور پر سمجھ نہیں پاتے۔ ان کا ذہن انہیں الجھاتا ہے مگر کبھی کبھار ایسا کوئی حادثہ پیش آتا ہے جس میں انسان کی اندرونی حسیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ دونوں دنیاؤں کا ادراک کرنے لگتا ہے اور یہاں سے اس کے لیے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے جیسا کہ شیلا کارٹر کے ساتھ ہوا تھا۔ ہر شخص کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہوتے کہ وہ اس حقیقت کے بوجھ کو سنبھال سکے۔ لوگ پاگل ہو جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ میں سوچتے ہوئے بستر پر آ کر لیٹ گیا اور چند منٹ بعد ہی گہری نیند سو چکا تھا۔

''بریٹ! اٹھو، کیا کام پر نہیں جانا ہے؟'' میری موٹی اور بدصورت بیوی نے چلا کر کہا۔ ''آج کام نہیں ملا تو فاقے ہوں گے۔''

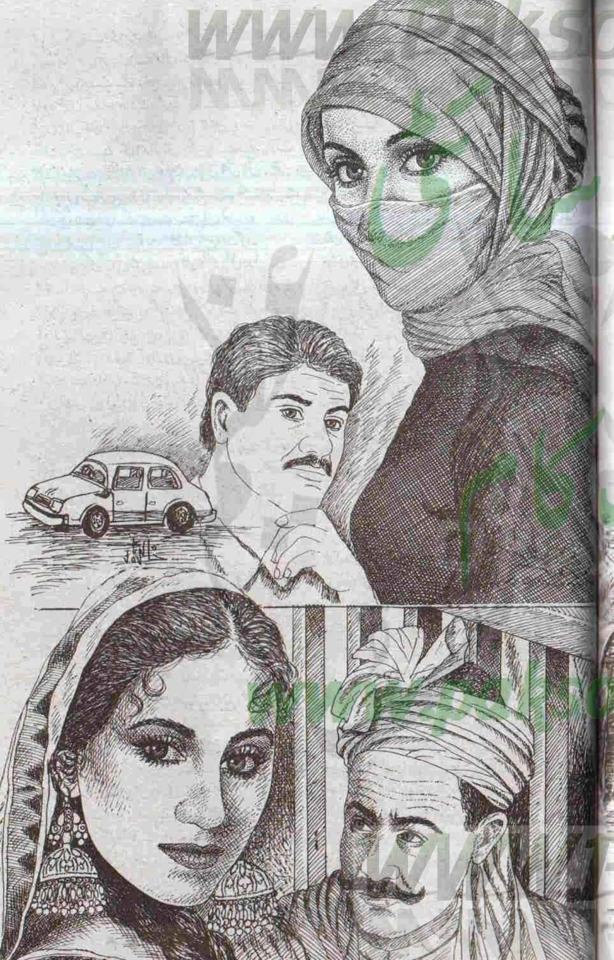
میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ کمرا حسب معمول گندہ ہو رہا تھا اور دیواروں پر سیلن تھی۔ باہر سے آتا شور بتا رہا تھا کہ اس غریبوں کے علاقے میں ایک اور صبح کا آغاز ہو گیا تھا جب یہاں بسنے والوں کو زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کرنا تھا۔ ان میں ایک میں بھی تھا اور یہ میری دوسری زندگی تھی۔

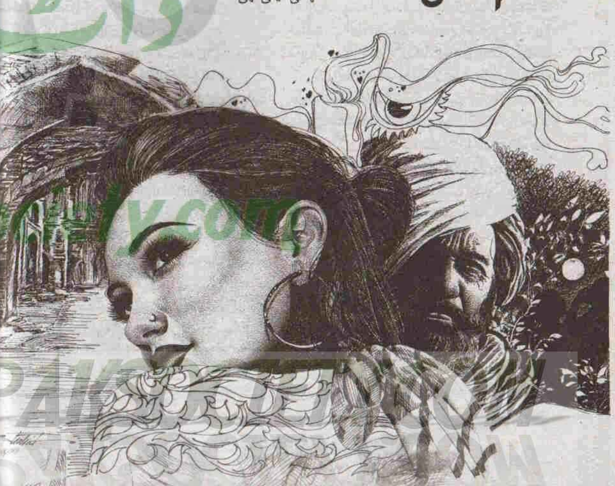
دشت تنہائی

نجمہ مودی

دل گرفتگی کے عالم میں ویران راہوں کا ایک تنہا مسافر اور نا آسودہ خواہشوں کا رقص

جب حزن وملال اور افسردگی کا موسم ہو اور کسی کی ذات کے کھنڈر میں گہرا سناٹا چھا جائے... جب دل کا پنچھی پھڑکنا بند کردے تو چاہنے والوں کی آنکھوں سے اشک نہیں لہو ٹپکتا ہے... اس کی ذات میں بھی جانے کیسا خلا تھا جسے پر کرنے کے لیے اس نے تمام عمر ہجرتوں میں ہی گزار دی... اسی دشت جنوں میں وہ صحرا صحرا بھٹکتا رہا... ستاروں میں، جگنوؤں میں، اسی ایک چہرے کو تلاشتا رہا... مگر خواہشیں حسرتوں میں ڈھلتی رہیں... ایک عجیب سی بے کلی اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ جو انسان کو خریدنے کی سکت رکھتا تھا... وہ جو ہر آسائش پر دسترس رکھتا تھا... وہ جو روٹھے ہوئے موسم بھی منا لیتا تھا مگر مقدر کو منانا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ اگرچہ اس نے کتنے مان سے کہا تھا "جب چھن جائیں سارے سائے... اور دھوپ سفر میں آجائے... مت تنہا تنہا گھبرانا... تم پاس ہمارے آجانا" مگر اس ہرجائی نے اس کی ایک نہ مانی۔ بچھڑ کر ملنا، مل مل کر بچھڑ جانا اس کی ادا ٹھہری مگر... درحقیقت اندیشوں کے سانپوں... اور زندگی کی تفکرات نے اسے گردش ایام کے حوالے کچھ ایسے کیا کہ وہ خواب دیکھنا ہی بھول گئی... اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کوئی دھوپ کے سفر میں اس کا منتظر ہے... مگر کب تک... بالآخر مایوسی نے اس مسافر کو دشت تنہائی میں لا پھینکا۔ جہاں معاشرتی اونچ نیچ... ذات پات کے گھمنڈ... اونچے شملے کچھ بھی تو نہیں تھا، البتہ دور دور تک ریتیلی زمین اونچے فلک سے ملتی دکھائی دیتی تھی۔





میں نے پہلی مرتبہ جب وہ منظر دیکھا تو مجھے بہت ہی عجیب سا محسوس ہوا۔ میرے خیال میں ابا جی بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وہ اپنے چند کارندوں اور مصاحب نما دوستوں کے ساتھ بیٹھے رقص دیکھ رہے تھے۔ دو کم عمر، طرح دار حسین لڑکیاں بجلی کی طرح قالین پر تھرک رہی تھیں۔ سازندے مشینی انداز میں ساز بجا رہے تھے۔ نوٹ لٹائے جا رہے تھے اور اس کام میں ابا جی پیش پیش تھے۔ سازندوں کے قریب بڑی عمر کی ایک عورت باچھیں کھلائے بیٹھی تھی' لالچ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ مستعدی سے، دونوں ہاتھوں سے نوٹ سمیٹنے میں مصروف تھی۔

جام بھی گردش میں تھا۔ دو تین بوتلیں کھلی ہوئی تھیں۔ مختلف آوازے کسے جا رہے تھے اور رقص کرنے والی نوخیز لڑکیاں نہایت گھاگ اور منجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ وہ آوازیں سن رہی تھیں۔ ان کی پیشانیوں پر شکن تک نہیں تھی۔ بلکہ زیادہ ناروا آوازوں کے جواب میں وہ زیادہ شدت سے اداؤں کے تیر چلانے لگتی تھیں۔ جھومتے ہوئے کسی تماش بین کی کسی الٹی سیدھی حرکت کے بعد گویا ان کے جسم کا لوچ بڑھ جاتا تھا۔

سارا ماحول ہی ایک عجیب سے خمار کی لپیٹ میں تھا۔ ابا جی نسبتاً پرسکون تھے۔ ان کی موٹی موٹی خوب صورت آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور سرخ و سپید چہرہ تمتما رہا تھا۔ ان کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ ان کے لیے یہ تماشا نیا نہیں تھا۔ تاہم وہ کوئی اوچھی حرکت نہیں کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی نئے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میری عمر اس وقت چودہ برس تھی۔ وجود میں آتش فشاں کروٹیں لینے لگے تھے۔ تھرکتی ہوئی لڑکیوں کی اداؤں، جسموں کے بل اور زلفوں کے پیچ و خم میں میرے لیے بھی کشش تھی مگر ابھی فطرت میں کم سنی کا حجاب اور شرمیلا پن باقی تھا۔ اس لیے سب کچھ غور سے دیکھنے کے بعد مجھے اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ابا جی ان سب لوگوں میں گھرے اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے اچھے نہیں لگے تھے۔

وہ ہماری زمینوں کی حدود میں ہی واقع ایک طویل و عریض مکان تھا، جس کے بڑے سے ہال میں یہ محفل جمی ہوئی تھی۔ اس مکان میں ہماری زمینوں کا منتظم (منشی) اور دو تین دوسرے کارندے رہتے تھے۔ زمینوں سے متعلق زیادہ تر معاملات یہیں نمٹائے جاتے تھے۔ اسے ہم ڈیرا کہتے تھے۔ ابا جی تقریباً چوبیس گھنٹے یہیں رہتے تھے۔ حالانکہ یہاں حویلی جیسا آرام نہیں تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ زمینوں کے معاملات نمٹانے اور اسی سلسلے کے دوسرے کام نمٹانے کی وجہ سے یہاں رہتے ہیں اور وہ ان جھگڑوں کو اصل گھر سے دور ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارا اصل مکان جو ایک چھوٹی موٹی حویلی سے مشابہ تھا، وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر گاؤں کے نواح میں تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر آبادی ہمارے مزارعوں کی تھی۔ تھوڑے بہت ہی ایسے لوگوں کے گھر تھے جو دوسرے چھوٹے موٹے زمینداروں کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ نسبتاً خوش حال قسم کے چند گھرانے ایسے بھی تھے جنہوں نے دوسروں کی زمین ٹھیکے پر لی ہوئی تھی۔ ہمارا گاؤں بہت چھوٹا نہیں تھا۔ تھوڑی بہت کوشش کی جاتی تو اسے قصبے کا درجہ مل سکتا تھا۔

ہمارے گاؤں سے دوسری طرف تقریباً ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ نیم پختہ پگڈنڈی پر طے کرنے کے بعد پکی سڑک آجاتی تھی جس پر تقریباً اٹھارہ میل کا فاصلہ طے کرکے لاہور پہنچا جا سکتا تھا۔ میں لاہور ہی کے ایک بہت اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک گاڑی مجھے روزانہ اسکول لے جانے اور لے آنے کے لیے مخصوص تھی۔

گھر میں گاڑیاں موجود ہوں تو لڑکے بہت چھوٹی عمر میں ہی ڈرائیونگ وغیرہ سیکھ جاتے ہیں۔ میں بھی فارغ وقت میں جیپ یا چھوٹی کار لے کر اپنی زمینوں کی طرف یا پھر آس پاس کے علاقے کی سیر کے لیے نکل جاتا تھا۔ کبھی کبھی اکیلا یا دوستوں کے ساتھ پیدل بھی میلوں چل لیتا تھا۔ گاڑی لے کر شہر جانے کی ابھی مجھے اجازت نہیں تھی اور اس علاقے میں چونکہ رنگینیاں اور دلچسپیاں کم از کم میرے لیے کم تھیں اس لیے میں دل میں ایک بے عنوان تشنگی لیے ادھر ادھر پھرتا رہتا تھا۔

ہمارے اسکول میں پڑھائی کا معیار بہت بلند تھا۔ اچھے طالب علموں میں شمار ہونے کے لیے مجھے گھر پر بھی خاصا پڑھنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود خاصا وقت فالتو محسوس ہوتا تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں، میں اس روز بھی سیر کے لیے نکلا اور یوں ہی بلا ارادہ ڈیرے کی طرف نکل آیا تھا۔

ڈیرے کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا اندر چلا گیا۔ دروازے کے قریب ہی طویل و عریض احاطے میں ایک لمبی چوڑی، بھاری بھرکم چارپائی پڑی رہتی تھی۔ جس پر خدا بخش مستقل نیم دراز رہتا تھا۔ کبھی کبھار دوسرے لوگ بھی اس کے اردگرد آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ ایک طرح سے ڈیرے کا غیر رسمی چوکیدار تھا۔ اس چارپائی پر نیم دراز ہی رہتے ہوئے وہ آنے جانے والوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ حرکت میں صرف اس وقت آتا تھا، جب کسی کو روکنا مقصود ہوتا تھا۔

وہ اگر آنکھ کے اشارے سے کسی کو اندر جانے سے منع کر دیتا تو اسے مزید ایک قدم بھی بڑھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت خدا بخش کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ شاید وہ خود بھی اندر گیا ہوا تھا۔ اندر سے طبلے کی تھاپ، سارنگی و ہارمونیم کی آوازیں اور گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔

میں پہلے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے نہایت احتیاط سے اس طرح اندر جھانکا کہ کوئی مجھے نہ دیکھ سکے...... اور تب مجھے وہ لڑکیاں ناچتی نظر آئیں۔

میں چند لمحے سانس روکے کھڑا وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھر میں خاموشی سے لوٹ آیا۔ میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ یہ انکشاف میرے لیے کچھ زیادہ ہی حیران کن تھا کہ ڈیرے پر زمینوں کے معاملات نمٹائے جانے کے ساتھ ساتھ اس قسم کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ میرے نزدیک یہ بہت سنگین معاملہ تھا۔

میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نہر تک پہنچا، جیپ میں بیٹھا اور اپنے دوست اشرف بھٹی کے گھر کی طرف چل دیا۔ اشرف بھٹی عمر میں مجھ سے تقریباً دو سال بڑا تھا۔ اس کے والد ایک چھوٹے زمیندار تھے اور جب کبھی میرے والد سے ملتے تو ان کے قدموں میں بچھ جاتے تھے۔ اشرف سے میری خاصی گہری دوستی تھی۔ جب بھی مجھے کوئی سنگین مسئلہ درپیش ہوتا اور میں مشورے کی ضرورت محسوس کرتا تو میں دوڑا دوڑا اسی کی طرف جاتا تھا۔

اشرف بھٹی اس وقت اپنے گھر کے سامنے نیٹ لگائے اپنے کسی کزن کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔ میں نے جیپ میں بیٹھے بیٹھے ہی اشارے سے اسے بلایا اور وہ ریکٹ ایک نوکر کو تھما کر میرے ساتھ جیپ میں آن بیٹھا۔ وہ سفید اسپورٹس شرٹ، نیکر اور جوگرز پہنے ہوئے تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نوجوانی میں ہی اس کا پیٹ خاصا باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے جیپ تھوڑا آگے بڑھا دی اور درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس جا کر روکی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اشرف بولا۔ ''یار، تم تو اس وقت یوں پریشان نظر آ رہے ہو جیسے کسی نے نہانے کے لیے نہر میں چھلانگ لگائی ہو اور کنارے پر سے کوئی اس کے کپڑے اٹھا کر بھاگ گیا ہو۔'' مثالیں ڈھونڈنے کے معاملے میں کبھی کبھی اس کا ذہن خوب کام کرتا تھا۔

''میں اس سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہوں۔'' میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرے ابا جی ڈیرے پر بیٹھ کر مجرے دیکھتے ہیں...... شراب پیتے ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میں ابھی ابھی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ ڈیرے پر دو لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔'' میں نے افسردگی سے بتایا۔

''اچھا......؟'' اشرف کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ پھر وہ میری طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ سے لہجے میں بولا۔ ''کیسی تھیں؟''

''کون کیسی تھیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی لڑکیاں...... جو ناچ رہی تھیں۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر ذرا بگڑ کر بولا۔ ''کمال ہے یار! میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ لڑکیاں کیسی تھیں۔ کیسے بے ہودہ انسان ہو تم۔''

''تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ تمہاری ابھی کچھ کرنے کی عمر نہیں ہے۔'' اشرف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ویسے...... بائی داوے...... تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ تمہیں تو یوں تشویش ہو رہی ہے جیسے باپ دراصل تم ہو اور تم نے اپنے کم سن بیٹے کو تماش بینی کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔''

پھر وہ میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''ابے الو......! وہ تمہارے والد ہیں اور کافی بڑے زمیندار ہیں۔ اگر وہ مجرا دیکھ رہے تھے تو یہ ایک معمولی بات ہے۔ تمہیں اس طرح آنکھیں پھیلا کر اور وحشت زدہ صورت لے کر ادھر ادھر بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس احساس سے دھچکا سا لگا کہ اسے میرے احساسات اور میری کیفیت کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ پھر وہ گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یار، ذرا اور بڑے ہو کر ہم بھی یوں ہی عیش کیا کریں گے۔ ایک تو میں تم سے بڑا ہونے کے باوجود پڑھائی میں ذرا پیچھے رہ گیا ہوں...... لیکن خیر...... ایک آدھ سال کی بات اور ہے...... پھر ہم کالج پہنچ جائیں گے۔ پیسے بھی زیادہ ملنے لگیں گے اور آزادی بھی زیادہ ہوگی۔ ہم بھی اس بازار میں جا کر ڈانس دیکھا کریں گے۔ تم میرے ساتھ چلا کرنا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی ہوئی

ہے۔ میں نے تو ایک مرتبہ وہاں جا کر گانا بھی سنا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے تو میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔ "کب ...... کیسے ...... تم نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

"اس وقت شاید میری تم سے دوستی زیادہ گہری نہیں تھی۔ ایسی باتیں تو گہرے دوستوں کو ہی بتائی جاسکتی ہیں نا......" وہ مربیانہ لہجے میں بولا۔ "میرے پاس کافی پیسے آگئے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو اپنے ساتھ شریک کرلیا تھا۔ اس رات ہم شہر میں ہی رک گئے تھے۔ بہانہ یہ کر کے گئے تھے کہ اسکول میں فنکشن ہے۔"

بڑے اطمینان سے بتانے کے بعد وہ ایک بار پھر مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو گیا۔ "کالج پہنچ کر ہم ہاسٹل میں داخلہ لے لیں گے یا پھر اپنے والدین سے کہیں گے کہ ہمیں وہاں کوئی اچھا سا مکان دلوا دیں۔ یہ روز روز آنے جانے کی کوفت سے چھٹکارا مل جائے گا......بس، پھر تو ہمارے عیش ہوں گے۔"

معلوم نہیں اس کے ذہن میں عیش و عشرت کا تصور کیا تھا۔ لیکن یہ بات بہرحال طے تھی کہ میں اس کے قبیل کا لڑکا نہیں تھا۔ اس کے خیالات گویا پہلی بار صحیح طور پر میرے سامنے آئے تھے۔

"مجھے تمہاری باتیں سن کر بہت مایوسی ہوئی ہے اشرف!" میں نے حقیقتاً بڑی مایوسی سے کہا۔

"دو چار سال اور ٹھہر جاؤ بچو......!" وہ میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ "پھر تمہیں میری یہ باتیں بہت اچھی لگنے لگیں گی۔ دراصل جوانی کی طرف تمہاری پیش قدمی ذرا سست ہے۔"

میں نے اسے واپس لے جا کر جیپ سے اتارا اور وہ دوبارہ جوش و خروش سے کھیل میں مشغول ہو گیا۔ اس سے بات کر کے مجھے اطمینان ہونے کے بجائے میرے اندر ایک بے نام سی وحشت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ چند منٹ مزید جیپ میں ادھر ادھر چکرانے کے بعد میں نے اپنے ایک اور دوست سکندر کے گھر کا رخ کیا۔ میرے خیال میں سکندر بہرحال اشرف بھٹی سے کہیں زیادہ سنجیدہ، بردبار اور سمجھدار تھا۔

سکندر سے میری دوستی گہری تو نہیں تھی لیکن وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ تاہم اس کے مزاج میں ایک عجیب سے تلخی تھی جس کی وجہ سے مجھے اس کے زیادہ قریب ہونے سے ایک عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کے مزاج کی یہ تلخی اور کھردرا پن اس کے گھریلو حالات کی پیداوار تھا۔

وہ ایک بہت ہی غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کے والد ایک معمولی کاشت کار تھے اور ان کے گھر میں دکھ بیماری بھی کچھ زیادہ رہتی تھی۔ کنبہ گوکہ کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن گھر میں جیسے ہمیشہ مسائل کا انبار رہتا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ ایک قریبی قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک سرکاری اسکول تھا اور سکندر دو تین میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے وہاں جاتا تھا۔

میں کبھی کبھار اپنی گاڑی میں لاہور جاتے وقت اسے پیدل اسکول جاتے دیکھتا تو گاڑی رکوا کر اسے لفٹ کی پیشکش کرتا مگر وہ میری گاڑی میں نہیں بیٹھتا تھا۔ بلا کا خوددار تھا وہ۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ "دو چار مرتبہ تمہاری گاڑی میں چلا جاؤں گا تو میری زندگی میں انقلاب تو نہیں آجائے گا۔ البتہ میری عادت خراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

ایک آدھ مرتبہ اس کے گھرانے میں کسی مالی پریشانی کا ذکر سن کر میں نے اپنے ذاتی وسائل کی مناسبت سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تو اس نے وہ بھی قبول کرنے سے سخت انکار کردیا تھا۔

ایسے موقعوں پر وہ کہتا تھا۔ "یہ مسئلہ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا ہے کہ میں تم سے کوئی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو بس باتوں میں ایک بات آگئی...... میں تو اپنا ہر مسئلہ خود حل کرنا چاہتا ہوں...... اور ہمیشہ کے لیے حل کرنا چاہتا ہوں۔ اس قسم کی عارضی اور ناکافی امداد میرے مسائل کا حل نہیں ہے۔"

ان سب باتوں کے باوجود میں اسے پسند کرتا تھا۔ ہماری بچپن کی شناسائی اب تک چلی آرہی تھی۔ اسے گہری دوستی تو نہیں کہا جاسکتا لیکن تعلق بہرحال سطحی رسم و رواج سے کچھ آگے کا تھا۔

جب میں اس کے نیم پختہ سے مکان پر پہنچا تو جیپ کی آواز سن کر وہ خود ہی باہر آگیا۔ وہ پرانی سی، معمولی شلوار قمیص میں تھا اور اس کے ہاتھوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ شاید وہ اپنے صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر ہاتھ دھوتے دھوتے باہر آیا تھا۔ وہ ایک گورا چٹا، دبلا پتلا لڑکا تھا جس کے نقوش تیکھے اور دلکش تھے۔ اس کی آنکھیں اکثر گویا کسی گہری سوچ سے سلگتی رہتی تھیں۔

میں نے اس سے بات کرنے کے لیے جیپ سے اتر جانا ہی بہتر سمجھا۔ سکندر نے اپنے گیلے ہاتھ قمیص پر ہی پھیر کر خشک کرنے کی کوشش کی اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے

معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "میں ذرا مرغیوں کے ڈربے کی مرمت کر رہا تھا۔ مرغیاں سردی گرمی سے بچی رہیں تو زندہ رہیں گی۔ زندہ رہیں گی تو انڈے دیں گی اور انڈے دیں گی تو انہیں بیچنے سے چار پیسے حاصل ہوں گے جن سے گھر کو سہارا ملے گا۔"

"تم بات کو بہت طویل اور پیچیدہ بنا دیتے ہو۔" میں نے کہا۔

"زندگی خود بھی طویل اور پیچیدہ سی چیز ہے۔" سکندر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے کچھ دور نکل آئے تھے۔ چلتے چلتے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "خیر...... تم ان باتوں پر غور کر کے اپنے نازک ذہن پر بوجھ مت ڈالو...... یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

میں نے وہ بات اس کے سامنے بھی بیان کر دی جو مجھے پریشان کر رہی تھی۔ وہ میری بات سن کر ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا ہی رہا۔ مگر مجھے اس کی ہنسی ایک مسلسل کراہ سے ملتی جلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی تلخی، عجیب سا درد تھا اس ہنسی میں۔ آخر کار وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"ظاہر ہے جن لوگوں کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے...... ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر جدی پشتی سونا اگلتی زمینیں انہیں ورثے میں مل گئی ہیں...... روپیہ پیسا ان کے پاس اتنا ہے کہ سات پشتیں بھی لٹاتی رہیں تو ختم نہ ہو...... وہ لوگ اگر اس قسم کے مشاغل میں وقت نہیں گزاریں گے تو کیا کریں گے؟"

میں نے اس کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اکثر اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا تھا اور مجھے اس کا عالمانہ انداز اچھا بھی لگتا تھا۔ لیکن اس وقت میں اس کے پاس کچھ ہمدردانہ سی باتیں سننے کی خواہش لے کر آیا تھا۔ گویا مجھے تھوڑی سی رہنمائی درکار تھی کہ ان حالات میں میرا اپنا کردار کیا ہونا چاہیے تھا؟ مگر اس طرف گویا کوئی آنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ میری نظر میں سکندر عقل و دانش کی علامت تھا۔ اگرچہ وہ ایک اخبار بھی خریدنے کا متحمل نہیں تھا مگر جانے کہاں کہاں سے مانگ کر اخبار پڑھتا تھا۔ طرح طرح کی کتابیں بھی کہیں نہ کہیں سے حاصل کر ہی لیتا تھا...... مگر اس وقت بھی جیسے وہ ہمیشہ کی طرح صرف تلخی ہی بکھیرنے پر تلا ہوا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ مزید بولا۔ "شکر کرو کہ تمہارے والد کی سرگرمیاں صرف یہیں تک محدود ہیں۔ ورنہ ان کی حیثیت کے لوگ تو سیاست میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ ان کے مشاغل سے تو اگر کوئی نقصان پہنچنا ہوتا ہے تو وہ صرف ان کی ذات اور اپنے کنبے کو پہنچتا ہے۔ لیکن سیاست میں حصہ لے کر تو وہ لاکھوں انسانوں کی زندگیاں برباد کرتے ہیں۔ اسی لیے تو مجھے جاگیرداری اور سرمایہ داری سے نفرت ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ میں اسے گھورتا ہوا بولا۔ "نفرت تو تمہیں سیاست سے بھی ہے۔"

"ہاں...... ہمارے ہاں سیاست صرف لوگوں کو تقسیم کرنے، انہیں ایک دوسرے سے لڑوا کر برباد کرنے اور ایک دوسرے سے دور لے جانے کے لیے کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں دولت، طاقت اور شہرت سمیٹنے کا یہ ایک گھناؤنا ذریعہ ہے۔" سکندر کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تمہیں ہر چیز سے نفرت ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے......" وہ ایک دم گویا اندر ہی اندر ٹھنڈا پڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے بہت سی چیزوں سے محبت ہے۔"

"مثلاً......؟" میں نے قدرے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تم ان معاملات میں میرا پوسٹ مارٹم کرنے کی کوشش مت کرو۔" اب اس کا لہجہ خوشگوار ہو گیا تھا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ ان مسائل کو سمجھنے کے سلسلے میں ابھی میری عقل چھوٹی ہے۔ عمر بھی کم ہے۔ ابھی مجھے بہت سے مطالعے اور اس دنیا سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن...... بہرحال...... میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔"

پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "تم ان باتوں کو چھوڑو۔ تم جیسے امیر زادے کو ان باتوں میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"صرف مشورہ!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مشورہ......؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "بھئی تمہیں مشورے کی کیا ضرورت آن پڑی ہے احمق آدمی......؟ وہ تمہارے اباجی ہیں، تم ان کے اباجی نہیں ہو۔ وہ جو کر رہے ہیں انہیں کرنے دو۔ تم انہیں نہیں روک سکتے...... اور اگر تم نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوگا۔ تمہارے اباجی ان سعادت مند والدین میں سے نہیں ہیں جو اولاد کے سمجھانے بجھانے پر اپنے طور طریقے چھوڑ دیں...... اور نہ ہی

ایسا الٹا زمانہ آیا ہے کہ اولادیں، والدین کو نصیحتیں کرنے لگیں، خصوصاً ایسی کم عمر اولادیں جو ابھی خود والدین کی محتاج ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے میرے چاند...... کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہاری اپنے آپ پر اور اپنی آنے والی نسلوں پر بس یہی مہربانی کافی ہوگی کہ تم خود بڑے ہو کر اپنے والد کی طرح بننے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش نہ کرو۔ ویسے سنا تو یہی ہے کہ پتا پر پوت، پوت پر گھوڑا...... بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔"

اس کی یہ مثال سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔ اب میں بھی قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔ "حیرت ہے کہ ایک گدھا بھی آج گھوڑے کی مثال دے رہا ہے۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا اور مصنوعی خفگی سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم نے مجھے گدھا کہا؟"

"ہرگز نہیں...... بھلا مجھے گدھے کی توہین کرنے کا کیا حق ہے؟ وہ بہرحال تم سے کہیں زیادہ عقلمند جانور ہے۔" پھر میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "مذاق سے قطع نظر...... تقریباً یہی بات اشرف بھٹی نے کہی تھی جو تم کہہ رہے ہو۔ یعنی تم دونوں دوستوں کا مشورہ یہی ہے کہ مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں کرنا چاہیے...... اور میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔"

"بے شک۔" سکندر نے تائید میں سر ہلایا۔ "تمہیں بس گھر جا کر ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پینا چاہیے اور سو جانا چاہیے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے لہجے کو مغموم سا بنا کر بولا۔ "اللہ نے اس گاؤں میں صرف دو دوست دیے اور وہ بھی اتنے نکمے کہ ضرورت کے وقت کسی کو تسلی یا مشورہ بھی نہیں دے سکتے۔ صرف لیکچر دے سکتے ہیں۔"

"حالانکہ دماغ سے محروم لوگوں کو تو لیکچر دینا بھی بے کار ہوتا ہے۔" سکندر بھی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے گھر کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ "آؤ، میں تمہیں بکری کے دودھ کی چائے پلاؤں۔"

"بھئی شکریہ...... میں تمہارے پاس چائے پینے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر کچھ اور پینے کا موڈ تھا تو ڈیرے پر چپکے سے اپنے اباجی کی محفل میں جا بیٹھتے۔ اس وقت شاید ان کی توجہ تمہاری طرف نہ جاتی اور اگر چلی بھی جاتی تو شاید وہ تمہیں اس عمر میں ہی اپنا ہم ذوق پا کر خوش ہوتے۔"

"فضول بکواس مت کرو۔" میں نے مصنوعی خفگی سے اسے ڈانٹا۔

"شاید تمہیں بکری کے دودھ والا آئیڈیا پسند نہیں آیا...... لیکن مجبوری ہے۔ ہمارے ہاں وہی دودھ دستیاب ہے۔ بکری گھر میں موجود ہے۔ ازرہِ مہربانی دن میں دو چار چھٹانک دودھ دے دیتی ہے لیکن ہم قناعت پسند لوگ ہیں۔ پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ گھر کی بکری، بھینس برابر۔"

"تم جا کر اپنی بکری کے ساتھ بیٹھ کر سیاست پر تبادلۂ خیال کرو۔ میں چلتا ہوں۔" میں نے اپنی جیپ کے قریب پہنچ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے روکنے پر اصرار نہیں کیا اور ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اپنے گھر میں چلا گیا۔

میں سست رفتاری سے جیپ چلاتا ہوا گھر واپس آگیا۔ امی بڑے ہال میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں کچھ دیر آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر ایک ٹک انہیں دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا ان کا چہرہ چاند کی طرح روشن لگ رہا تھا۔

وہ ایک دراز قد اور حسین عورت تھیں مگر ان کا حسن شاید کورے لٹھے کی طرح بے کیف تھا۔ وہ کبھی لپ اسٹک تک نہیں لگاتی تھیں۔ وہ چپ چاپ زیادہ تر عبادت یا گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی تھیں۔ گھر میں اتنے نوکر اور نوکرانیاں ہونے کے باوجود بہت سے کام وہ خود کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ہر وقت ایک عجیب سی اداسی تیرتی رہتی تھی۔ وہ مسکراتیں بھی تو ان کی مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

دعا سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔ "تمہیں مجھ سے کوئی بات کرنی ہے بیٹا؟"

ان کے لہجے میں شفقت کے سمندر موجزن ہوتے تھے۔ یوں تو ہر بچے کو اپنی ماں بہت اچھی لگتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی امی کچھ زیادہ ہی اچھی لگتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کبھی ڈانٹنا یا مارنا تو دور کی بات، کبھی کڑی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت اتنی پاکیزہ، اجلی اجلی اور نکھری نکھری سی تھی، ان کی حرکات وسکنات اور انداز گفتگو میں اتنا ٹھہراؤ تھا کہ وہ مجھے آسمان سے اتری ہوئی کوئی مخلوق لگتی تھیں۔

"امی! آپ کے لیے ایک بری خبر لایا ہوں۔ اباجی نے ڈیرے پر ناچ گانے کے لیے خراب خراب عورتوں کو بلانا شروع کر دیا ہے۔" میں نے حوصلہ کر کے اپنی دانست میں انہیں اس صدی کی سب سے خطرناک خبر فراہم کی۔

مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت اور مایوسی بھی ہوئی...... کہ امی اپنی جگہ سے اچھلنا تو درکنار، چونکیں تک نہیں۔ وہی اداسی کی دھند میں لپٹی ہوئی مسکراہٹ ان کے چہرے پر

طلوع ہوئی اور وہ اپنے مخصوص دھیمے اور شکست خوردہ سے لہجے میں بولیں۔ "بیٹا! شکر کرو، وہ ایسی عورتوں کو گھر میں نہیں بلاتے۔ اگر وہ یہاں ایسی محفلیں جمانا شروع کر دیں تب بھی کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

مجھے ان کے جواب سے تقریباً ویسی ہی مایوسی ہوئی جیسی اشرف بھٹی اور سکندر سے تبادلۂ خیال کر کے ہوئی تھی۔ میں نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔ "امی! میں جب بالکل چھوٹا سا تھا، تب سے آپ مجھے نصیحتیں کرتی آ رہی ہیں کہ برے کام نہیں کرنے چاہئیں اور آپ اکثر سمجھاتی رہتی ہیں کہ اچھے کام کیا ہوتے ہیں اور برے کیا...... لیکن اباجی کو آپ بالکل نہیں سمجھاتیں۔"

"بیٹا! تمہیں پہلے بھی اس لیے سمجھاتی رہی ہوں اور اب بھی اگر کچھ سمجھاتی ہوں کہ تم پر میرا زور چلتا ہے اور تم میرے اپنے ہو...... وہ اب میرے نہیں رہے اور اب وہ اس مقام پر بھی نہیں رہے، جب سمجھانے بجھانے سے کسی میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔"

وہ ایک پروقار عورت تھیں۔ پوری کوشش کر رہی تھیں کہ ان کے لہجے سے کوئی دکھ جھلکنے نہ پائے۔

"بیٹا! شاید میں اس طرح کی عورت نہیں ہوں جیسی تمہارے ابا کو ملنی چاہیے تھی...... جو انہیں قابو میں رکھ سکتی...... مجھے یہ ہنر نہیں آتا...... اور اب تو بالکل ہی میرے پر کٹ چکے ہیں۔ تمہارے نانا کا انتقال ہو چکا ہے، بھائی بہن میرے کوئی ہیں نہیں...... جو زمین مجھے ورثے میں ملی تھی وہ بھی میں نے سادہ لوحی میں تمہارے اباجی کے نام لکھ دی۔ اس وقت تک وہ اتنے بگڑے بھی نہیں تھے۔ مجھے ان کی اصلاح کی امید تھی...... لیکن اب میں ناامید ہو چکی ہوں بیٹا!"

وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میرے ہاتھ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ ان کے وجود سے ایک عجیب سی پاکیزہ خوشبو پھوٹتی تھی اور ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میرے دل کو قرار سا آ جاتا تھا۔ ان کی ذات میرے لیے تقویت، مضبوطی اور روشنی کی علامت تھی۔

وہ میرا ایک ہاتھ چومنے کے بعد بولیں۔ "تم نے فرعون کا قصہ پڑھا ہے نا بیٹا؟ میں نے تمہیں زبانی بھی ساری باتیں بتائی ہیں...... بس یوں سمجھ لو کہ فرعون آج بھی اس دنیا میں کسی نہ کسی روپ میں ہر جگہ موجود ہے۔ ان میں سے ایک چھوٹے سے فرعون تمہارے اباجی بھی ہیں۔ اس چھوٹے سے علاقے میں چونکہ ان کا زور چلتا ہے، وہ یہاں سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ جو ان کا دل چاہتا ہے وہی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اب وہ کسی قسم کی حدود وقیود کے پابند نہیں رہے۔"

"کیا ہم ان کو کسی طرح بھی روک نہیں سکتے امی!" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"جہاں تک...... اور جب تک میرا بس چلا میں نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اب میں بے بس ہو گئی ہوں بیٹا!" میرے ہاتھوں پر ان کا مشفقانہ دباؤ بڑھ گیا۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولیں۔ "اب میری امیدوں کا مرکز، خدا کے بعد صرف تم ہو...... میں تمہیں تمہارے باپ سے بالکل الٹ دیکھنا چاہتی ہوں...... اور شاید تم پیدائشی طور پر ہی ان سے بہت مختلف ہو۔ پھر شاید میں نے عبادت میں پناہ ڈھونڈنے کی جو کوشش کی تھی، میں اس میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ میں تو اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ تمہارے ابا کا رویہ کم از کم میرے اور تمہارے ساتھ تو اچھا ہی ہے...... وہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچاتے۔"

"یہ تو ایک طرح کی خود غرضی ہے امی......!" میں نے افسوس سے کہا۔ "کہ ہم صرف اس لیے چپ رہیں کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ جو بات بری ہے وہ بس بری ہے...... خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ اگر کچھ دوسرے لوگوں کو اباجی کی ذات سے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بھی انسان ہی ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن میں نے یہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ نہایت شکست خوردہ سے لہجے میں بولیں۔ "میں ان کی بیوی ہوں اور تم ان کی اکلوتی اولاد۔ دوسروں کے لیے لڑنے اور اپنا گھر اجاڑنے کی مجھ میں شاید اس لیے ہمت نہیں ہے کہ میں ایک کمزور انسان ہوں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولیں۔ "ایک بات یاد رکھنا بیٹا! جن بستیوں میں کفر کا راج ہو، وہ تو پھر بھی قائم رہ سکتی ہیں لیکن جن بستیوں میں ظلم حد سے بڑھ جائے وہ کبھی نہ کبھی اجڑ جاتی ہیں۔ اس لیے جب یہ چھوٹا سا علاقہ تمہارے تصرف میں آ جائے...... یہاں تمہارا حکم چلنے لگے تو سب سے پہلا انتظام یہ کرنا کہ تمہاری علمداری میں کہیں کسی کے ساتھ کوئی ظلم، کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ جہاں تمہارا اختیار چلتا ہوگا وہاں ہر فرد کے بارے میں جوابدہ بھی تم ہی ہو گے۔ خدا کے حضور تم صرف یہ کہہ کر نہیں بچ سکو گے کہ خود تم نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا اس لیے تم بے قصور ہو۔ یہ عذر خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔"

میں اڑتی اڑتی سی داستانیں سن چکا تھا کہ اباجی کا رویہ علاقے کے لوگوں کے لیے اچھا نہ تھا۔ وہ جبر ودہشت کی علامت سمجھے جاتے تھے اور ان کی حرکتوں کی آڑ میں نیچے

والوں کو بھی کھل کھیلنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

"انسان دوسروں پر ظلم کیوں کرتا ہے امی؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ بات شاید ابھی صحیح طور پر تمہاری سمجھ میں نہ آسکے۔" امی میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے گہری سانس لے کر بولیں۔ "دراصل ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہوتا ہے۔ جسے ہم تہذیب، مذہب اور اچھی تربیت کے ذریعے دبائے رکھتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں یہ درندہ انسان پر غالب آجاتا ہے جہاں صرف طاقت کو سلام کیا جاتا ہے۔ جہاں اچھی قدروں اور قانون کی عملداری نہیں ہوتی۔ جب ایک بار کسی کو احساس ہوجائے کہ وہ بہت طاقتور ہے اور ظلم کرکے بچ سکتا ہے تو پھر اسے ظلم کی چاٹ لگ جاتی ہے...... جو لوگ طاقت اور اختیار رکھتے ہوئے بھی اس قسم کے واقعات دیکھ کر انجان بن جاتے ہیں، منہ پھیر لیتے ہیں اور صرف اس وجہ سے مطمئن رہتے ہیں کہ یہ واقعہ خود ان کے ساتھ پیش نہیں آرہا...... وہ بھی کمزور قسم کے درندے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بے حس ہوتے ہیں اور بے حسی بھی درندوں ہی کی ایک خصوصیت ہے۔"

"امی! ویسے مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں کہ اباجی کیا کچھ کرتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں...... اور یہ نفرت شاید ہمارے حصے میں بھی آرہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ مجھ سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ بہ ظاہر تو وہ صرف خوفزدہ رہتے ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ان کے دلوں میں میرے لیے نفرت ہوتی ہے...... میں اپنی عمر کے کسی لڑکے سے بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ خوفزدہ سا ہوکر کسی اور طرف چلا جاتا ہے۔ میری دوستی صرف اشرف بھٹی اور تھوڑی بہت سکندر سے ہے۔"

"ہمارے مختصر سے خاندان کی اتنے بہت سے لوگوں پر گرفت صرف طاقت، زمینوں کی ملکیت اور کرائے کے مسلح آدمیوں کے زور پر ہے۔ جس دن بھی یہ چیزیں ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں، لوگ نہ جانے ہمارا کیا حشر کریں گے۔" امی جھرجھری سی لے کر بولیں۔ "ناکردہ گناہوں کی سزا ہمیں بھی بھگتنا پڑے گی۔ زیادتیاں اکیلے تمہارے اباجی کی ہوں گی لیکن خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ میں ایسے ہی کسی وقت کے تصور سے ڈرتی رہتی ہوں۔ اگر مجھے عبادت کا سہارا نہ ملا ہوتا تو میں ضرور خطرناک قسم کی مریضہ بن چکی ہوتی۔"

میں امی کو بہت پسند کرتا تھا۔ شاید اسی لیے ان کی ہر بات مجھ پر بہت گہرا اثر کرتی تھی۔ دراصل بچپن ہی سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں ایک بے عنوان سا احساس تنہائی موجود تھا۔ میں گویا دنیا کے سمندر میں ایک الگ تھلگ جزیرے پر رہتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا خاص دوست، ہمدم یا ہم خیال نظر نہیں آتا تھا۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ ایک امی کی ذات ہی سائبان نظر آتی تھی۔

اباجی کو میں نے کبھی اپنی طرف زیادہ متوجہ نہیں پایا تھا۔ شاید ان کی دوسری دلچسپیاں ہی اتنی تھیں کہ انہیں میری اور امی کی طرف زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ ہمیں کبھی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ایک اشارے پر ہر چیز مہیا ہوجاتی تھی۔

اس روز امی سے دیر تک اباجی کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد میرا دل کچھ بوجھل سا ہوگیا۔ ایک بے بسی آمیز غصہ بھی تھا اور بے عنوان سے شکوے بھی۔ جیسے عموماً ان لوگوں سے ہوتے ہیں جنہیں انسان اپنا سمجھتا ہے مگر وہ اس کی توقعات پر پورے نہیں اترتے۔

اس رات اتفاقاً کھانے کی میز پر ہم تینوں یکجا ہوئے۔ اباجی کبھی کبھار ہی گھر پر ہمارے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ امی کھانے کے دوران میں منتظر سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہتیں کہ شاید وہ کچھ بولیں مگر وہ گویا گردوپیش سے بے خبر، سر جھکائے کھانا کھاتے رہتے تھے۔ اگر کبھی امی ہی کوئی بات چھیڑتیں تو وہ ہوں، ہاں میں جواب دیتے۔ آخر امی گویا شرمندہ سی ہوکر اٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر میرا بہت کچھ کہنے کو دل چاہتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اپنے احساسات کو لفظوں کا روپ دوں اور کس طرح میں چھوٹا ہوتے ہوئے بڑوں کے اس معاملے میں دخل دوں؟ لیکن اس روز جب امی اٹھ کر چلی گئیں تو میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"اباجی! آپ امی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے...... مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔"

انہوں نے بری طرح چونک کر میری طرف دیکھا اور شاید زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے بڑے غور سے میرا سراپا جائزہ لیا۔ پھر عجیب سے انداز میں مسکرائے اور بولے۔ "تم تو کافی بڑے ہوگئے شہریار! مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"آپ کو گھر اور گھر والوں کی طرف دیکھنے کی فرصت ہوتی تو پتا چلتا۔" میں نے شاید اپنی عمر سے زیادہ سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے یہ میری بات کا جواب نہیں ہے اباجی!"

نیپکن سے منہ صاف کرکے انہوں نے اطمینان سے ایک سگار سلگایا اور ایک کش لینے کے بعد قدرے پھیل کر

بیٹھتے ہوئے بولے۔ "برخوردار! تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ میں اپنی دانست میں تمہاری امی سے بہت اچھا سلوک کرتا ہوں ورنہ شاید برسوں پہلے ہمارے درمیان علیحدگی ہوچکی ہوتی۔"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ شاید میرے تاثرات بدلے تھے، جنہیں محسوس کرتے ہوئے اباجی ملائمت سے بولے۔ "مانا کہ تم کافی بڑے ہوگئے ہو...... لیکن پھر بھی ایک باپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اولاد کے سامنے ایسی بات کرے لیکن بات چونکہ تم نے ہی چھیڑی ہے اس لیے میں سچا جواب دینے پر مجبور ہوں۔"

میں بھی اس دن اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اگر آپ کو امی اتنی ہی ناپسند تھیں تو آپ کو ان سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"یہ شادی ہم نے نہیں، ہمارے بزرگوں نے کی تھی۔" انہوں نے گویا صفائی پیش کی۔ "اس کے بعد شاید تمہاری امی نے بھی کوشش کی ہو لیکن اس کا مجھے اندازہ نہیں...... بہرحال، میں نے بڑی کوشش کی کہ ان سے میری انڈر اسٹینڈنگ ہوجائے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا۔"

پھر وہ ایک طویل کش لے کر بولے۔ "بہرحال، یہ کوئی ایسا سنگین مسئلہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں شاید نوے فیصد شادی شدہ جوڑوں میں انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے لیکن گاڑی تو بہرحال چلتی ہی رہتی ہے۔" وہ کھوکھلے سے انداز میں ہنسے۔ "اور اہم بات یہی ہے کہ گاڑی کسی نہ کسی طرح چلتی رہے...... گزارا ہوتا رہے۔"

میرے ذہن میں بہت سے خیالات کا سیلاب امڈ آیا۔ مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دوسرے، مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے اور امی کے لیے رحم کی بھیک مانگنے کی کوشش کررہا ہوں...... اور یہ احساس قدرے اہانت آمیز سا تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد قطعی غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ "وہ ناچنے گانے والی گندی عورتیں آپ کو اچھی لگتی ہیں؟"

انہوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے کیسے معلوم ہوا بلکہ وہ پہلے ہی کی طرح ملائمت سے بولے۔ "ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ہم اس موضوع پر کوئی گفتگو کرسکیں۔"

چند سیکنڈ کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔ "مجھے افسوس ہے شہریار! کہ تم پر اپنی ماں کی شخصیت کا اثر ضرورت سے زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک عجیب سا دھیما پن ہے تمہارے اندر...... مجھے اندیشہ ہے کہ تم بہت ٹھنڈے میٹھے قسم کے آدمی نکلو گے۔ اس قسم کے آدمیوں کو یہ سفاک دنیا ایک گھونٹ میں پی جاتی ہے۔ میں تمہیں بہت تندخو اور سرکش قسم کا مرد دیکھنا چاہتا تھا۔ طوفان کی طرح بپھرا ہوا اور زلزلے کی طرح لوگوں کو دہلاتا ہوا...... جو کہیں سے گزرے تو لوگ سہم جائیں، دم سادھ لیں۔ یقین کرو، زندگی صرف ایسے ہی لوگ گزارتے ہیں۔ کیچوے کی طرح بے ضرر سے انداز میں زندگی گزارنا بھی کوئی زندگی ہے؟"

میں یک ٹک ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم مردانہ قسم کے مشاغل میں دلچسپی لو۔ گھڑسواری سیکھو...... اسلحہ استعمال کرنا سیکھو...... کافی عرصہ پہلے میں نے استاد خادم علی کو ہدایت بھی کی تھی کہ وہ تمہیں اس قسم کے کام سکھایا کرے۔"

"یہ حکم دینے کے بعد آپ نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ مجھے گھڑسواری بھی آتی ہے، سوئمنگ بھی اور ہر طرح کی گن چلانا بھی۔ میں کئی مرتبہ شکار پر بھی گیا ہوں۔ اپنی عمر کے حساب سے کچھ زیادہ ہی کام سیکھ لیے ہیں لیکن آپ کی طرح میں ان لوگوں کو ٹھڈے نہیں مار سکتا جو میرے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں۔"

"وہ بھی ضروری ہوتا ہے برخوردار!" وہ شاید غیر ارادی طور پر اپنی مونچھ کو بل دینے لگے۔ "کہنے کو نظام چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس علاقے کے اصل حاکم ہم ہی ہیں...... اور جب تک اس علاقے میں ہماری دہشت نہیں ہوگی، ہمارا گزارا مشکل ہوگا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ زمانہ کس ڈگر پر جارہا ہے۔ اگر ہم تمہاری ماں کی طرح ٹھنڈے میٹھے انسان بن گئے تو لوگ ہمیں ہضم کرجائیں گے اور ڈکار بھی نہیں لیں گے یا پھر ہمیں بیچ کھائیں گے۔"

میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں بزدل یا ڈرپوک نہیں ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے سے کمزور کو نہیں مار سکتا تھا۔ کسی ایسے انسان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا جو پہلے ہی ہاتھ باندھے کھڑا ہو۔ ایسے کسی آدمی کو ٹھوکر نہیں مار سکتا تھا جو پہلے ہی زمین پر گرا پڑا ہو...... لیکن مجھے فوری طور پر ان خیالات کو بیان کرنے کا سلیقہ نہ آیا اور میں ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

اباجی اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے میرا کندھا تھپک کر بولے۔ "برخوردار! تمہاری نظر میں یا تمہاری ماں کی نظر میں، میں کوئی اچھا آدمی نہ سہی لیکن مجھ میں کم از کم ایک

بات بہت اچھی ہے کہ میں اپنے آپ میں مگن رہتا ہوں۔ میں اپنے بچے...... حتیٰ کہ اپنی بیوی کی زندگی میں بھی دخل دینے یا اس پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ چنانچہ بیٹا جی! تم مزے سے اپنی زندگی گزارو اور مجھے میری زندگی گزارنے دو۔ ہو سکے تو کبھی کبھار شکر ادا کر لیا کرو کہ تمہیں زندگی کی ہر آسائش میسر ہے ورنہ تم جیسے ٹھنڈے ٹھار لوگوں سے تو لوگ منہ کا نوالہ بھی چھین کر لے جاتے ہیں۔“

وہ چلے گئے اور میں بوجھل سا دل لیے وہیں بیٹھا رہا۔ امی اپنے بیڈ روم میں تھیں اور شاید عبادت میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اباجی گھر سے باہر چلے گئے تھے۔ طویل و عریض کمرے میں، میں اکیلا بیٹھا تھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا، اکیلے پن اور تنہائی کا یہی احساس دھند کی طرح میرے حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔ میں بڑا بے خوف سا لڑکا تھا لیکن کبھی کبھی صرف اسی احساس تنہائی کی وجہ سے میں محسوس کرتا تھا جیسے میں ایک تنہا پنچھی ہوں۔ نیچے لامتناہی صحرا ہے اور اوپر بیکراں آسمان...... اور میں ان کے درمیان فضائے بسیط میں تنہا پرواز کر رہا ہوں۔ ننھا سا دل میرے سینے میں بے طرح دھڑک رہا ہے، کانپ رہا ہے۔

میں، اباجی اور امی...... ایک عجیب مثلث کی طرح تھے، جس کی ہر لکیر دوسری سے مختلف تھی۔ کبھی کبھی میں گھر میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتا...... میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے؟ اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے گھبرا کر میں گاڑی لے کر ویرانوں کی خاک چھاننے نکل جاتا۔

اسی احساس تنہائی کے سائے میں، میں جوان ہوا۔ کالج میں پہنچ گیا لیکن زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سینے میں جو ایک خلا سا تھا، وہ جوں کا توں رہا۔ اشرف بھٹی اور اس جیسے کئی دوسرے دوستوں نے میری زندگی میں کچھ رنگینیاں لانے کی اپنی سی کوشش کی۔ میں کوئی بہت زیادہ پارسا تو ثابت نہیں ہوا۔ میں نے ہر چیز کو تھوڑا بہت قریب جا کر ضرور دیکھا مگر کسی میں بھی مجھے کوئی ایسی تسکین محسوس نہیں ہوئی کہ میں اسی کا ہو کر رہ جاتا۔

میں دو چار مرتبہ گانا سننے بھی گیا لیکن عورتوں کی مشینی اداؤں، سوچی سمجھی حرکات و سکنات، بے ساختگی سے عاری جملوں اور ماہرانہ پینتروں میں مجھے کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے الفاظ جذبوں سے خالی، ان کی مسکراہٹ روح سے محروم، ان کے چہرے پتھر سے تراشے ہوئے اور ان کی نظریں تصنع سے بھرپور محسوس ہوئیں۔ مجھے کوئی لطف نہ آیا۔ میں نے جلد ہی یہ مشغلہ ترک کر دیا۔

میں نے پی کر بھی دیکھی۔ پینے کے بعد بہت سے لوگ زیادہ بولنے لگتے ہیں۔ مجھے پینے کے بعد چپ لگ جاتی۔ دل کے ویرانے میں ایک عجیب ہولناک سی صدائے بازگشت گونجنے لگتی۔ نہ جانے کن کن بھولی بسری راتوں کی آہٹ سنائی دینے لگتی اور میں پچھتانے لگتا کہ میں نے پینے کی حماقت ہی کیوں کی۔ یہ شوق بھی میں نے جلد ہی ترک کر دیا۔ اصلی خوشی کہیں اور تھی، جس کی مجھے تلاش تھی۔

لڑکیوں سے بھی میری ملاقاتیں ہوتیں۔ جب وہ میری چم چم کرتی لمبی سی کار کو دیکھتیں اور انہیں پتا چلتا کہ میں ایک بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا ہوں تو ان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور اسی لمحے میرا ان پر سے اعتماد اٹھ جاتا۔ شاید میرا وجدان بہت تیز تھا۔ میں ان کے ہر عمل کی حقیقت کچھ زیادہ ہی جلدی سمجھنے لگتا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ بہ ظاہر بے نیاز سی رہتیں مگر اس بے نیازی میں ہی اتفاقاً آئے دن ملاقات ہونے لگتی۔ ان کے والدین پر اچانک انکشاف ہوتا کہ میں تو انہیں بالکل گھر کا فرد ہی محسوس ہوتا ہوں۔

مجھے اس جذبے کا کہیں سراغ نہ ملتا جو خود بخود دل کی سنگلاخ زمین سے سرکش چشمے کی طرح پھوٹتا ہے۔ وہ جو ایک غیر مرئی سی ڈور ہوتی ہے کہ دو روحوں کو ایک بے عنوان سے بندھن میں باندھ دیتی ہے...... وہ سب کچھ میرے لیے ایک خواب ہی رہا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ جیسے یہ سب باتیں قصوں، کتابوں، افسانوں اور کہانیوں میں ہی زندہ رہ گئی ہیں۔ دنیا صرف نفع نقصان کے حساب کتاب کی اسٹاک مارکیٹ ہے۔ موقع محل اور حیثیت کے اعتبار سے انسان کے شیئرز کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مفلس کے لیے ہمیشہ مندی کا رجحان رہتا ہے۔ مجھے اپنے دل کی سنسان رہ گزر پر گویا ہمیشہ کسی کا انتظار رہتا۔ یوں لگتا جیسے کسی کو آنا ضرور ہے۔

گاؤں سے تعلق رکھنے والے میرے دوسرے دوست سکندر نے لاہور کے بجائے شیخوپورہ کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا تھا، جو اسے زیادہ قریب پڑتا تھا۔ وہاں داخلہ لینے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں سے قریب ہی ہائی وے پر واقع ایک کارخانے میں شام کی شفٹ میں اس نے نوکری بھی کر لی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ حسب روایت اس کے کالج میں بھی تمام سیاسی پارٹیوں کا اسٹوڈنٹ ونگ موجود تھا۔ کالج زیادہ بڑا نہیں تھا۔ شہر بھی چھوٹا تھا۔ طلبہ میں بڑی تعداد ارد گرد کے دیہات سے آنے والوں ہی کی تھی۔

مجھے ان سب باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

مجھے تو سب سے دلچسپ بات یہ لگی کہ سکندر باری باری ان سب اسٹوڈنٹ ونگز میں شامل ہو چکا تھا لیکن جلد ہی ان سے نکالا گیا یا وہ خود انہیں چھوڑ گیا تھا۔ اب میری اس سے ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی لیکن ایک بار گاؤں میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے اس کی متلون مزاجی کا سبب پوچھا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”مشہور تو یہی ہے کہ میں پیسے کھا کر دوسری پارٹی میں چلا جاتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر پارٹی میں میری اپنی کچھ نہ کچھ خون پسینے کی کمائی حرام راستے چلی جاتی ہے۔ طلبہ سیاست میں میرے دربدر رہنے کی وجہ یہ ہے کہ میں جن سیاسی لوگوں کو قریب سے دیکھ لیتا ہوں، ان سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے اور میں ان کے اسٹوڈنٹ ونگ کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔“

”لیکن تمہیں تو سیاست سے نفرت تھی......“ میں نے نرمی سے اسے یاد دلایا۔ ”پھر تم اس میں پڑتے ہی کیوں ہو؟“

”اصل میں بات یہ ہے کہ نظام کی خرابیوں کے خلاف حسب توفیق ہاتھ پاؤں مارنے کا حق سب ہی کو حاصل ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ مخلص لوگوں کو وہاں بھی آگے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔“ سکندر نے پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔“ میں نے بھی بوجھل سانس لے کر کہا۔ اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

✈✈✈

اباجی کی فرعونیت کا وہی عالم تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی یہی عادات و اطوار مجھے ان سے مزید دور لے گئی تھیں۔

ایک بار میں گاؤں میں آوارہ گردی کے دوران ڈیرے کے قریب سے گزرا تو گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ میں ایک محفوظ گوشے سے بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچا۔ اندرونی عمارت کی کھڑکیاں بھی اس روز بند تھیں تاہم ایک کھڑکی میں اتنی درز موجود تھی کہ اندر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

بڑے ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ایک سرے پر اباجی آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھے۔ اس وقت سگار کے بجائے حقے کی نے ان کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی اور وہ بڑے آسودہ انداز میں دھیرے دھیرے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ گویا اس وقت نہایت مدھر موسیقی سنتے ہوئے مستا رہے ہوں جبکہ ان کے سامنے ایک شخص چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔

چھت میں موجود آہنی ہک سے ایک رسی گزاری گئی تھی جس کا ایک سرا کھڑکی کی سلاخوں سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے پر وہ بدنصیب اس طرح الٹا لٹکا ہوا تھا کہ اس کی بوسیدہ سی دھوتی اور میلی سی واسکٹ اس کا بدن چھپانے سے قاصر تھی۔ ایک موٹا سا سیاہ فام جلاد نما شخص ایک مضبوط اور لمبا بید گھما گھما کر یہ دیکھے بغیر اس کے جسم پر رسید کر رہا تھا کہ ضرب کہاں لگ رہی ہے۔ میں اس جلاد نما شخص کو پہچانتا تھا۔ اس کا نام شکورا تھا۔ الٹا لٹکا ہوا شخص ہر ضرب پر دلدوز انداز میں چیخ رہا تھا جبکہ حاضرین میں سے کئی مسکرا رہے تھے۔

اسی دوران میں ایک صاحب بولے۔ ”شکورے! یہ تو بہت ہی زیادہ گلا پھاڑ رہا ہے۔ اس کے منہ میں کچھ ٹھونس دے۔“

شکورے نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے الٹے لٹکے ہوئے شخص کے منہ میں کپڑا ٹھونسا، پھر اوپر بھی ایک کپڑا کس کر باندھ دیا۔ ایک بار پھر اس نے موٹا بید شاں شاں کی آوازوں کے ساتھ اس پر برسانا شروع کر دیا۔ اب اس شخص کی آواز تو معدوم ہو چکی تھی مگر ہر ضرب پر اس کا جسم تشنجی انداز میں جھٹکے لیتا تھا۔ وہ منظر بڑا اذیت ناک تھا۔

صرف وہی نہیں، تقریباً اسی سے ملتے جلتے حلیے کے دو اور آدمیوں کو ہمارے آدمی مضبوطی سے پکڑے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تیسرے شخص کی سفاکانہ انداز میں پٹائی ہوتے دیکھ رہے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے گاؤں کے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن مزارعے ہی دکھائی دیتے تھے۔

آخر کار مار کھانے والے کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ بے جان سے انداز میں جھولنے لگا۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو گیا تھا۔ اباجی نے حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”بس کر شکورے! اسے تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمارے خلاف گواہیاں کیسے دی جاتی ہیں اور مخبریاں کیسے کی جاتی ہیں۔“

پھر انہوں نے دوسرے دو مفلوک الحال آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب ذرا انہیں بھی سبق سکھاؤ۔“

وہ دونوں رونے، گڑگڑانے اور معافیاں مانگنے لگے۔ ان کی آہ و زاری مجھ جیسے انسان کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ مگر اباجی اسی طرح اطمینان سے نیم دراز حقہ گڑگڑا

رہے تھے۔ میری کنپٹیاں تپنے لگیں۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اندر گھس پڑوں لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میں شاید اس سفاکانہ ڈرامے کو رکوا نہیں سکوں گا اور وہاں موجود لوگوں کے سامنے خوامخواہ میری بات کچی ہوگی۔ میں دل پر ایک بھاری بوجھ لیے ڈیرے سے باہر آ گیا۔

دو دن بعد گھر میں میرا اباجی سے سامنا ہوا۔ میں نے بہ ظاہر سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''پرسوں میں ڈیرے کے قریب سے گزرا تو مجھے کربناک چیخیں سنائی دیں۔ میں نے سنا ہے مظلوموں کی چیخیں آسمان کو ہلا دیتی ہیں لیکن آج کل شاید کوئی شیطانی طاقت ان چیخوں کو آسمان تک پہنچنے نہیں دیتی...... راستے ہی میں روک لیتی ہے۔''

اباجی نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''بعض لوگ اتنے مظلوم نہیں ہوتے جتنے نظر آتے ہیں۔''

''ہر ظالم کا مظلوم کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''شہریار!'' وہ قدرے درشت لہجے میں بولے۔ ''میں بہت آزاد خیال آدمی ہوں لیکن کچھ حدود ایسی ہیں جن میں دخل اندازی میں قطعاً برداشت نہیں کرتا۔''

''افسوس تو یہی ہے کہ میں دخل اندازی کی طاقت اپنے اندر محسوس نہیں کرتا۔'' میں نے افسردہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی اتر آئی اور ان کی اوپر کو اٹھی ہوئی گھنی مونچھیں لرز کر رہ گئیں۔ میرا قد چھ فٹ تھا لیکن وہ قد میں مجھ سے بھی نکلتے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک لمبے تڑنگے بیٹے کے باپ ہیں۔ جن نظروں سے وہ میری طرف دیکھ رہے تھے، ان سے میں نے ایک لمحے کے لیے خوف سا محسوس کیا۔ وہ ایک باپ کی نظریں ہرگز نہیں تھیں۔

''میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ چہل قدمی یا آوارہ گردی کے دوران میں اپنا رخ ڈیرے کی طرف نہ کرو تو اچھا ہے۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ''مجھے اچھا معلوم نہیں ہوگا کہ میں اپنے آدمیوں کو حکم دوں کہ وہ تمہیں ڈیرے کی طرف نہ آنے دیا کریں۔ تم خود ہی خیال رکھو تو بہتر ہے۔''

ایک اسی واقعے کی بات نہیں تھی۔ اس سے ملتے جلتے نہ جانے کتنے منظر میں ڈیرے پر دیکھ چکا تھا۔ اس دن کی گفتگو کے بعد خود میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ ڈیرے کی طرف نہ جاؤں۔ یہ اپنے اداس ذہن کو مزید چوکے لگانے کا راستہ تھا۔ میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا۔ لیکن کبھی کبھی راستے انسان کو نہیں چھوڑتے۔

ایک روز میں جیپ میں نہر کے کنارے کنارے پشتے پر جا رہا تھا کہ نشیب میں کافی فاصلے پر میں نے اپنی فصلوں کے درمیان سے ایک لڑکی کو نکلتے دیکھا۔ وہ حواس باختگی کے عالم میں دوڑ رہی تھی۔ میں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس کے لباس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ تین آدمی اس کے تعاقب میں تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں گن تھی۔

میں نے جیپ نشیب میں اتاری اور اسی طرف موڑ لی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جیپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر لڑکی حوصلہ محسوس کرنے کے بجائے کچھ اور بدحواس ہو کر رخ بدل کر گرتی پڑتی ایک اور سمت میں دوڑنے لگی، لیکن میں نے رخ تھوڑا سا بدل کر جیپ اس کے قریب جا روکی اور تب ہی میں نے اس لڑکی کو پہچانا۔

وہ نوجوانی میں بیوہ ہو جانے والی ایک حسین لڑکی بلقیس تھی۔ گاؤں کے نواح میں وہ غالباً اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ ڈیرے کی طرف سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے اباجی کے ہی آدمی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ دور ہی رک گئے۔ میں جیپ سے اتر آیا۔ بلقیس بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن اس کی یہ حالت صرف دوڑنے کی وجہ سے ہی نہیں تھی، اس کے چہرے پر خراشوں وغیرہ کے نشان بھی تھے۔

ایک لمحے کے لیے تذبذب کے عالم میں رکنے کے بعد اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے بھی خوفزدہ تھی۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے بھاگنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کیوں ڈر رہی ہو؟''

اس کے منہ سے گویا غیر ارادی طور پر نکلا۔ ''ظاہر ہے، بیٹا باپ سے مختلف تو نہیں ہوگا۔''

مجھے محسوس ہوا کہ یہ جملہ نہیں، ایک طمانچہ تھا جو اس نے میرے منہ پر مارا تھا۔ مجھے اس لمحے اپنے آپ پر بڑی شرم آئی۔ اپنی ندامت سے فرار چاہتے ہوئے میں نے ان تینوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم تھا۔

''کیا قصہ ہے امیر الدین؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں ملک صاحب! کوئی خاص بات نہیں......''

مخاطب امیر الدین نے گن سے کھیلتے ہوئے قدرے بے رخی سے جواب دیا۔ ''بس، بڑے ملک صاحب نے اسے بلایا ہے۔ یہ کوئی چکر بازی کر کے بھاگی ہے۔''

''قصہ ان سے کیا پوچھتے ہو، مجھ سے پوچھو......''

بلقیس ٹوٹتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بہت سے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ کبھی ڈیرے کے قریب سے نہ گزرنا۔ آج کسی مجبوری کے تحت گزرنا پڑ گیا۔ بڑے ملک صاحب کی نظر پڑ گئی...... نظر تو شاید پہلے سے ہی پڑی ہوئی تھی...... انہوں نے فوراً اٹھوا لیا۔ انہوں نے خود تو جو کیا سو کیا......''

اس کی آواز پھولی پھولی سانسوں اور امڈتے ہوئے آنسوؤں میں گھٹ کر رہ گئی۔ بہ مشکل وہ دوبارہ بولی۔ ''اس کے بعد مجھے یوں دوسروں کے سامنے پھینک دیا جس طرح سیر ہونے کے بعد لوگ ہڈیاں بھوکے کتوں کے سامنے پھینک دیتے ہیں۔ پتا نہیں وہ مجھ سے کس وقت کا اور کس خطا کا بدلہ لے رہے ہیں...... میں کسی طرح بھوکے کتوں کے نرغے سے نکل بھاگی...... لیکن قسمت تو میری پیدائشی طور پر ہی خراب ہے نا...... آگے تم مل گئے...... معلوم نہیں کہ اب میرا حشر کیا ہوگا۔''

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ ایک دم زمین پر بیٹھ گئی۔ جیسے اس کی ہمت ٹوٹ گئی ہو اور مزید بھاگنا اس کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

امیر الدین پرسکون لہجے میں بولا۔ ''اس کی باتوں میں نہ آنا ملک صاحب! بڑی فتنہ چیز ہے۔ اس وقت پارسا بن رہی ہے۔ گاؤں کا کون سا نوجوان ہے جو اس سے بچا ہو۔ اس کا سارا مسئلہ پیسوں کا ہوتا ہے۔ اس وقت بھی بات پیسوں پر بگڑی ہے۔''

بلقیس نے گویا تڑپ کر اس کی طرف دیکھا مگر پھر جیسے کسی انجانی دہشت کے باعث کچھ نہ کہہ سکی۔ تاہم کمزور انسان کا بس نہیں چلتا تو بددعا تو دیتا ہی ہے۔ چند لمحے ہچکیاں لینے کے بعد وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ ملک صاحب کے بڑے بوڑھے سب اس علاقے میں عزتوں کے رکھوالے تھے۔ کمزوروں کے مددگار تھے...... لیکن شاید ہم سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہوا ہے جو یہ عذاب ہمارے سروں پر مسلط ہوا ہے۔''

وہ ایک بار پھر گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ میرے بارے میں شاید کوئی نہیں جانتا کہ میں اپنے باپ سے بہت مختلف انسان ہوں۔ تاہم میں نے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا اور سخت لہجے میں امیر الدین کو مخاطب کیا۔ ''تم لوگ اب واپس جاؤ، یہ لڑکی اپنے گھر جائے گی۔''

''دیکھ لیں جی...... بڑے ملک صاحب ناراض ہوں گے۔'' امیر الدین گن کندھے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں نرم سی دھمکی پنہاں تھی۔ ''وہ ایک بار آپ کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے معاملات میں آپ کی دخل اندازی بھی پسند نہیں کرتے۔''

''دخل اندازی کا بچہ......!'' میں یک لخت ہی چلا اٹھا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے...... ملک صاحب جو کچھ کہیں گے، میں خود دیکھ لوں گا۔''

امیر الدین خاموش تو رہا لیکن گستاخانہ انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ تب میں نے اچانک آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ الٹ کر ایک طرف جا گرا۔ اس کی گن دوسری طرف جا گری۔ دوسرے دو آدمی، جو نہتے نظر آ رہے تھے خود ہی کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ امیر الدین کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ خون پونچھتا ہوا اٹھا اور خاموشی سے اپنی گن اٹھا کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ باقی دونوں آدمیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شاید وہ یہی زبان بہتر طور پر سمجھتا تھا جو میں نے آخر میں استعمال کی تھی۔

بلقیس اب سر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنسوؤں سے بھیگی وحشی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''چلو...... میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔'' میں نے اسے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

قدرے ہچکچاہٹ کے بعد وہ بولی۔ ''بس مجھے اتنی دور چھوڑ آؤ کہ میں دوبارہ بھوکے کتوں کے نرغے میں نہ پھنس سکوں۔ گھر تک میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں......؟'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے افسردگی سے پوچھا۔

''لڑکی کی شکل ذرا اچھی ہو اور وہ جوانی میں بیوہ ہو جائے تو سہاگ کے ساتھ ساتھ وہ شاید اعتبار بھی کھو دیتی ہے۔ اکیلی جاؤں گی تو ان خراشوں...... ان پھٹے ہوئے کپڑوں کے بارے میں کوئی بات گھڑ لوں گی۔ تمہارے ساتھ جا کر تو ماتھے پر لگی ہوئی کالک کبھی نہیں دھو سکوں گی۔ لاکھ قسمیں کھاؤں گی، تب بھی کوئی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔''

''ہوں......'' میں نے اس کا مسئلہ سمجھتے ہوئے گہری سانس لی۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''اپنے باپ کو اپنے اس حلیے کے بارے میں کیا بتاؤ گی؟''

''باپ کی تو خیر کوئی بات نہیں...... اس بے چارے کی نظر تو بہت کمزور ہے...... وہ تقریباً نابینا ہی ہے، مجھے اس کی فکر نہیں۔ اصل فکر تو یہ ہے کہ کسی اور نے دیکھ لیا تو کیا کہوں

گی؟ لوگوں کو تو مجھ میں وہ عیب بھی نظر آجاتے ہیں جو موجود نہیں ہیں......" اس کے لہجے میں بلا کا زہر تھا۔ آستین سے چہرہ پونچھتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ "اس سے تو اچھا تھا میں ایسی ویسی عورت ہی بن جاتی۔ جو کچھ آج میرے ساتھ ہوا ہے، اس سے تو ویسی عورت بن جانا ہی اچھا تھا۔ بڑا گھاٹے کا سودا ہے کہ عورت کو ذلتیں تو ایسی ویسی عورت سے زیادہ برداشت کرنی پڑیں اور اس کے باوجود بھوکی مرتی رہے۔ عزت دار کہلانے کی حسرت میں ہر رات اپنے ہاتھوں سے اپنے اندر کی عورت کا گلا گھونٹ کر سوتی ہوں۔"

میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال جو تھوڑی سی دیکھ بھال سے کسی شاعر کی تشبیہات سے زیادہ حسین نظر آسکتے تھے، اس وقت مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے اور ان میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے رسیلے ہونٹ جن کی جنبش پر نہ جانے کون کون ہمہ تن گوش ہوسکتا تھا، اس وقت زخمی تھے، ان سے لہو رس رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کندنی کرنوں میں اس کی یہ شکستہ حالی اردگرد کے سارے خوبصورت منظر پر کوڑھ کے داغ کی طرح چمک رہی تھی۔

اس کے لہجے کا زہر میری رگ وپے میں اتر گیا تھا۔ میں اس سے شرمندہ تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر مجھ میں جیسے سکت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ نہ جانے کس طرح بس میں ڈرائیونگ کیے جا رہا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیوں اور کیا سوچ کر میں نے جیپ روکی اور پرس نکالا۔ اس میں سے دو ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ لو...... کسی کام آجائیں گے۔"

اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں اس سے نظر ملانے کی ہمت نہ کرسکا۔ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں وہ بولی۔ "کیا تم لوگوں کے خیال میں ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے اور پیسے سے ہر نقصان کی تلافی ہوجاتی ہے؟ تمہارے باپ نے بھی مجھے رقم دینے کی کوشش کی تھی اور جب میں نے رقم پر تھوک دیا تو رقم کے بغیر ہی......"

اس نے جیپ سے باہر تھوک دیا اور پہلے سے کمزور آواز میں بولی۔ "شاید اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ طاقتور کی سودے بازی کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ دہرا نقصان ہوتا ہے۔ جو مل رہا ہوتا ہے وہ بھی نہیں ملتا اور جو چھنتا ہوتا ہے وہ چھن ہی جاتا ہے......" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ "تم یہ رقم کس لیے دے رہے ہو؟"

میں کوئی صحیح جواب نہیں دے سکا۔ میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ "بس...... یونہی......"

پھر میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ بلقیس نے نوٹ لیے نہیں تھے، وہ اس کی گود میں پڑے تھے۔ جیپ چلی تو اس کا شکستہ دامن پھڑپھڑایا اور نوٹ ہوا میں اڑ گئے۔ وہ عجیب سے انداز میں ہنس دی۔ اس کی ہنسی کسی کھنڈر میں ابھرنے والی آوارہ روح کی کراہ سے مشابہ تھی۔ معلوم نہیں وہ کیوں ہنسی تھی؟ یا پھر شاید یہ اس کے رونے کی آواز تھی جو ذرا بدل گئی تھی۔

میں تاریخ کے ورق الٹ کر اپنی یادداشت کے نہاں خانوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب کوئی گوشۂ زمین وہاں کے باسیوں پر تنگ ہوجاتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

گاؤں کے نواح میں ہی بلقیس ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "بس...... بس مجھے یہیں اتار دو۔"

جیپ رکی تو وہ اتر کر آنکھیں سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تم اسی باپ کے بیٹے ہو۔"

پھر وہ مڑی اور تیز تیز مگر غیر متوازن قدموں سے گاؤں کی طرف چل دی۔

اسی شام میں نے سنا کہ اباجی شہر چلے گئے ہیں۔ دو دن گزر گئے۔ میں آنسوؤں کا غبار سینے میں ہی لیے پھرتا رہا اور جب میرا ان سے سامنا ہوا تو موقع مناسب پا کر میں نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

"مجھے بھی اس بات پر شرم آتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولے اور شال کندھوں پر ڈال کر دروازے کے قریب جا کر انہوں نے جملہ مکمل کیا۔ "کہ میں تم جیسے بیٹے کا باپ ہوں۔" وہ بارعب انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ان دنوں میں بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اباجی نے ایک اور عجیب قدم اٹھایا جس نے میرے ذہن میں مچلتے ہوئے آتش فشاں کی ہولناکی کچھ اور بڑھا دی۔

اس روز میں اور امی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اباجی کی گاڑی طویل و عریض ڈرائیو وے میں داخل ہوئی اور وہ ایک نہایت حسین اور نوخیز لڑکی کا ہاتھ تھامے کار سے اترے۔ لڑکی خوب بنی سنوری ہوئی تھی۔ لباس وغیرہ سے وہ حتی الامکان معزز نظر آرہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا تعلق عورتوں کے ایک مخصوص طبقے سے تھا۔ اس بازار کا کوئی نہ کوئی حوالہ اس کے ساتھ تھا۔

میں اور امی دم بخود کھڑے انہیں آتے دیکھ رہے تھے۔ اباجی کی دیدہ دلیری میں کلام نہیں تھا۔ وہ ذرا بھی

ہچکچاہٹ یا تذبذب کا مظاہرہ کیے بغیر اپنے مخصوص بارعب انداز میں سر اٹھائے اس لڑکی کا ہاتھ تھامے برآمدے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر انہوں نے کچھ دور کھڑی ملازمہ کو بلایا اور بولے۔ "ریشماں! اوپر جو گیلری والا بڑا بیڈروم ہے نا...... بی بی جی کو وہاں چھوڑ آ...... اور گاڑی سے ان کا سامان بھی اتروا کر وہیں پہنچا دے۔ اب تو خود بھی اوپر بی بی جی کے ساتھ ہی رہنا اور انہیں جس چیز کی ضرورت ہو، فوراً حاضر کرنا۔"

اندر جانے سے پہلے لڑکی نے محض اچٹتی سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر گردوپیش پر نظر ڈالی اور اس سرسری سی نظر میں اس نے گویا سب کچھ دیکھ لیا، سب کچھ سمجھ لیا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کوئی معمولی چیز نہیں تھی۔

اباجی اپنی تمام تر بے پروائی، عیش پرستی اور فرعونیت کے باوجود آج تک کسی عورت کو گھر میں نہیں لائے تھے۔ اب اگر ایک زمانے کے بعد اس عمر میں ایک گرگ باراں دیدہ اس مرحلے تک آن ہی پہنچا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کسی عام سی عورت کا ہاتھ نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ لڑکی ریشماں کی رہنمائی میں نہایت نپے تلے قدموں سے ہال میں داخل ہو رہی تھی جہاں سے سیڑھیاں اوپر کی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے امی کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لڑکی کو جاتے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ یکدم پیلا پڑ گیا تھا۔ اتنی پیلاہٹ میں نے ان کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اباجی سامنے ہی کھڑے تھے اور گویا منتظر تھے کہ ان سے کچھ پوچھا جائے۔ آخر امی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھ ہی لیا۔ "کون تھی یہ......؟"

"اس کا نام گلشن ہے۔" اباجی نے گویا تہذیب اور اخلاق کے تقاضے پورے کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ "اور میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ بہتر تو یہی تھا کہ میں شادی کرنے کے بعد ہی اسے اس گھر میں لاتا لیکن حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ مجھے فوری طور پر لانا پڑا۔ مہینا ڈیڑھ مہینا یہ ایک مہمان کی طرح یہاں رہے گی۔ اسی دوران میں شادی کی تیاریاں ہوں گی۔ پھر میں اس سے باقاعدہ شادی کرلوں گا۔ امید ہے کہ تم اس سلسلے میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کرو گی۔ میں نے زندگی میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی اور آئندہ بھی نہیں دوں گا۔ تمہیں میری اس شادی یا گلشن کی ذات سے خوفزدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے پھر بولے۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کہ اسے شہر میں یا یہاں الگ مکان لے دوں لیکن اس طرح میں تم لوگوں سے اور دور ہوجاتا۔ اس کے علاوہ میں نے سوچا خود گلشن کی اس قسم کی کوئی فرمائش نہیں ہے تو اس فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اتنی بڑی حویلی ہے۔ اس میں گلشن جیسی دس اور آجائیں تب بھی پتا نہ چلے۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی شاہ زیب ملک!" امی نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ ان کے جسم میں ہلکی سی لرزش آچکی تھی اور آنکھیں عجیب سے انداز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے کی پیلاہٹ ایک خطرناک قسم کی سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جیسے ان کے کسی نادیدہ گھاؤ سے بہت تیزی سے خون بہہ رہا ہو اور لمحہ بہ لمحہ ان کی شریانیں لہو سے خالی ہوتی جا رہی ہوں۔

"کیوں......؟ آخر تمہیں اس پر اعتراض کیا ہے؟" اباجی کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ "تمہارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم اسی طرح گھر پر راج کرتی رہو گی۔ ہر آسائش، ہر سہولت تمہیں حاصل رہے گی۔ گلشن تمہاری کسی بات میں، کسی کام میں دخل اندازی نہیں کرے گی...... تمہیں اور کیا چاہیے؟"

"میں نے کہا نا کہ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی...... نہیں ہونے دوں گی......" امی نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ اندر ہی اندر ان کی حالت گویا مجنونانہ سی ہوتی جا رہی تھی۔

"تمہارے اندر سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ شوہر کی خوشیاں تمہیں کبھی عزیز نہیں رہیں۔" اباجی نے بدمزگی سے کہا۔

"یہ طریقہ ہوتا ہے کیا شوہر کی خوشیاں پوری کرنے کا؟" امی نے زخمی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ "زندگی بھر تم نے جو چاہا وہ کیا اور میں ایک عضو معطل کی طرح اس گھر میں پڑی رہی۔ دیواروں سے باتیں کرتے کرتے بوڑھی ہوگئی۔ صرف اس بچے کی خاطر میں نے سب کچھ برداشت کیا۔" انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اب عمر کے اس دور میں، میں یہ ذلت برداشت نہیں کروں گی کہ تم کسی سوتن کو میرے سر پر لا کر بٹھا دو۔ جہاں تم نے اور نہ جانے کس کس طرح خاک پھانکی ہے وہاں اس عورت کو بھی بس یونہی رکھ لو...... وہ میں برداشت کرلوں گی...... لیکن اس سے تمہاری شادی میں نہیں ہونے دوں گی۔"

"اس طرح رہنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔" بے

ساختہ اباجی کے منہ سے نکلا۔ ”تم عورتوں کی عقل بھی الٹی ہوتی ہے۔ ناک سیدھی طرح نہیں پکڑنے دیتیں۔ گھما کر پکڑلی جائے تو کوئی بات نہیں۔“

پھر ان کے لہجے میں مخصوص کرختگی اور تحکم عود کر آیا۔ ”مجھے وہ راستہ اختیار کرنے پر مت مجبور کرو جس سے میں بچنا چاہتا ہوں۔“

”کون سا راستہ؟“ امی نے پلکیں جھپکائے بغیر ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں۔“ اباجی نے بلا تامل کہا۔

میں ایک طرف خاموش کھڑا ان کے درمیان مکالمہ سن رہا تھا۔ بہ ظاہر میں بت بنا کھڑا تھا لیکن درحقیقت میرے اندر طوفان مچل رہے تھے۔ میرے رگ و پے میں لہو کی جگہ دھیرے دھیرے گویا چنگاریاں دوڑنے لگی تھیں۔ میں نے یک ٹک اباجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر میں اس شادی کو روکنے کی کوشش کروں؟“

مجھے خود یہ محسوس کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ میرا لہجہ بالکل ہموار تھا۔ جبکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے وجود میں بپھرے ہوئے طوفان کا اثر میری آواز اور الفاظ میں بھی آجائے گا۔ گو کہ میں چیخنا چلانا، ہنگامہ مچانا اور حویلی کے ملازموں وغیرہ کے لیے تماشا نہیں لگانا چاہتا تھا۔

”تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔“ اباجی نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ وہ لڑکی، جس کا نام گلشن تھا یقیناً بڑی جادوگرنی تھی۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

”شاہ زیب ملک......!“ امی دانت پیس کر بولیں لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کے دانت سختی سے بھنچ گئے اور پھر یکدم وہ سینہ تھام کر اس طرح برآمدے کے فرش پر گریں کہ مجھے بھی انہیں تھامنے کی مہلت نہ مل سکی۔

میں یکدم گھبرا کر ان پر جھکا اور انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ اباجی بھی پاس ہی بیٹھ گئے۔ نوکر چاکر بھی دوڑے آئے۔ کوئی پانی لا رہا تھا، کوئی پنکھا جھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ان کی نبض ٹٹولی۔ نبض دھیرے دھیرے معدوم ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی، وہ بھی دھیرے دھیرے تھم رہی تھی۔

”امی......!“ میں بے اختیار رو دینے کے انداز میں چلا اٹھا۔ انہیں یقیناً فوری طور پر اسپتال لے جانا ضروری تھا۔ میں نے انہیں اٹھا کر اباجی کی مدد سے گاڑی میں ڈالا۔

اباجی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور ہم آندھی طوفان کی طرح لاہور کی طرف روانہ ہوگئے۔

لیکن یہ ایک رائگاں سفر تھا۔

مین روڈ پر پہنچنے کے بعد ہم نے بہ مشکل ایک میل سفر کیا ہوگا، جب میں نے امی کی نبض دیکھی اور دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ذات کے کھنڈر میں گہرا سناٹا چھا چکا تھا۔ دل کے پنچھی نے پھڑکنا بند کر دیا تھا۔

بہرحال ہم نے لاہور کا سفر ملتوی نہیں کیا۔ راستے بھر میں اندر ہی اندر چپکے چپکے روتا رہا۔ میو اسپتال پہنچ کر تصدیق ہوگئی کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ دل کا دورہ انہیں اس ہرجائی دنیا سے بہت دور لے گیا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے آخر کار ان کے قدم اٹھ ہی گئے تھے۔

جب ہم امی کی میت ایمبولینس میں لیے رات گئے واپس آ رہے تھے تو بہ ظاہر اباجی بھی مغموم نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ درحقیقت وہ راستے کی دیوار گر جانے پر دل ہی دل میں کیا محسوس کر رہے تھے۔

راستے میں وہ قدرے پشیمان اور دھیمے لہجے میں بولے۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ نورالنساء اس بات کو اس حد تک دل پر لے لے گی۔ یہ کوئی ایسی انہونی یا انوکھی بات تو نہیں تھی......ہم جیسے لوگ چار چار شادیاں کر لیتے ہیں۔“

وہ شاید احساسِ جرم کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ میرا کچھ بولنے کو، ان سے کچھ کہنے کو......حتیٰ کہ ان کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس میں امی کا سر اپنے زانو پر رکھے یک ٹک تمام راستے ان کا چہرہ تکتا آیا تھا، جس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کٹھن راستے پر چلتے چلتے تھک کر سو گئی تھیں۔

ڈرائیور خالی گاڑی لیے ایمبولینس کے آگے چل رہا تھا۔

بچپن سے جوانی تک وہ جو ایک بے عنوان سا احساس تنہائی سانپ بن کر ڈستا تھا لیکن اس کی اذیت صرف امی کے وجود کی بدولت مجھے زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب وہی احساس تنہائی گویا عفریت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ زندگی بے اماں، بے سائباں ہو کر رہ گئی تھی۔ چاروں طرف بس ایک جلتا ہوا صحرا تھا......اور کچھ بھی نہیں۔ وہ شبنمی چہرہ جس کے دم سے دل و جاں کو ٹھنڈک میسر تھی، اب خاک میں پنہاں ہونے کے لیے عازم سفر تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ امی جیسی ہستی یوں اچانک بھی میرا ساتھ چھوڑ کر جا سکتی ہے۔

✦✦✦

دسویں تک تو گھر میں سوگواری و افسردگی کا راج رہا،

اس کے بعد دھیرے دھیرے گویا میرے محسوسات کے سوا ہر چیز معمول پر آنے لگی۔ اباجی کے چہرے پر حزن و ملال اور افسردگی کا جو موسم آیا تھا، وہ گزر گیا۔ تاہم مرنے والی کا احترام انہوں نے اس حد تک ضرور کیا کہ ان دنوں وہ اوپر گلشن کے پاس کم ہی جاتے تھے۔ زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہتے تھے۔

ملازمائیں وغیرہ گلشن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اوپر اپنے شب و روز کس طرح اور کس مصروفیت میں گزارتی تھی۔ وہ کبھی نیچے نہیں آئی اور میں بھی اوپر نہیں گیا۔ صرف امی کا جنازہ اٹھاتے وقت اور سوئم والے دن میں نے اس کی صورت دیکھی تھی۔ میرے خیال میں وہ غمزدہ نظر آنے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

سوئم والے دن اس کے اوپر جانے کے بعد اباجی گویا مجھے سنانے کے لیے گھر کے ایک خاص نوکر فیضو سے کہہ گئے تھے۔ ”فیضو! تم اس بات کا خاص خیال رکھو گے کہ نوکرانیوں کے علاوہ اوپر گلشن کے پاس کوئی نہ جانے پائے۔“

میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی نوکر میرا راستہ روکنے کی کوشش کرے۔ اگر مجھے اوپر جانا کچھ زیادہ ہی ضروری محسوس ہوتا تو کوئی مجھے روک بھی نہیں سکتا تھا لیکن میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس عورت کا قدم گھر میں پڑتے ہی میں اس ماں سے محروم ہوگیا تھا جو میرا سب کچھ تھی لیکن اس عورت سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... بلکہ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب کسی بھی بات کا کوئی فائدہ نہیں...... وہ ایک مہربان ہستی جو اس نامہربان گھر سے روٹھ کر چلی گئی تھی وہ تو اب کسی بھی طرح واپس نہیں آ سکتی تھی۔

میں یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ گلشن کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کی تربیت اور زندگی کا ڈھب یہی تھا۔ اس قبیلے کی عورتوں کو کہیں نہ کہیں تو اونچا ہاتھ مارنا ہی ہوتا ہے۔ قصور تو اس کا تھا جو اسے اس گھر میں لایا تھا۔

میں سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ کچھ کرنے کو، کسی سے ملنے کو، کسی کی صورت کو دیکھنے کو جی نہ چاہتا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ یوں تنہا اپنے کمرے میں مقید رہ کر اور اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کر میں کہیں ذہنی توازن نہ کھو بیٹھوں۔ چنانچہ کبھی کبھار میں لاہور جانے لگا۔ وہاں دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزر جاتا۔

امی کے انتقال کو دو ماہ گزر گئے تو اباجی اور گلشن کی شادی کے انتظامات ہوتے نظر آنے لگے۔ حویلی میں نیا فرنیچر آنے لگا۔ ملبوسات کے پیکٹ اور نہ جانے کیا کچھ آتا دکھائی دینے لگا لیکن یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے ہو رہا تھا۔ گھر کے نوکر چاکر بھی جیسے اباجی کے رازدار تھے۔ ہر بات بڑے گول مول سے انداز سے، ہر کام بڑے سلیقے قرینے اور خاموشی سے کرتے تھے۔

ایک روز شام ڈھلے میں لاہور سے واپس آ رہا تھا۔ گاڑی ہائی وے سے اتارنے کے بعد میں نے تنگ سڑک پر تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ دور سے میں نے ایک خشک اور متروک کنویں کی منڈیر پر ایک شخص کو اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے تھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔

اچانک اس نے سر اٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ پھر شاید مجھے پہچان کر وہ منڈیر سے اترا اور گرتا پڑتا گاڑی کے سامنے آگیا اور بے تابی سے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر گاڑی روکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک دبلا پتلا اور قدرے مفلوک الحال سا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ واقعی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔

”کیا بات ہے بابا؟“ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

”صاحب جی......!“ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑایا۔ ”ویسے تو آپ بڑے ملک صاحب کے ہی صاحبزادے ہیں لیکن میں نے سنا ہے آپ ان سے بالکل الٹ ہیں......آپ بہت نیک طبیعت کے مالک ہیں......غریبوں اور کمزوروں پر رحم کھاتے ہیں، اس لیے میں آپ کے سامنے فریاد کرنے کے لیے آپ کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا پتا نہیں آج آپ گاؤں آئیں گے بھی یا نہیں......“

”بات بتاؤ بابا!“ میرا ماتھا ٹھنکا۔

”بیل دار فضل خان نے میری سترہ سال کی بیٹی کو رستے سے اٹھا لیا ہے...... اسے بچائیں چھوٹے سرکار! ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جلدی شہر سے واپس آگئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو میری مدد کے لیے صحیح وقت پر بھیجا ہے۔“ اس کے منہ سے صحیح طور پر بات نہیں نکلی تھی لیکن اس کا مفہوم یہی تھا۔

اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو میری کنپٹیوں میں انگارے سے دہک اٹھے۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اباجی تو جو کچھ تھے سو تھے، لیکن یہاں تو ہر شخص فلمی ولن بننے پر تلا ہوا تھا۔ بیل دار افضل خان گہری سانولی رنگت کا ایک گیم شیم شخص تھا اور اس کی عمر پچاس سال سے کم نہیں تھی۔ وہ ایک

طرح سے منیجر تھا، فصلوں کا محافظ بھی تھا۔ چند مسلح کارندے اس کے ماتحت تھے۔ اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوتا تھا کہ کوئی ہماری فصلوں کو کاٹنے، ان میں آگ لگانے یا ان کا پانی کاٹنے کی کوشش نہ کرے۔ یعنی فصلوں کی حفاظت کے لیے تو گاؤں میں ہمارے آدمی موجود تھے لیکن عزتوں کی حفاظت کرنے والا شاید کوئی نہیں تھا۔

بیل دار افضل خان خاصا طاقتور اور بدمعاش آدمی تھا۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ وہ اپنی طاقت اور بدمعاشی کو اس قسم کے کاموں میں بھی استعمال کر رہا تھا۔

”تم کسی اور کے پاس نہیں گئے؟“ میں نے ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا۔

”میں...... جی...... کیا بتاؤں......“ اس کے آنسو ایک بار پھر اُمڈ آئے۔ وہ سر پر لپٹی ہوئی مختصر سی پگڑی کے سرے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ ”میں دوڑا دوڑا ڈیرے پر گیا تھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ بچی کو ڈیرے پر لے جائیں گے لیکن وہ وہاں پر نہیں پہنچے تھے۔ بڑے ملک صاحب موجود تھے لیکن انہیں جب بات کا پتا چلا تو وہ میری مدد کرنے کے بجائے الٹا ہنسنے اور خوش ہونے لگے...... کہ بیل دار نے بڑے دنوں کے بعد کچھ سرگرمی دکھائی ہے اور اس کی ڈھلتی جوانی میں ابال آیا ہے...... پھر انہوں نے مجھے حکم دیا کہ جا، آرام سے سوجا...... کل تیری لڑکی گھر پہنچ جائے گی۔ ذرا ہمیں بھی تو دیکھنے دے وہ کیا چیز ہے جس پر بیل دار کا دل آیا ہے...... یہ جواب ملا ہے جی مجھے وہاں سے......“

وہ ایک بار پھر ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہمارے کارندے بھی اس حد تک کھل کھیل رہے ہیں۔“ میں نے حلق میں پھیلتی ہوئی کڑواہٹ کو نگلتے ہوئے کہا اور بوڑھے کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جب اوپر والے ہی اندھیر مچائے ہوئے ہوں تو نیچے والوں کے بھی حوصلے کھل جاتے ہیں سرکار! وہ تو پھر اوپر والوں سے بھی زیادہ قیامت مچاتے ہیں۔“ وہ میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”علاقے میں اندھیر مچا ہوا ہے صاحب جی! لوگ اب بڑے ملک صاحب کے بہت خلاف ہوتے جا رہے ہیں...... یا تو لوگ چپکے چپکے علاقہ چھوڑنا شروع کر دیں گے اور کسی طرح گوندل برادری سے جا ملیں گے یا پھر متحد ہو کر اب ضرور کچھ کریں گے۔ ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے جی...... اور تو ہر طرح کا ظلم لوگ سہ لیتے ہیں مگر یہ جو معصوم بچیوں کا معاملہ ہے نا...... اس میں لوگ اپنی عزت کی خاطر زبان بند رکھتے ہیں لیکن کب تک......؟ یہ آگ اندر ہی اندر پھیلتی ہے۔ ہم کمزور ہیں، مجبور ہیں...... لیکن پاؤں تلے آ کر چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ اب یہ اندھیر ختم ہونا چاہیے ملک صاحب!“

”آج بند ہو جائے گا چاچا! آج یہ اندھیر بند ہو جائے گا۔“ میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا مگر اس لہجے کی تہ میں برسوں کی اذیت بول رہی تھی۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا مگر آج اچانک ہی اس نے مجھے ایک بڑے فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی تھی۔ اب میں بہت واضح انداز میں سوچ رہا تھا کہ اباجی بہت زندگیاں اجاڑ چکے تھے۔ اب ان کا حساب کتاب ہو جانا چاہیے...... اور میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کا حساب کتاب میرے سوا کوئی نہیں چکا سکتا تھا۔

ساری برائیوں کی جڑ اباجی کی ذات تھی اور جڑ سے ختم کیے بغیر ظلم کے شجر کا پھلنا پھولنا بند نہیں ہوتا۔ محض پتے اور شاخیں تراشنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں لڑکپن تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ اس قسم کے جاگیردار صرف فلموں میں ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے خود ایک ایسے ہی جاگیردار کے ہاں جنم لیا ہے۔

میں نے پاس پڑوس کے کئی دوسرے بڑے زمینداروں کو بھی قریب سے دیکھا تھا لیکن میں نے ان میں سے کسی کو اباجی جیسا نہیں پایا تھا۔ ان میں اگر کچھ خباثت تھی تو صرف سیاست کے میدان کی حد تک تھی۔

میں نے گلوو کمپارٹمنٹ سے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور فل لوڈ تھا۔ میں نے اسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

”آپ کیا کرنے جا رہے ہیں جی......؟“ اس شخص نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا جو ایک لمحہ پہلے متحد ہونے اور ظالموں کے اندھیر کھاتے کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بات کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں خوف جھلک آیا تھا۔

”کچھ نہیں...... تمہیں تمہاری بچی مل جائے گی۔ خدا کرے وہ خیریت و عافیت سے ہو...... اور آج کے بعد اس علاقے میں کسی کی لڑکی نہیں اٹھائی جائے گی، کسی کی عزت پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ میں نے بڑے یقین سے کہا۔ میں فی الحال اسے یہ بتا کر بدحواس نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اباجی کو گولی مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور...... میرے خیال میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس فیصلے پر پہنچ کر میں بہت مطمئن تھا۔ میں اپنے آپ کو بالکل پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اباجی کو شاید معلوم ہی نہیں تھا کہ میں اندر سے کتنا مضبوط آدمی ہوں۔

”تمہارے خیال میں بیل دار تمہاری بچی کو کہاں لے

گیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
''معلوم نہیں جی...... اس کے ساتھ تین بندوق والے بھی تھے۔ وہ کہیں بھی گئے ہوں جی...... ان کا پتا تو ڈیرے سے ہی چلے گا۔ وہاں ہر بات کی خبر ہوتی ہے جی......'' وہ لرزاں سی آواز میں بولا۔

میرا بھی یہی خیال تھا، اس لیے میں نے پہلے ہی گاڑی کا رخ ڈیرے کی طرف موڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ ''جب اس قسم کی کوئی بات ہوتی ہے تو تم لوگ پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتے؟''

''پولیس کے پاس......؟'' اس نے یوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی بہت ہی ڈراؤنی یا بہت ہی بے وقوفی کی بات کہہ ڈالی ہو۔ پھر وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ ایک عذاب میں تو ہم پہلے ہی پھنسے ہوئے ہیں...... پولیس کے پاس جا کر ہم دوسرے کئی عذاب بھی مول لے لیں؟ اپنے آپ کو اور اپنی بچیوں کو مزید ذلیل کرائیں؟ آپ کو شاید پتا نہیں کہ بڑے ملک صاحب کی مرضی کے بغیر تو اس علاقے میں کسی تھانیدار کا تبادلہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو آپ ہی لوگوں کے محافظ ہیں جی...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگ کہاں جائیں۔''

''آج کے بعد تمہیں کہیں نہیں جانا پڑے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اس وقت ہم ڈیرے سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر تھے، جب کہیں دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ فائرنگ کی آوازیں سنائی دینا ہمارے علاقے میں نئی یا انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس وقت فائرنگ خاصی شدید تھی...... تاہم میں نے ڈیرے کی سمت میں ہی سفر جاری رکھا۔ فائرنگ کی آوازیں کسی اور سمت سے سنائی دے رہی تھیں۔

جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں ویرانی کا راج تھا۔ دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ ایک دیوار کے قریب صرف ایک ہونق سا آدمی کھڑا تھا۔

''یہ سب لوگ کہاں گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جو دس ایکڑ والا ٹکڑا ہے نا جی...... جس کی وجہ سے کئی مرتبہ گوندلوں سے لڑائی ہو چکی ہے...... وہاں کچھ لوگوں نے ہمارے آدمیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ یہاں خبر پہنچی تو بیل دار اپنے آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گیا تھا۔'' اس شخص نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے بیل دار یہیں تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... وہ حملے کی خبر آنے سے دو چار منٹ پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔''

''اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

ہونق سا شخص کچھ ہچکچایا، پھر تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... تھی تو...... لیکن افراتفری میں وہ یہاں سے نکل کر بھاگ گئی۔''

میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے لیکن شاید یہ تشکر کے آنسو تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ بیل دار کو اس شخص کی بیٹی کو برباد کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے ہی یہ افتاد پڑ گئی تھی جو کسی غریب کے لیے رحمت بن گئی تھی۔

''اور بڑے ملک صاحب کہاں گئے؟'' میں نے ہونق سے آدمی سے پوچھا۔

''وہ بھی بیل دار صاحب کے ساتھ موقع پر گئے ہیں جی! ان کو آج بہت غصہ آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آج وہ خود جا کر دیکھیں گے کہ گوندلوں نے کیا بدمعاشی مچائی ہوئی ہے...... وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ وہ آج گوندلوں کا قصہ ہی ختم کر کے آئیں گے۔''

میں نے اپنے ساتھ آنے والے شخص سے کہا۔ ''چاچا! اب تم آرام سے گھر جاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔ خدا نے رحم کر دیا اور خیریت ہی رہی۔ تمہاری بچی گھر پہنچ چکی ہوگی۔''

وہ شخص وہاں سے چلتا ہوا نہیں بلکہ دوڑتا ہوا رخصت ہوا۔ اس کی ناتواں ٹانگوں میں گویا بجلی بھر گئی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر ادھر روانہ ہو گیا جدھر سے فائرنگ کی آوازیں کچھ دیر پہلے تک آ رہی تھیں لیکن اب معدوم ہو چکی تھیں۔

ہمارے علاقے میں دوسرے بڑے زمیندار گوندل برادری کے لوگ تھے۔ ہماری صرف دس ایکڑ زمین معلوم نہیں کس طرح ان کی زمینوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ شروع میں انہوں نے ابا جی کو پیشکش کی تھی کہ وہ زمین انہیں ہی بیچ دی جائے کیونکہ اس کی وجہ سے انہیں کچھ دقتیں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔

ابا جی غالباً اپنی مصروفیات کی وجہ سے جلدی انہیں کوئی جواب نہیں دے سکے اور انہوں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پٹواری سے مل ملا کر کوئی ہیرا پھیری کر کے وہ ٹکڑا اپنے نام کرانے کی کوشش کی۔ جس کا فوراً ابا جی کو علم ہو گیا اور اس وقت وہ بری طرح چڑ گئے۔ انہوں نے اسی وقت قسم کھا لی کہ وہ کسی قیمت پر زمین کا وہ ٹکڑا گوندلوں کے

ہاتھ نہیں بیچیں گے۔ اس کے بعد وہ ٹکڑا دونوں فریقوں کے لیے انا کا مسئلہ اور تنازعے کی وجہ بن گیا تھا۔

اس دن کے بعد عین اسی مقام پر چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے آئے تھے۔ کچھ عرصے سے ان جھگڑوں میں سنگینی بھی آ گئی تھی اور دونوں طرف کے تین چار آدمی مر چکے تھے۔ مقدمے چل رہے تھے اور آئے دن گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ تازہ ترین صورتِ حال کیا تھی تاہم میرا ارادہ اب بھی نہیں بدلا تھا۔ بھرا ہوا پستول اب میں نے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

تنگ اور ناہموار پگڈنڈی پر مجھے گاڑی بہت آہستہ چلانا پڑ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد میں اس مقام پر پہنچا جہاں میرے اندازے کے مطابق فائرنگ ہوئی تھی۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا مگر آثار بتا رہے تھے کہ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ وہاں کچھ دیر پہلے یقیناً افراتفری رہی تھی اور گولیاں بھی چلی تھیں۔ کئی جگہ گولیوں کے خالی خول پڑے دکھائی دے رہے تھے۔

میں گاڑی سے اتر کر پیدل آگے بڑھا۔ چاروں طرف عجیب پراسرار سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا، جس سے خوف آنے لگتا ہے، جلد کے اندر پھریریاں سی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ایک جگہ مجھے سیون ایم جی کی کچھ غیر استعمال گولیاں بھی پڑی نظر آئیں۔ ان دنوں، ہمارے علاقے میں چھوٹے موٹے جھگڑوں میں سیون ایم جی کی گن استعمال نہیں ہوتی تھی۔ کسی انجانے سے خدشے سے میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ ارد گرد کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن فضا میں جیسے لہو کی بو رچی ہوئی تھی۔

میں کھڑی فصلوں میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ مجھے ابا جی کی جیپ کھڑی نظر آئی۔ اس کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہو چکی تھی۔

میں ذرا آگے بڑھا تو اچانک جیسے میرے سر پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال کر سامنے دیکھا۔ کچلی ہوئی فصل کے درمیان ابا جی چت پڑے تھے۔ بائیں کان سے اوپر ان کی کھوپڑی کا خاصا حصہ اڑ چکا تھا۔ ایک گولی گردن سے بھی پار ہو چکی تھی۔ ان کی شکل مسخ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ قیمتی لباس خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ادھر ادھر پھیلا ہوا خون جمنا شروع ہو گیا تھا اور لاش پر ابھی سے مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں۔

یہ ایک ایسے شخص کی لاش تھی جسے دور سے گزرتے دیکھ کر لوگوں کی رگوں میں خون خشک ہونے لگتا تھا۔

جیب میں پڑے ہوئے پستول کے دستے پر میری گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میں نے جیب سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ میں آہستگی سے ان کے قریب بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کا بے جان ہاتھ برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت تھا۔ میری آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور ابا جی کے چہرے پر گرے لیکن یہ دو آنسو ان کے چہرے پر نظر آنے والے خاک اور خون اور ان کے اعمال کی نظر نہ آنے والی سیاہی کو نہیں دھو سکتے تھے۔

''ابا جی......! شاید اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو کہ حکم دے کر لڑوانے اور خود آگے بڑھ کر لڑنے میں کیا فرق ہے...... اور کاش آپ دیکھ سکتے کہ آپ اس حالت میں یہاں پڑے ہوئے کتنے بے وقعت اور حقیر لگ رہے ہیں، آپ کی لاش پر مکھیاں......'' اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے میں یک لخت خاموش ہو گیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید ایک آدھ لمحے کے لیے میرا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔

اسی لمحے کسی کے کراہنے کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں فصل سے نکلا اور آواز کی سمت میں بڑھا...... آگے پانی کا چھوٹا سا نالہ تھا جسے ''کھال'' کہا جاتا ہے۔ کھال کے قریب ایک لاش اس طرح اوندھی پڑی تھی کہ اس کا سر پانی میں تھا اور اس کی پگڑی کھل کر ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی رائفل کچھ دور پڑی تھی۔

اس سے ذرا آگے، نشیب میں بیل دار فضل خان چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کی شکل زندگی میں بھی کچھ کم بھیانک نہیں تھی لیکن زندگی سے محروم ہونے کے بعد وہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کا بڑا سا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ گویا مرتے وقت اسے یقین نہ آیا ہو کہ موت اس کی شہ رگ تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ وہ کسی بھینسے کی طرح مضبوط آدمی تھا لیکن چند تولہ سیسے کی صرف ایک گولی اس کے جسم کے مضبوط قلعے سے روح کا پنچھی نکال کر لے گئی تھی۔

کراہ دراصل اس آدمی کی تھی جس کا سر پانی میں تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر اس کا سر پانی سے نکالا۔ پانی اس کے ناک منہ میں نہیں گیا تھا۔ اسی لیے وہ کراہ سکا تھا اور اس کے کراہنے کی آواز سنائی بھی دے گئی تھی۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں تھوڑی سی کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی دھندلاہٹ قدم جما رہی تھی۔ تاہم اس نے مجھے پہچان لیا۔

''چھوٹے ملک صاحب......'' اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔ ''آپ فوراً گھر چلے جائیں...... کہیں آپ کو بھی کوئی......'' بات بات پر رائفل لے کر نکل کھڑا ہونے

والا وہ شخص، جسے میں بشیر خان کے نام سے جانتا تھا، موت کی علمداری میں قدم رکھتے وقت سخت دہشت زدہ تھا۔ فرشتۂ اجل یقیناً آج اس کے تنِ جاں کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''تم میری فکر چھوڑو۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ ''یہ بتاؤ یہاں کیا ہوا تھا؟''

''وہ شاید گوندلوں ہی کے آدمی تھے۔'' وہ اسی طرح اٹک اٹک کر بولا۔ ''لیکن ان کے چہروں پر...... ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے...... انہوں نے ...... آج بڑی تیاری سے...... حملہ کیا تھا...... لیکن وہ بھاگ گئے ہیں...... ہمارے آدمی ان کے پیچھے گئے ہیں...... انہوں نے اندھا دھند فائرنگ...... کی تھی۔''

سرگوشی میں بولتے وقت بھی اس کے منہ سے بھل بھل خون نکل رہا تھا۔ اس کے سینے میں گولیاں لگی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھا۔ اچانک ہی اس نے اذیت کے ایک جھٹکے کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں اور پھر نہیں کھولیں۔ میں نے اسے ہلایا جلایا مگر اب اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق نہیں رہی تھی۔

میں تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ پر واقعی یکدم ہی بے پناہ تھکن نے غلبہ پالیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کی طرف واپس جا رہے تھے۔ میرا بھی بڑی شدت سے گھر واپس جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے...... اور پھر سب سے پہلے تو مجھے تھانے جانا تھا۔

✈✈✈

حملہ آوروں میں سے دو آدمیوں کو ہمارے آدمیوں نے پکڑ لیا تھا اور مزید دو آدمیوں کو پولیس نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ واقعی گوندلوں ہی کے آدمی تھے اور حملہ بھی یقیناً گوندلوں نے ہی کرایا تھا لیکن اس بات کو جاننے اور ثابت کرنے میں بڑا فرق تھا۔

پولیس نے مار مار کر ان کی چمڑی ادھیڑ دی مگر وہ اس بات پر قائم رہے کہ وہ تو صرف پانی کے مسئلے پر بات کرنے گئے تھے۔ جھگڑا اچانک ہی اور فوری اشتعال کے تحت شروع ہوگیا۔ اس میں کسی سازش کو دخل نہیں تھا اور نہ ہی پس پردہ دوسری شخصیات کام کر رہی تھیں۔

انہوں نے اقرار کرلیا تھا کہ مرنے والے انہی کی فائرنگ سے مرے تھے۔ اس کے بعد ظاہر ہے تفتیش ختم ہو جانی تھی۔ تھانیدار کا رویہ معذرت خواہانہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں کچھ ''سرگرمی'' دکھاؤں تو گوندلوں پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ مگر میں سرگرمی نہیں دکھا رہا تھا۔

پولیس کو بھی معلوم تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ جو لوگ پکڑے گئے ہیں اور اقرار کر رہے ہیں کہ مرنے والے ان کی فائرنگ سے مرے تھے...... وہ درحقیقت قربانی کے بکرے تھے۔ اصل مجرم تو ڈوریاں ہلانے والے تھے۔ جنہوں نے ان لوگوں کو اس مہم پر روانہ کیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دراصل اب مجھے ان معاملات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ سب کچھ مکافاتِ عمل کے تحت ہو رہا تھا...... اور اب گویا کہانی ہی ختم ہوگئی تھی۔ میرا ہر چیز سے دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ پولیس نے مزید چار آدمیوں کو پکڑا لیکن ایک ایک کرکے انہیں چھوڑ دیا۔

چالان عدالت میں پیش ہوچکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اقرارِ جرم کرنے والوں کو پانچ پانچ، سات سات سال کی سزا ضرور ہو جائے گی۔ اس دوران میں ان کی بیویاں اور بچے عیش و عشرت سے رہیں گے۔ دنیا کی ہر آسائش ان کو میسر ہوگی اور مستقبل کے لیے بھی بڑی بڑی رقمیں ان کے گھروں میں رکھے ہوئے ٹرنکوں اور صندوقوں کے کونوں کھدروں میں پہنچ چکی ہوں گی، جن کا ان سے پہلے وعدہ کیا گیا ہوگا۔

جب اس واقعے کا ہیجان ختم ہوا اور روز و شب میں ذرا ٹھہراؤ آیا تو ایک روز میں اوپر کی منزل پر گلشن کے پاس پہنچا۔ اباجی کی موت پر اسے سکتہ سا ہوگیا تھا۔ اس کے بعد گزرنے والے دو مہینوں میں، میں نے اسے صرف دو مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ دونوں ہی مرتبہ ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ بہ دستور خاموشی سے رہ رہی تھی جیسے وہ اسی گھر کی ایک فرد ہو اور شروع سے یہیں رہتی آئی ہو۔

اس روز میں اوپر پہنچا تو وہ سیاہ ماتمی لباس میں ایک بھاری بھرکم کرسی پر کشادہ بالکونی میں بیٹھی تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں اب وہ ڈھکا چھپا سا بازاری پن نہیں رہا تھا، بلکہ بڑی متانت اور ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اباجی کے انتقال کے بعد وہ مستقل طور پر سیاہ لباس پہن رہی تھی۔

ایک خادمہ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور بڑے سلیقے سے بالوں کو سنبھالے ہوئے تھی ورنہ شاید اس کے بال اتنی اونچی کرسی سے بھی فرش پر پھیلے ہوتے۔ وہ بلاشبہ ایک حسین عورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے لمبی لمبی پلکوں کی جھالر بے حد آہستگی سے اٹھی۔ پھر اس کی نظر میرے چہرے پر جم کر رہ گئی۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے اس نے خادمہ کو اشارہ کیا اور وہ اس کے بالوں کا عارضی سا جوڑا بنا کر نیچے چلی گئی۔

گلشن کا سپید، نازک اور مرمریں ہاتھ حرکت میں آیا۔ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ مترنم مگر نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ ''بیٹھو شہریار!''

''میں بیٹھنے نہیں...... مختصر سی بات کرنے آیا ہوں۔'' میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی بھوؤں میں خم گہرا ہوگیا۔ وہ نہایت پُرتمکنت انداز میں میری طرف متوجہ تھی۔

میں نے بالکونی کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''گلشن بیگم! تمہاری آمد اس گھر کے لیے بیک وقت نحوست کا باعث بھی ثابت ہوئی ہے اور کسی حد تک مبارک بھی رہی ہے...... نحوست کا باعث اس طرح کہ یہ گھر اجڑ کر رہ گیا اور مبارک اس طرح کہ اب بہت سے گھر سکون سے بسے رہ سکیں گے...... لیکن تمہیں اب اس گھر سے جانا ہوگا۔ اس حسن و شباب کا کوئی اور قدردان تلاش کرنا ہوگا۔''

''تمہیں مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ میرا تمہارے مرحوم باپ سے کچھ نہ کچھ ناتا رہا ہے۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ ''میں اسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں، میں ان کی یاد کے سہارے زندگی گزار دوں گی۔''

''یہ افسانوی مکالمے بولنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مکالموں پر جان دینے والا اس دنیا سے جاچکا ہے۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''لیکن تم مجھے یوں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ تمہارا باپ مجھ سے شادی کرنے والا تھا۔'' وہ یکدم چلا اٹھی۔ اس کی متانت، صبر و ضبط اور ٹھہراؤ جلد ہی جواب دے گیا۔ میں مسکرا دیا۔

''شادی کرنے والا تھا...... شادی کی نہیں تھی۔'' میں نے گویا اس کی کوئی غلط فہمی دور کی۔

چند لمحے وہ خاموشی سے یک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نظریں مردوں کی شخصیت میں دراڑیں ڈال دینے والی تھیں۔ اس کا ذہن یقیناً بہت تیزی سے کام کرتا تھا۔ میرے چہرے پر پھیلی سرد مہری کو محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے قریب آئی، اتنے قریب کہ میں اس کے وجود کی مہک محسوس کرسکتا تھا۔ یہ مہک کسی کلون یا پرفیوم کی محتاج نہیں تھی۔

''آخر میں کیوں اس گھر میں نہیں رہ سکتی؟'' اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔ وہ گویا یکدم چیخنا ہی بھول گئی تھی۔

''میں نے یہ گھر، زمینیں اور دیگر جائداد...... سب کچھ بیچنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' میں نے سیدھی سچی بات اسے بتا دی۔ ''میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں مستقل طور پر لاہور شفٹ ہو رہا ہوں۔ میں زمینداری نہیں کرسکتا اور نہ ہی ان زمینوں کا مالک کہلوانا چاہتا ہوں۔ میں شاید کچھ اور کروں...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نہ کروں۔''

''کیا میں تمہاری کنیز بن کر تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی؟'' اچانک اس نے خوابناک لہجے میں سرگوشی کی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میری رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پھر مجھے جھرجھری سی آگئی۔ گلشن کا پس منظر خواہ کچھ بھی تھا، پھر بھی میرے لیے اس کی یہ قلابازی ناقابلِ یقین تھی۔

دوسرے ہی لمحے سنبھل کر میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''مجھے کسی کنیز کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً ایسی کنیز کی، جو میرے باپ کی بھی کنیز رہ چکی ہو۔''

اس کی آنکھوں کا نشیلا پن دم توڑ گیا۔ وہ واپس کرسی پر جابیٹھی اور بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم بہت مختلف آدمی ہو۔''

اپنے جذبات اور تاثرات کو قلابازیاں کھلانا شاید اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

''شاید......'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ شاید میں ان لوگوں سے ذرا مختلف ہوں جن سے تمہارا واسطہ رہا ہے۔''

وہ ایک لمحہ خاموش رہی۔ آخر اپنی حقیقی سطح پر آتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے باپ نے ایک بہت بڑی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے کی تکمیل شادی سے دو چار دن پہلے ہی ہونا تھی۔ میں وہ رقم لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ میں بڑا جھگڑا کھڑا کرسکتی ہوں۔ تم مسائل میں پھنس جاؤ گے۔''

''مثلاً......؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تم پر کیس بن سکتا ہے کہ تم نے میری عزت پر حملہ کیا تھا۔'' اس نے شاید اپنی بات پر زیادہ غور کیے بغیر کہا۔

''ایک عرصے سے میں ہنسا نہیں ہوں لیکن تمہارے منہ سے یہ سب سن کر لفظوں کی اس ستم ظریفی پر میرا ہنسنے کو جی چاہ رہا ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''عزت...... حملہ...... کیس...... میں...... اور...... تم......! بڑی مضحکہ خیز سی تصویر بنا رہے ہیں یہ الفاظ۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم ایسی احمقانہ بات کہو گی...... روپے پیسے کی مجھے کبھی کوئی ایسی پروا نہیں رہی، لیکن یہ بات کرکے تم نے خود ہی اپنے لیے تمام امکانات کو ختم کرلیا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ مجھے بلیک میل

ہونا بالکل برداشت نہیں ہے۔ آج تک کوئی مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔“

پھر میں نے بالکونی کی دیوار کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ ”ذرا یہاں آؤ۔“

وہ متذبذب انداز میں اٹھ کر میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔ اس بالکونی سے بہت دور تک نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ کھلا میدان، کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ...... آتے جاتے اکادکا مزارعے...... ٹیوب ویل کا سرخ چوکور کمرا...... دور تک لہلہاتی فصلیں اور مویشی...... میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”یہ دور تک پھیلی ہوئی زمینیں دیکھ رہی ہو؟ یہاں تم جیسی عورت کو قتل کر کے دفن کر دیا جائے تو شاید کبھی اس کی لاش بھی دریافت نہ ہوسکے۔ میں بہت رحم دل انسان ہوں لیکن صرف ان کے لیے جو رحم کے مستحق ہوتے ہیں۔“ میرا لہجہ غیر ارادی طور پر انتہائی سرد ہوگیا تھا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سرخ وسپید رنگت ایک لمحے کے لیے پھیکی پڑ گئی تھی۔ میں نے بہ دستور سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں رقم ضرور دے دیتا بشرطیکہ تم ضرورت مند ہوتیں۔ میں روپے پیسے کے پیچھے جان دینے والا آدمی نہیں ہوں، لیکن میں دیکھ چکا ہوں کہ تمہارے پاس ڈائمنڈز کی بہت سی جیولری ہے۔ قیمتی ملبوسات سے تمہارے ٹرنک اور الماریاں بھری پڑی ہیں۔ اور بھی بہت کچھ ہوگا جو میرے علم میں نہیں ہے اور ان میں سے زیادہ تر یقیناً اباجی نے دیا ہوگا۔ بس...... اب میں مزید کوئی بات کہنا یا سننا نہیں چاہتا۔“

پھر میں نے وہیں کھڑے کھڑے پکارا۔

”شیدے...... مقصود، شریفن...... زینب!“

چند لمحے بعد وہ چاروں یکے بعد دیگرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے۔ شیدا اور مقصود چھ چھ فٹ لمبے جوان تھے اور دونوں ہی کو لمبی لمبی اور گھنی مونچھیں رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ صورت سے وہ ڈاکو لگتے تھے۔

میں نے شریفن اور زینب کو مخاطب کیا۔ ”گلشن بی بی کا سامان پیک کرو...... بہت احتیاط سے پیک کرنا۔ کوئی چیز ٹوٹنے اور خراب نہ ہونے پائے...... اور کسی چیز پر اعتراض نہ کرنا...... خواہ یہ کچھ بھی لے جانا چاہیں، انہیں لے جانے دینا۔“

پھر میں نے شیدے اور مقصود کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”بڑی والی لینڈ کروزر لے جانا۔ اسے ڈرائیور چلائے گا اور تم دونوں بی بی جی کے ساتھ جاؤ گے تاکہ راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ جہاں یہ حکم دیں، تم انہیں وہاں چھوڑ کر آؤ گے۔ سمجھ گئے نا۔“

”جی سرکار!“ شیدا سر جھکا کر بولا۔ ”ہم نیچے جاکر گاڑی کے پاس کھڑے ہوتے ہیں۔ بی بی جی تیار ہوجائیں گی تو شریفن اور زینب ہمیں اطلاع بھجوا دیں گی۔ ہم آکر سامان اٹھوا کر لے جائیں گے۔“

وہ دونوں واپس نیچے چلے گئے اور دونوں ملازمائیں اندر جاکر سامان جمع کرنے لگیں۔ گلشن اپنی جگہ دم بخود کھڑی تھی، لیکن شاید وہ آخری سانس تک لڑنے کی قائل تھی۔ سنبھل کر بولی۔ ”اتنے عرصے تک اگر کوئی یہاں مجھے ملنے نہیں آیا تو یہ مت سمجھو کہ میں کوئی لاوارث یا بے وسیلہ عورت ہوں۔ یہ میری ہدایت تھی کہ جب تک میں کسی کو طلب نہ کروں، کوئی مجھے یہاں ملنے نہ آئے۔ لیکن اب ہمارے آدمی تم سے بدلہ لینے ضرور آئیں گے۔ تم نے مجھے بے عزت کیا ہے۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”اگر تم مجھے اپنا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ دے جاؤ تو میں تمہیں مطلع کرتا رہوں گا کہ میں کن دنوں میں کہاں پایا جارہا ہوں۔ تاکہ تمہیں اپنے آدمیوں کو بھیجنے میں آسانی رہے اور وہ مجھ سے خاطر خواہ انتقام لے سکیں۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ مزید کچھ نہ بولی، خونخوار نظروں سے مجھے گھورتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نیچے آگیا۔

ایک گھنٹے بعد گلشن دونوں مسلح آدمیوں کے ساتھ نہایت خاموشی سے رخصت ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک بے مقصد سے انداز میں پورے گھر میں پھرتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ کیسا بدنصیب گھر ہے...... اتنی بڑی حویلی اور اس میں رہنے والا صرف میں...... یا پھر چند ملازم اور ملازمائیں!

یہ درست تھا کہ میں نے حویلی اور زمینیں وغیرہ فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے یہ سب جگہیں آسیب زدہ سی لگتی تھیں۔ زمین سے مجھے لہو کی بو آتی تھی۔ حویلی اور ڈیرے کے در و دیوار سے نادیدہ انسانوں کی چیخیں اور سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ میرے دل نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ میرے رہنے کی جگہ نہیں تھی، حالانکہ گاؤں والے بہت خوش تھے کہ اب وہاں کا مالک و مختار میں تھا۔ بلکہ میں نے سنا تھا کہ اباجی کے چہلم کے بعد انہوں نے باقاعدہ کوئی چھوٹا موٹا جشن بھی منایا تھا، مٹھائی بھی بانٹی تھی لیکن یہ کام چپکے چپکے کیے گئے تھے۔

ان سب باتوں کے باوجود مجھے یہاں رہنا اپنے بس کی بات نہیں لگتی تھی۔ اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ اتنی بڑی جائداد کے لیے اچھا گاہک کہاں تلاش کیا جائے؟ ان سب

چیزوں کو خریدنا کسی چھوٹے موٹے زمیندار کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد اس کا بھی حل تلاش کرلیا، جو اس علاقے کے ہر شخص کے لیے حیرت کا باعث بننے والا تھا۔

دوسری صبح میں جیپ میں بیٹھ کر تنہا گوندلوں کے علاقے کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں سے گوندلوں کی زمین شروع ہوتی تھی تو ایک مزارعے نے مجھے قریب سے دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ یکدم ہی اس کی آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ پھر وہ خوفزدہ سے انداز میں فصلوں کے درمیان دوڑتا چلا گیا۔

میں نے چوڑی پگڈنڈی پر سفر جاری رکھا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ گوندلوں کا ڈیرا کس طرف تھا۔ مدتوں پہلے میں صرف ایک بار وہاں گیا تھا، جب ان کی اور ہماری دشمنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال، میں اندازے سے چلا جارہا تھا۔

راستے میں کئی مزارعے وغیرہ نظر آئے۔ میں تو کسی کو نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ لوگ یقیناً مجھے پہچانتے تھے اور پہچان کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ جاتی تھیں۔ شاید انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شاہ زیب ملک کا اکلوتا بیٹا یوں تنہا گوندلوں کی زمینوں پر دکھائی دے سکتا ہے۔

میں کچھ اور آگے پہنچا تو سامنے سے ایک کھلی جیپ آتی دکھائی دی۔ ڈرائیور کے علاوہ اس میں چار آدمی تھے اور چاروں کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ جیپ ترچھی ہوکر یوں رک گئی کہ مجھے بھی جیپ روکنا پڑی۔ میں اطمینان سے اسٹیئرنگ وہیل پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا رہا۔

ان میں سے ایک رائفل بردار اتر کر میرے قریب آیا اور باقی تینوں یوں رائفلیں سنبھالے چوکنے بیٹھے رہے جیسے میری ذرا سی بھی حرکت پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ لیکن مجھے اطمینان تھا کہ کسی حرکت سے پہلے وہ بہرحال گولی نہیں چلائیں گے۔ میں بالکل پرسکون بیٹھا تھا۔

”کدھر جارہے ہیں ملک صاحب؟“ رائفل بردار نے اپنے کھردرے لہجے کو ملائم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”امیر گوندل سے ملنے......“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ گوندل پانچ بھائی تھے اور زمینیں سب کی مشترکہ تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ امیر گوندل ان میں سب سے بڑا بھائی ہے اور زمینوں کا انتظام فی الحال اسی کے ہاتھ میں تھا اور اس علاقے میں حکم بھی اسی کا چلتا تھا۔

سوال کرنے والا گویا کچھ الجھن میں پڑ گیا اور آخر وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”کیوں ملنے آئے ہیں؟“

”کچھ ضروری باتیں کرنے۔“ میں نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی میری آواز سن رہے تھے۔ چند سیکنڈ خاموشی کے بعد جیپ میرے راستے سے ہٹ گئی۔

رائفل بردار اپنی جیپ کی طرف جانے سے پہلے بولا۔ ”احتیاط آپ کے حق میں اچھی ہوگی ملک صاحب!“

میں نے کڑی نظروں سے اسے گھورا اور لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ جب ایک زمیندار دوسرے زمیندار سے بات کرنے جارہا ہو تو کارندے بیچ میں مشورہ نہیں دیا کرتے۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اپنی جیپ میں جا بیٹھا۔ میں نے جیپ آگے بڑھادی تاہم وہ جیپ بھی یوٹرن لے کر میرے پیچھے آنے لگی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھ لیا تھا کہ رائفل بردار اب بھی چوکس بیٹھے تھے۔

میں جب گوندلوں کے ڈیرے پر پہنچا تو وہاں باہر ہی کئی آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے بھی چند کے پاس رائفلیں وغیرہ تھیں۔ وہ سب بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے انہوں نے نظروں ہی نظروں میں یہ بھی پرکھ لیا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ یہ اندازہ کر کے یقیناً ان کی حیرت میں اضافہ ہوا ہوگا۔ اپنے دشمنوں کے علاقے میں، مسلح افراد کے جتھوں کے درمیان میں تنہا اور نہتا چلا آیا تھا۔ انہیں شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ تاہم انہوں نے خاموشی سے میرے لیے لکڑی کا بھاری بھرکم گیٹ کھول دیا۔ چار رائفل بردار بہرحال مستعدی سے میرے پیچھے آرہے تھے۔

احاطہ عبور کر کے میں بڑے ہال میں پہنچا۔ وہاں روایتی پنچایت کا سا منظر تھا۔ بہت سے لوگ دو طرفہ قطاروں میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور سامنے وسط میں ایک خاصی اونچی، منقش، رنگین اور مخملیں گدوں والی کرسی پر امیر گوندل بیٹھا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا اور درمیانے قد کاٹھ کا ایک عام سا آدمی تھا لیکن دولت اور جاگیرداری نے اس کی شخصیت میں ایک نکھار اور دبدبہ سا پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس بھیڑ میں سب سے الگ تھلگ اور نمایاں نظر آرہا تھا۔

”خوش آمدید شہریار ملک!“ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر یک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے گونجیلی آواز میں کہا۔

”شکریہ۔“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا اور

اپنے آس پاس مستعدی سے کھڑے ہوئے رائفل برداروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارے ہاں مہمانوں کو اس طرح خوش آمدید کہا جاتا ہے؟“

”دراصل ہمیں معلوم نہیں ہے کہ آنے والا مہمان ہے یا کچھ اور......“ امیر گوندل سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے...... وہ کس ارادے سے آیا ہے؟“

میں اس وقت شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنے کسی آدمی سے کہو کہ میری تلاشی لے کر اطمینان کر لے۔ میں بالکل نہتا ہوں، نیل کٹر تک نہیں ہے میرے پاس...... ظاہر ہے ایک نہتا آدمی، اتنے مسلح آدمیوں کے ہجوم میں تمہارے اپنے ڈیرے پر تم سے کوئی بات کرنے ہی آسکتا ہے۔“

”تلاشی کی ضرورت نہیں۔ تم نے کہا اور ہم نے یقین کر لیا۔“ امیر گوندل بولا اور تعظیم کے سے انداز میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ”بات کرنے آئے ہو تو یہاں آؤ...... میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے اپنے قریب پڑی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مضبوطی اور گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ بہت سمجھدار اور متحمل مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں اس سے ہماری دشمنی کیوں اتنی آگے چلی گئی تھی۔

بیٹھنے کے بعد میں نے بات شروع کی تو آواز اتنی بلند رکھی کہ ہال میں موجود سب لوگ سن سکیں۔ ویسے بھی سب میری ہی طرف متوجہ اور ہمہ تن گوش تھے۔

”خونریزی ختم کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو پہل ضرور کرنی پڑتی ہے امیر!“ میں نے کہا۔ ”اور میں نے کسی مجبوری کے تحت نہیں، بلکہ اپنی خوشی اور عقل کے تحت اس معاملے میں پہل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم اسے میری مجبوری یا کمزوری نہ سمجھنا، میں بھی چاہوں تو برسوں تک اس دشمنی اور خونریزی کو جاری رکھ سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں اب بہت ہو چکی ہے۔ یہ زمین بہت لہو پی چکی ہے...... اب یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ آدمیوں کے بل بوتے پر لڑتے رہنا بہت آسان ہے۔ انہیں تو صرف حکم دینا پڑتا ہے۔ میں اور تم اپنے آرام دہ کمروں میں بیٹھے رہتے ہیں، یہ سب چیزیں میرے مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ بیچ کر مستقل طور پر لاہور میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے میں زمین کا وہ ٹکڑا تمہیں تحفے کے طور پر پیش کرتا ہوں جس کی وجہ سے ہمارے درمیان ایک احمقانہ سی دشمنی چلی آرہی ہے۔“

ایک گہری سانس لے کر میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”اس کے علاوہ میں تمہیں اپنے ایک اور فیصلے سے بھی مطلع کرنا چاہ رہا تھا۔ میں اپنی ساری زمین اور حویلی وغیرہ بیچ رہا ہوں۔ اس علاقے میں چونکہ اب صرف میں اور تم دو بڑے زمیندار ہیں اس لیے میں نے تمہارا حق مقدم سمجھا ہے۔ کوئی اشتہار وغیرہ دینے یا کسی اور بڑے زمیندار سے بات کرنے سے پہلے میں تمہارے پاس آیا ہوں...... کیا تم سب کچھ خریدنے کو تیار ہو......؟ یا مجھے کسی اور علاقے سے پارٹی تلاش کرنا پڑے گی؟“

ایک لمحے کے لیے ہال میں ایسا سناٹا چھا گیا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ امیر گوندل یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں ذہن کی گہرائیوں میں اتر جانے والی تھیں۔

آخر وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ صرف ایک لمحے سوچ کر بولا۔ ”میری طرف سے تو اس سلسلے میں ہاں ہی سمجھو لیکن مجھے اپنے چار بھائیوں سے بھی مشورہ کرنا پڑے گا۔ میرے ایک بھائی نے کراچی جا کر فیکٹری لگائی ہے۔ بینک سے لون لینے کے باوجود کافی روپیہ اس میں پھنس گیا ہے لیکن...... بہرحال...... روپیہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے کراچی والے بھائی سے میں فون پر بات کروں گا۔ پرسوں میں اس سلسلے میں کوئی حتمی جواب دے سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے...... میں پرسوں تک انتظار کر لوں گا۔“ میں نے کہا اور جانے کے لیے اٹھنے لگا لیکن امیر گوندل بڑی اپنائیت سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے مجھے دوبارہ بٹھا کر بولا۔

”اب تم ایسے تو نہیں جا سکتے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اتنے بہادر اور شاندار آدمی ہو۔ دشمن سے لڑنے کے لیے نہیں، اس طرح خالی ہاتھ آکر صلح کرنے کے لیے شیر سے بھی بڑے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج مجھے یقین آگیا ہے کہ تمہارے سینے میں ایک سنہرا دل ہے۔ ہماری وجہ سے تمہیں آج تک جو بھی تکلیفیں پہنچیں، ان کے لیے میں تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں...... بولو، تم مجھے معاف کر رہے ہو یا نہیں؟“

”اگر میں نے تمہیں معاف نہ کیا ہوتا تو یہاں آتا ہی کیوں؟“ میں نے کہا۔

وہ اٹھا اور بڑے پرجوش انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔

”آج سے تم میرے جگری یار ہو...... میرے بھائی ہو۔ زندگی میں کبھی کوئی کام پڑے، مجھے آواز دینا۔ تمہارے پسینے کی جگہ خون بہاؤں گا۔ یہ امیر گوندل کا وعدہ ہے۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک عجیب سی کیفیت کے دوران میں یوں یہاں آنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن درحقیقت مجھے اب اندازہ ہوا تھا کہ دوستی اور دشمنی کے درمیان بہت باریک سی لکیر حائل ہوتی ہے۔ لکیر سے ادھر قدم پڑتا ہے تو خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ قدم لکیر سے ادھر رکھا جائے تو محبتوں کے پھول کھل سکتے ہیں...... اور یہ لکیر اتنی مبہم، اتنی نازک ہوتی ہے کہ ذرا سی غلط فہمیوں سے مٹ جاتی ہے۔ اس کی بڑی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔

میں امیر گوندل کے اصرار پر دوبارہ بیٹھ چکا تو امیر نے ایک شخص کو آواز دی۔ ”حیاتے! حویلی جا اور مرغیاں، بکرے ذبح کروا...... کھانے کا عالیشان انتظام کروا...... آج شہریار ملک صاحب کی آمد کی خوشی میں ہماری طرف سے عام دعوت کا اعلان کر دے۔ جو بھی چاہے آکر کھانا کھا سکتا ہے۔ جا کر فٹافٹ انتظامات کر......“

✦✦✦

زمین وغیرہ کا سودا ہو چکا تھا۔ بیعانہ بھی ہو گیا تھا لیکن باقی کارروائیاں اور لین دین مکمل ہونے میں ابھی دو تین ماہ لگنے تھے۔ اس دوران میں میرا ارادہ حویلی میں ہی رہنے کا تھا۔ تاہم میں نے لاہور کے دو تین اچھے علاقوں کے پراپرٹی ڈیلرز کو اپنے لیے کوئی اچھی کوٹھی خریدنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ میں لاہور چلا جاتا تھا۔

روز و شب پر ہمیشہ کی طرح وہی پرانا احساس تنہائی سایہ فگن تھا۔ میں نے اب حویلی کے اوپر کی منزل پر سونا شروع کر دیا تھا۔ رات گئے تک عموماً میں پڑھتا رہتا یا پھر پرانے نغمے سنتا رہتا۔ میرے پاس بہت پرانے کلاسیکل اور نیم کلاسیکل گانوں اور غزلوں وغیرہ کے ریکارڈز اور کیسٹوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ موسیقی سے دل بہلانے کے بعد بھی اگر نیند نہ آتی تو میں طویل و عریض ٹیرس پر ٹہلنے نکل جاتا۔ اگر آسمان پر چاند ہوتا تو باہر کا نظارہ خاصا دلکش دکھائی دیتا۔

اس رات بھی میں بتیاں بجھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ چکا تھا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ زندگی کی بے مقصدیت اور روز و شب کا خالی پن کبھی کبھی اپنا اثر کچھ زیادہ ہی دکھاتا تھا۔ میں اٹھ کر ٹیرس پر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ باہر سے مجھے بہت ہی خفیف سا کھٹکا سنائی دیا۔ جیسے کسی درخت کی شاخ پر کسی نے کچھ مارا ہو۔ پھر شاخ کے چرچرانے کی مدھم سی آواز ابھری۔ پھر کچھ ایسی آواز سنائی دی جیسے ٹیرس پر کوئی بڑی سی بلی کودی ہو۔

میں نہایت پھرتی سے لیکن خاموشی سے اٹھ کر دروازے تک پہنچا اور بے آواز طریقے سے دروازہ صرف اس حد تک کھولا کہ باہر سے دیکھنے والے کو حرکت کا احساس نہ ہو سکے۔ معمولی جھری سے میں نے باہر دیکھا۔ ٹیرس پر گلوب روشن تھے لیکن ایک دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں، میں نے ایک ہیولے کو دیوار سے چپکے دیکھ لیا۔ وہ بہ ظاہر تاریکی ہی کا حصہ بنا بالکل ساکت کھڑا تھا۔ سرسری نظر میں اتنی دور سے شاید اسے کوئی بھی نہ دیکھ پاتا۔ اس کا لباس جو کچھ بھی تھا، اس کا رنگ بھی سیاہ ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں چاہتا تو تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال کر، دروازہ مزید ذرا سا کھول کر یہیں سے اس کا نشانہ لے سکتا تھا لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں اس کی آمد کا مقصد کیا تھا اور یہ کہ وہ تنہا ہی تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

میں نے حویلی میں ملازموں کی تعداد کافی کم کر دی تھی، تاہم اب بھی رات کے وقت ایک مسلح چوکیدار سامنے کے گیٹ پر اور ایک عقبی دروازے پر موجود رہتا تھا۔ ان کی موجودگی میں دونوں طرف کی دیواروں پر تو کسی کا چڑھنا مشکل ہی نظر آتا تھا۔ سیڑھیوں پر بہت مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شخص سیدھا ٹیرس پر کیسے پہنچ گیا تھا۔ ایک ہی طریقہ ممکن نظر آتا تھا۔ حویلی تین طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ شاید وہ بغلی دیوار کے قریب سے کسی اونچے درخت پر چڑھا ہو اور اس کی شاخ سے اس نے ٹیرس کی دیوار پر چھلانگ لگائی ہو...... لیکن اس کے لیے اس کا بلی کی طرح سبک اور پھرتیلا ہونا ضروری تھا کیونکہ قریب ترین درخت بھی دیوار سے کئی فٹ دور تھا۔ شاخ چرچرانے کی آواز بہرحال میں نے سنی تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ ہیولا وہیں اندھیرے میں دیوار سے چپکا رہا۔ شاید وہ جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں اس کی آمد کو محسوس کیا گیا ہے یا نہیں۔ پھر دیوار کے ساتھ ساتھ ہی کھسکتا ہوا وہ کمروں کی طرف بڑھا۔ آخر کار وہ ایک کمرے کے دروازے پر آن رکا۔

خاصا عرصہ پہلے اباجی اس کمرے میں سوتے تھے۔ پھر جب گلشن آئی تو انہوں نے نیچے کا ایک بیڈروم اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ غالباً امی کو یہ دکھانے کے لیے کہ وہ باقاعدہ شادی سے پہلے گلشن کے پاس نہیں جا رہے ہیں۔ آج کل یہ

کمرا دوسرے بہت سے کمروں کی طرح خالی پڑا ہوا تھا اور جہاں تک مجھے یاد تھا، اس کا دروازہ مقفل بھی نہیں تھا۔

فاصلہ کم ہوجانے کی وجہ سے اب وہ ہیولا مجھے قدرے واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ غالباً کسی گہرے رنگ کی جینز اور جیکٹ میں تھا۔ اپنی حرکات وسکنات سے وہ نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ جوتے اس نے یقیناً بہت ہی نرم اور ہلکے پہنے ہوئے تھے اور کچھ اس کی مشق بھی تھی کہ اس کے چلنے سے بالکل آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ذرا سی بھی آواز پیدا کیے بغیر دروازے کا ہینڈل گھمایا اور پھرتی سے کمرے میں داخل ہوگیا۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید گلشن نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی حسب مقدور کوشش کی ہے اور مجھے قتل کرانے کے لیے کسی کو بھیجا ہے لیکن پھر یہ خیال مجھے کچھ زیادہ قرین قیاس محسوس نہیں ہوا۔ گلشن حویلی کے ماحول کو اچھی طرح جان چکی تھی۔ اکا دکا آدمی کا یہاں کچھ کر کے خیریت سے واپس چلے جانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ دوسرے، جب گلشن اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، اس وقت میرا بیڈروم نیچے تھا۔ وہ کسی آدمی کو بھیجتی تو کم از کم بیڈروم کا محل وقوع سمجھا کر بھیجتی تاکہ وہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا نہ پھرے۔

میں نے ریوالور لینا بھی ضروری نہ سمجھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اس کمرے کی طرف لپکا۔ ننگے پاؤں اس کمرے تک پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس شخص نے اندر جانے کے بعد دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ جھری سے آنکھ لگا کر میں نے دیکھا، وہ اس شاندار ماسٹر بیڈ کے پاس غالباً کچھ مایوسی کے عالم کھڑا تھا جس پر کبھی اباجی سویا کرتے تھے۔ بیڈ پر بستر وغیرہ آج بھی اسی طرح لگا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب بھی وہ کسی کے زیر استعمال ہو۔ ہر روز جھاڑ پونچھ بھی ہوتی تھی۔

دراندازنوجوان نے نائٹ بلب آن کرلیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ کم روشنی میں بھی اس کا پھل جھلملا رہا تھا۔ چند لمحے وہ نوجوان اسی طرح مایوسی کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر یکدم جیسے اس پر جنون سا طاری ہوا اور وہ خالی بستر پر بے تحاشا خنجر سے وار کرنے لگا۔ اس کے حلق سے غضب ناک سی غراہٹیں خارج ہو رہی تھیں، جیسے کسی زخمی درندے کو اپنی درندگی کی تسکین کا موقع نہ ملا ہو۔

جب وہ اپنے اس مجنونانہ عمل میں الجھا ہوا تھا تو میں پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر سوئچ بورڈ کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا اور نوجوان کو پتا بھی نہ چلا۔ اس نے خنجر سے اسپرنگ والا گدا ادھیڑ کر رکھ دیا اور تب مجھے اس کی گھٹی گھٹی سی آواز میں کچھ بے ربط سے الفاظ بھی سنائی دیے۔

"آج تو بچ گیا شاہ زیب ملک......! لیکن تیری موت...... تیری موت میرے ہی ہاتھ سے لکھی ہے...... میری زندگی کا واحد مقصد تجھے جہنم رسید کرنا ہے۔"

تب مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ وہ گلشن کا بھیجا ہوا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو اباجی کا نام لے رہا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے لیکن نوجوان کو شاید اس بات کا علم نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی قصہ معلوم ہوتا تھا۔

گدے کے چیتھڑے اڑانے کے بعد شاید اسے کچھ قرار سا ملا۔ میرے خیال میں وہ اب تھک چکا تھا۔ تب اچانک میں نے لائٹ آن کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں تلاش ہے تمہیں شاہ زیب ملک کی؟"

سوال کا جواب تو ظاہر ہے مجھے فوری طور پر ملنے کی امید نہیں تھی لیکن جتنی پھرتی سے وہ نوجوان پلٹا، مجھے اس کی بھی توقع نہیں تھی۔ اس کی تیزی میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ اس نے یقیناً صرف میری آواز کو ہدف بناتے ہوئے خنجر میری طرف پھینکا تھا۔ اس نے یہ دیکھنے میں بھی ایک آدھ سیکنڈ ضائع نہیں کیا تھا کہ بولنے والا کون تھا اور کہاں کھڑا تھا۔

اس کے باوجود اس کا اندازہ اتنا درست تھا کہ اگر مجھے ایک طرف ہٹنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو خنجر یقیناً میرے سینے میں پیوست ہوگیا ہوتا۔ خنجر پھینکنے والے میں نے چند ایک اور بھی دیکھے تھے لیکن اس نوجوان کو اس کام میں یقیناً کمال حاصل تھا۔ خنجر دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوگیا۔

کمرے میں روشنی ہوچکی تھی اور اب ہم ایک دوسرے کو صاف دیکھ سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، اس نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چپٹا سا پستول بھی نکال لیا۔

"ہلنا مت......" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں تنبیہ کی۔ اس کے لہجے میں سفاکی تھی مگر ساتھ ہی مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس ہاتھ سے اس نے پستول تھاما ہوا تھا اس میں معمولی سا ارتعاش تھا۔ وہ کتنا ہی دلیر سہی لیکن بہرحال وہ نروس تھا۔ جس صورتِ حال سے اس کا واسطہ پڑا تھا، وہ اس کی توقع لے کر نہیں آیا تھا۔ میں نے اس ایک ساکت لمحے میں اس کا تفصیلی جائزہ بھی لے لیا۔

اس کی رنگت میں ایک انوکھی سی ملاحت تھی اور موٹی موٹی سی وحشی آنکھیں بے پناہ کشش رکھتی تھیں۔ بھورے بال روشنی میں چمک رہے تھے اور بھرے بھرے ہونٹ اس وقت اعصابی تناؤ کی وجہ سے عجیب انداز میں بھنچے ہوئے

تھے۔ وہ خوبصورت جسم کا مالک معلوم ہوتا تھا مگر اس کی ساخت میں مردانگی کی کچھ کمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ابھی اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن عمر کی مناسبت سے دیکھا جاتا تو اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ اس کے چہرے پر نسوانی ملائمت اور مردانہ کرختگی کا کچھ عجیب سا امتزاج تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جہاں کہیں نسوانی کشش کی حدود ختم ہوتی ہیں اور مردانہ کرختگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ اتصال سے اس کی شخصیت نے جنم لیا ہے۔ نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

"کون ہو تم؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔" میں نے کافی حد تک پرسکون لہجے میں کہا۔

لیکن وہ گویا میری بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔ "تمہاری صورت میں شاہ زیب ملک کی بڑی جھلک ہے...... لگتا ہے اسی کے بیٹے ہو۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا ہوگیا تھا۔ "تم شاید شہریار ملک ہو۔"

اس کا مطلب تھا کہ وہ اباجی کو صورت سے پہچانتا بھی تھا۔ وہ خود کلامی کے سے انداز ہی میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے...... میں تمہیں بھی ہلاک کر کے کافی خوشی محسوس کروں گا...... آخر تم بھی اسی سانپ کے سنپولیے ہو۔"

پھر وہ پستول سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر ہٹ جاؤ...... اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوجاؤ۔ میں تمہیں خنجر سے ہلاک کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی آواز پیدا نہ ہو...... لیکن اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں نتائج کی پروا کیے بغیر یہ پستول تم پر خالی کردوں گا۔"

میں خاموش رہا اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دوسری دیوار کی طرف کھسک گیا۔ اس کی باتوں اور حرکات وسکنات سے بہرحال مجھے اس کے اناڑی پن کا اندازہ ہوگیا تھا۔ شاید وہ کسی خوشحال گھرانے کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ سرکشی اور آوارگی کی راہ پر چل نکلا تھا۔

مجھے بہ دستور پستول کی زد پر لیے وہ ترچھے رخ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ چوکھٹ میں پیوست خنجر نکالنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ان کاموں میں ماہر اور مشاق ہوتا تو کبھی پہلے ہی اس بات کا اعلان نہ کرتا کہ اسی خنجر سے وہ میرا کام تمام کرے گا۔ جب وہ چوکھٹ تک پہنچا تو لامحالا مجھ پر نظر رکھنے کی کوشش میں اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

اب تک میں دل ہی دل میں بہت پچھتا رہا تھا کہ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر میں کیوں ریوالور کے بغیر اس کمرے میں آن پہنچا لیکن اب میرا پچھتاوا دور ہوگیا۔ اس نے نادانستگی میں مجھے ایک موقع فراہم کردیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوچکا تھا۔ میں نے ایک پرانا طریقہ استعمال کیا اور اس کے عقب میں دروازے کی طرف دیکھ کر یوں چونکا جیسے دروازے پر کوئی نمودار ہوا ہو۔ پھر میں بدحواسی کی اداکاری کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر چلایا۔

"نہیں...... مارنا مت......!"

طریقہ پرانا تھا مگر کام کر گیا۔ نوجوان دھوکے میں آگیا وہ پستول کا رخ دروازے کی طرف کرتے ہوئے مشینی انداز میں گھوم گیا۔ میرے لیے اتنا موقع ہی کافی تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کہاں گرا لیکن وہ پہلے کی طرح پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلٹا اور اس نے میری گردن پر جوڈو کا وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں جھکائی دینے میں کامیاب ہوگیا اور ساتھ ہی اس کی کلائی میرے ہاتھ میں آگئی۔

میں نے اسے جھٹکا دیتے ہوئے ایک داؤ پر گرانے کی کوشش کی مگر وہ گرنے سے بچ گیا۔ وہ زیادہ طاقتور نہیں تھا لیکن داؤ پیچ کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ جوڈو کراٹے سے شاید وہ واجبی سا واقف تھا۔ ہم گتھم گتھا ہوگئے۔ آخر میں نے اس طرح اسے قابو کرلیا کہ اس کے دونوں بازو اس کی پشت پر اور میری گرفت میں تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ اگر وہ مزید زور آزمائی کی کوشش کرتا تو اس کے کندھے کا کوئی جوڑ الگ ہوسکتا تھا۔

میں اسے کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتا تھا ورنہ شاید اب تک وہ ڈھیر ہوچکا ہوتا۔ میں نے اسے تباہ شدہ بیڈ پر دھکیل دیا اور لپک کر قریب ہی فرش پر پڑا پستول اٹھا لیا جو مجھے اسی لمحے دکھائی دیا تھا۔ وہ اوندھے منہ ادھڑے ہوئے گدے کے اسپرنگوں پر گرا تھا۔ وہ گویا تڑپ کر سیدھا ہوا اور شاید ایک بار پھر مجھ پر جھپٹنا چاہتا تھا لیکن میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر شکست خوردہ سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ اب یقیناً تھک چکا تھا۔ اب تک کے مرحلوں میں اس نے نہ جانے کتنی مشقت اٹھائی تھی۔

میں یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری قوت گویائی سلب ہوچکی ہے۔ کیونکہ اس دوران مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوچکا تھا کہ وہ نوجوان درحقیقت لڑکا نہیں، لڑکی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "اب تم مجھے بتاؤ گی کہ تم کون ہو؟"

"بتاؤ گی ......؟ کیا مطلب ......؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تم مجھے لڑکیوں کی طرح کیوں مخاطب کر رہے ہو؟ میں کوئی لڑکی تو نہیں ......"

اس نے اپنے لہجے سے برہمی کا تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک انجانا سا خوف جھلک آیا تھا، جیسے اس کے لڑکی ہونے کا راز فاش ہو جانا اس کے لیے کسی بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتا ہو۔ اس دوران میں اس نے غیر ارادی انداز میں چمڑے کی اپنی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ کو بھی ٹٹولا مگر اس کی زپ بہ دستور بند تھی جس سے اسے کچھ ڈھارس ہوئی۔

"جب تم لڑکی ہو تو لڑکی کہلانے سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہو؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

اس نے محسوس کر لیا کہ اب تردید کا کوئی فائدہ نہیں۔ یکدم اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ معلوم نہیں اس کی تمتماہٹ کی وجہ غصہ تھا یا کوئی اور جذبہ۔ وہ گویا ہوا میں کسی ان دیکھی اور غیر مرئی چیز کو ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولی۔ "نہیں کہلانا چاہتی میں لڑکی ...... میرا بس چلے تو دنیا کی ساری لڑکیوں کو لڑکا بننے کی ترغیب دینے کے لیے تحریک چلاؤں ...... نفرت ہے مجھے لڑکی کہلانے سے ......" اس کے لہجے میں کوئی کہانی بول رہی تھی۔

"کیوں؟" میں نے پلک جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"دلچسپی ہو گئی ہے تمہاری ذات سے۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔ یہ ایک سیدھا اور سچا جواب تھا۔

"اپنے پاس رکھو اپنی دلچسپی۔" وہ حقارت سے بولی۔ "اور یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں تمہیں ضرور قتل کروں گی۔ موت کے خوف سے میں منافقت سے کام نہیں لوں گی۔"

"لیکن کیوں قتل کرو گی؟ میرا جرم کیا ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"تمہارا یہی جرم کیا کم ہے کہ تم شاہ زیب ملک کے بیٹے ہو۔" وہ نفرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور شاہ زیب ملک کا جرم کیا ہے؟" میں نے بہ دستور ملائمت سے پوچھا۔

"اس کے بیٹے ہو کر تم یہ بات مجھ سے پوچھ رہے ہو؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "اس کے جرائم کی فہرست تو اتنی لمبی ہے کہ حشر کے دن شاید فرشتے بھی اسے پڑھتے پڑھتے تھک جائیں۔"

"میں صرف اس جرم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، جس کا تعلق تمہاری ذات سے ہے۔" میں نے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پستول کا رخ میں نے اب بھی اس کی طرف ہی رکھا تھا۔

ایک لمحے اس نے کچھ سوچا پھر سر ہلا کر بولی۔ "ہاں ...... تمہیں تو معلوم نہیں ہوگا ...... واقعہ کافی پرانا ہے اور بہت معمولی گھرانے سے اس کا تعلق تھا ...... تمہاری رعایا میں سے ایک گھرانا ......" اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

میں خاموش رہا۔ میرے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ تیز تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ "اسی گاؤں کے پرلے سرے پر ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں رہتے تھے وہ لوگ۔ بہت مختصر سا کنبہ تھا۔ میاں بیوی اور پانچ چھ سال کی ایک بچی ...... مرد ذرا بڑی عمر کا تھا اور عام سی شکل صورت کا مالک تھا جبکہ بیوی نوجوان بھی تھی اور بے حد حسین بھی ...... اس کا حسین ہونا ہی اس کا جرم بن گیا ...... حالانکہ وہ دیگر بہت سی عورتوں کی طرح کھیتوں میں کام بھی نہیں کرتی تھی اور زیادہ تر گھر میں رہتی تھی لیکن نہ جانے کس طرح شاہ زیب ملک کی اس پر نظر پڑ گئی ...... اور پھر یہ نظر پڑنا ہی غضب ہو گیا ......"

اس نے قدرے تکلیف زدہ سے انداز میں سینے میں سانس کھینچی اور سلسلۂ کلام جوڑا۔ "وہ بھوکے درندے کی طرح اس کے پیچھے پڑ گیا۔ پہلے تو اسے پیغامات بھجوا کر ...... بڑے بڑے لالچ دے کر ڈیرے پر بلانے کی کوشش کی گئی۔ جب اس نے سختی سے مزاحمت کی تو اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی مگر کسی طرح وہ بچ گئی۔ ایک بار شوہر پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا لیکن اس کی زندگی کچھ زیادہ لکھی تھی۔ وہ بھی بچ گیا اور خوفزدہ ہو کر اپنی بیوی اور بچی کو لے کر اس علاقے سے نکل جانے کا پروگرام بنانے لگا ...... مگر اس سے پہلے کہ وہ اس ارادے پر عمل کرتا، ایک رات اچانک اس کے مکان میں خوفناک طریقے سے آگ لگ گئی۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ بولنے کے لیے گویا اسے بار بار حوصلہ مجتمع کرنا پڑ رہا تھا۔ اس بار وہ بولی تو اس کی آواز بہت مدھم تھی۔ "وہ شخص بہ مشکل اپنی بچی کو بچا کر نکل پایا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ایک وقت میں وہ کسی ایک کو ہی لے کر بھڑکتے شعلوں کے درمیان سے نکل سکتا تھا۔ اس نے پہلے بچی کو بچانے کی کوشش کی۔ بچی کی ماں بھی

یہی چاہتی تھی کہ پہلے بچی کی جان بچائی جائے۔"

اس کی آواز بالکل بیٹھ سی گئی۔ "جب وہ اپنی نیم سوختہ اور نیم جاں بیوی کو نکالنے کے لیے پلٹ کر آیا تو اندھیرے سے گولیاں برسنے لگیں۔ وہ نہ تو شعلوں میں گھس سکا اور نہ ہی وہ بدنصیب عورت باہر آ سکی۔ بچی نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو آگ میں جلتے دیکھا اور اس کی آخری کربناک چیخیں بھی سنیں۔ اس رات کا وہ منظر اس بچی کے ذہن میں آج بھی اسی طرح تازہ ہے، جیسے یہ کل کی بات ہو اور وہ چیخیں آج بھی اس کے کانوں میں گونجتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ راتوں کو سوتے میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی، جیسے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اور وہ بچی یقیناً تم ہو۔" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ میرا دل واقعی بوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس قسم کے واقعات کی بازگشت سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر کسی نہ کسی واقعے کی کوئی نہ کوئی پرچھائیں سامنے آن کھڑی ہوتی تھی اور مجھے میری ہی نظروں سے گرا کر شرمسار کر دیتی تھی۔

"ہاں ...... وہ بچی میں ہی ہوں۔" اس نے تسلیم کیا۔

طویل و عریض کمرے میں چند لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔

ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ماضی کے سوختہ کھنڈر سلگ رہے تھے اور میری آنکھیں ناکردہ گناہوں پر ندامت کے سبب بوجھل ہو رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا بولوں۔ میرا کچھ بولنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور نہ ہی کچھ مزید جاننے کا تجسس تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لڑکی کی کہانی میں میرے لیے اذیت کے سامان کے سوا کچھ نہیں ہوگا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"پھر کیا ہوا ......؟"

وہ جیسے سکوت کے کنویں میں بہ مشکل اپنی آواز تلاش کرنے کے بعد بولی۔ "بابا جی مجھے سینے سے لگائے اس نامہرباں رات کی تاریکی میں کسی نہ کسی طرح لاہور کی طرف نکل گئے۔ رفتہ رفتہ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی میسر آ گیا اور کسی نہ کسی طرح گزر بسر بھی ہونے لگی لیکن اس بچی کے ننھے سے ذہن پر بہت بھیانک تصویریں نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔"

بچپن میں ذہن پر نقش ہونے والی تصویریں انسان کو زندگی بھر کتنی اذیت دیتی ہیں، اس کا اندازہ کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ذہن زندگی بھر بے سکون اور منتشر رہتے ہیں جو کم عمری سے ہی سوالوں کے جنگل میں بھٹکنا شروع کر دیتے ہیں۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اتنی کم عمری میں ہی اس بچی کو یہ ادراک ہو گیا تھا کہ عورت ...... اور خصوصاً غریب عورت، اس معاشرے کا ایک نہایت ہی بےکار حصہ ہے۔ تھوڑی سی بھی طاقت رکھنے والے جس شخص کا جب بھی دل چاہتا ہے، اسے کچلتا ہوا، روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مجھے اپنے لڑکی ہونے سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ مرد میری نظر میں بہرحال فائدے میں تھا۔ مرد کتنا ہی کمزور ہو، اس پر اتنا ظلم نہیں کیا جا سکتا جتنا عورت پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں بچپن ہی سے لڑکوں میں اٹھتی بیٹھتی آئی ہوں، انہی جیسے کپڑے پہنتی ہوں۔ مار دھاڑ میں نے بڑی محنت سے سیکھی ہے۔ یہ سب کچھ میں نے شعوری طور پر کیا ہے۔"

"اور اب شاید تم باپ بیٹی کے مالی حالات بھی اچھے ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کی جینز، جیکٹ اور جوتے بیش قیمت تھے۔ پستول بھی معمولی نہیں تھا۔ یہ چیزیں غریبانہ رہن سہن کی نشاندہی نہیں کرتی تھیں۔

"مالی حالت تو ہماری اب بھی وہی ہے لیکن مجھے اب اس کی کوئی خاص فکر نہیں رہی۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ میں پستول، خنجر یا پھر زور بازو سے حاصل کر لیتی ہوں۔" وہ بےپروائی سے بولی۔

میں یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پیشانی پر جھکے ہوئے بال ایک ادائے خاص سے گردن جھٹک کر پیچھے کیے۔ اس کے اس انداز سے میرے دل نے جیسے ہچکولا سا لیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "ویسے بابا نے میرے طور طریقوں سے خوفزدہ ہو کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی گویا مجھ سے الگ رہتے ہیں۔ مجھ سے کوئی پیسا نہیں لیتے۔ میری کوئی چیز استعمال نہیں کرتے۔ وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ کبھی میری کسی حرکت کی ذمے داری قبول نہیں کریں گے اور نہ کبھی کسی معاملے میں میرا دفاع کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک میں سیدھی سادی لڑکی نہیں بن جاتی، وہ حقیقی معنوں میں مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ یوں کہنا چاہیے کہ فی الحال وہ گویا مجھے بیٹی ہی تسلیم نہیں کرتے۔ انہیں سیدھی سادی بیٹی کی ضرورت ہے۔"

اس نے ایک بار پھر ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو ٹھوکر ماری۔ "سیدھی سادی لڑکی ...... اونہہ ......! ایک ایسی لڑکی، جس کا ہاتھ پکڑ کر وہ بھیڑ بکری کی طرح کسی کے حوالے کر سکیں ...... یا

جسے جب بھی کوئی بدمعاش چاہے اٹھا کر لے جائے...... اور اگر وہ مزاحمت کرے تو اسے اس کے اپنے ہی گھر کی آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ لعنت ہو ایسی لڑکی پر......"

اس کے لہجے میں ایک بار پھر غیظ و غضب جھلک آیا تھا، جس پر قابو پانے میں اسے چند سیکنڈ لگے۔ پھر وہ ذرا سی دھیمی آواز میں بولی۔ "چنانچہ...... اب جہاں ہم رہتے ہیں وہاں کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ میں لڑکی ہوں۔ لڑکے کی حیثیت سے بھی کم ہی لوگ جانتے ہیں...... اور جو جانتے ہیں وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ کوئی مجھے ذرا سی بھی اکڑ دکھائے تو میں اس کے دانت توڑ دیتی ہوں۔" اب اس کی آواز میں ذرا سی تبدیلی آئی تھی اور نسوانی آواز محسوس ہونے لگی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مبالغہ آرائی نہیں کر رہی تھی۔ میں اس سے زور آزمائی کر چکا تھا اور مجھے بہت سی حقیقتوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے شعوری طور پر تو خود کو جو کچھ بنانے کی کوشش کی تھی، سو کی تھی لیکن اس میں یقیناً کچھ خداداد صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔

وہ اب کافی حد تک پرسکون لہجے میں بولی۔ "لیکن میں حتی الامکان غیر نمایاں رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس لیے میں خوامخواہ کے جھگڑے مول نہیں لیتی، کوئی ہلا گلا نہیں کرتی۔"

"اپنے حق میں اچھا ہی کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

وہ کٹی پھٹی میٹریس پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہیں سب باتیں یوں اطمینان سے بتا دی ہیں جیسے میں تمہاری مہمان ہوں اور بہ طور خاص تم سے ملنے، تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کرنے آئی ہوں۔ اب تم بھی مجھے بتا دو کہ شاہ زیب ملک آج اپنی خواب گاہ میں موجود کیوں نہیں ہے...... اور دوسری بات یہ بھی بتا دو کہ اب تم مجھ سے کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "تم نے یہاں آنے سے پہلے یقیناً حویلی کے بارے میں معلومات تو حاصل کی ہوں گی؟ کیونکہ میں نے تمہیں ٹیرس پر کودنے کے بعد سیدھے اس کمرے کی طرف آتے دیکھا تھا جو کبھی اباجی کا بیڈروم ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں...... میں نے معلومات حاصل کی تھیں...... حویلی کے ایک سابق ملازم سے لیکن میری معلومات کچھ پرانی ہیں، چھ ماہ پہلے کی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"میرا خیال ہے تم اخبار نہیں پڑھتیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے آج کل کے اخبارات سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

اس نے ترخ کر جواب دیا۔

"تب میں تمہیں کچھ نئی باتیں بتاتا ہوں جن سے تمہاری معلومات اپ ٹو ڈیٹ ہو جائیں گی۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ان چھ مہینوں میں یہاں بڑے انقلابات آ چکے ہیں۔ شاہ زیب ملک اب اس دنیا میں نہیں ہیں اس لیے وہ تمہیں اس کمرے میں نہیں ملے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے چونکی مگر پھر اپنی حیرت کو چھپا گئی۔ کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کرنا وہ گویا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ البتہ غصے اور غیظ و غضب سے ضرور مغلوب ہوتی تھی۔ شاید یہی اس کا واحد ردعمل تھا۔

میں نے اس کے سپاٹ چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں خوشی نہیں ہوئی اس خبر سے؟"

"نہیں۔" وہ بلا تامل بولی۔ "خوشی تب ہوتی جب میں اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرتی، وہ میرے ہاتھوں مرتا۔"

"اپنے باپ سے محبت مجھے بھی نہیں تھی لیکن اب ان کی موت کے بعد ان کے بارے میں اس قدر نفرت کا اظہار مجھے اچھا نہیں لگا۔ مرنے والوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں تو معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے بے لچک لہجے میں کہا۔ "میں نفرت کا زہر پی پی کر پلی بڑھی ہوں۔ یہ زہر میرے لہو میں دوڑ رہا ہے۔ خیر...... یہ بحث چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ مجھے پولیس کے حوالے کرو گے؟ اپنے کسی ذاتی قید خانے میں ڈالو گے یا اس سے بھی کوئی برا سلوک کرو گے؟"

"پولیس سے رابطہ قائم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں...... نجی قید خانہ میرا کوئی ہے نہیں۔ تم جانے کے لیے بالکل آزاد ہو۔ جس وقت چاہو اٹھ کر جا سکتی ہو۔" میں نے پستول گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ مجھے پستول ہاتھ سے رکھتے دیکھ کر اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تم میری چند گزارشات ضرور سن جاؤ۔ شاید تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو میں زہر کم ہو سکے۔"

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اکثر اوقات والدین کی غلطیوں، خامیوں یا گناہوں کا خمیازہ ان کی اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مجھے جتنے گناہوں کا بوجھ اباجی سے ورثے

میں ملا ہے، میں اس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت خود میں نہیں پاتا...... اور شاید اتنا نیک بننے کے قابل بھی نہیں ہوں کہ گناہ وثواب کے پلڑے برابر ہوسکیں۔ اس لیے میں یہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

اس نے بھویں اچکائیں۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی جھلک در آئی تھی۔ میں نے وضاحت کی۔ ''میرا قیام یہاں بہت تھوڑے دنوں کے لیے ہے۔ یہ حویلی، یہ زمینیں سب کچھ میں نے گوندلوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ ان سے میں نے دست بستہ یہی درخواست کی تھی کہ ہوسکے تو اپنی ذمے داری اور فرض سمجھ کر اس علاقے میں انصاف قائم کرنا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کمزور کے ساتھ ظلم نہ ہونے پائے ورنہ تمہارا انجام بھی میرے اباجی سے مختلف نہ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری اس التجا کا خیال رکھیں گے، کیونکہ وہ لوگ اباجی سے بہت مختلف ہیں۔''

پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اباجی کس طرح مارے گئے۔ میں کس قسم کے خیالات اور نظریات کا آدمی تھا، کیا سوچتا تھا، کیا چاہتا تھا اور یہ کہ اب اس علاقے کے حالات کتنے مختلف تھے۔

وہ سب کچھ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ملائمت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے آخر میں کہا۔ ''تمہارا دل مانے تو میری مہمان بن کر رہو۔ گاؤں میں گھومو پھرو۔ حالات کا جائزہ لو اور دیکھو کہ لوگ کتنے خوش ہیں۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اسے میری ذات سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو تم آکر میرا گریبان پکڑ لینا۔''

وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''زیادہ نہیں، اس رات کے جو دو چار گھنٹے باقی رہ گئے ہیں وہ یہیں گزارو اور صبح مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ میں تمہیں تمہاری ماں واپس نہیں دلا سکتا۔ جتنے برس تم نے اذیت اور نفرت کی آگ میں جلتے ہوئے گزارے، ان کی تلافی نہیں کرسکتا...... تمہارے ذہن پر جو بھیانک تصویریں نقش ہو کر رہ گئی ہیں، کھرچ نہیں سکتا...... لیکن صرف اپنے اخلاص اور ندامت کے اظہار کے لیے دنیاوی سطح پر تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں۔ کوئی مکان، زمین کا کوئی ٹکڑا جو تمہیں پسند ہو...... وہ تمہیں اور تمہارے بابا کو دے سکتا ہوں...... یا کہیں اور کسی بھی طرح کی مدد جو تمہارے لیے قابل قبول ہو، وہ میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اس سلسلے میں ٹھنڈے دل سے سوچو...... غیر جذباتی ہو کر غور......''

''غیر جذباتی ہو کر سوچنا میرے بس کی بات نہیں۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے گویا وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے...... تم جذباتی رہو۔ جذباتی ہونا کوئی معیوب بات نہیں...... لیکن جذبات کبھی کبھی انسان کو منفی راستوں کی طرف لے جاتے ہیں، جن کی منزل صرف تباہی ہوتی ہے۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ تم بالکل غیر جذباتی ہو جاؤ۔ جذبات کے بغیر انسان، انسان نہیں ہوتا...... لیکن اگر کوئی دوسرا اچھے جذبات کا اظہار کرے تو ان پر بھی توجہ دینی چاہیے۔''

پھر میں نے اس کا پستول اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ''اپنا یہ پستول اور خنجر بھی اپنے پاس رکھو۔ بیڈ کو تم نے برباد کر دیا ہے۔ اب اس کاؤچ پر سو جاؤ اور سمجھو کہ تم اپنے مقروض کے گھر میں ہو۔ میں تمہارے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر کے یا اس کا بولٹ چڑھا کر نہیں جاؤں گا۔ برابر والا کمرا چھوڑ کر اس سے اگلا کمرا میرا ہے۔ اس کا دروازہ بھی غیر مقفل ہوگا۔''

''یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' وہ بے رخی سے بولی۔

''میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ تم آرام سے لیٹ کر بہت اچھی طرح غور کرو۔ اگر تمہارا دل یہ کہے کہ مجھے ہلاک کر کے تمہارے زخم کچھ مندمل ہوسکتے ہیں...... تمہیں کچھ فائدہ ہوسکتا ہے تو بے دھڑک آنا اور اپنا پستول میرے سینے پر خالی کر کے یا اپنے خنجر سے میری شہ رگ کو کاٹ کر یہاں سے فرار ہو جانا۔ اول تو میں اس وقت سو رہا ہوں گا اور اگر بیدار بھی ہوا تو کوئی مزاحمت نہیں کروں گا...... یہ میرا وعدہ ہے...... اور اگر تم مجھے بے گناہ محسوس کرو تو صبح اٹھ کر مجھے کوئی حکم دینا۔ میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلی بار اس کے ہونٹوں پر بہت مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے ماہتاب حرکت میں آیا ہو مگر بادلوں نے اس کا راستہ روک لیا ہو۔ گہرے بادلوں کی اوٹ سے اس کی تھوڑی سی کرنیں زمین تک پہنچ پائی ہوں۔

''تم بہت عجیب آدمی ہو۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''جبکہ میرے خیال میں تم بہت عجیب لڑکی ہو۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر آگیا۔ اس نے عقب سے مجھ پر فائر نہیں کیا، میری پیٹھ پر گولی نہیں ماری۔ یہ میری پہلی جیت تھی۔

اپنے کمرے میں آکر میں حسب وعدہ دروازہ غیر مقفل چھوڑ کر لیٹ گیا۔ میں جوا ہی کھیل رہا تھا لیکن یہ کچھ اس قسم کا جوا تھا جس میں بازی جیتنے کا مجھے سو فیصد یقین تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سوتے میں مجھے ہلاک کرنے کے ارادے سے نہیں آئے گی۔

بہت دیر تک میں ساکت لیٹا جاگتی آنکھوں سے ان گنت خواب دیکھتا رہا۔ وہ لوگ جو دوسروں کو غیر جذباتی بن کر سوچنے کے مشورے دیتے ہیں، عموماً اندر سے خود بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ میں خود بیشتر فیصلے بہ ظاہر بڑے پرسکون انداز میں کرتا تھا لیکن درحقیقت وہ بے حد جذباتی فیصلے ہوتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اب تک کوئی فیصلہ میرے لیے جان لیوا یا نقصان دہ ثابت نہیں ہوا تھا۔

اور یہ جو لڑکی تھی، جس سے میں اتنے پرسکون انداز میں سب کچھ کہہ سن کر آگیا تھا، اس نے درحقیقت میرے محسوسات کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ میرے اندر کا منظر الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

میں بچپن سے تنہائیوں کے جس جنگل میں بھٹک رہا تھا، آج ان سناٹوں میں کسی کے قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی۔ جاگتی آنکھوں سے خواب تو میں ہمیشہ ہی دیکھتا آیا تھا لیکن آج ان خوابوں میں گویا رنگ بھرنے لگے تھے۔ آج سے پہلے خواہشوں کی دنیا انوکھے تخیلاتی ہیولوں سے سجی رہتی تھی لیکن آج یہ ہیولے گویا انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگے تھے۔ انسانی نفسیات اتنی گنجلک چیز ہے کہ بعض اوقات لفظوں کی گرفت میں بالکل نہیں آتی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، ایک پرچھائیں کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ پرچھائیں میرے خوابوں کی رہ گزر پر برسوں سے میری ہم سفر تھی لیکن جب بھی میں اسے چھونے کی کوشش کرتا، اپنے شعور کی گرفت میں لانے اور اس کی کوئی شناخت متعین کرنے کی کوشش کرتا، وہ پلٹ کر اپنے اچھوتے خدوخال کی ایک جھلک دکھا کر کسی انجانے دیس کی طرف چل دیتی تھی...... میرے شعور کو جل دے جاتی تھی۔ مگر آج شب کے اندھیروں کی کوکھ سے نکل کر یہ پرچھائیں بالکل روشن اور واضح ہوئی تھی۔ ایک زندہ سلامت لڑکی کا روپ دھار کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ بلاشبہ یہی وہ لڑکی تھی جس کے تعاقب میں میرا تخیل برسوں سے بھٹک رہا تھا۔ عالم یہ تھا کہ میں اب بھی اس کا نام تک نہیں جانتا تھا مگر اس کا وجود خوشبو کی طرح اس وقت بھی میرے آس پاس مہک رہا تھا۔ جلترنگ کی طرح کانوں میں گونج رہا تھا اور گھٹا کی طرح حواس پر چھا گیا تھا۔

میں تصور ہی تصور میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔

''میں صدیوں سے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا لیکن تم ملی ہو تو اتنے عجیب انداز میں...... ایسے غیر دلکش حالات میں...... اور پھر آج کا یہ ایٹمی دور، اس پر مستزاد یہ کہ تم بھی زمانے سے کچھ تیز دوڑ رہی ہو، اب ان حالات میں کس طرح میں یہ فرسودہ جملہ دہراؤں کہ میں تمہاری محبت کا اسیر ہو گیا ہوں۔ میں کس دلیل کے ساتھ تمہیں سمجھاؤں کہ وہ تم ہی ہو جس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میں نے خوبانیوں اور سیبوں سے لدے درختوں کے درمیان میلوں لمبے سنسان رستوں پر سیر کی ہے۔''

پھر میں نے کروٹ بدل کر تصور ہی تصور میں سرگوشی کی۔ ''وہ تم ہی ہو جس کا ملیح چہرہ میں نے نہر کے خنک پانی سے بارہا بھگویا ہے...... وہ تم ہی ہو جس کے روٹھے روٹھے لبوں پر میں نے بے شمار لطیفوں سے مسکراہٹیں سجائی ہیں۔ وہ تم ہی ہو جس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو میں نے بارہا اپنی انگلیوں سے پونچھے ہیں۔ وہ تم ہی ہو جو زندگی کے نہ جانے کس کس موڑ پر مجھے مل کر بچھڑتی رہی ہو اور میں موت وحیات کی بھول بھلیوں سے گزرتا ہوا صدیوں بعد پھر تم تک آپہنچا ہوں...... مگر یہ سب باتیں میں تمہیں کیسے بتاؤں؟ بہت افسانوی سا لگتا ہے یہ سب کچھ...... اور پھر تم یقین بھی کب کرو گی؟ اتنی بدگمان ہو تم مجھ سے...... اور شاید ساری دنیا سے...... لیکن...... اب تم مل گئی ہو تو ساری بدگمانیاں دور ہو جائیں گی۔ محبتوں کی زبان تمہاری سمجھ میں آجائے گی، جنہیں خاموشی سے سینے میں چھپائے میں اب تک بھٹک رہا تھا۔''

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔ اتنی آسودگی کی نیند میں شاید زندگی میں کبھی نہیں سویا تھا۔ جانے کیوں میں اتنا خوش تھا۔ شاید وہ عجیب لڑکی اس لیے میرا آئیڈیل تھی کہ اس کی شخصیت، اس کی حرکات وسکنات اور اس کی ہر بات میں ایک جارحیت تھی۔ وہ بپھری ہوئی ایک پہاڑی ندی تھی اور میں ایک پرسکون جھیل...... شخصیتوں اور مزاجوں کا یہ تضاد ہی شاید میرے حواسوں پر چھا گیا تھا۔ اس میں جتنی تیزی وتندی تھی، مجھ میں اتنا ہی ٹھہراؤ اور دھیما پن تھا...... اور شاید مقناطیس کے ایک مخالف سرے کو دوسرا مخالف سرا اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

میں صبح اٹھا تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ میں ایک نئی مسرت دل میں لیے اس کمرے کی طرف چلا۔ رات اتنے سکون سے گزری تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے میری باتوں پر غور کیا تھا، میری ندامت کو اہمیت دی تھی۔

لیکن جب میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو میرا دل

ڈوب گیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر، کس راستے سے وہ رخصت ہوچکی تھی۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ اسے شاید معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیسی معصوم خوشی کی کلی کو پیروں تلے مسل کر جارہی ہے۔ میرا تجربہ ناکام ہوگیا تھا۔ میں نے کسی بندھن کے بغیر اسے روکنا چاہا تھا۔ لیکن اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ میرے خاموش لبوں میں شاید کسی کے لیے اتنی کشش نہیں تھی...... یا پھر شاید جانے والی کو ان احساسات کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوسکا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میری روح پر وہی یخ بستہ سی اداسی چھا گئی۔

پھر ایک موہوم سی امید نے مجھے سہارا دیا۔ شاید وہ جانے والی پھر کبھی لوٹ کر آئے...... اور یہ ''شاید'' ہی اب میری زندگی کی واحد دلچسپی تھی۔ دن گھٹتے رہے اور راتیں رینگتی رہیں لیکن وہ نہیں آئی اور نہ ہی کہیں اس کا نام ونشان دکھائی دیا...... مگر میں اس کا انتظار کیے جارہا تھا۔ شاید اندر سے میں بہت افسانوی سا آدمی تھا۔ صرف ایک پرچھائیں، ایک خواب سی ملاقات، کسی ان کہی بات کی خاطر زندگی کے سنہرے دن رائگاں گزارے جارہا تھا...... اور نہ جانے کب تک یونہی اس کا انتظار کرنے کے لیے تیار تھا، جس نے آنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا...... اور جو ایک بار آئی بھی تو ایک واہمے کی طرح...... کسی ادھورے خواب کی طرح۔

آخر میری جائداد کی منتقلی اور فروخت کا عمل مکمل ہوگیا۔ روپیہ میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوگیا اور میں بادیدۂ نم اپنے آس پاس کے آبائی علاقے کو خیرباد کہہ کر لاہور آگیا جہاں میں گلبرگ میں ایک ڈیلر کے توسط سے ایک کوٹھی خرید چکا تھا اور وہ آراستہ بھی ہوچکی تھی۔

✈✈✈

لاہور منتقل ہوئے مجھے کئی ماہ ہوچکے تھے۔ دن اچھے ہی گزر رہے تھے۔ آدمی کے پاس کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کے لیے روپیہ ہو، فارغ البالی ہو تو حلقۂ احباب خودبخود وسیع ہوجاتا ہے۔ میرے احباب میں بھی ہر طرح کے، ہر عمر کے اور ہر ذوق کے لوگ شامل تھے۔ مشاعرے منعقد کرانے والے، شکار پر جانے والے، پینے پلانے کی محفلیں جمانے والے، زندگی کی تمام رنگینیوں میں دلچسپی لینے والے، خشک قسم کے مباحثوں میں حصہ لیتے وقت بھی سردھڑ کی بازی لگانے والے، مکمل طور پر میری طرح بےفکرے...... یا پھر دن بھر بزنس میں سرکھپا کر شام کو نشاط کی چند گھڑیوں کے متلاشی...... میں سب کے مشاغل میں شریک تھا۔

لیکن دل کا جو ایک گوشہ ویران تھا وہ اب بھی ویران چلا آرہا تھا۔ تشنگی اب بھی زندگی کی ہم سفر تھی۔ ایک بےعنوان انتظار اب بھی جاری تھا۔

ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اس روز میں ایک دوست کے ہاں گیا تھا۔ اس کے پورچ میں پہلے ہی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس لیے مجھے اپنی گاڑی گلی میں ہی چھوڑنا پڑی۔ گاڑی کے دروازے وغیرہ لاک کرنے کے معاملے میں، میں زیادہ محتاط نہیں تھا۔ ان دنوں عدم تحفظ کا احساس بھی اتنا عام نہیں تھا۔ میں اندر پہنچا تو وہاں تاش کی محفل جمی ہوئی تھی۔ میں زندگی کی ہر چیز میں کچھ نہ کچھ دلچسپی لیتا ہوں لیکن تاش سے عموماً میں جلد بور ہوجاتا ہوں۔ مجھے یہ کھیل کچھ زیادہ نہیں بھاتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر اور ایک آدھ بازی کھیل کر میں وہاں سے نکل آیا۔

رات کے تقریباً گیارہ کا عمل تھا۔ گلی میں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ مجھے اندیشہ یہی محسوس ہورہا تھا کہ آج کی شام تو بوریت ہی میں گزری ہے، اب باقی وقت بھی شاید بوریت میں گزرے گا۔ دو تین خاص دوست جن سے میری گاڑھی چھنتی تھی، انہوں نے شام ہی کو فون کرکے اطلاع دے دی تھی کہ وہ کچھ ضروری کاموں میں مصروف ہیں اس لیے آج میری طرف نہیں آسکیں گے۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے؟ اب تو کبھی کبھی فارغ البالی سے اکتا کر میں سوچنے لگتا تھا کہ مجھے بھی کوئی کاروبار کرلینا چاہیے یا چھوٹی موٹی انڈسٹری لگا لینی چاہیے۔ دو تین کاروباری دوست ہر قسم کی مدد اور رہنمائی کی پیشکش بھی کرچکے تھے لیکن ابھی میں ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

کسی فیصلے پر پہنچے بغیر میں گلبرگ کی ایک سنسان مگر کشادہ گلی سے سست رفتاری سے گزر رہا تھا کہ عقب سے کوئی ٹھوس اور ٹھنڈی سی چیز میری کنپٹی سے آلگی اور کسی نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''یہ پستول کی نال ہے...... گاڑی ایک طرف کرکے روک لو۔''

ایک لمحے کے لیے میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہوا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور پرسکون ہوگیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن نیم تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

گاڑی رکنے پر وہ بولا۔ ''چابیاں اگنیشن میں ہی چھوڑ

کر اتر جاؤ۔ اترنے سے پہلے اپنا پرس نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دو۔ پرس میں سے پیسوں کے علاوہ کوئی بھی چیز نکالنا چاہو تو نکال سکتے ہو، لیکن زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا...... ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' اس نے خود ہی ہاتھ اونچا کرکے روف لائٹ آن کردی تاہم زاویہ ایسا تھا کہ اب بھی اس کی شکل عقب نما آئینے میں نظر نہیں آرہی تھی۔

میں نے ایک لمحے تامل کیا تو وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''معمولی سے نقصان کے لیے جان داؤ پر لگانا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ گاڑی کل پرسوں کسی سڑک کے کنارے تمہیں کھڑی مل جائے گی۔ صرف رقم کا ہی نقصان ہوگا۔''

''کیا میں یہ بھی اطمینان رکھوں کہ میری گاڑی کسی واردات میں استعمال نہیں ہوگی؟'' میں نے ایک سیدھے سادے اور بزدل سے شہری کے انداز میں پوچھا۔

''زیادہ امکان تو یہی ہے...... لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔'' وہ کوئی بہت ہی زیادہ راست گو قسم کا لٹیرا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے پرس نکالا اور اسے کھولتے وقت ذرا جوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا، جو میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ لیکن میں خطرات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ نہایت تیزی سے گھومتے ہوئے میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اسے اونچا کردیا تاکہ اگر وہ فائر بھی کرے تو گولی چھت میں لگے۔ ساتھ ہی میں نے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کردیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔ پستول میرے ہاتھ میں آگیا...... لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اسے گھونسا کیوں رسید کیا۔

یہ تو وہی دشمن جاں تھی، جس کی میرے دل کو ایک مدت سے تلاش تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ پھر اس نے سر جھٹکتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بلاشبہ وہ بہت سخت جان تھی ورنہ وہ گھونسا کھا کر اسے ایک آدھ منٹ تک تو اٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس کی پی کیپ سر سے اتر کر ایک کونے میں جا گری۔ اس نے اسے اٹھا کر دوبارہ سر پر رکھا۔ ابھی تک اس نے صحیح طور پر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

''معاف کرنا دوست!'' میں نے حقیقتاً معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ تم ہو تو نہ صرف گاڑی تمہارے حوالے کردیتا بلکہ ڈرائیور کے فرائض انجام دیتے ہوئے جہاں تم کہتیں، وہاں چھوڑ آتا۔''

وہ کنپٹی سہلاتے ہوئے بولی۔ ''اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ تم ہو تو میں اتنی لمبی بات کرنے کے بجائے خاموشی سے تمہاری کھوپڑی میں گولی اتار دیتی۔''

''اتنی بےمروتی؟'' میں نے تاسف سے کہا۔

''مروت کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

میں نے اس کا پستول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لو اور اگلی سیٹ پر آجاؤ۔''

اس نے پستول جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اگلی سیٹ پر آگئی۔ حسب سابق وہ مردانہ لباس میں تھی اور پہلے سے کچھ سبک نظر آرہی تھی، تاہم لہجے کا کھردرا پن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اب حالانکہ وہ اپنی اصل آواز میں بول رہی تھی لیکن اب بھی اس کے لہجے میں ایک عجیب رسیلا بھاری پن تھا جو مجھے اور بھی دلکش محسوس ہورہا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جس ڈھب سے زندگی گزارنے کی عادی تھی، اس میں پختہ کار ہوتی جارہی تھی۔

''کیا تم میرا گھر دیکھنا پسند کروگی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم چاہو تو مجھے وہاں چھوڑ کر گاڑی لے جانا۔''

''نہیں...... اب تم مجھے میرے گھر ہی چھوڑ دو، یہاں سے تو مجھے کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔'' وہ قدرے پرسکون لہجے میں بولی۔ ''سارا پروگرام ہی چوپٹ ہوگیا۔''

''کہاں ہے تمہارا گھر؟'' میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ میری مایوسی کسی حد تک دور ہوگئی تھی۔ میں کم ازکم اس کا ٹھکانا تو دیکھ ہی سکتا تھا۔ رابطے کا امکان رہ سکتا تھا۔

''یہیں گلبرگ میں ہی۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ''اگلے چوراہے سے مین مارکیٹ کی طرف موڑ لینا۔''

سڑکیں اس وقت تقریباً ویران نظر آرہی تھیں۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں تم سے دوبارہ سامنا ہوگا۔'' ایک لمحے کے بوجھل سکوت کے بعد وہ بولی۔

''شاید یہ میری طلب اور جذبے کی صداقت کا کمال ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''میں تم سے ملنے کا بڑی شدت سے خواہش مند تھا۔''

''کیوں؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں تمہارے بارے میں

کیا محسوس کرتا ہوں تو شاید تم یقین نہ کرو۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر قدرے رکھائی سے بولی۔ ’’شہریار ملک! تمہارے ذہن میں میرا تاثر ایک آوارہ لڑکی کا ہوگا...... گھومنے پھرنے اور ظاہری انداز و اطوار کی حد تک شاید میں آوارہ ہوں بھی لیکن اگر تم یقین کر سکو تو میں سوچ یا کردار کے اعتبار سے آوارہ نہیں ہوں...... اور اگر تمہیں یقین نہ آئے تو مجھے اس کی پروا بھی نہیں...... یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری دولت مندی کو دیکھ کر پھسل جاؤں گی اور تم مجھے افسانوی محبت کا جھانسا دے کر اپنے لیے کھلونا بنا سکو گے۔‘‘

اس کے الفاظ سے میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ میں نے قدرے افسوس سے کہا۔ ’’کیا تمہیں زندگی میں کبھی سچے جذبوں سے واسطہ نہیں پڑا؟ کیا سچائی کی خوبصورتی نے تمہیں کبھی متاثر نہیں کیا؟‘‘

’’میں نے کبھی سچائی تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔‘‘ وہ بے پروائی سے بولی۔ ’’نہ تو مجھے اس کی ضرورت پڑی اور نہ ہی دلچسپی محسوس ہوئی۔ میرا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے اور مجھے اسی میں لطف آتا ہے۔ باقی ساری دنیا کو میں نے ٹھوکر مار دی ہے۔ اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں کہ کون کیا سوچتا ہے...... کون کس طرح زندگی گزارتا ہے...... میں نے اس قسم کی باتوں کو سوچنا چھوڑ دیا ہے۔‘‘

’’زندگی کے بارے میں یہ کوئی اچھا رویہ نہیں ہے، سودمند طرزِ عمل نہیں ہے۔‘‘ میں نے مربیانہ لہجے میں کہا۔

’’مجھے سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ سبق پڑھانے والوں سے مجھے سخت چڑ ہے۔‘‘ وہ بےزاری سے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے چوراہے پر گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ ’’کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے تمہارا نام تک معلوم نہیں۔‘‘

’’کون سا نام؟‘‘ اس نے پوچھا۔ ’’جو میرے ماں باپ نے رکھا تھا یا جس نام سے میں مشہور ہوں؟‘‘

’’دونوں ہی بتا دو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اصل نام سلطانہ ہے...... لیکن لوگوں کے لیے میں سلطان بن گئی ہوں۔ میرے قریبی دوست مجھے سلو کہتے ہیں، میری اصلیت میرے قریبی دوستوں تک کو معلوم نہیں۔ وہ مجھے لڑکا ہی سمجھتے ہیں۔‘‘ وہ نہ جانے کس رو میں بتاتی چلی گئی۔ ’’میں نے لڑکیوں کے کالج میں پڑھا ہے، اس وقت بھی میں صرف کالج میں سلطانہ ہوتی تھی، گھر آتے ہی سلطان بن جاتی تھی۔ کالج چھوڑنے کے بعد تو میں مکمل طور پر ہی سلطان بن گئی ہوں۔ سلطانہ کو میں نے مار کر کہیں دفن کر دیا ہے۔‘‘

’’اپنے اصل کو کوئی مار کر کہیں دفن نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں تم سلطانہ ہو اور ہمیشہ سلطانہ ہی رہو گی۔‘‘ میں نے کہا۔

اس دوران میں ہم گلبرگ کی مین مارکیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے ایک کئی منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’وہاں روک لینا۔‘‘

مجھے کبھی اس عمارت کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت چھوٹے چھوٹے فلیٹوں پر مشتمل تھی، یہاں تمام متصل عمارتوں کے نیچے برآمدہ سا تھا جو فٹ پاتھ کا کام دیتا تھا۔ اسی برآمدے میں دکانوں کی قطار تھی اور کہیں کہیں فلیٹوں میں رہنے والوں کی موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔

سلطانہ کچھ کہے بغیر گاڑی سے اتر گئی۔ لگتا یہی تھا کہ وہ مجھے ساتھ آنے کی دعوت نہیں دے گی۔ میں نے خود ہی کہا۔ ’’انسان بے شک اپنا لائف اسٹائل بدل لے لیکن اسے اتنا بداخلاق نہیں ہونا چاہیے کہ گھر آئے مہمان کو ایک کپ چائے بھی نہ پوچھے۔‘‘

’’چائے......؟‘‘ وہ نہ جانے کیوں استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔ ’’تمہیں میرے ساتھ آنا ہے تو آ جاؤ، لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ تمہیں چائے میسر آ سکے گی یا نہیں۔‘‘

میں اس کے ساتھ عمارت کے تنگ سے زینے کی طرف بڑھا۔ اس کی چال میں غضب کی دلکشی بھی تھی اور کمال کی تمکنت بھی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس سارے علاقے کی مالک وہی ہو۔ دکانیں وغیرہ بند تھیں البتہ مین مارکیٹ کے چوراہے کے قریب کڑاہی گوشت اور کولڈ ڈرنکس کی دکانوں پر کچھ رونق نظر آ رہی تھی۔

برآمدے میں وہ ایک پرانی سی اسپورٹس موٹر سائیکل کے قریب سے گزرتے ہوئے رک گئی۔ اس میں سے پیٹرول ٹپک ٹپک کر برآمدے کے پختہ فرش پر پھیل رہا تھا۔ اس نے جھک کر ٹنکی کے نیچے لگا ہوا فیول کا رک بند کیا اور پیٹرول ٹپکنا بند ہو گیا۔ سلطانہ نے یوں پیار سے موٹر سائیکل پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ کوئی جاندار شے ہو۔

’’میری وفادار موٹر سائیکل اب تھک گئی ہے...... اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔‘‘ خودکلامی کے سے انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

سیڑھیوں میں بہت کم طاقت کا ایک میلا سا بلب مقدور بھر روشنی پھیلا رہا تھا۔ سیڑھیوں کی دونوں جانب دیواروں پر میل کی تہیں اور داغ دھبے نظر آ رہے تھے۔

سیڑھیوں پر مٹی کی تہ کے علاوہ کپڑوں کی بہت سی کترنیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ شاید عمارت میں کہیں گارمنٹس کا کام بھی ہوتا تھا۔

پہلی منزل پر پہنچ کر وہ بائیں طرف مڑ گئی اور تنگ سی بالکونی سے گزر کر کونے کے فلیٹ کی طرف بڑھی۔ تمام فلیٹوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور ایسا سکوت طاری تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ چاروں طرف ملگجا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ عمارت کی ساخت ایک بہت بڑے چوکور کنویں کی سی تھی۔

جس دروازے پر پہنچ کر وہ رکی، اس پر طرح طرح کے اسٹیکرز چسپاں تھے۔ شاید اس طرح دروازے کی بوسیدگی اور بدرنگی کو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

سلطانہ نے رازدارانہ انداز میں دروازے پر دستک دی۔ شاید وہ پڑوسیوں کو بیدار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی چرس کے دھوئیں کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا لیکن میں طبیعت پر جبر کرتے ہوئے سلطانہ کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ دروازہ کھولنے والا لڑکا تھا لیکن اس کے بال لڑکیوں سے بھی لمبے تھے۔ ماتھے پر اس نے کالی پٹی لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والی شوخ رنگ کی شرٹ اور جینز میں تھا۔ بے حد دبلے پتلے اس لڑکے کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

ہمارے اندر آتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ایک ڈربا نما کمرا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بوسیدہ سی الماری کھڑی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ فوم کا گدا بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر کے طور پر کمرے میں صرف ایک بےہنگم سی کرسی اور ایک تپائی تھی۔ فرش پر ادھر ادھر کتابیں، رسالے اور پرانے اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان چائے کے کئی گندے مگ، سگریٹوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے، ایک ٹوٹا ہوا ہیٹر، ایک پرانا کیسٹ پلیئر اور چند گلاس پڑے تھے۔ المونیم کا ایک جگ بھی لڑھکا ہوا تھا۔ دیواروں پر نہایت جارحانہ قسم کی تصویروں والے پوسٹر چسپاں تھے۔ شکار پر چھلانگ لگاتا ہوا چیتا، اچھل کر ایک چٹان سے دوسری چٹان پر پہنچتی ہوئی موٹر سائیکل، اپنے حریف کو لہولہان کرتا ہوا باکسر اور اسی قسم کی دوسری تصویریں۔

دروازہ کھولنے والے کے علاوہ بھی کمرے میں دو لڑکے موجود تھے۔ وہ بھی اسی قبیل کے تھے۔ تینوں کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ دیوار سے ہٹے تو لڑھک جائیں گے۔ انہوں نے میرے بارے میں کچھ پوچھنا تو درکنار، میری طرف غور سے دیکھا بھی نہیں۔ کمرا چرس کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

سلطانہ دروازے کے قریب ہی تن کر کھڑی تھی۔ چند لمحے وہ خاموشی سے ان تینوں کو گھورتی رہی۔ پھر چٹکی بجاتے ہوئے غصیلے انداز میں اور حتی الامکان مردانہ آواز میں بولی۔ ’’اب تم تینوں دفع ہو جاؤ اور جا کر اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ تم نے تو میرے فلیٹ کو اپنے مشاغل کا اڈا بنا لیا ہے۔‘‘

’’تم ہمیں کیوں بھگا رہے ہو؟‘‘ ایک نے گنگنانے کے سے انداز میں پوچھا۔

’’کیونکہ آج کا پروگرام غارت ہو گیا ہے۔‘‘ سلطانہ نے جواب دیا۔

’’کیوں غارت ہو گیا سلطان؟‘‘ دوسرا بھی منمنایا۔

’’جس کی گاڑی چھیننے کی کوشش کی وہ دوست نکل آیا۔‘‘ سلطانہ نے جواب دیا اور مجھے ایک بےعنوان سی خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے دوست کہا تھا۔

’’یہ تو اور بھی اچھا ہے......‘‘ پھولدار شرٹ والے نے سگریٹ اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’دوست سے تو گاڑی اور پیسے ادھار بھی مانگے جا سکتے ہیں۔‘‘

’’مگر میں مانگنا نہیں چاہتا۔‘‘ سلطانہ کی آواز اور انداز بدستور لڑکوں والا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چٹکی بجائی۔ ’’میں کہہ چکا ہوں کہ تم تینوں دفع ہو جاؤ۔‘‘

’’یس باس۔‘‘ ایک لڑکے نے یہ کہتے ہوئے اٹھ کر باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ دوسرے نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور وہ تینوں سعادت مندانہ انداز میں رخصت ہو گئے۔

’’بیٹھو۔‘‘ سلطانہ نے بےہنگم کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ’’اور اگر تمہارا بیش قیمت سوٹ خراب ہو جائے تو شکوہ مت کرنا۔‘‘

میں بیٹھ چکا تو وہ گدے پر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور فرش پر پڑے ہوئے ایک پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگی۔ اس کے دھوئیں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سگریٹ سادہ ہی تھا۔

فلیٹ دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ دوسرے کمرے کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ درمیانی دروازہ کھلا تھا اور ادھر بھی اسی طرح کاٹھ کباڑ اور میلے کپڑوں کے انبار نظر آ رہے تھے۔

’’تمہیں یہ فلیٹ کس طرح مل گیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اللہ تعالیٰ اپنے نکمے اور بےہودہ بندوں کو بھی پیٹ

بھرنے کو روٹی اور سر چھپانے کو ٹھکانا دے ہی دیتا ہے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جس کا بس چلے تو وہ اپنے ناپسندیدہ انسانوں کو نیست و نابود کر دے۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ پھر گویا میری تسلی کے لیے اصل جواب کی طرف آتے ہوئے بولی۔ ''مدتوں پہلے یہ فلیٹ کسی شریف آدمی نے کرائے پر لیا ہوگا۔ اس نے غالباً از راہ مہربانی کسی دوست کو دے دیا...... اس نے اپنے کسی اور دوست کو...... اور یوں ہوتے ہوتے اب میں اس میں رہ رہی ہوں۔ اس عمارت کا مالک ملک سے باہر ہے، بس چوکیدار آتا ہے، کرایہ لے کر رسید دے جاتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں کہ کس فلیٹ میں کون رہ رہا ہے۔'' ایک طویل کش لے کر اس نے ہوا میں دھوئیں کے چھلے بنا دیے۔

''اچھا...... یہ بتاؤ......'' میں نے تحلیل ہوتے ہوئے دھوئیں کے چھلوں کو تکتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم مجھ سے گاڑی اور پیسے چھیننے میں کامیاب ہو جاتیں تو کیا کرتیں؟''

''کچھ نہیں...... بس ہم سب ذرا آوارہ گردی کرتے۔ کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ رات بھر گاڑی دوڑاتے رہتے۔ شاید کہیں کولڈ ڈرنکس کی دو چار بوتلیں بھی سڑک پر توڑتے...... اور ممکن ہے کوئی چھوٹی موٹی واردات بھی کر بیٹھتے۔''

''ماشاءاللہ، کیا عمدہ لائف اسٹائل اپنایا ہے تم نے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور ایک بار پھر فلیٹ کا جائزہ لینے لگا۔

''زیادہ طنز گو بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ قدرے برہمی سے بولی۔

میں یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ملیح سراپا نہ جانے کیوں میرے دل کو اتھل پتھل کر دیتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ اپنے لیے لڑکی کا ہی صیغہ استعمال کرتی تھی اور اس کی آواز میں وہ معمولی سی تبدیلی بھی آ جاتی تھی جو اس کی آواز کو نسوانی بنا دیتی تھی۔

''میں تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں سلطانہ......!'' میں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ لڑکے کے بھیس میں پھرنے والی ایک لڑکی کو پولیس نے پکڑا ہے جو کئی وارداتیں کر چکی تھی۔ کبھی کسی ٹیکسی ڈرائیور سے ٹیکسی چھین لیتی تھی۔ کبھی سنسان گلی میں کسی کو روک کر سینے پر چاقو رکھ کر رقم چھین لیتی تھی۔ میرا ذہن فوراً تمہاری طرف گیا۔ میں ایک بڑے وکیل کو ساتھ لے کر متعلقہ تھانے بھی گیا......'' کہتے کہتے میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

وہ پُرتجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''وہ لڑکی کوئی اور تھی، لیکن بہرحال یوں سمجھ لو کہ محض تمہاری یاد کے صدقے میں اس کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا تھا وہ میں نے کیا اور پولیس سے اس کی جان چھڑائی۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئی...... لیکن اصل بات جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں شاید صحیح طرح بتا نہیں سکتا...... وہ یہ ہے کہ جس وقت ہم نے اس لڑکا نما لڑکی کو حوالات سے نکلوایا، اس کی حالت غیر تھی۔ وہ سیدھی طرح چل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو تشدد ہوا وہ بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔ غائب ہونے سے پہلے کافی دن اسے اسپتال میں گزارنے پڑے تھے۔''

یہ سب کچھ سنتے ہی سلطانہ کے ملیح چہرے پر تناؤ آ گیا اور آنکھیں سلگنے لگی تھیں۔ وہ تند لہجے میں بولی۔ ''میں نے آج تک کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا، میں نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ کبھی زندہ حالت میں پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ جس دن مجھے یقین ہو گیا کہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں...... میں اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلا لوں گی اور اگر میرے پاس پستول نہ ہوا تو چاقو سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ لوں گی یا چاقو گلے پر پھیر لوں گی۔''

''لیکن تمہیں بلاوجہ اپنی جان کے لیے اتنے عذاب مول لینے کی آخر کیا ضرورت ہے؟'' میں نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اس معاشرے میں اکثر لوگوں کی زندگیاں دوسرے لوگ بسر کر رہے ہیں۔ لیکن یہ میری زندگی ہے اور اسے میں ہی بسر کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔ پھر گویا اس موضوع سے پیچھا چھڑانے کے لیے بولی۔ ''میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں پہنچی تو میں بھی ٹہلنے کے سے انداز میں اس کے پیچھے چل دیا۔ دوسرے کمرے کے ایک کونے میں کچن نما حصہ تھا۔ اس کی حالت بھی تباہ تھی۔ چولہا گویا سیاہی کے ڈھیر میں دفن تھا۔ سنک پر لتھڑے ہوئے برتن الٹے سیدھے پڑے تھے۔ شیلف میں چند ڈبے لڑھکے پڑے تھے۔

''برتن وغیرہ دیکھ کر گھن مت کھانا۔'' اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔ ''تمہارے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ تم سلطانہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیو گے۔''

میں مسکرا دیا۔ وہ اسکاؤٹوں والے انداز میں پھرتی

سے، چائے بنانے کے لیے چینی، پتی وغیرہ کیتلی میں ڈال رہی تھی۔ میں غور سے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ میں اس کے انداز و اطوار میں ایک گمشدہ لڑکی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں ہی چونک پڑے۔ دستک دینے کا انداز کچھ رازدارانہ سا ہی تھا، جیسے کوئی مکین کو تو دروازے پر بلانا چاہتا ہو لیکن پڑوسیوں کے سکون میں خلل ڈالنے سے بھی بچنا چاہتا ہو۔ سلطانہ نے چولہے کی آگ ہلکی کی اور کچن سے نکل کر دروازہ کھولا۔ میں اس کے پیچھے ہی تھا۔ دروازے پر ایک باریش شخص کھڑا تھا جو اپنی وضع قطع سے چوکیدار معلوم ہوتا تھا۔ سلطانہ نے سلطان کے انداز میں اسے سلام کیا۔

وہ سلام کا جواب دینے کے بعد نرمی سے بولا۔ ''سلطان! تم خود تو بہت اچھے لڑکے ہو۔ مجھے یا پڑوسیوں کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن تمہاری یہ عادت بہت خراب ہے کہ تم نے اپنے فلیٹ کی چابی نہ جانے کس کس کو دے رکھی ہے۔ وہ تمہارے پیچھے کبھی کبھی آتے ہیں تو گانا بجانا کرنے لگتے ہیں۔ اونچی آواز میں ٹیپ ریکارڈر چلاتے ہیں۔ پڑوسی شکایت کرتے ہیں۔ اول تو تمہاری غیر موجودگی میں کسی کو یہاں آنا نہیں چاہیے اور اگر آئے تو شور شرابا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ تم خود شور شرابا نہیں کرتے لیکن تمہارے دوست کرتے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں چچا میاں! میں انہیں سیدھا کر دوں گا۔ ان میں سے بعض کا تو میں خود ہی داخلہ بند کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب جو آئے گا، وہ یہاں انسانوں کی طرح بیٹھے گا۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ پڑوسیوں کو بھی تسلی دے دیجیے گا۔'' سلطانہ نے خاصے اطمینان سے اسے تسلی دی اور وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

سلطانہ دروازہ بند کر کے کچن میں آئی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''ان کنگلوں اور خانہ بدوشوں پر ترس کھا کر مجھے اکثر کوئی نہ کوئی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔''

پھر وہ چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں تو اس شکایت سے پریشانی نہیں ہوئی؟''

''نہیں...... مجھے بھلا کیا پریشانی ہونی تھی۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

چائے بنا کر اس نے مگوں میں انڈیلی اور ہم اپنا اپنا مگ اٹھائے کمرے میں آ بیٹھے۔ میں نے اسٹرانگ چائے کی پہلی چسکی لی۔ اس میں زندگی کی حرارت تھی، جارحیت بھری زندگی کی حرارت۔ اس کے ذائقے سے اسی تیزی و تندی کا احساس ہوتا تھا جو سلطانہ کے مزاج میں شامل تھی۔

چند لمحے کے بوجھل سے سکوت کے بعد میں نے گویا ٹوٹا ہوا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کبھی غور کیا سلطانہ...... کہ یہ زندگی بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟''

''تمہیں مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ایک بار پھر برہم سی ہو گئی۔ ''مجھے وہ لوگ زہر لگتے ہیں جو مجھ پر ترس کھانے کی کوشش کریں...... بلکہ اس قسم کے لوگ شاید ہر ایک کو ہی زہر لگتے ہیں۔'' پھر وہ جیسے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ محبت پانے...... اور محبت لٹانے کا خواہش مند ایک انسان تمہارے آس پاس تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ آخر تم یہ سب کچھ ترک کر کے، تج کے، اس کی کیوں نہیں ہو جاتیں؟ یقین کرو، کسی کا ہو کر رہنے میں بڑی لذت ہے۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں التجا سی شامل ہو گئی تھی۔

اس نے عجیب سے انداز میں قدرے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''یہ ہماری صرف دوسری ملاقات ہے اور میں نے پہلی ہی ملاقات میں تمہاری آنکھوں میں خواب بنتے بگڑتے دیکھے تھے۔ ہم لڑکیاں اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک دولت مند اور معزز آدمی کو ایک آوارہ، وحشی اور خود گزیدہ لڑکی میں ایسی مر مٹنے والی کون سی بات نظر آ گئی ہے؟''

''میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ورنہ تمہیں سمجھانے کی کوشش ضرور کرتا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''بعض خواب سمجھنے سمجھانے کے لیے نہیں ہوتے...... اور تم میرا خواب ہو۔''

اس کے چہرے پر صرف ایک ثانیے کے لیے ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ پھر وہ گویا اپنے پھرتیلے قالب میں واپس آتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی زندگی سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ میں خواب دیکھنے اور کسی کا خواب بننے میں یقین نہیں رکھتی۔ مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ میں کسی کی عالیشان کوٹھی یا چمکتی دمکتی آسائشوں میں جا کر پناہ لوں...... اور نہ ہی مجھے ابھی تک کسی سے اتنی محبت محسوس ہوئی ہے کہ میں اس کی ہو کر رہنے کے بارے میں سوچنے لگوں۔''

پھر اس نے گہری سانس لی اور اپنے مختصر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اور ان سب سے زیادہ اہم بات میری نظر میں یہ ہے کہ ہم دونوں کی کلاس بہت مختلف

ہے۔ ممکن ہے مجھ میں تمہارے لیے ابھی بہت کشش ہو لیکن یہ کشش کچھ ویسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی بچہ کسی نئے طرز کے کھلونے میں کشش محسوس کرتا ہے۔ لیکن آخرکار ایک دن بچے کا دل کھلونے سے بھر جاتا ہے۔ وہ دوسرے کئی کھلونوں کی طرح اسے بھی اٹھا کر کسی کونے میں پھینک دیتا ہے۔ میں کھلونا بننا نہیں چاہتی اور تم بہرحال ایک جاگیردار کے بیٹے ہو، تمہاری رگوں میں بڑا بدنام خون دوڑ رہا ہے۔ گھروں میں کھلونے سجانا، پھر انہیں توڑ پھوڑ دینا، پھینک دینا تم لوگوں کی روایت ہے۔ میں اس روایت کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہتی۔"

"تمہیں اس کے لیے کون سی ضمانت چاہیے کہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ہر ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"مجھے کوئی ضمانت نہیں چاہیے۔ میرا دل میری ضمانت ہے اور میرا دل ابھی اس معاملے میں خاموش ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس نے دل کی یہ بات کی تو میرا دل جیسے سرد سا ہوگیا۔ میں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ میرے ذہن و دل پر یکایک اسی افسردگی کا حملہ ہوا تھا، جو شاید ازل سے میرے ساتھ چلی آرہی تھی۔

ہم دونوں چائے کے مگ خالی کر کے رکھ چکے تو وہ نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "اب تم جاؤ، اپنے سوا میں نے آج تک اس فلیٹ میں کسی اور کو رات بسر کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

"میں جانے ہی لگا تھا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "رات بسر کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ زندگی بسر کرنے کا ہے۔"

دروازے کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک کر میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں کسی قابل تو نہیں لیکن اگر کبھی ضرورت پڑے ...... یا دل اجازت دے تو اس نمبر پر رنگ کر لینا۔ اس پر میرا ایڈریس بھی ہے۔"

اس نے وزیٹنگ کارڈ لے کر بے پروائی سے گدے پر پھینک دیا۔ میرے دل کو ایک اور دھچکا سا لگا۔ آثار سے مجھے کچھ ایسا لگا جیسے مستقبل میں کبھی اگر اس کمرے میں جھاڑو دی گئی تو میرا وزیٹنگ کارڈ بھی کوڑے کے ساتھ چلا جائے گا۔ میں نے بس ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر آگیا۔ چاروں طرف ایک بے نام سی اداسی طاری تھی۔

میں نے کئی دن نہیں بلکہ کئی ہفتے انتظار کیا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید کوئی سندیسہ آئے۔ کوئی بے عنوان سا پیغام ...... کسی بہانے تو آوازِ دوست سنائی دے ...... لیکن دوسری طرف وہی بے رحم سکوت طاری رہا۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز میں ہی اس کے ہاں جا پہنچا۔ اتنے دن تک میں نے بڑی مشکل سے اپنی بے تابی چھپائی تھی۔ بے تابی یہ جاننے کی بھی تھی کہ وہ اپنے ٹھکانے پر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس حال میں ہے؟

میں نے کئی مرتبہ اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کمرے کی کھڑکی میں گرل تھی اور اس کے پیچھے شیشہ تھا جس کے عقب میں خاکی کاغذ چپکا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ناخن برابر کاغذ اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے وہاں آنکھ لگا کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ فلیٹ ویران ویران سا لگ رہا تھا۔ صرف گدا، کرسی اور تپائی نظر آرہی تھی۔ دوسرا کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ فرش پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹا تو یہ دیکھ کر قدرے شرمندہ ہوگیا کہ برابر کے فلیٹ کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر ایک دبلا پتلا، سانولا سا ادھیڑ عمر شخص خوفزدہ سے انداز میں باہر جھانک رہا تھا۔

سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کے بجائے میں معذرت خواہانہ سے انداز میں مسکرایا تو اس شخص کا حوصلہ کچھ بڑھا اور اس نے دروازہ تھوڑا سا اور کھولتے ہوئے پوچھا۔ "سلو کو دیکھنا پڑا؟" وہ غالباً کرسچن تھا۔

"جی ہاں ...... آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ایک دن ادھر دو پولیس والا اس کی تلاش میں آیا ...... اس کا قسمت شاید اچھا تھا ...... اس وقت سلو گھر پر نہیں تھا لیکن اسی دن سے سلو ایک دم گائب ہے ...... اپنا سامان بھی معلوم نہیں کس وقت لے گیا ہے۔ یہ ہم کو بھی بالکل معلوم نہیں کدھر گیا۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر رازدارانہ سے انداز میں بولا۔ "تمہارا ادھار مدھار تو نہیں تھا اس کی طرف؟"

"جی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بلکہ اس کا میری طرف بہت سا قرض نکلتا ہے۔"

وہ شخص عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ دل ہی دل میں شاید وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ کسی کی طرف سلطان کا قرض بھی نکل سکتا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے نیچے

آگیا۔ دل ایک بار پھر بوجھل سا ہوگیا تھا۔ میں پرچھائیں کے تعاقب میں تھا اور پرچھائیں ہر بار اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد گزرتے گزرتے پورے تین برس گزر گئے۔

اگر وہ کسی موڑ پر مجھے مل جاتی تو شاید یقین نہ کرتی کہ یہ تین برس میں نے اسے تلاش کرتے ہوئے گزارے تھے۔ راہ چلتے، ڈرائیونگ کرتے، کسی دکان میں آتے جاتے، چہروں کی بھیڑ میں، انسانوں کے ہجوم میں ...... میری نظریں اس کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں۔ مگر بڑے شہروں کا مزاج کچھ عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو برسوں کے بچھڑے ہوئے لوگ اچانک ہی یوں سرِراہ مل جاتے ہیں کہ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بھیڑ میں آپ کا ہاتھ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر برسوں اس کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

اس دوران میں، میں نے اپنے وقت کا بہتر مصرف تلاش کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ہماری کلاسیں شہر کے مرکزی علاقے میں اولڈ کیمپس ہی میں ہوتی تھیں۔ لیکن ہوسٹل میں رہنے والے چند لڑکے میرے دوست بن گئے تھے اور ہوسٹلز نیو کیمپس کے قریب تھے اس لیے شام کو میں نیو کیمپس چلا جاتا۔ ہوسٹلز کی بکھری بکھری سی عمارتوں کے قریب سبک خرامی سے بہتی نہر کے کنارے دو رویہ کھڑے درختوں کے درمیان دھیرے دھیرے کار چلانا مجھے بہت بھلا لگتا۔

میں اپنے الجھے الجھے سے خیالوں کی ڈور میں بندھا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ پھر واپس آ کر شیشے کی دیواروں والی کینٹین میں داخل ہو کر لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اگر دوست لڑکے اور ان کی کلاس فیلو لڑکیاں موجود ہوتیں تو فوراً پرجوش گفتگو شروع ہو جاتی ورنہ میں ان کے انتظار میں آہنی میز کی ٹھنڈی سطح پر کہنیاں ٹکائے خواب و سراب کی دنیا میں بھٹکنے لگتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ شیشے کی دیوار پر ہلکی ہلکی کہر جمنے لگی تھی اور سامنے نہر کے کنارے کھڑے درخت ملگجے سے اندھیرے میں سایوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ٹھنڈ کافی تھی۔ یونیورسٹی میں الیکشن کی آمد آمد تھی اور میرے سوا باقی سب لوگ گویا الیکشن ہی کے کاموں میں مصروف تھے۔ دوسری تمام سرگرمیوں کو انہوں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

میں اس معاملے میں بھی اپنے طبقے کے نمائندوں سے بالکل الٹ تھا۔ میرے طبقے کے ہر عمر کے لوگ ہر قسم کے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے کو بے تاب رہتے تھے۔ لیکن مجھے چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے سیاسی، غیر سیاسی، کسی بھی قسم کے عہدے کے لیے منتخب ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس وقت بھی الیکشن میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے حامی باہر کنستر اور کتابیں پیٹ پیٹ کر انوکھے نعرے لگا رہے تھے۔ لڑکے لڑکیاں اندر کرسیوں پر بکھرے خورونوش میں مصروف تھے۔ بڑی گہما گہمی کی فضا تھی۔

میں نے شور سے اکتا کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور جیسے ہی میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں، میرا دل گویا اچھل کر حلق میں آگیا۔ نہایت آہستگی سے کینٹین کا دروازہ کھول کر سلطانہ اندر آرہی تھی۔ جیسے کوئی چپکے سے خواب نگر کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھ رہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

وہ بہت بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں نسوانیت کا پلڑا جھک گیا تھا اور یوں وہ پہلے سے زیادہ دلکش نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بال اب بوائے کٹ نہیں تھے۔ گو کہ اب بھی تراشیدہ ہی تھے لیکن کندھوں تک جھکے ہوئے تھے اور اتنی نفاست سے برش کیے گئے تھے کہ گھنے ہونے کے باوجود ایک ایک بال علیحدہ نظر آرہا تھا۔

پہلے کے مقابلے میں اب وہ نہایت صاف ستھری اور اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اپنی شخصیت کا ذرا سا خیال رکھنے پر اس کے وجود میں سر سے پاؤں تک ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔ وہ نیوی بلیو شلوار قمیص اور بلوچی واسکٹ میں تھی۔ اس کی شخصیت کی مقناطیسیت کو شاید صرف میں ہی محسوس نہیں کر رہا تھا بلکہ سب باتیں کرتے ہوئے لڑکے، لڑکیاں بھی ایک لمحے کے لیے مبہوت سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

خالی میز کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی اس کی نظر آخرکار میری میز پر آن ٹھہری اور جب اس نے مجھے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کی بھی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس ایک لمحے میں گویا وہ گم صم سی کھڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

آخر دھیرے دھیرے لاابالی سے انداز میں قدم اٹھاتی وہ میری ہی میز کی طرف بڑھی۔ میں سحر زدہ سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب مکمل سلطانہ نظر آرہی تھی مگر وہ جو کہیں کہیں سلطان کے مٹے مٹے سے نقوش اس کی شخصیت میں مدغم تھے، انہوں نے اسے بالکل منفرد بنا رکھا تھا۔ اس

مدھم امتزاج نے اس کی شخصیت میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا کردی تھی۔ ہتھیار پھینکنے کے سے انداز میں اس نے اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھا اور تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

''اگر یونیورسٹی میں الیکشن نہ ہوا کریں تو کیا حرج ہے؟'' اس نے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے جواب طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس نے یوں بات شروع کی جیسے بہت دیر سے ہم یہیں بیٹھے باتیں کررہے تھے اور وہ چند منٹ کے لیے اٹھ کر کہیں چلی گئی تھی۔

''حرج تو کچھ نہیں......'' میں نے بھی اسی کے سے ہموار اور پرسکون لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ جو نوجوان کے اندر جوش وخروش ہے، توانائی ہے...... یہ اپنے اظہار اور استعمال کا موقع چاہتی ہے۔ اسے اظہار اور اخراج کا ذریعہ نہیں ملے گا تو ان میں فرسٹریشن پیدا ہوگی، جو زیادہ بری اور زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔''

''فرسٹریشن تو ان میں اب بھی ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''یہ جو لڑکے راہ چلتی لڑکیوں پر آوازے کستے ہیں، سنیما ہال میں نعرے لگاتے ہیں، بڑھکیں مارتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں...... بس میں سفر کرتے ہیں تو دوسروں کا سفر کرنا دوبھر کردیتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر جمع ہوکر ہنگامہ آرائی، توڑ پھوڑ کرتے ہیں...... یہ سب فرسٹریشن ہی کی تو نشانیاں ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اسے گویا کچھ یاد آگیا۔ وہ جوشیلے سے لہجے میں بولی۔ ''اب دیکھو...... کیسی عجیب بات ہے، زرین ہے نا...... وہی جو وائس پریذیڈنٹ کی سیٹ کے لیے کھڑی ہورہی ہے۔ وہ میری دوست ہے۔ بے چاری نے کنویسنگ کے لیے دو مرسیڈیز گاڑیاں چھوڑی ہوئی ہیں۔ ان پر اپنے اشتہار چپکا چپکا کر انہیں ڈھک دیا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں دو سو لڑکوں کو ٹریٹ دی۔ لمبا چوڑا بل بنا اور جب ووٹ کی بات کرنے لڑکوں کے پاس گئی تو انہوں نے ایسی فرمائشیں کیں جو انتہائی فرسٹریٹڈ نسل ہی کرسکتی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''کسی نہ کسی قسم کی فرسٹریشن ہی انسان کو سلطانہ سے سلطان بنا دیتی ہے۔'' پھر میں نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ''لیکن یہ دوبارہ سلطان سے سلطانہ بننے کی کہانی کیا ہے؟ کیونکر آگیا یہ انقلاب؟''

''بس...... آگیا۔'' اس نے مبہم سے لہجے میں جواب دیا اور نظر جھکا کر اپنے ناخن کریدتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا، انسان اپنے اصل کو دفن کرکے زندگی نہیں گزار سکتا۔''

''شکر ہے......'' میں نے طمانیت سے کہا۔ ''کسی طرح بھی سہی...... تمہیں میری کسی بات کا اعتبار تو آیا۔ یہ بتاؤ، تم یونیورسٹی میں کیا کررہی ہو؟''

''میں انگلش میں ایم اے کررہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اور تم......؟''

''میں پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کررہا ہوں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھے پولیٹکس سے ذرا برابر دلچسپی نہیں ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ دکھ پولیٹکس نے دیے ہیں۔ انسان کے نوے فیصد مسائل اور مصائب کی وجہ پولیٹکس ہے، اس کے باوجود انسان اسی میں خوش رہتا ہے...... اور میں بھی پولیٹکس کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے سے پولیٹکس کی سمجھ تھوڑی آتی ہے۔ پولیٹکس کو سمجھنا ہے تو ان لوگوں میں جاؤ جن کا سراپا انسانوں کا سا اور دل بھیڑیوں کے سے ہیں۔''

''شاید میرا یہاں پڑھنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ مجھے بس کچھ نہ کچھ پڑھنا تھا۔ شاید یہاں نیو کیمپس میں وقت گزاری کا ایک بہانہ ہے۔ مجھے ان دونوں جگہ کا ماحول، یہاں اور وہاں کی الگ الگ فضا بہت اچھی لگتی ہے۔ میرا ان دونوں جگہوں پر بہت دل لگتا ہے۔'' میں نے کہا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا۔ ''یہ بتاؤ تم نے وہ سلطان والے سارے دھندے، سارے مشاغل، سارے چکر چھوڑ دیے یا نہیں؟''

''سب کچھ چھوڑ دیا۔ میں اب بالکل صحیح قسم کی لڑکی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا۔

''کہاں رہ رہی ہو؟'' میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''گرلز ہوسٹل نمبر ایک میں۔'' اس نے بتایا۔ اس دوران میں ہم چائے پی چکے تھے۔ وہ اپنی فائل سے پنکھا جھلتے ہوئے بولی۔ ''کچھ دیر پہلے تک مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ اب یہاں حبس محسوس ہورہا ہے۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔''

''شاید یہ تمہارے اندر کا موسم ہے جو جلدی جلدی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔ لان میں ٹہلتے ہوئے غیر ارادی طور پر ہم نہر کے ساتھ والی سڑک کی طرف چل دیے۔ وہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لینے کے بعد بولی۔ ''مشغلے کے طور پر پڑھنے کے علاوہ تم کیا کررہے ہو؟''

''تمہارا انتظار کررہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی

سے کہا۔

''ابھی تک......؟'' میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم مایوس نہیں ہوئے؟''

''میں اتنی جلدی مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہوں...... اور پھر انتظار کی طوالت کا انحصار تو ان باتوں پر بھی ہوتا ہے نا کہ انتظار کرنے والا کون ہے، انتظار کس کا کیا جارہا ہے...... لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال وغیرہ نے عشق کی مثالیں چھوڑی ہیں، میں انتظار کی مثال چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔'' غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ہلکی سی افسردگی در آئی تھی۔

وہ ایک لمحے کو چپ سی ہوگئی۔ پھر بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ''تم میرا انتظار چھوڑ دو۔ زندگی کے سنہرے برس ضائع مت کرو۔''

''جو برس تمہارے انتظار میں گزریں گے، ان کو رائگاں مت کہو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بائی داوے، تم مجھے یہ مشورہ کیوں دے رہی ہو؟ لڑکیوں کے لیے شاید اس میں کسی مبہم سی خوشی، کسی مدھم سے فخر کا پہلو ہوتا ہے کہ کوئی ان کا انتظار کررہا ہے اور کیے ہی چلا جارہا ہے۔''

''میں...... میں شاید تمہارا بھلا چاہتی ہوں۔'' وہ بے یقینی سے بولی اور شاید مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر غالباً موضوع بدلنے کے لیے بولی۔ ''آج میرا ڈرائیونگ کرنے کو زبردست جی چاہ رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ میرے پاس آج کل کوئی گاڑی تو کیا سائیکل بھی نہیں ہے۔''

میں نے خاموشی سے چابیاں اس کی طرف بڑھادیں اور پختہ روش کی طرف اشارہ کیا، جہاں میری مرسیڈیز کھڑی تھی، اس نے مسکراتے ہوئے چابیاں لیں اور جاکر گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی یوں دھول اڑاتی اچھل کر پختہ سڑک پر آئی کہ مجھے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ پھر گاڑی طوفانی رفتار سے نہر کے کنارے سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

ہم گویا چشم زدن میں اپر مال جا پہنچے، جہاں سے واپسی کے لیے اس نے گاڑی دو پہیوں پر ٹرن کی۔ میں بہ ظاہر پرسکون بیٹھا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ اگر آج ہم زندہ سلامت نیو کیمپس واپس پہنچ گئے تو یہ ایک معجزہ ہوگا یا محض سلطانہ کی مہارت کا کمال۔

ایف سی کالج، مسلم ٹاؤن وغیرہ سے نہر کے کنارے آندھی طوفان کی طرح گزرتے ہوئے ہم ہوسٹلوں کے قریب واپس آن پہنچے۔ پل کے قریب اس نے نشیب میں گاڑی روکی اور ہم پل پر آگئے۔ نیچے سرمئی سے اندھیرے میں پانی سبک خرامی سے بہہ رہا تھا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔ ''بہت سے لوگ ابھی تک سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیا بگولا سا تھا، جو ان کے قریب سے گزر گیا۔''

''مجھے اس طرح لوگوں کو شاک سا دے کر لطف آتا ہے۔'' اس کی خوشی میں عجیب سی معصومیت تھی۔

''یہ سنسنی خیزی کو پسند کرنے والی بیمار سی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔'' میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ''یا پھر شاید تمہارے اندر سلطان کی روح کے بچے کھچے ٹکڑے باقی ہیں۔''

''نہیں، نہیں......'' یکایک اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔ ''سلطان کو تو میں نے مکمل طور پر دفن کردیا ہے، اس کی روح سمیت۔''

''روح کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو تو مغرب والے بھی مانتے ہیں جو بلا کے مادیت پرست ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحے پرخیال سے انداز میں خاموش رہی، پھر چونک کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اب چلتی ہوں۔ دیر ہوجائے تو ہوسٹل کا چوکیدار بہت بحث مباحثہ کرتا ہے۔''

پل عبور کرکے وہ پیدل ہی اپنے ہوسٹل کی طرف چل دی اور میں وہیں بے حس وحرکت کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

دوسرے دن وہ مجھے اولڈ کیمپس میں مل گئی۔ پیریڈ ختم ہوچکے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا۔ ''تم آج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ میرے گھر پر کیوں نہیں کھاتیں؟''

اس نے ایک لمحے سوچا پھر سر جھٹک کر بولی۔ ''ٹھیک ہے...... چلو، چلتے ہیں۔''

گلبرگ پہنچ کر وہ جب میری کوٹھی کے کشادہ ڈرائیو وے میں گاڑی سے اتری تو کوٹھی کی شان وشوکت اور وسعت سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی۔ ایک نظر ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی برآمدے کی ماربل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی جیسے اپنے ہی گھر میں داخل ہورہی ہو۔

وہ ہر کمرے میں گھومی۔ ہر کمرا ویران تھا۔ ملازموں کے ہاتھوں تمام تر صفائی ستھرائی کے باوجود فرنیچر پر گرد کی ہلکی سی تہ نظر آرہی تھی۔ وہ طویل وعریض لاؤنج میں واپس آتے ہوئے بولی۔ ''اتنے بڑے گھر میں تم اکیلے رہتے ہو؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔

''نہیں، تین نوکر بھی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

"لیکن انہیں معلوم ہے کہ میں ان کی ضرورت کو کم ہی محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے کسی نہ کسی بہانے اکثر غائب رہتے ہیں۔ تاہم شکر کرو کہ کک موجود ہے اور اس نے کھانا بھی تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔"

اس دوران میں اس نے ڈرائنگ روم میں موجود چھوٹی سی کیبنٹ کا دروازہ کھول لیا تھا جو درحقیقت دیوار گیر بار کا تھا۔ وہ شیلفوں میں سجی بوتلوں کو قدرے تعجب سے دیکھنے لگی۔

"تم بھی پیتے ہو؟" آخر وہ آہستگی سے بولی۔ میں اندازہ نہ کر سکا کہ یہ جملہ سوالیہ تھا یا محض اس کی خود کلامی کا حصہ۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "مت پیا کرو...... یہ بزدلی کی علامت ہے۔"

"مجھے اپنی بزدلی کا اعتراف ہے...... اندر سے شاید میں بزدل ہی ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں عادی پینے والا نہیں ہوں۔ کچھ دن ایسے آئے تھے جب میں کبھی کبھار تھوڑی بہت پینے لگا تھا لیکن پھر احساس ہوا کہ میرے لیے پینے میں کچھ کیف نہیں ہے۔ مجھے خود ہی معلوم نہیں کہ میری پیاس، میری تشنگی کس قسم کی ہے...... چنانچہ یہ شغل بھی چھوڑ دیا۔ تم شاید غور سے دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ بوتلیں عرصے سے استعمال نہیں ہوئیں۔ ان پر جمی گرد کی تہ گواہی دے گی۔ ویسے میں نے اب سوچ لیا ہے کہ اس شے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔" میں نے بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اب بھی کبھی کبھی ڈپریشن کے عالم میں پینے کو جی چاہنے لگتا ہے لیکن میں خود پر ضبط کرتا ہوں اور یوں اپنے صبر کو آزماتا ہوں۔ شاید میں ادھورا ہوں...... جس دن مکمل ہو گیا اس دن یہ کبھی کبھی کی طلب بھی مٹ جائے گی۔"

"اس دنیا میں سب ادھورے ہیں۔ تم کبھی مکمل نہیں ہو گے۔ یہ صرف ایک خواب ہے...... میں فلسفہ بولنا نہیں چاہتی۔ بے شمار کتابیں فلسفے سے بھری پڑی ہیں۔ آپس میں باتیں کرنے کے لیے تو دوسرے موضوعات ہونے چاہئیں۔" وہ بے رحم سے لہجے میں بولتی چلی گئی۔

چنانچہ ہم نے دوسرے موضوعات پر باتیں شروع کر دیں۔ کھانا کھانے میں بہت لطف آیا۔ ایک مدت سے میں نے اتنے خوشگوار ماحول میں خود کو اتنا مسرور محسوس کرتے ہوئے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد بھی تھوڑی دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اب تم مجھے چھوڑ آؤ۔"

میں اسے گاڑی میں بٹھا کر ایک نمبر ہوسٹل پہنچا تو لان پر دو تین لڑکیاں اپنے ملاقاتیوں سے باتیں کر رہی تھیں۔

"بیٹھو، میں تمہیں اورنج جوس پلواتی ہوں۔" اس نے لان میں پڑی لوہے کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ وہاں کی چھوٹی سی کینٹین والے بابا کو آواز دے کر بولی۔ "بابا دو گلاس جوس بھجوائیے گا۔"

ہم دونوں جامن کے ایک پستہ قد پودے تلے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں دوسری لڑکیوں اور ان کے ملاقاتیوں کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد میں نے کہا۔ "بڑی عجیب سی بات ہے۔ میں نے بہت سے لڑکوں کو یہاں لڑکیوں سے ملنے کے لیے آتے دیکھا ہے مگر کوئی لڑکا ایسا نظر نہیں آیا جو پیدل آتا ہو، جس کا لباس میلا اور شکن آلود ہو یا چہرے مہرے اور حلیے سے غریب نظر آتا ہو۔ جبکہ ظاہر ہے غربت ہمارے ہاں سے ختم نہیں ہو گئی...... وہ تو ہمیشہ کی طرح شرم ناک حد تک موجود ہے اور اس کے ختم ہونے کا شاید ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے...... کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی لڑکی کسی غریب اور مفلوک الحال لڑکے سے ملنا پسند نہیں کرتی؟"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی اور بولی۔ "اتنی تعلیم حاصل کر کے اور اتنی خود مختارانہ زندگی گزار کر لڑکیوں میں کم از کم اتنا شعور تو آ ہی جاتا ہے...... یا یوں کہو کہ ان کے محسوسات میں کسی قدر حقیقت پسندی اور ہلکی سی سفاکی آ جاتی ہے اور وہ زنانہ رسالوں کے افسانوں والے تصوراتی ماحول سے نکل آتی ہیں۔ انہیں مستقبل کے لیے سیکیورٹی درکار ہوتی ہے...... ان کے پاس ناکام تجربوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مسائل حل کرنا چاہتی ہیں، مسائل میں اضافہ نہیں چاہتیں۔ اتنی موٹی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟"

یہ موٹی سی بات میری سمجھ میں تو آتی تھی لیکن میں اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا اور اسے یاد دلانا چاہتا تھا کہ میرے پاس سیکیورٹی تھی، تحفظ تھا۔ مجھ سے زیادہ اسے تحفظ کون دے سکتا تھا؟ پھر وہ مجھ سے کیوں بھاگ رہی تھی؟

بابا سے جوس کا گلاس لے کر میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا اور ان سوالوں پر غور کرتا رہا لیکن کوئی جواب پائے بغیر واپس آ گیا۔

یونہی دن گزرتے رہے۔ روح کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی۔ سوالات اسی طرح دل کے ویرانے میں گونجتے تھے اور کوئی جواب نہ پا کر پیاسے وجود کے در و دیوار سے سر پھوڑتے رہے۔

میرے روز و شب اسی خالی پن کی سی کیفیت میں گزر رہے تھے۔ سلطانہ کے ملنے کے بعد گھپ اندھیرے میں

کہیں کہیں جگنو چمکنے لگے تھے لیکن جگنوؤں کا بس یہی ہے کہ ایک پل چمکے دوسرے پل غائب۔ سلطانہ سے میری ملاقات ہوتی اور بس ختم ہو جاتی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔ کوئی موضوع ہماری زد سے نہ بچتا۔ بس وہی ایک بات نہ ہو پاتی جس کے لیے دل ترستا تھا۔ کچھ ان کہے سے لفظ پر کٹے کبوتروں کی طرح روح کے گنبد میں پھڑپھڑاتے رہتے۔ اسی عالم میں سال کا آخری سمسٹر بھی ختم ہو گیا۔ اس روز میں اس سے ملنے اس کے ہوسٹل پہنچا تو وہ اپنا سوٹ کیس لان میں رکھے بیٹھی تھی۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ بولی۔

"مگر تم نے تو مجھے یہاں آنے کے لیے نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں نے اس وقت آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں تو بغیر پروگرام کے آ گیا ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے پھر بھی یقین تھا کہ تم آؤ گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "شاید میرا یقین ہی تمہیں کھینچ لایا ہے۔" یکایک اس کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور ایک لمحے کے توقف سے وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں گاؤں جا رہی ہوں۔"

"گاؤں......؟ کون سے گاؤں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ گو مجھے معلوم تھا کہ آخری سمسٹر کے بعد چھٹیاں ہو چکی تھیں اور سبھی ہوسٹلرز اپنے گھروں کو جا رہے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا ہوسٹل کے علاوہ بھی کوئی ٹھکانا تھا۔ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔

"اب کون سے گاؤں میں ٹھکانا بنا لیا تم نے؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"فرخ آباد، شیخوپورہ کے قریب ہے۔" اس نے بتایا۔ "شہر میں رہنا میں افورڈ نہیں کر سکتی تھی اور کچھ دوسری وجوہات بھی ہیں۔ اس لیے اصل گھر فرخ آباد میں ہے۔"

"وہ تو زیادہ دور نہیں، چلو میں تمہیں گاڑی میں ہی چھوڑ آؤں۔ میں تمہارا گاؤں اور تمہارا گھر دیکھنا چاہتا ہوں...... کون کون رہتا ہے وہاں؟" میں روانی سے کہتا چلا گیا۔

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ میں نے اضطراب کی جھلک دیکھی ورنہ میرے خیال میں تو اس کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے اسے کبھی کسی حال میں پریشان اور فکر مند نہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے کسی سوچ میں غلطاں رہنے کے بعد وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکا کر بولی۔ "چل کر خود ہی دیکھ لینا۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس کے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں کبھی کبھار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا۔ وہ جب بھی میرے برابر گاڑی میں بیٹھتی، میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہتا کہ وہ میرے ساتھ نہایت جچتی تھی، بہت خوبصورت لگتی تھی۔ حالانکہ وہ خوبصورتی کے مروجہ پیمانوں پر پوری نہیں اترتی تھی۔ نہ تو اس کی رنگت گلابوں کو شرماتی تھی اور نہ ہی اس کے لب پنکھڑی سے تھے...... مگر بس اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر بہت دلکش تھا۔

راوی کے پل پر میں نے ٹول ٹیکس دینے کے لیے ایک لمحے کو گاڑی روکی۔ اسی لمحے نہ جانے کہاں سے ایک بھکارن نمودار ہو کر کھڑکی سے تقریباً لٹک ہی گئی۔

"بابو جی! اللہ جوڑی سلامت رکھے۔" اس نے روایتی دعا دی۔

"یہ لوگ شاید پل صراط پر بھی پہنچ جائیں گے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اور وہاں بھی یہی افسانوی دعا دیں گے۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کتنے ہی افسانوں میں اس قسم کی صورت حال پڑھی ہے کہ ہیرو، ہیروئن سیر کو نکلے تو راستے میں ملنے والی کسی بھکارن نے انہیں میاں بیوی سمجھتے ہوئے یہی دعا دی۔"

"چلو آج تجربہ بھی ہو گیا۔" میں نے بھکارن کے ہاتھ پر پیسے رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"مجھے صرف اس چیز سے الجھن ہوتی ہے کہ بھکاریوں کی دعائیں خلوص سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے لبوں پر دعائیں اسی طرح گردش کرتی رہتی ہیں جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کر دیا ہو۔" سلطانہ کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔

"ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "دعاؤں کی مشین ہوتے ہیں یہ لوگ۔" پھر میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ بے چارے بھی کیا کریں۔"

کار اب لاہور، شیخوپورہ روڈ پر فراٹے بھر رہی تھی۔ سڑک ناہموار تھی مگر دیو پیکر مرسڈیز میں ہمیں دھچکے نہیں لگ رہے تھے۔ سلطانہ اب بالکل خاموش تھی اور سامنے سڑک کی سرمئی پٹی پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

میں تصور ہی تصور میں اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کے والد نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور رات کو کھانے کی میز پر دیر تک میرے بارے میں، میرے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی بیٹی کی ذہانت اور خوش خلقی کے بارے میں بتاتے رہے۔ باتوں

باتوں میں انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ فائنل ایئر کا رزلٹ آتے ہی وہ اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتے ہیں۔"

"ادھر مڑنا ہے۔" سلطانہ نے میرا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔ تب میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ ہم شیخوپورہ کی حدود سے نکل آئے تھے۔ میں نے سلطانہ کے اشارے کے مطابق گاڑی کچی سڑک پر موڑ دی۔

چار چھ میل کے سفر کے بعد سلطانہ نے جس گھر کے سامنے گاڑی رکوائی، وہ خاصا معقول قسم کا ایک نیم پختہ مکان تھا۔ اس کی چار دیواری سے دو تین درختوں کی شاخیں باہر جھانک رہی تھیں جن پر مالٹے لگے ہوئے تھے۔ مکان کا دروازہ بالکل کوتاہ تھا اور مجھ جیسے قد آور شخص کے لیے کافی چھوٹا تھا۔ میں دروازے پر ہی رک گیا۔ دروازے کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ میرے رکنے کا سبب میری ہچکچاہٹ تھی۔

سلطانہ اندر پہنچ چکی تھی۔ وہ رک کر مڑتے ہوئے بولی۔ "آجاؤ، آجاؤ، شرماؤ نہیں۔"

میں اندر پہنچا تو سامنے چارپائی پر وہی بوڑھا بیٹھا تھا جو سلطانہ کے ہوسٹل میں چھوٹی سی کینٹین چلاتا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے تعجب ہوا تھا۔

سلطانہ نے سوٹ کیس چارپائی پر رکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ "شہریار! یہ میرے بابا ہیں...... میرے والد صاحب۔"

مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا لیکن میں نے اپنی حیرت پر فوراً قابو پا کر سلطانہ کے والد کو سلام کیا پھر ہموار لہجے میں کہا۔ "تم نے پہلے کبھی بتایا نہیں۔"

"دنیاداری کی مصلحتوں نے اجازت نہیں دی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اور پھر بابا کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں ہوسٹل میں ان کے ساتھ غیروں کی طرح ملوں تاکہ دوسری لڑکیوں میں میری سبکی نہ ہو۔ کیونکہ یونیورسٹی پہنچ کر بھی سوشل اسٹیٹس کے بارے میں لڑکے لڑکیوں کے ذہن کشادہ نہیں ہوتے۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں کینٹین والے بابا کی بیٹی ہوں تو ان کے رویے میں حقارت آجائے گی۔"

پھر وہ اندر ایک کمرے کی طرف بڑھی اور مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کمزور سی روشنی کا ایک بلب چھت سے لٹک رہا تھا اور اس روشنی میں ایک معمولی مگر صاف ستھرے بستر پر ایک نوجوان لیٹا نظر آرہا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا خوب صورت اور پرکشش نوجوان تھا لیکن اس کی آنکھوں میں مصر کے اہراموں کا سا سونا پن اور چہرے پر تاج محل کی سی بے روح سفیدی تھی۔ پہلی نظر میں وہ چہرہ زندگی سے عاری معلوم ہوتا تھا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کے سینے تک لحاف تھا اور اس کی ویران آنکھیں دروازے پر ہی جمی تھیں۔

"فاروق! میں آگئی ہوں۔" سلطانہ یہ کہتے ہوئے لپک کر بستر پر پہنچی اور والہانہ انداز میں اس نوجوان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ پھر اس نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "ان سے ملو شہریار! یہ میرے شوہر فاروق ہیں۔"

نوجوان کا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا۔ میں نے تنویمی سی حالت میں اسے تھام لیا۔ وہ ہاتھ برف کی طرح سرد تھا یا پھر شاید میرے اندر ہی کہیں جذبوں کی چٹانوں پر برف باری ہو رہی تھی۔

"یہ شہریار ملک ہیں......" سلطانہ نے اپنے شوہر کو بتایا۔ "یہ بھی یونیورسٹی میں ہی پڑھتے ہیں۔ یہ ہمارے اسی گاؤں کے ہیں جہاں ہم اس وقت رہتے تھے جب میں بہت چھوٹی تھی۔ بہت بڑے زمیندار کے بیٹے ہیں مگر اب انہوں نے زمینیں بیچ دی ہیں۔"

فاروق کچھ نہ بولا۔

"یہ بیمار ہیں کیا؟" میرے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"کافی دن پہلے ایک حادثے میں فاروق کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ورنہ پہلے یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ شوقیہ کوہ پیما تھے۔ چھوٹی موٹی کئی چٹانیں سر کر چکے تھے۔ پھر کچھ بڑی مہمات کی تیاری کر رہے تھے کہ حادثہ پیش آگیا۔" سلطانہ نے بتایا اور کچھ یوں خاموش ہو گئی جیسے کل داستان بس یہی تھی۔ یہی آغاز تھا، یہی انجام۔ یہی تفصیل تھی اور یہی اختصار تھا۔ میں مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔ سلطانہ نے تو یہی کہا تھا کہ وہ کئی چھوٹی موٹی چٹانیں سر کر چکا تھا لیکن میری نظر میں وہ بہت بڑا کوہ پیما تھا۔ اس نے سلطانہ جیسے ہمالیہ کو سر کر لیا تھا۔ میں تو اس سنگلاخ اور برف پوش پہاڑ سے سر ہی پھوڑتا رہ گیا تھا۔

نوجوان کی آنکھوں کا سونا پن کچھ بڑھ گیا تھا اور وہ اسی طرح ساکت سے انداز میں پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ جن میں شکوک و شبہات کی پرچھائیاں کھڑی مجھے گھور رہی تھیں۔

"بیٹھ جائیے۔" آخر نوجوان نے کہا اور اس کے سپید سے ہاتھ نے حرکت کی۔

"بس، شکریہ...... میں چلتا ہوں، میں صرف سلطانہ کو

چھوڑنے آیا تھا۔" میرے دل کے قبرستان سے آواز ابھری اور میں دروازے کی طرف مڑ گیا۔

سلطانہ مجھے چھوڑنے باہر تک آئی۔ کار کچے میں ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ سلطانہ درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا، کیا سلطانہ؟" میری آواز ان آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی جو بہہ نہیں پا رہے تھے۔

"میں نے کوئی ایسا کام تو نہیں کیا...... میں نے شادی ہی تو کی تھی۔" وہ بڑی سادگی سے بولی۔ "فاروق اس وقت بالکل ٹھیک تھا، صحت مند اور خوبصورت۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی اس کی، اتنی کہ جس سے سفید پوشی سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ وہ زمین اب بک چکی ہے، اس کے علاج پر لگ چکی ہے۔"

اسی سادگی آمیز بے چارگی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے وہ بولی۔ "اب کیا کریں...... حادثہ ہو گیا...... حادثوں پر تو کسی کا اختیار نہیں ہے نا۔"

"ہاں...... حادثوں پر تو کسی کا اختیار نہیں اور جذبوں پر بھی۔" میں نے سرگوشی سے کہا اور کئی لمحے تک یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ سر جھکائے جوتی کی نوک سے زمین کریدتی رہی۔

آخر کار میں اسے خدا حافظ کہہ کر کار میں بیٹھا اور نہایت سست رفتاری سے واپس روانہ ہو گیا۔ میرے ہاتھ پیروں میں ایک خفیف سی کپکپاہٹ طاری تھی جیسے میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کپکپاہٹ بھی ختم ہو گئی اور میرے اندر ایک عجیب سی یخ بستگی اور سناٹا چھا گیا۔ میرے ہونٹوں سے کوئی آہ تک نہ نکلی۔ میں بس سوچتا رہا...... سوچتا رہا اور جب میں اپنے گھر کے ڈرائیو وے میں داخل ہوا تو مجھے حیرت ہوئی کہ راستے میں میرا ایکسیڈنٹ کیوں نہیں ہوا؟

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی اور اگلے دن میں بغیر کچھ کھائے پیے نیو کیمپس کے ویران ہوسٹلوں کے قریب نہر کے کنارے جا بیٹھا اور گھاس کی پتیاں توڑ توڑ کر نہر میں پھینکتا رہا۔ میں شاید غمزدہ بھی نہیں تھا۔ کم از کم اس طرح غمزدہ نہیں تھا جس طرح لوگ غمزدہ ہوتے اور روتے دھوتے تھے۔ میرے اندر تو بس ایک ہولناک سناٹا چھا گیا تھا جس سے مجھے خوف آرہا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میں نہ تو رویا اور نہ ہی مجھے دل کا دورہ پڑا۔ نہ ہی میں نے پی اور نہ ہی مجھے سلطانہ پر غصہ آیا۔

چھٹیاں ختم ہونے پر ہوسٹلز آباد ہو گئے۔ بابا بھی اپنی کینٹین پر آگئے اور سلطانہ سے بھی میری ملاقات ہونے لگی۔ ہم پھر اسی طرح ملے جیسے پہلے ملتے تھے۔ میں نے کسی شکستگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی سلطانہ نے کچھ پوچھا یا بتایا۔ ہم حسب معمول باتیں کرتے اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے اچانک یوں خاموش ہو جاتے جیسے ہمارے درمیان کوئی اجنبی آن کھڑا ہو۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی اس تبدیلی کے بارے میں کچھ نہ کہتا۔ میں اس کی پسند کے سانچے میں ڈھلنے کی کوشش کرتا اور اسی طرح باتیں کرتا، جیسی وہ پسند کرتی۔ ایک عرصے تک میں نے اس کے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے بھی دل کا کوئی بھید کھلنے نہ دیا۔

ایک بار میں نے صرف اتنا پوچھا۔ "تم نے کیا سوچ کر فاروق سے شادی کی تھی؟"

"میں کوئی بھی کام زیادہ غور کر کے نہیں کرتی۔" اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "یہی کیا کم تھا کہ اسے مجھ سے اور مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اسی نے درحقیقت مجھے سلطان سے دوبارہ سلطانہ بنایا تھا اور پھر وہ تھا بھی میری ہی کلاس کا آدمی۔ وہ اتنا دولت مند نہیں تھا کہ میں اس سے خوف محسوس کرتی اور مجھے اندیشہ محسوس ہوتا کہ کسی دن اس کے گھر میں میری حیثیت کھلونے کی سی ہو جائے گی۔"

"معلوم نہیں کلاس کا کمپلیکس تمہیں کیوں اس بری طرح چمٹا ہوا ہے۔" میں یہ کہتے کہتے رک گیا۔ بہرحال، اب اس سلسلے میں بات کرنے کا، بحث کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ کارواں بہت آگے نکل چکا تھا۔

ایک روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔

اس روز میں اور سلطانہ گلبرگ کے ایک چائنیز ریستوران سے کھانا کھا کر نکلے تھے۔ کیمپس پہنچ کر اس نے ہوسٹل سے ذرا دور ہی اچانک گاڑی رکوا کر کہا۔ "شہریار، مجھے دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔"

میں نے یہ نہیں پوچھا کہ اسے روپیہ کس مقصد کے لیے چاہیے تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس سے کچھ پوچھنا اس کی توہین ہوگی۔ اگر اس نے اچانک یہ سوال کیا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی لمبی کہانی ہوگی۔ اس نے اپنی انا اور خودداری کو نہ جانے کتنا دبایا تھا اور اس کے بعد حلق میں پھنسے ہوئے گولے کی طرح اچانک ہی یہ جملہ اگل دیا تھا۔ ویسے بھی میں اس کا مقروض تھا۔ اس کا قرض تو شاید میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا تھا۔

میں نے خاموشی سے پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا بریف کیس اٹھایا، چیک بک نکالی اور اسے دس لاکھ کا چیک لکھ دیا۔ چیک لے کر اس نے نہایت احتیاط سے اپنے پرس میں موجود ایک نوٹ بک میں رکھ لیا۔

کار کی کھڑکی سے ایک مرکری بلب کی روشنی ترچھے رخ سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ یہ مرکری بلب سڑک کے کنارے کھڑے الیکٹرک پول پر لگا ہوا تھا۔ اس کی چمکیلی سفید روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی ایک لمحے کے لیے جھلملائی تھی۔ یہ نمی میں نے پہلی اور آخری مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

اس سے اگلے روز وہ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ کئی دن تک وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ رزلٹ بھی کب کا آچکا تھا۔ بابا سے بھی میں نے کچھ نہ پوچھا۔ میں کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ مبادا کسی سوال کے پردے سے کوئی بھیانک حقیقت سانپ کی طرح پھن پھیلائے مجھ پر جھپٹ پڑے۔

سلطانہ کے بابا عجیب شکستہ اور مضمحل انداز میں سر جھکائے کینٹین میں اپنے کام میں مصروف رہتے۔ نہ وہ میری طرف دیکھتے اور نہ ہی میں ان کی نظر میں آنے کی کوشش کرتا۔

میں اکثر سلطانہ کے بارے میں سوچا کرتا کہ وہ مجھے کچھ بتائے بغیر کہاں چلی گئی؟ پھر میں نے سوچا کہ وہ کیوں مجھے بتا کر جاتی؟ میں اس کا کیا لگتا تھا؟ اس پر میرا کیا حق تھا؟ میں روز اس سے ملنے کی آس لے کر ہوسٹل جاتا اور مایوس واپس آجاتا۔

میں نے کئی بار دل ہی دل میں ارادہ کیا بھی کہ سلطانہ کے بابا سے اس کے بارے میں پوچھوں۔ وہ بہ دستور اپنی چھوٹی سی کینٹین میں نظر آتے تھے لیکن میں جب بھی ہوسٹل جاتا، اپنے اس ارادے پر عمل نہ کر پاتا۔ میں سوچتا کہ اگر بتانے والی کوئی بات ہوتی تو شاید وہ خود ہی بتا دیتے۔ بلکہ سلطانہ بھی چاہتی تو بتا کر جاسکتی تھی۔

اپنے اندر کی اس کشمکش کے باوجود آخر کار میں ایک روز پکا ارادہ کر کے ہوسٹل پہنچا کہ آج ضرور بابا سے سلطانہ کے بارے میں پوچھوں گا...... مگر اس روز بابا نے مجھے دیکھ کر خود ہی اشارہ کر کے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ انہیں یقیناً یہ اندازہ تو تھا کہ میں سلطانہ کی تلاش میں گویا خود اپنی روح کے صحرا میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ میں اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا بابا کے قریب پہنچا۔ ان کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں جیسے ساری رات روتے رہے ہوں۔

انہوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“

”مگر سلطانہ کہاں ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

بابا نے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے میں نے ان کا کوئی خوابیدہ زخم چھیڑ دیا ہو۔ وہ لرزتی سی آواز میں بولے۔ ”مجھے تو خود معلوم نہیں، وہ کہاں ہے۔“

”کیا مطلب......؟ تو یہ لفافہ......؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ لفافہ تو کل ایک لڑکا مجھے دے گیا کہ شہریار صاحب کو پہنچا دیں...... سلطانہ تو کئی روز سے غائب ہے۔“

پھر انہوں نے شاید آنسو ضبط کرنے کے لیے منہ پھیر لیا اور اسی عالم میں بولے۔ ”فاروق کو یقین تھا کہ وہ تمہارے ساتھ گئی ہوگی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے خلاف تھانے میں رپٹ درج کراؤں لیکن میں نے اسے سمجھا بجھا کر باز رکھا۔ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں گئی۔ اگر وہ تمہارے ساتھ گئی ہوتی تو تم اس کی تلاش میں یوں نہ بھٹک رہے ہوتے۔ وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں جاسکتی۔ جس طرح فاروق سمجھ رہا ہے...... کم از کم اس طرح بھاگ کر نہیں جاسکتی...... وہ میری بیٹی ہے، اسے میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔“ ان کی آواز رندھ گئی اور وہ کینٹین کے پچھلے حصے میں چلے گئے۔

میں لفافہ لے کر اپنی گاڑی میں آبیٹھا اور چند لمحے اسے تکتا رہا۔ میں اسے کھولتے ہوئے ایک انجانا سا خوف محسوس کر رہا تھا۔ اس کاغذی قفس میں نہ جانے کون سے بھید مقید تھے۔

آخر میں نے حوصلہ مجتمع کر کے اسے کھولا۔ اس میں سے کئی صفحات پر مشتمل ایک خط برآمد ہوا جس کے ایک کونے پر میرا دیا ہوا دس لاکھ کا چیک بھی جوں کا توں پن کے ذریعے منسلک تھا۔ میں نے چیک علیحدہ کیا اور خط پڑھنے لگا، لکھا تھا۔

”شہریار! میرے درد آشنا!

تم ایک ایسے مرد ہو، جیسے آج کے دور میں لوگوں کو صرف خوابوں میں مل سکتے ہیں۔ مجھے آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں تم سے اسی نامہرباں، بے رحم اور وفا ناشناس دنیا میں ملی تھی۔

شہریار! تم نے میرے شوہر فاروق کو دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ میری زندگی کا پہلا اور شاید آخری مرد ہے جسے میں نے اپنے دل کے اس قدر قریب محسوس کیا تھا۔ اس سے میں نے جتنی محبت کی، اس سے زیادہ شاید کوئی کسی سے نہیں کرسکتا۔ اس کی خاطر میں نے زندگی قربان کر دی۔ میرے پاس خواب بھی زیادہ نہیں تھے، جو تھوڑے بہت خواب تھے، ان سب کا محور و مرکز فاروق تھا۔

جب فاروق کو حادثہ پیش آیا تو میں نے ان خوابوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے حوصلے مجتمع کر کے تعلیم کے میدان میں نکل آئی، تاکہ پڑھ لکھ کر کوئی اچھی سی ملازمت کرسکوں یا پھر بیرون ملک جاسکوں اور اس

طرح میرے پاس چار پیسے جمع ہوسکیں کیونکہ یہاں کے سرجنوں نے بتایا تھا کہ فاروق کا علاج امریکا میں ممکن ہے جس کے بعد وہ تقریباً ٹھیک ہوجائے گا۔

دو سال سے میں گھسٹ گھسٹ کر اس منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تعلیم کے دوران میں بھی فاروق کا علاج کرانے کے لیے ایک ایک پیسا جمع کرتی رہی۔ بابا جو بھی کماتے میں اسے حتی الامکان کنجوسی سے خرچ کرتی۔ میں نے دو چار بسکٹ کھا کر اور پانی پی کر دو دو دن گزارے ہیں۔ میں نے سہاگن ہو کر بھی دو سال، دو صدیوں سے زیادہ طویل سال کانٹوں پر لوٹتے اور بیواؤں کی طرح گزارے ہیں۔ میں نے اپنی طرف بڑھتا ہوا ہر ہاتھ نفرت سے جھٹکا ہے، خواہ وہ کتنا ہی توانا یا پرکشش تھا۔

یہ سب کچھ میں فاروق کے لیے کر رہی تھی۔ جس سے میں نے...... ایک عورت نے محبت کی تھی۔ مجھ جیسی عورتیں جب محبت کرنے پر آتی ہیں تو تاریخ رقم کرتی ہیں۔ وہ صحرا کی طرح بکھر گیا تھا اور میں اس کا ریزہ ریزہ جمع کر رہی تھی لیکن فاروق کی معذوری کو جتنا عرصہ گزرتا جا رہا تھا، اس کے اندر سے میرا محبوب مٹتا جا رہا تھا، بلکہ شاید اب تو اس کی ذات میں سرے سے کوئی انسان ہی نہیں رہا تھا۔

اس کے دل میں نہ جانے کب سے اندیشوں کے سانپ پرورش پا رہے تھے کہ میں اس کی معذوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر نہ جانے کیا کچھ کرتی پھر رہی ہوں۔ مجھے ان سانپوں کی موجودگی کا شبہ تک نہیں تھا کیونکہ وہ کبھی اس کے دل سے رینگتے ہوئے زبان تک نہیں آئے تھے اور میں معصومیت سے اپنی دھن میں مگن اپنے متعین کردہ رستے پر ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی۔

البتہ میں یہ ضرور محسوس کر رہی تھی کہ اس کی معذوری کو جتنے دن گزرتے جا رہے ہیں، وہ اپنے اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ مجھے بے چینی سی رہنے لگی کہ وہ جتنی جلدی بستر سے اٹھ کھڑا ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ وہی دنیا جہاں میں اس کی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی...... اسی دنیا...... سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ تم مجھے خوابوں کے انسان لگے۔ وہ انسان جس کے ہونٹوں پر خاموشی کے قفل ہوتے ہیں اور جن کے دل سمندروں سے زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس روپیہ بھی تھا۔ ایک رات اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ بقا کی جس جنگ کے لیے میں تنکا تنکا کر کے اسباب جمع کر رہی ہوں، اس کا فیصلہ تم چٹکی بجاتے میں کر سکتے ہو لیکن تم سے مدد مانگنے کا فیصلہ میں چٹکی بجاتے نہ کر سکی۔ خود کو آمادہ کرنے کی کوششوں میں میرے کئی روز و شب گویا انگاروں پر گزرے۔

آخرکار میں نے اپنی خودداری کے سارے بت مسمار کر کے تم سے دس لاکھ کی بھیک مانگ لی۔ کچھ رقم میرے پاس پس انداز ہوچکی تھی۔ مجھ پر تمہاری اچھی رفاقتوں کا قرض ہی کافی تھا کہ میں نے تمہارا مالی قرض بھی سر پر چڑھا لیا۔ کیونکہ میری تاب ختم ہوچکی تھی۔ میرے اندر کوئی طاقت سرگوشیاں کر رہی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے، فاروق کو اس کے قدموں پر کھڑا کردو۔ کہیں یہ غلط فہمیوں کے راستوں پر بہت دور نہ نکل جائے۔

میں نے بڑے مسرور لہجے میں اسے اطلاع دی۔ ”تمہارے علاج کا بندوبست ہوگیا ہے۔ میں نے ایک بہت اچھے انسان سے قرض لے لیا ہے۔“

”کون ہے وہ انسان؟“ اس نے چیک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں اتنی احمق تھی کہ اب بھی اس کے لہجے میں چھپا ہوا خنجر مجھے چونکا نہ سکا۔ محبت واقعی بڑی خوش گمان ہوتی ہے۔

”شہریار ملک۔“ میں نے جواب دیا۔

تب دو سال سے فاروق کے دل میں پلتی ہوئی ساری کمینگی، ساری بداعتمادی، سارا بغض اور سارا تعفن منہ کے راستے ابل پڑا۔ وہ سب کچھ جو اس نے کہا، میری نظر میں وہ اتنا شرمناک ہے کہ میں اسے لکھتے ہوئے خود کو اپنی نظر میں بہت گھٹیا محسوس کروں گی۔ مجھے تمہاری رکھیل قرار دیتے ہوئے اس نے چیک اٹھا کر میرے منہ پر مار دیا۔ اس آدھے گھنٹے میں اس کا بولا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں انگارے کی طرح پیوست رہے گا۔

میں نے اپنا دل پتھر کا بنا لیا تھا شہریار! جو آخرکار ٹوٹ گیا اور پتھر ٹوٹ کر کبھی نہیں جڑتا۔ میں اپنی محبت، وفا اور ایثار کی لاشوں پر قدم رکھتے ہوئے اس چار دیواری سے نکل آئی ہوں۔

فاروق نے جو کچھ کیا؛ بالکل ٹھیک کیا...... کیونکہ وہ انسان ہے، بالکل عام اور سطحی سا انسان، لیکن میں اپنی روح پر سے پچھتاوے کا یہ داغ کبھی نہیں مٹا سکتی کہ میں اتنے طویل عرصے تک ایک بالکل عام اور سطحی سے انسان کو اپنی زندگی سمجھ کر اسے ٹوٹ کر پیار کرتی رہی۔ محبت میں انسان اتنا بے وقوف ہوجاتا ہے؟

شہریار! میرے خیال میں تو جب انسان کی محبت فنا ہوجائے تو اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ اس لیے اب

میں ایسے سفر پر جا رہی ہوں جس میں کوئی پڑاؤ، کوئی منزل نہیں آتی، کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ بس تنہائی ہی اپنے زخموں کا مرہم ہوتی ہے۔ میں وہ بدنصیب ہوں جسے اس کی اپنی آستین سے محبت نے ڈس لیا۔ اب کوئی قیامت نہیں جس کا مجھے انتظار ہو۔ تم سے بس اتنی سی درخواست ہے کہ مجھے ڈھونڈنا مت۔ میں اپنے آپ سے بھی منہ چھپا لینا چاہتی ہوں۔

ایک خواب گم گشتہ...... سلطانہ۔“

خط پڑھ کر میں دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے اپنا پورا وجود سن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اعصاب شل سے ہوگئے تھے۔ غم، دل شکستگی اور غصے کی کیفیات بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ غم اس لیے تھا کہ سلطانہ میری محبت، خلوص حتیٰ کہ عظمت کی بھی قائل ہونے کے باوجود اپنی زندگی کے بارے میں فیصلے کرتے وقت میرے احساسات یا خواہشات کو ذرا بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھتی تھی۔ میں دل شکستہ اس احساس سے تھا کہ میرے جذبہ دل میں اتنی کشش بھی نہیں تھی کہ وہ میری طرف کھنچی چلی آتی؟ وہ بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے کی جرأت رکھتی تھی، بڑے سے بڑا قدم اٹھا لیتی تھی۔ غصہ مجھے بہت سی باتوں پر آ رہا تھا۔ میں خود کو ہمیشہ ایک خوددار اور انا پرست شخص سمجھتا تھا لیکن میری سلطانہ سے محبت اور ایک عجیب و غریب غیر معمولی عشق کا معاملہ آتا تو میری انا اور خودداری نہ جانے کہاں چلی جاتی تھی۔ وہ میری تمام اچھی باتوں کی معترف ہونے کے باوجود ہر باغیانہ فیصلہ کرنے کے بعد کسی اور سمت میں نکل جاتی تھی، میری طرف پلٹ کر نہیں دیکھتی تھی، اس کے باوجود میں تمام تر دلجمعی اور اخلاص کے ساتھ اس موڑ پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا تھا جس پر وہ مجھے چھوڑ جاتی تھی۔ یہ کیسی محبت ہے!

غصہ مجھے اس کے شوہر پر بھی آ رہا تھا۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ سلطانہ نے اس سے محبت کی تھی مگر ساتھ ہی وہ کیسا ناشکرا اور قدرناشناس بھی نکلا کہ اس محبت کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ یکایک میرے جی میں آیا کہ جا کر اس بدبخت کی خوب پٹائی کروں۔ سلطانہ نے اس کی خاطر اپنی زندگی کا ڈھب بدلا تھا۔ لیکن اس نے محض گھٹیا شکوک کی تلوار سے اس کی روح پر ایک گہرا گھاؤ لگا کر ایک بار پھر بھٹکنے کے لیے نہ جانے کون سی تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔ ویسے بھی فاروق جیسے معذور شخص کو مارنا میرے شایانِ شان نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر فاروق کی جگہ میں خود ہوتا تو شاید مجھ سے بھی ایسی حرکت سرزد ہوجاتی۔ شاید مجھے بھی اسی طرح شک کے سانپ ڈسنے لگتے اور شاید میری زبان سے بھی اسی طرح بدگمانی کا زہر ٹپکتا۔ پھر مجھے سلطانہ پر غصہ آنے لگا۔ آخر کسی بھی بات پر اس کا ردعمل عام انسانوں سے مختلف کیوں ہوتا تھا؟ وہ نہ جانے کہاں کہاں در بدر بھٹک رہی ہوگی...... اس خیال کے آتے ہی گویا میرے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ پھر مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ آخر میری محبت دنیا سے انوکھی کیوں ہے؟ میں کیوں ایسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوں جس کے مزاج کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس سے میرا کوئی عہد و پیمان بھی نہیں تھا، جس نے کبھی اشارہ بھی نہیں دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ وعدے کی کسی زنجیر سے بندھنے کے لیے تیار ہے، پھر...... پھر آخر میں کیوں اس کے سحر میں گرفتار ہوں؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے بارہا کوشش کی تھی کہ سلطانہ کا خیال اپنے دل سے نکال دوں لیکن میں اپنی اس کوشش میں ناکام ہی رہا تھا...... نہ جانے وہ لڑکی تھی یا کوئی آسیب جو میرے دل کے ہر گوشے میں گھر کر کے بیٹھ گیا تھا۔

میں نے اس کا خط سنبھال کر بہت حفاظت سے ایک جگہ رکھ دیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔

میرا خیال تھا کہ اب سلطانہ سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوسکے گی اور یہ کہانی اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہے گی لیکن تین برس بعد اس نے ایک عجیب موڑ لیا۔

وہ مجھے وہاں مل گئی جہاں کے بارے میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں بھی پائی جا سکتی ہے۔

میں ان دنوں لندن میں تھا۔ اپنی روح کی تنہائی اور زندگی کی بے مقصدیت سے گھبرا کر میں ذرا سیاحت پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے کچھ ملکوں کے سفر کے بعد میں نے انگلینڈ کا رخ کیا تھا۔ لندن میں دو تین انگریز میرے دوست بن گئے تھے۔ ایک روز ان کی فرمائش پر میں انہیں ایک اردو فلم دکھانے لے گیا تھا اور فلم کے دوران میں مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ آخری شو تھا جسے دیکھ کر ہم ہال سے نکلے تو بکنگ پر بیٹھنے والی لڑکیاں ٹیرس پر کھڑی اپنے کوٹ اور ٹوپیاں سنبھال رہی تھیں۔

ٹیرس کے جنگلے پر کافی دور ایک دراز قد لڑکی فر کا کوٹ پہنے قدرے ترچھی کھڑی تھی اور اتنی تیزی سے سگریٹ پھونک رہی تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لے گا۔ اس وقت برف کے ذروں کی پھوار سی

آسمان سے گر رہی تھی۔ اس کے باوجود لڑکی ننگے سر تھی۔ اس کی ٹوپی جنگلے پر ٹنگی ہوئی تھی۔ دھند کی روشنی میں اس کے بال چمک رہے تھے اور ان بالوں کو میں دور سے ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتا تھا۔

''سلطانہ......!'' میں دوستوں کے حلقے سے نکل کر اندھوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کا جسم یکبارگی بری طرح کانپ گیا۔ یہ کپکپاہٹ میں نے اس کے دبیز کوٹ کے باوجود دیکھ لی۔ سیدھی کھڑی ہو کر اس نے ہیٹ اپنے سر پر رکھ لیا۔

''سلطانہ......!'' میں اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اسی ایک لفظ میں سارے سوال تھے اور اسی ایک لفظ میں سارے جواب۔

اس کا ملیح چہرہ کچھ زرد ہو گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور جس ہاتھ سے وہ سگریٹ پی رہی تھی اس پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں مجھے دھندلی روشنی میں بھی نمایاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے جب آخری بار اسے دیکھا تھا وہ کچھ ایسی مدتوں پرانی بات نہیں تھی۔ صرف تین برس ہی تو گزرے تھے لیکن اس کی حالت میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اس کی روح پر یقیناً غم کا بوجھ بہت زیادہ تھا مگر شاید اس کے علاوہ بھی کوئی چیز اسے اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ جو سگریٹ وہ پی رہی تھی شاید ''سادہ'' نہیں تھی۔ شاید اس نے شکست تسلیم کر لی تھی، شاید اس کی باغی روح تھک گئی تھی...... یا پھر شاید اس نے فرار کا مہلک راستہ تلاش کر لیا تھا۔

''سلطانہ......! آؤ گھر چلیں۔'' آخر میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''گھر......؟ کون سا گھر......؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اسے کھانسی آ گئی۔ کھانسی رکی تو اس نے گویا بات مکمل کی۔ ''بلکہ میرے خیال میں دنیا میں کسی بھی لڑکی کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ گھر تو مردوں کے ہوتے ہیں۔''

''میرا گھر آج بھی ویران ہے سلطانہ!'' میرے حلق سے آواز محض سرگوشی کی حد تک نکل رہی تھی۔ گویا مجھ میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

''تمہارا صرف گھر ویران ہے۔ میری روح تک ویران ہے شہریار!'' اس کی آواز آسمان سے گرتی برف سے بھی زیادہ سرد تھی۔

''میرا ہاتھ تھام لو سلطانہ! یہ میرا اعتراف شکست ہے۔ میں تمہارے سوا کسی کو بھی زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا۔ میرا رواں رواں تمہیں، صرف تمہیں پکارتا ہے۔'' میں نے بہت تاخیر سے ہی سہی لیکن بہرحال اسے اپنی روح کی پکار کے بارے میں بتا دیا۔ میری ٹانگوں میں گویا جان نہیں رہی تھی۔ میں آسمان سے برستی برف کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے میرا ہاتھ نہ تھاما تو میں ریت کے گھروندے کی طرح ڈھیر ہو جاؤں گا۔

''میں اب کسی مرد کا ہاتھ نہیں تھام سکتی۔'' اس نے بھی سرگوشی کے سے انداز میں ہی جواب دیا۔ پھر وہ اتنی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی کہ میں اس کے پیچھے اتنی تیزی سے نہ جا سکا۔

جب میں اس کے تعاقب میں نیچے پہنچا تو لوگوں کے ہجوم میں اس کا دور دور تک کہیں پتا نہیں تھا۔

میں نے اسے لندن میں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں نے پولیس اور امیگریشن والوں تک کی مدد حاصل کی لیکن ایسا لگتا تھا کہ میں اس کا سراغ لگاتا ہوا اس کے جس ٹھکانے پر بھی پہنچتا تھا، وہ وہاں سے آگے روانہ ہو چکی ہوتی تھی۔ آخر میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جب کوئی کسی سے ملنا ہی نہ چاہتا ہو تو پھر اس سے ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مجھ پر تھکن غلبہ پانے لگی تھی۔

میرا دل لندن سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میرا پاکستان جانا ضروری بھی ہو گیا تھا۔ میں وہاں چھوٹی سی ایک انڈسٹری لگانے کی تیاریاں کر کے آیا تھا۔ اب اس کے سلسلے میں میری پاکستان میں موجودگی ضروری تھی۔ جس شخص کو میں کرتا دھرتا بنا کر آیا تھا، اس کے فون پر فون آ رہے تھے۔

آخر میں واپس پاکستان آ گیا اور مصروفیات میں الجھ گیا۔ اس طرح کافی عرصہ گزر گیا۔ میری ہوزری ملز نے کام شروع کر دیا تو میرے روز و شب کچھ معمول پر آ گئے۔ مگر اس دوران میں ایک دن کے لیے بھی سلطانہ کا تصور میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

میرا خیال یہی تھا کہ وہ لندن میں ہی ہو گی مگر ایک روز میں ریگل کے قریب سروس روڈ پر اپنی گاڑی دوسری گاڑیوں کے ہجوم سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فضل دین کیمسٹ کی دکان پر وہ مجھے کھڑی نظر آ گئی۔

جن لوگوں نے پہلے اسے دیکھا ہوا تھا ان میں سے میرے سوا شاید ہی کوئی اسے پہچان پاتا۔ حالانکہ موسم زیادہ سرد نہیں تھا مگر وہ لمبا سا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھی اور گو کہ وہ اب لندن میں نہیں تھی لیکن اس کے سر پر انگریز عورتوں کی طرح چھوٹا سا ہیٹ تھا اور اس کا چہرہ......!

خدا کی پناہ......! مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ کسی مردہ عورت کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کھنڈر دیکھ

کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ عمارت کبھی حسین اور شاندار تھی لیکن اس کھنڈر کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس عمارت کو دیکھ کر لوگ مبہوت اور سحر زدہ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ اتنی سوکھ چکی تھی کہ اوور کوٹ میں بھی اس کے کندھوں کی ہڈیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ سیلز مین اسے کچھ دوائیاں لفافے میں ڈال کر دے رہا تھا اور وہ بار بار منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی کھانسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے گاڑی دکان کی سیڑھیوں کے ساتھ لگا دی اور یوں دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی ڈرائیور اپنی مالکن کے انتظار میں کھڑا ہو۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں اترنے لگی۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے وقت اس نے اچانک سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ لیا۔ وہ یکدم لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ ساتھ ہی اسے زوردار کھانسی آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

سنبھلنے کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم زندگی کے ہر موڑ پر مجھ سے ٹکراتے رہو گے؟''

''یہی میرے جذبے کی صداقت کا ایک ثبوت ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی چیز تو ہے جو مجھے کھینچ کر تمہارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔''

''اور میں اب دوڑتے دوڑتے تھک گئی ہوں۔'' اس نے یوں دھیمے لہجے میں کہا گویا یہ اس کے نزدیک ایک نہایت ہی شرمناک سا اعتراف ہو۔ کھانسی اسے ایک بار پھر اٹھ رہی تھی۔

''شکر ہے، تمہیں بھی احساس ہوا کہ انسان کبھی تھک بھی جاتا ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

اس نے افسردہ سے انداز میں سر ہلایا۔ ''اور زیادہ تیز دوڑنے والے تو جلد ہی تھک جاتے ہیں۔''

''آخر مجھ سے فرار حاصل کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی؟'' میں نے دکھ سے پوچھا۔

''جب یہ احساس ہوا تھا کہ مجھے تمہارا ہاتھ تھام لینا چاہیے، اس وقت دراصل اپنا آپ تمہارے قابل نظر نہیں آیا تھا۔'' وہ پژمردہ سے لہجے میں بولی۔ ''اب یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ایک ایماندار، مخلص، سچے اور محبت کرنے والے انسان کو وہ پروڈکٹ دی جائے جسے گھٹیا انسان بھی ٹھکرا چکے ہوں۔''

''انسان اور پروڈکٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں قدرے غصے سے کہا۔ ''تم کبھی اپنے آپ کو صحیح نہج پر سوچنے کی عادی نہیں بنا سکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری بربادیوں کے نقطۂ آغاز پر میرے مرحوم باپ کا نام لکھا ہے لیکن اس کے بعد سے تم نے اپنے آپ کو خود بھی ہر طرح سے برباد کیا ہے۔''

''اب اتنی تاخیر سے فرد جرم عائد کرنے کا فائدہ؟'' وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی۔ پھر اس نے یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی ہماری باتیں سن رہا ہو گا۔ میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خلاف توقع بلا حیل و حجت بیٹھ گئی۔

''میرے گھر یا تمہارے گھر؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو آج کل جہاں رہ رہی ہوں وہ کمرا مکان مالکن نے اس شرط پر مجھے دیا تھا کہ کوئی مرد ملاقاتی وہاں مجھ سے ملنے یا میرے ساتھ نہیں آئے گا۔'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں سیٹ پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

''بابا کہاں ہوتے ہیں؟''

ممالک، زبان، کرنسی اور رنگ

(1) انڈونیشیا میں سرکاری زبان بہاسا ہے جبکہ ڈچ اور دیگر چالیس علاقائی زبانیں بھی ہیں۔ کرنسی روپیہ اور سین ہے جبکہ پرچم پر متوازی سرخ اور سفید پٹیاں بنی ہوئی ہیں۔

(2) اردن میں عربی زبان بولی جاتی ہے جبکہ کرنسی اردنی دینار اور فلس ہے۔ پرچم پر تین سیاہ، سبز اور سفید متوازی پٹیاں ہیں جبکہ بائیں طرف ایک سرخ مثلث بنی ہے جس میں سات کناروں والا زرد رنگ کا ستارہ بنا ہوا ہے۔

(3) الجزائر میں سرکاری زبان عربی ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی بھی بولی جاتی ہے۔ فارسی اور بربر زبانیں بھی موجود ہیں۔ کرنسی دینار ہے اور عمودی سبز اور سفید رنگ کا پرچم ہے۔ اس کے درمیان میں سرخ ابھرتا ہوا چاند بنا ہوا ہے۔

(4) افغانستان میں پشتو، فارسی اور دیگر علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کرنسی افغانی ہے۔ سیاہ، سرخ اور سبز تین متوازی پٹیاں درمیان میں قومی نشان بنا ہوا ہے۔

(5) البانیہ میں البانی زبان بولی جاتی ہے جبکہ کرنسی لیک اور فرانک ہے۔ سرخ رنگ پر دو سروں والی چیل اس کے اوپر سرخ پانچ نوکوں والا پیلے رنگ کا ستارہ ہے۔

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔

"افسوس ہوا سن کر...... باقی باتیں میرے گھر چل کر ہوں گی۔" میں نے حقیقی تاسف سے کہا۔

"تمہاری بیوی برا نہیں منائے گی؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ہوتی تو شاید برا مناتی۔" میں نے کہا۔

"تو کیا تم نے اب تک شادی نہیں کی؟" اس نے بری طرح چونک کر میری طرف دیکھا اور اسے ایک بار پھر کھانسی آگئی۔

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ بعض لوگ مجھ سے بھی کہیں بڑی عمر تک شادی نہیں کرتے۔ تمہیں شاید یاد نہیں کہ میں انتظار کی ایک مثال قائم کرنا چاہتا ہوں۔ میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"لیکن میں صرف موت کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ہم موت سے تھوڑی سی زندگی کی بھیک مانگ لیں گے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کسی کو حاصل کرنے کے معاملے میں تم بہت ضدی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی مسکراہٹ میں پہلی بار زندگی کی رمق دکھائی دی۔ "بنیادی طور پر زمیندار ہونا اور وہ بھی شاہ زیب ملک کے بیٹے۔ ولدیت کا کچھ نہ کچھ اثر تو آنا ہی تھا۔ فرق صرف یہ ہے اس کی ضد چیختی دھاڑتی اور ہر رکاوٹ کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے والی تھی جبکہ تمہاری ضد ٹھنڈی، پرسکون اور انتظار کرنے والی ہے۔"

میں نے اس سے بحث کرنے، دلیلوں میں الجھنے یا اسے یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کہ اب میں زمین یا جاگیر کا مالک نہیں رہا تھا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے لندن سے واپس آنے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا؟"

"میں بہت بیمار ہو گئی تھی...... اور چونکہ مجھے وہاں سٹیزن شپ نہیں ملی تھی اس لیے سوشل سیکیورٹی کے تحت میرا علاج نہیں ہو سکتا تھا...... اور پرائیویٹ علاج میں زکام، بخار کا بھی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ لوگ یہاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک سفاک ہیں لیکن انہی کے درمیان سے کسی نہ کسی کونے کھدرے سے کوئی نہ کوئی خدا ترس بھی نکل آتا ہے۔ میں نے سوچا یہاں مروں گی تو کوئی چندہ کر کے ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ عزت آبرو سے دفن تو کر دے گا۔ مردہ خانے میں نہیں پڑی رہے گی لاش...... انگریز بھی کیا سوچیں گے کہ کیسی لاوارث لڑکی ہے، کوئی اس کی لاش بھی لینے نہیں آیا۔"

وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسی اور بولی۔ "میں انگریزوں کو اپنی لاش پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔"

میرے دل کو جیسے کوئی بار بار مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا مگر میں بہ ظاہر سکون اور خاموشی سے کار ڈرائیو کیے جا رہا تھا۔

گلبرگ پہنچ کر میں نے گھر جانے کے بجائے کار ایک اور جگہ لے جا کر روکی۔ یہ ایک چھوٹا سا مگر نہایت مہنگا پرائیویٹ اسپتال تھا۔ اس کا مالک ڈاکٹر بلال میرا جاننے والا تھا۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟" اس نے اسپتال کا بورڈ پڑھتے ہوئے کہا۔ پڑھتے وقت وہ یوں آنکھیں سکیڑ رہی تھی جیسے اس کی نظر بہت کمزور ہو گئی ہو۔

"تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تمہیں بہت زیادہ اور بہت اچھے علاج کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "میں خود گزیدہ ہوں۔ میرا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں۔"

"زیادہ افسانوی بننے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے گاڑی سے اتارا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

"خاموشی سے میرے ساتھ اندر چلو۔" میں نے اسے ہدایت کی اور اسے اندر لے گیا۔ اسے ویٹنگ روم میں بٹھا کر میں جا کر ڈاکٹر بلال سے ملا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی اس کے ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ وغیرہ کرا لیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی کوئی رائے یا مشورہ دے سکوں گا۔" ڈاکٹر بلال نے کہا۔

میں ویٹنگ روم میں واپس آیا۔ ایک اٹینڈنٹ میرے ساتھ تھا۔ وہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں وہیں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سلطانہ کی واپسی ہوئی۔ وہ اب اور بھی زیادہ نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔

"خدا کی پناہ!" وہ صوفے پر ڈھیر ہو کر ہانپتے ہوئے بولی۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں میرے اتنے ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ وغیرہ ہوں گے۔ جسم میں جو دو چار قطرے خون باقی تھا کم بختوں نے وہ بھی نکال لیا۔"

وہ اپنی کلائی سہلانے لگی۔ اس کی گداز اور خوبصورت کلائی اب بالکل سوکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر نیلی رگوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

"لندن میں تم کیا کرتی تھیں؟ میرا مطلب ہے گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں کے عام معاوضوں سے آدھے معاوضے پر ایک چھوٹی سی فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ وہاں کینوس کی

جیکٹیں بنتی تھیں...... اور ہم اس طرح کام کرتے تھے جیسے جیل میں قید ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس خصوصی ویٹنگ روم میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر ندیدے پن سے گہرے گہرے کش لینے لگی۔

سگریٹ نہایت گھٹیا برانڈ کا تھا اور اس کا تلخ دھواں مجھے برا لگ رہا تھا لیکن میں نے اسے سگریٹ پینے سے منع نہیں کیا۔ میرے خیال میں ابھی اس کے لیے وقت مناسب نہیں تھا۔

مزید ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر بلال نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ ساری رپورٹیں وغیرہ اس کی میز پر پہنچ چکی تھیں۔ ہنگامی انداز میں کام کیا گیا تھا۔

"میں حیران ہوں شہریار!" وہ حد سے زیادہ سنجیدہ اور متفکر لہجے میں بولا۔ "کہ یہ عورت اب تک اپنے ساتھ کیا کرتی رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ اپنے آپ سے انتقام لیتی رہی ہے۔ اسے خود پر ذرا بھی ترس نہیں آیا اور میں اس پر بھی حیران ہوں کہ تم اسے اتنی تاخیر سے میرے پاس کیوں لائے ہو۔ دنیا کی مہلک ترین منشیات استعمال کر کے اس نے اپنا بیڑا غرق کر لیا ہے۔ اس کے پھیپھڑے، گردے اور دیگر جسمانی اعضا تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اس کے بچنے کی امید کم ہی نظر آتی ہے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس سے تمہارا کوئی جذباتی تعلق ہے۔ اس لیے میں اسے بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا اور ذاتی توجہ سے اس کا علاج کروں گا۔ اسے بہت طویل اور سخت علاج اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مکمل صحت یاب ہو گی یا نہیں۔"

"تمہیں یہ بازی جیتنے میں میری مدد کرنا ہو گی بلال!" میرے لہجے میں ہزاروں التجائیں پنہاں تھیں۔

"اس وقت میرے ہاں کوئی کمرا خالی نہیں ہے لیکن کل تک میں اس کے لیے کمرے کا انتظام کرا دوں گا۔ تم اسے کل شام لے آؤ۔ میں ایڈمٹ کر لوں گا۔" وہ بولا۔

"تھینک یو بلال!" میں نے کہا اور واپس ویٹنگ روم میں آیا۔ سلطانہ اب قدرے پرسکون بیٹھی تھی۔ میں اسے گھر لے آیا۔

کھانے کے وقت تک وہ کئی سگریٹیں پھونک چکی تھی۔ کھانا اس نے برائے نام ہی کھایا البتہ دوائیں کئی کھائیں پھر غنودگی زدہ لہجے میں بولی۔ "مجھے سخت نیند آرہی ہے۔"

میں نے ایک کمرا اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے تمہارا بیڈ روم، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ ملازم فوراً آجائے گا۔ یہ اس کمرے میں خصوصی انتظام ہے۔ مجھ سے کچھ کہنا ہو تو ملازم ہی کے ذریعے بلوا لینا۔ میں بھی فوراً آجاؤں گا، ملازم ہی کی طرح۔"

وہ خمار زدہ سے انداز میں مسکرائی۔ "تم اتنے مہربان ہو کہ کبھی کبھی تمہارے احسانات کے بوجھ تلے دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"بکواس مت کرو اور سو جاؤ۔" میں نے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

دوسری صبح ملازم نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں دوڑ کر اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ واقعی وہاں نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح غائب ہو چکی تھی جس طرح برسوں پہلے، پہلی ملاقات کے بعد غائب ہو گئی تھی اور گاؤں والی حویلی کے کمرے میں میرے لیے صرف ہولناک سناٹا چھوڑ گئی تھی۔

گزشتہ رات تو مجھے بالکل اندیشہ نہیں تھا کہ وہ یوں غائب ہو سکے گی۔ میرا خیال تھا کہ بستر پر گرنے کے بعد اس میں اٹھنے کی بھی سکت نہیں ہو گی۔ تاہم اس بار یہ فرق ضرور تھا کہ وہ سائڈ ٹیبل پر میرے لیے ایک خط چھوڑ گئی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے اور شکستہ سے لفظوں میں لکھا تھا۔

"مسیحا!

تم میرے لیے خوامخواہ پریشان ہو۔ میرے بچنے کی امید کم ہی ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں تم مجھے خوامخواہ کی بے کار پابندیوں میں مت جکڑو۔ میں خود حیران ہوں کہ میں کیوں آسیب بن کر تمہاری زندگی میں گھس گئی ہوں۔

جہاں تک تمہارا سوال ہے تو میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے یا بے انتہا نفرت؟ جب تم میرے روبرو ہوتے ہو، میں تمہیں دیکھتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے قدموں میں سر رکھ کر جان دے دوں یا تمہارے لیے کوئی ایسا کام کروں جو آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔ لیکن کبھی کبھی میں راتوں کو ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی ہوں کہ شعلوں میں گھری ہوئی ایک عورت دلدوز چیخیں مار رہی ہے، مدد کے لیے چلا رہی ہے مگر جواب میں گولیوں کی تڑتڑ سنائی دے رہی ہے اور وہ عورت میری ماں ہے!

میں پسینے میں شرابور اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اس لمحے میرا دل چاہتا ہے کہ کلہاڑی لے کر دوڑتی جاؤں اور تمہارا سر تن سے جدا کر دوں...... کیونکہ تمہارا باپ شاہ زیب ملک تو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور پیاسے انتقام کو کوئی ہدف چاہیے ہوتا ہے۔

میں سوچتی ہوں، اچھا ہی ہوا کہ میری شادی تم سے نہیں ہوئی ورنہ شاید ایک صبح ایسی بھی ہوتی کہ میرے قریب بستر پر تم مردہ پائے جاتے اور اخبار میں خبر آتی۔ ''سفاک بیوی نے سوتے میں شوہر کا گلا کاٹ دیا۔''

میں کسی طرح بھی دنیا کو سمجھا نہ پاتی کہ جس کا میں نے گلا کاٹا ہے اس سے مجھے بے پناہ محبت تھی۔ اس کے قدموں میں سر رکھ کر میرا جان دینے کو جی چاہتا تھا۔ کون میری بات کا یقین کرتا؟ میری نفسیات میں کوئی بہت بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ میرے ذہن میں کوئی گرہ پڑ گئی ہے جسے کھولنا شاید تمہارے بس میں نہ ہو۔ مجھے جانے ہی دو۔ بہت بے کار سی چیز ہوں میں۔ خدا حافظ...... اور ہاں، کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی ضرور کر لینا۔ مجھ جیسی نہیں ہونی چاہیے۔

فقط تمہاری، سلطانہ۔''

☆☆☆

اس کے تقریباً ایک ماہ بعد ایک شام مجھے ایک فون آیا۔ کوئی عورت لرزاں آواز میں بول رہی تھی ''آپ شہر یار ملک ہیں نا؟''

''جی ہاں، فرمایئے؟''

''وہ جی...... دراصل...... میرا نام کنیز فاطمہ ہے......'' وہ کچھ پریشان لگتی تھی۔ ''میں بیوہ ہوں، اپنے مکان کے چار کمرے میں نے ضرورت مند لڑکیوں کو کرائے پر دیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام سلطانہ ہے......''

''جی ہاں...... جی ہاں، کہاں ہے وہ؟ کیا حال ہے اس کا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''تو آپ اسے جانتے ہیں؟'' خاتون نے گویا اطمینان کی سانس لی۔

''جی ہاں، مسئلہ کیا ہے؟'' میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

''وہ جی...... دراصل دو دن سے اس کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ دستک دینے پر بھی کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ آج میں نے ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھولا تو سلطانہ بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی حالت بہت خراب لگتی ہے۔ بالکل مرنے کے قریب...... میرا مطلب ہے...... اگر آپ اس کے جاننے والے ہیں تو پلیز اسے یہاں سے لے جائیں...... دیکھیں نا...... میں ایک مجبور بیوہ ہوں۔ اگر وہ یہاں مر گئی تو میرے لیے کوئی الجھن یا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ برا مت مانیے گا......''

''آپ مجھے صرف اپنا ایڈریس سمجھا دیجیے۔'' میں نے ان کی مزید معذرتیں سنے بغیر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں سمن آباد سے بول رہی ہوں۔'' وہ اپنے گھر کا محل وقوع سمجھانے کے بعد بولیں ''پلیز، ذرا جلدی آیئے گا۔ اس کی نبض بالکل ڈوب رہی ہے۔''

میں ریسیور رکھنے لگا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کو میرا فون نمبر کہاں سے ملا؟''

''میں نے سلطانہ کے پرس کی تلاشی لی تھی۔'' وہ روانی میں بولیں اور پھر فوراً ہی انہیں گویا صفائی پیش کرنے کا خیال آیا۔ ''اس کے پرس میں کوئی قیمتی چیز روپیہ پیسا کچھ نہیں تھا۔ میں نے تو تین ماہ سے اس بے چاری سے کرایہ بھی نہیں لیا تھا۔ اس کے پرس میں بہت پرانا مڑا تڑا ایک وزیٹنگ کارڈ تھا جو آپ کا تھا۔ اسی پر نمبر دیکھ کر میں آپ کو فون کر رہی ہوں۔''

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحے بعد میری گاڑی آندھی طوفان کی طرح سمن آباد کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ میں ہر موڑ پر، دو پہیوں پر، ٹائروں کی چرچراہٹ کے ساتھ ٹرن لے رہا تھا۔ کئی دیکھنے والوں نے شاید میرا یہ انداز دیکھ کر زیر لب کہا ہو۔ ''نودولتیے کہیں کے!''

میری آنکھیں بار بار آنسوؤں سے دھندلا رہی تھیں اور میں انہیں آستین سے پونچھ رہا تھا۔

جب میں نے پیلی سی اس کہنہ سال کوٹھی کے پورچ میں گاڑی روکی تو ادھیڑ عمر کی ایک فربہ اندام سی عورت تقریباً دوڑتی ہوئی باہر آئی اور پچھلے راستے سے مجھے اینکسی کے ایک کمرے میں لے گئی۔

دونوں ہاتھ سینے پر رکھے سلطانہ ایک چھوٹے سے بیڈ پر ساکت پڑی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر اڑتا ہوا کسی مافوق الفطرت مسیحا کے پاس پہنچوں جو اس لڑکی کے اندر چھپے ہوئے سارے زخموں کو مندمل کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دے...... اس کی وحشت کا کوئی علاج کر دے۔

مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔

اس کی نبض معدوم تھی۔ دھڑکن رک چکی تھی۔ دل وحشی سو چکا تھا...... مگر اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ وہ ایک خود گزیدہ اور جہاندیدہ لڑکی کے بجائے ایک معصوم اور کمسن بچی لگ رہی تھی۔

میں اس کے بیڈ کے کنارے پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں......''